اوم

رسالہ

مستانہ جوگی

لاہور

جلد ۲۹	جنوری سنہ ۱۹۴۱ء	نمبر ۱

نرگس کے پھول

ایک روز میں اکیلا اِسطرح پھر رہا تھا۔ جسطرح کوئی بادل اُونچے آسمان میں پہاڑیوں اور گھاٹیوں کے اُوپر سے گذر رہا ہو۔ اچانک میری نظر نرگس کے ایک زبردست گروہ پر پڑی۔ یہ پھول ایک جھیل کے کنارے درختوں کے نیچے بادِ صبا کے جھونکے کھا کھا کر پھڑ پھڑا رہے تھے۔ اور ناچ رہے تھے۔ یہ پھول کہکشان کے چمکدار اور جگمگاتے ہوئے ستاروں کی مانند لگاتار اُگے ہوئے تھے۔ اور جھیل کے کنارے لا اِنتہا قطاروں میں پھیلے ہوئے تھے۔ میں نے ایک ہی نظر میں ہزاروں پھولوں کو رقص میں سر ہلاتے ہوئے دیکھا۔ ان کے قریب جھیل کی لہریں بھی ناچ رہی تھیں لیکن یہ پھول اپنی مستانہ خوشی سے ان کو مات کر رہے تھے۔ ایک شاعر ایسی محفل میں شادمان ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں اُن کو گھور گھور کے دیکھتا رہا۔ لیکن مجھے یہ خیال مطلق نہیں آیا۔ کہ اِس نظارے نے مجھے کیا بے بہا دولت بخشی ہے۔ جب کبھی میں اپنے بستر پہ پڑا ہوتا ہوں۔ اور من اُچاٹ ہوتا ہے۔ یا غور و فکر میں غرق ہوتا ہوں ...... تب اچانک یہ پھولوں کی قطار تصور کی آنکھ کے سامنے اپنی جھلک دِکھا دیتی ہے۔ اور اِس قسم کی جھلک ایک ایسی نعمت ہے۔ جو خلوت ہی بخش سکتی ہے۔ اُسوقت میرا دل خوشی سے بھرپور ہو جاتا ہے۔ اور ان نرگس کے پھولوں کے ساتھ ناچنے لگتا ہوں۔

وادی کشمیر میں
زعفران کے کھیت

سری نگر دارالخلافہ کشمیر سے جانب جنوب کوئی آٹھ ۹ نو میل کے فاصلہ پر ایک قصبہ بنام "پانپور" یا "پامپور" دریائے جہلم کے کنارے پر آباد ہے۔ گذشتہ زمانہ میں اسے "پدم پور" کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ روزِ ازل سے کشمیر جنت نظیر کے خطہ پدم پور کی مٹی میں یہ تاثیر ودیعت ہوئی۔ کہ زعفران جیسی بیش بہا اور نایاب چیز کا وطن مالوف کہلائے۔ ہو تو زعفران علاقہ کشتواڑ اور ایران میں بھی ہوتی ہے۔ مگر جو شرف یہاں کی پیداوار میں ہے کہیں سننے میں نہیں آیا ✦

وسط جون و جولائی میں اس کی کاشت شروع ہوتی ہے۔ زمین میں ہل چلا کر مٹی کو ہموار کیا جاتا ہے۔ اور جابجا خیابان بنا دیئے جاتے ہیں جس سے قدرتِ الٰہی کا تماشہ نظر آتا ہے۔ چند روز کے عرصہ میں پودا خود بخود سر نکالنا شروع کر دیتا ہے۔ اور تقریباً تین مہینے میں اس کا نازک اندام پودا پورے قد کا ہو جاتا ہے جس کی بلندی فٹ ڈیڑھ فٹ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ وسط ماہ اکتوبر میں اپنے پورے جوبن پر آتا ہے۔ اور اس کی ننھی ننھی شاخیں اپنی پیاری پیاری کلیوں کی آنکھیں کھولنا شروع کر دیتی ہیں۔ اسے "شگوفہ زعفران" کہتے ہیں۔ جب خاندانِ گل کا آخری بادشاہ یعنی گل زعفران تاج شاہی کو زیب سر کر کے مسند آرائے انجمن گلشن ہو کر کرسی ناز پر جلوہ فرمائی کرتا ہے۔ تو اس جشنِ تاجپوشی کے اشتیاق دید میں زندہ دلوں کے دل پُر اضطراب اور آنکھیں بیتاب ہو جاتی ہیں۔ اور قرب وجوار کے لوگ جوق در جوق ہر طرف سے دیوانہ وار اسکے خیر مقدم کیلئے میلوں کی مسافت طے کر کے پہونچتے ہیں ✦

اس کا پھول عشق پیچاں کے پھول سے قدرے چھوٹا اور بنفشے سے کچھ بڑا مگر شکل و شباہت کے لحاظ سے گل بنفشہ کے قریب تر ہوتا ہے۔ ذرا اس بنفشئی سرخی کے نیلگوں فانوس کو اٹھا کر دیکھئے۔ اس میں شمع مراد پوشیدہ ہے۔ جسے آپ "زرِ گل" کہتے ہیں ✦ پنکھڑیوں کو پھول سے جدا کر کے دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ اوپر کا حصہ جو ارغوانی رنگ کا ہوتا ہے علیحدہ رکھا جاتا ہے۔ اور "موگرہ" کہلاتا ہے۔ نیچے کا حصہ جو کچھ سفیدی مائل ہوتا ہے۔ کچھ اور نام پاتا ہے۔ اس نازنین کو دہقانوں کے سخت سخت ہاتھوں سے تڑوا کر طرح طرح کے عذاب میں گرفتار کیا جاتا ہے پہلے دھوپ میں سکھاتے ہیں۔ پھر ایک باریک چھڑی کی نرم نرم ضربوں سے کوٹتے ہیں۔ پھر ایک پانی کے مٹکے میں بیٹھ جاتی ہے۔ اور افسردہ پنکھڑیاں پانی کی سطح پر تیر آتی ہیں۔ پانی کو گرا دیا جاتا ہے۔ اور "کیسر" نکال لیتے ہیں۔ یہ "زعفران شاہی" کا معزز خطاب پاتی ہے۔ بڑی کمیاب ہوتی ہے۔ اور سونے کے مول تولی جاتی ہے ✦ فصل کے دنوں میں کشت زاروں اور کارخانے پر سرکاری پہرہ بیٹھ جاتا ہے۔ اور ایک ایک پھول کی حفاظت کان طلائی کیطرح عمل میں لائی جاتی ہے ✦

زعفران کی ابتداء ہماری لاعلمی کے پردے میں پوشیدہ ہے۔ بعض تو اسے کشمیر الاصل بتاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ اسکی جڑ جو پیاز سے بہت مشابہ ہوتی ہے شوجی کو کسی نے دی۔ جس کا یہ سارا گل کھلا ہوا ہے۔ اور بعض ایرانی الاصل بتاتے ہیں۔ مگر اس میں کوئی شبہ نہیں۔ کہ اس کی کاشت کاری قدیم الایام سے چلی آتی ہے۔ جس کی نسبت عجیب غریب روایات مشہور ہیں۔ جو نظر انداز کی جاتی ہیں ۔ ایام گذشتہ میں زعفران کی کاشت یہاں بہت ترقی پر رہتی تھی۔ چنانچہ عہد مغلیہ میں اور خصوصاً اکبر اعظم سے شاہجہان کے زمانے تک دس بارہ ہزار بیگھے تک زمین میں اس کی کاشت ہوتی تھی اور یہ اپنی معراج کمال پر پہونچ گئی تھی۔ مگر بعد میں بسبب متواتر حوادثات ملکی اور قحط سالیوں کے لوگ اسکی جڑوں تک کو زمین سے کھود کر کھا گئے۔ جس سے پیداوار میں نہائت ضعف آگیا۔ مگر آجکل پھر رو بہ ترقی ہے ۔

کشمیر کا یہ موسم عجب دلکش ہوتا ہے۔ ہوا اور فضا نہائت صاف اور شفاف۔ آسمان پر کہیں کہنے کو بھی بادل کا ٹکڑا نظر نہیں آتا۔ دھوپ میں گرمی کا نام نہیں۔ نور بے نار جس میں آب ہی آب ہے۔ اور تاب کا نام تک نہیں۔ شہر سے پامپور تک سڑک باقاعدہ اور مصفا ہے۔ اور اسکے بائیں جانب فصیل کوہ اور دائیں طرف آب جہلم ایک خاموشی کے عالم میں اپنے آسمانی رنگ کے پانی کو لئے اپنے راستے پر سانپ کی طرح لہراتا اور بل کھاتا چلا جاتا ہے ۔

خزاں کی نیرنگی اور رنگ آمیزی سے سیر کا لطف اور بھی دو چند ہو جاتا ہے جس طرف دیکھو۔ سُرخ اور سبز پوش اور جدھر نگاہ اٹھاؤ۔ گلابی اور زعفرانی قبائیں بردوش درخت ایک آن بان کے ساتھ کھڑے ہیں۔ چنار جو اس ملک کی شان وشوکت کا سرتاج ہے۔ اور موسم میں نیا رنگ لاتا ہے۔ اسکے منہ پر ..... شفق پھولی ہوئی ہے۔ اور اسکے شاندار خیمے ایسے سرخ دکھائی دیتے ہیں۔ کہ گویا کسی کے خرمن عیش میں آگ لگی ہو۔ سفیدے سبز و بسنتی لباس پہنے ہر طرف پرے باندھے سر بلند ہیں۔ دوسرے جوانان چمن بھی ہفت رنگ کلیوں اور قباؤں سے مزین ہیں۔ مگر اپنی دو روزہ بہار پر اُن کو خود بھی مایوسی ہے۔ ہوا کے چلنے سے رنگ برنگ کے پتوں کا جھڑنا گل افشانی کا سماں دکھاتا ہے۔ جو ایک دوسری بہار سے مشابہ ہے۔ اور جس کو خزاں کا شگوفہ کہتے ہیں۔ اسی سے پتہ چلتا ہے۔ کہ خزاں اور بہار میں فرق ہے تو اتنا ہے۔ کہ ایک صبح ہے تو دوسری شام ہے ۵

جنوں پسند ہے مجھ کو ہوا بگولوں کی   عجب بہار ہے ان زرد زرد پھولوں کی

پامپور کے قریب جاکر ذرا مشرق کی طرف نظر اٹھاؤ۔ تو ایک قطعہ سطح مرتفع نہائت نامحسوس اٹھان کے ساتھ بلندی کی طرف راغب ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ اور رفتہ رفتہ انتہائے نظر تک پہونچکر ایک نہائت دلفریب اور خوش قطع ہلال نما وادی کی صورت میں ختم ہو جاتا ہے۔ ایسے قطعہ مرتفع کو یہاں "کریوہ" کہتے ہیں۔ جو عام طور پر پہاڑوں کے دامنوں میں کم و بیش سلامی چبوتروں کی صورت میں لگے رہتے اور اپنی زرریزی کے لئے شہرہ آفاق ہیں۔ اس "کریوے" کی گود میں طفل زعفران کی پرورش ہوتی ہے ۔

جب سورج نیلگوں آسمان کا سارا میدان خالی کر کے مغربی کوہستان کی گھاٹیوں میں اپنا منہ چھپانے کو ہوتا ہے۔ تو زعفران زار کی کشت ایک دلچسپ کیفیت رکھتی ہے منتہائے نظر پر سرسبز اور نیلی نیلی پہاڑیوں کی لمبی قطار اور اُس کی ناہموار مگر سڈول آسمان سے باتیں کرتی ہوئی مخروطی چوٹیاں مغربی اُفق پر شفق کا پردۂ ارغوانی اور دامن کوہ میں ایک دلکشا وادی شادمانی جس زندگی۔ راحت بخش ہوا۔ اور جان پرور خوشبو سے دیکھنے والوں کی آنکھیں شاداب۔ دل شگفتہ اور دماغ معطر ہوتے جاتے ہیں۔ نظر آتی ہے پس پشت دریا "بہت" ایک سکون کے عالم میں اپنی پُرتمکنت رفتار کو پورا کرتا اور آسمان کے بدلنے والے رنگوں کی تصویریں اپنے سینۂ صاف کے آئینہ میں اُتارتا ہوا چلا آتا ہے + اس سے زیادہ دل آویز نظارہ شب ماہ کا ہے۔ کوہستان مشرق سے ماہ کامل کا سر اُٹھانا۔ آن کی آن میں تاریک وادی کو اپنی نورانی شعاعوں سے بھر دینا۔ پہاڑوں کے آسیب دار سایوں کا سمٹنا اور سمٹ سمٹ کر اُن کے دامنوں سے لپٹ جانا۔ زعفران زار پر چاندی کا چھٹکنا۔ گویا تاروں بھری رات کا زمین پر اُتر آنا۔ اس کی پُرنور کرنوں کا پھولوں کے رنگین فانوسوں میں سمانا۔ اور دریا کے آئینہ سیال میں جلوس بدر کا فوٹو اُترنا۔ ایسے جنون خیز سامان ہیں۔ کہ جن کو دیکھ کر فرط انبساط سے غشی نہ کرنا اور حواس خمسہ کو سلامت لے آنا ایک ناممکن سا امر معلوم ہوتا ہے۔ مگر تعجب ہے کہ پھر سب کے سب اچھے خاصے چلے آتے ہیں +

زعفران کا پودا چھوٹا سا اور ایک گٹھی سے پیدا ہوتا ہے۔ جو پیاز کی طرح سمجھنی چاہئے۔ نباتی حیثیت سے یہ اس نوع میں داخل ہے جس میں گل سوسن شامل ہے۔ پھول کے مؤنث حصہ گل میں تقریباً ایک ایک انچ لمبی اور پتلی نالیاں سی پائی جاتی ہیں۔ جن کی رنگت گہری سُرخ ہوتی ہے۔ یہ وہ حصہ گل ہے۔ جسے سکھا کے "زعفران" بناتے ہیں +

تاریخ:- "زعفران" زمانہ قدیم سے ہندوستان میں مروج ہے۔ اور ویدصاحبان اس کی طبی تاثیرات کے زمانہ ماقبل تاریخ سے قائل چلے آتے ہیں۔ قدیم سنسکرت کی طبی لغت "بھاؤ پرکاش" میں بھی زعفران کا نام سنسکرت زبان میں "کنکوما" درج ہے۔ اہل ہنود اسے اپنی بعض مذہبی رسوم اور اونچی ذات کے بیاہ شادیوں میں برتتے تھے۔ اور ذات پات کی تمیز کے لئے ماتھے پر بھی اس کا ٹیکہ لگاتے تھے + انجیل میں بھی زعفران کا حوالہ موجود ہے کشمیر میں ایک خاص خطہ "زعفران" کی کاشت کے لئے مشہور ہے۔ جہاں سلاطین مغلیہ کے وقت میں اسکی کاشت بڑے اہتمام سے ہوا کرتی تھی شہنشاہ بابر نے اپنے بابرنامے۔ جہانگیر نے اپنی تزک جہانگیری اور ابوالفضل نے اپنی آئین اکبری میں کشمیری زعفران کے حوالے دیئے ہیں + قدیم اہل یونان اور رومی بھی زعفران کو بطور رنگ اور بطور دوا۔ نیز خوشبو خوشگواری پیدا کرنے کے لئے استعمال کیا کرتے تھے۔ دسویں صدی مسیح میں یہ ہسپانیہ میں کاشت ہوتی تھی۔ جہاں سے فرانس اور انگلستان میں یہ پودا پہنچ گیا۔ ایران میں بھی اس کی کاشت کا پتہ چلتا ہے +

وطن:- ایشیا میں ایشیا کوچک اور کشمیر کا علاقہ پام پور اور یورپ میں ہسپانیہ۔ فرانس۔ یونان اور

اٹلی یعنی یورپ کا جنوبی حصہ زعفران کی کاشت کے لئے موزوں سمجھا جاتا ہے۔ جہاں یہ عمدگی سے اُگتی ہے کشمیر کی زعفران اپنی نفاست۔ رنگت کی عمدگی کے لحاظ سے اوّل درجہ کی سمجھی جاتی ہے۔ اور فی زمانہ تو یورپ کی زعفران بہت بڑی مقدار میں ہندوستان میں آکر فروخت ہوتی ہے کیونکہ یہاں زعفران کی بہت قدر و قیمت ہے لیکن مصیبت یہ ہے۔ کہ ولائتی زعفران اکثر نقلی ہوتی ہے۔ یعنی ایسے پودوں سے حاصل کیجاتی ہے۔ جو اصل زعفران سے صورت یا رنگت میں مشابہ ہوتے ہیں۔ ہم نے چھ سات قسم کی نقلی زعفران بازار میں دیکھی ہے۔ جو ہسپانیہ کی کسی کمپنی نے ٹین کے خوبصورت ڈبوں میں بند کر کے فروخت کی غرض سے یہاں بھیجی تھی۔ حال ہی میں حیدر آباد دکن میں زعفران کی کاشت شروع کی گئی ہے +

نام۔ زعفران کے دوسرے مشہور نام یہ ہیں :- "کیسر کیکرا۔ کرکم۔ کنکوما۔ کسمیر اجنما۔ کنگو مئو۔ کونگ۔ سیفرن (SAFFRON) اور لاطینی میں "کروکس سیٹاٹوس" (CROCUS SATIOUS) +

نباتی توضیح۔ یہ پانچ چھ انگل اونچا نرم پودا ہے جس میں تنا نہیں ہوتا۔ اس کی جڑ میں نرگس یا پیاز کی طرح چھوٹی سی گٹھی پائی جاتی ہے جس کی موٹائی ایک انچ یا اس سے قدرے بڑی ہوتی ہے۔ پتے گھاس کی طرح اور تعداد میں ۶ سے ۱۰۔ مگر پھول سے بلند تر نہیں ہوتے۔ ان کے کناروں پر باریک رواں سا ہوتا ہے۔ پھول کی ڈنڈی خاصی لمبی اور اندر سے کھوکھلی ہوتی ہے۔ پھول کی پنکھڑیاں لمبوتری مگر چوڑی اور قیف کی طرح رنگت میں بنفشئی یا بعض قسموں میں بالکل سفید بھی ہوتی ہیں۔ پھول براہ راست گٹھی میں سے نکلتا ہے۔ زیرہ گل زرد اور زعفران کی تریوں سے چھوٹی تر۔ تخم دان کی بالائی نالی لمبی۔ سہ شاخہ۔ جن میں سے ہر شاخ تقریباً ایک انچ لمبی اور پھول سے باہر نکلی اور لٹکتی رہتی ہے۔ اس نالی اور شاخوں کا رنگ شوخ سرخ ہوتا ہے۔ اسی کو سکھا کے زعفران بنالیتے ہیں۔ ایک گرام یعنی تقریباً ۱۵½ گرین میں ۸سو خشک تریاں آجاتی ہیں۔ پودے پر پھول اوائل ستمبر یعنی وسط اکتوبر میں نمودار ہوتا ہے۔ پرانی گٹھیوں کے ساتھ ساتھ یا اوپر کی طرف نئی گٹھیاں بنتی رہتی ہیں۔ اور یوں خود بخود نسل بڑھتی رہتی ہے +

کشمیری زعفران "کشمیری زعفران" اپنی نفاست۔ رنگت اور خوشبو کے لحاظ سے سب پر فائق ہے۔ اور تحفہ کے طور پر دور دور بھیجی جاتی ہے۔ سری نگر سے چند میل کے فاصلہ پر مشرق کی طرف ایک اونچا قطعہ زمین ہے۔ جو زمانہ قدیم سے زعفران کی کاشت کیلئے موزوں سمجھا جاتا ہے۔ یہ قطعہ تقریباً ۴ میل مربع ہوگا۔ اس کا نام "کریوہ مان پور" ہے۔ اونچائی کے سبب سے اس میں نہری آبپاشی کا انتظام نہیں۔ البتہ بارش سے آبیاری ہوتی رہتی ہے۔ یہاں پر "زعفران" کاشت کی جاتی ہے۔ جس زمین میں پہلے "زعفران" کا بیج بونا ہو۔ وہ سات آٹھ برس سے افتادہ ہونی چاہیے جہاں کوئی کھاد وغیرہ نہیں دی جاتی۔ بیج کے طور پر "زعفران" کی گٹھیاں لگا دیتے ہیں۔ جو ۱۴ برس تک خود بخود بڑھتی اور نئے پودے پیدا کرتی رہتی ہیں۔ تخم ریزی کا موسم جولائی یا اگست ہوتا ہے۔ وسط اکتوبر میں

(۱)



(۲)



(۱) اصل زعفران کی گٹھی جو چھوٹی کر کے دکھائی گئی ہے

(۲) کروکس ورنس کی تصویر۔ جو اصل سے ایک تہائی ہے

(۵)



(۴)





(۳)

(۳) "گل کیلنڈولا" کی پتیاں جو بلانٹ کے طور پر مستعمل ہیں اس پھول کو "چینی کسنبہ" بھی بولتے ہیں یہ اصل سے ڈیڑھ گنا ہے

(۴) "کروکس ورنس" یعنی نقلی زعفران کی ایک قسم جو یونان میں

(۵) اصل زعفران کی تریاں جو ٹوٹتے حصہ گل کی ڈنڈی کے ٹکڑے پر جڑی ہوئی اور سہ شاخہ ہے۔ تصویر اصل سے

(۶)



(۶) اصل زعفران کا پودا۔ جو اصل قد کا دو تہائی ہے +

(۷)



(۷) "کروکس ورنس" کی تریاں جو اصل زعفران کی تریوں سے وضع میں بھی مختلف ہیں +

(۸)



(۸) دیسی کسنبہ کی تریاں جو ملاوٹ کے لئے مستعمل ہیں اصل سے ڈیڑھ گنا +

پھول نمودار ہوتے ہیں۔ تو کھیت زعفران زار بن جاتا ہے۔ اور ہوا پھولوں کی خوشبو سے مہک جاتی ہے۔ پھول پختہ ہو جاتے ہیں۔ تو اُنہیں توڑ کر دھوپ میں سکھاتے ہیں۔ پھر پھول کے اندر سے تین لمبی لمبی نالیاں جو تخمدان کا بڑھاؤ ہوتی ہیں۔ چٹکی سے نوچ لیتے ہیں۔ جس سے اوّل درجہ کی "شاہی زعفران" بنتی ہے۔ اسے عُرف عام میں "مونگرا زعفران" بولتے ہیں۔ اسکی شناخت یہی ہے۔ کہ رنگت شوخ سُرخ ہو۔ نالیاں علیحدہ علیحدہ نظر آئیں۔ اور پھر خوشبو بھی ہو۔ پھول کی ڈنڈی کے اندر ان نالیوں کا زیرین حصہ ہوتا ہے۔ جسکی رنگت بہت ہلکی ہوتی ہے۔ مگر اِس سے بھی زعفران بنائی جاتی ہے۔ "مونگرا" نکال لینے کے بعد پھولوں کو ہلکے ہلکے کوٹتے اور چھاج میں ڈال کر پھٹک لیتے ہیں۔ تاکہ پھول کی پتیاں اور فالتو پردے علیحدہ ہو جائیں۔ اِسکے بعد سب کو پانی میں ڈال دیتے ہیں۔ جس سے تخمدان کی نالیوں کے ٹکڑے جو بھاری ہوتے ہیں۔ پانی کی تہ میں بیٹھ جاتے ہیں۔ اور ہلکے پردے اوپر تیر آتے ہیں۔ تہ نشین ٹکڑوں کو اکٹھا کر کے سکھا لیتے ہیں۔ جس سے دوسرے درجے کی "زعفران" بنتی ہے۔ اور تیرنے والے پردوں کو دوبارہ خشک کر کے کوٹتے اور پانی میں تہ نشین کرتے ہیں۔ جس سے تیسرے درجے کی زعفران بنتی ہے۔ الغرض اسی ترکیب سے مختلف درجوں کی زعفران بن جاتی ہے۔ مگر زعفران کے یہ درجے "مونگرا" سے رنگت اور خوشبو میں بہت ہلکے ہوتے ہیں۔ جب زعفران جمع ہو جاتی ہے۔ تو اسے فروخت کے لئے منڈیوں میں بھیج دیا جاتا ہے + کشمیر کی زعفران مدت مدید سے حکومت کی ملکیت متصور ہو رہی ہے۔ جس کی پیداوار کا ایک حصہ کاشت کاروں کو مل جایا کرتا تھا۔ اِس بارے میں ایک سیاح نے جو حالات قلمبند کئے ہیں۔ وہ پُر از معلومات ہیں۔ جن کا خلاصہ ہم بھی درج ذیل کرتے ہیں۔

"زعفران کا پودا بہت نازک شے ہے۔ اِس کی کاشت میں خاص احتیاط برتی جاتی ہے۔ اگر زعفران کے کھیت میں بے احتیاطی سے مویشی چر جائیں۔ تو گٹھی سے تین سال تک پتے دوبارہ نہیں پھوٹتے اور پیداوار نام کو نہیں ہوتی۔ جو قطعہ اراضی زعفران کی کاشت کے لئے مخصوص ہے۔ وہ سارے کا سارا زیر کاشت نہیں ہوتا۔ بلکہ اس میں بہت سے کھیت افتادہ رکھے جاتے ہیں۔ اور کوئی دوسری جنس بھی کاشت نہیں کی جاتی۔ کہ کہیں چوہے پیدا ہو کے زعفران کو نقصان نہ پہونچائیں۔ بارہ تیرہ سال کے بعد خالی زمین میں "زعفران" کا نیا بیج لگایا جاتا ہے جس سے زعفران خوب سرسبز ہوتی اور پھولتی ہے۔ بادشاہانِ قدیم کے عہد میں دستور تھا۔ کہ جب وقت گل زعفران برآمد ہوتا تھا۔ تو رعایا کے مرد و زن اس کو چنتے تھے۔ شام کو سرکاری ملازم اُن سے بنصف بانٹ لیتے تھے۔ اور نصف پیداوار سرکاری ذخیرے میں جمع ہو جاتی تھی جس کو پٹواری اور قانونگو اپنے کاغذات میں درج کر لیتے تھے۔ چونکہ زعفران قیمتی چیز ہے۔ اس میں چوریاں ہوتی تھیں۔ کھیتوں پر بہت سے سپاہی متعین کئے جاتے تھے۔ بعد تقسیم زعفران کے چننے والوں کو دریا سے پار کر دیتے تھے۔ کہ وہ سرکاری زعفران کو اپنی زعفران میں ملا کے نہ لے جائیں۔ یہ انتظام سینکڑوں برس سے جاری تھا۔ لیکن جب چوری کی وارداتیں زیادہ ہونے لگیں۔ تو لاچار مہاراجہ صاحب جموں و کشمیر نے حکم دیا۔ کہ نصف حصہ جو مزدور رعایا کو دیا جاتا ہے۔ اسکی جگہ بازار کے نرخ کے مطابق انہیں نقد مزدوری دی جائے۔ کہ چوری کی نوبت نہ آئے چنانچہ اب تک یہی دستور جاری ہے ⁂

مسلمان بادشاہوں اور سکھوں نے زعفران کی پیداوار سے اپنے خزانے بھرے ہیں لیکن شہنشاہ جلال الدین اکبر کو زعفران سے جو مالی فائدہ نصیب ہوا۔ وہ کسی کے حصہ میں نہیں آیا۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ اکبر نے اس کا خوب انتظام کیا تھا! ور "میر باقر" کو دیوان زعفران مقرر کیا تھا۔ جسکے ماتحت سینکڑوں آدمی کام کرتے تھے۔ یہ دیوان ایک لاکھ ترک تک گل زعفران شاہی ذخیرے میں سالانہ جمع کرایا کرتا تھا۔ اکبر کے بعد بدنظمی ہوئی۔ اور جب افغانوں کے ہاتھ میں کشمیر آیا۔ تو سردار محمد عظیم خان کے ذخیرہ زعفران میں ایک سال کی پیداوار ۸۴۰۷ ترک آئی سکھوں کے عہد میں پھر اسکی غور پرداخت ہونے لگی۔ چنانچہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانے میں ۱۲۸۰۷ ترک زعفران ذخیرہ سرکاری میں جمع ہوئے۔ اسکے بعد مہاراجہ شیر سنگھ کے عہد میں پھر کاشت زعفران برباد ہو گئی۔ جب مہاراجہ گلاب سنگھ کے ہاتھ میں کشمیر آیا۔ تو انہوں نے کاشت زعفران پر خاص توجہ مبذول کی جس سے خطۂ زعفران بربادی سے محفوظ ہو گیا۔ اور ایک ہی سال میں زعفران کی پیداوار ۱۲۵۰۷ ترک ہو گئی۔ انکے انتظامات نے یہانتک ترقی کی۔ کہ ۱۰۰۹۱ ترک سالانہ تک پہونچگئی۔ مگر خدا کا کرنا ایسا ہوا۔ کہ یکایک بے وقت بارشیں شروع ہو گئیں جس سے پھول خشک نہ ہو سکے۔ اور زمین میں گٹھیاں گل گئیں اور تخم ضائع ہو گیا۔ چنانچہ سمت ۱۹۳۵ میں کل ۱۵۲۰۷ ترک ذخیرے میں آئے۔ اگلے سال قحط شروع ہو گیا جس سے زعفران کی کاشت

کشمیر کے عہد سے بڑھ کر نہیں +

استعمالات - زعفران زیادہ تر رنگ کے طور پر مستعمل ہے - اس میں خوبی یہ ہے - کہ پانی اور روغن میں بآسانی گھل مل جاتی ہے - اسی لحاظ سے ہندوستان میں بعض کھانوں اور ادویہ میں برتی جاتی ہے - یہ برطانی فارماکوپیا میں بھی داخل رہی ہے - اور ادویہ کو خوش رنگ بنانے میں مستعمل ہے - ہندوستان میں بیاہ شادیوں کے موقعہ پر زیادہ مستعمل ہے - مگر چونکہ اس کا نرخ بہت گران ہے - اسلئے فی زمانہ زعفران کا استعمال بہت گھٹ گیا ہے - ولائت میں طیور پالنے والے پرندوں کو زعفران کھلاتے ہیں - کہ اس سے کریز میں بہت مدد ملتی ہے - اور نئے پر بہت نفیس اور چمکیلے پیدا ہوتے ہیں +

ملاوٹ - زعفران ایک قیمتی شے ہے - اسلئے بعض بددیانت تاجر اور دوکاندار اس میں ملاوٹ کر دیتے ہیں - زعفران جس نباتی نوع میں داخل ہے - اس میں چند پودے اور بھی ہیں - جن کے پھول زعفران سے مشابہ ہوتے ہیں - مگر رنگت اور خوشبو اس پائے کی نہیں ہوتی - انہیں بددیانتی سے اصل زعفران میں ملا دیا جاتا ہے - ہندوستان میں اصل زعفران کی جگہ بعض اوقات کسنبہ اور ہارسنگار کے پھول بھی استعمال کر لئے جاتے ہیں - جو اپنی وضع قطع کے لحاظ سے گل زعفران سے بالکل مختلف ہوتے ہیں - اور آسانی سے ان کی تمیز بھی ہو سکتی ہے - لیکن ولائت سے جو نقلی زعفران آتی ہے - اُس کی شناخت آسانی سے نہیں ہو سکتی - سوائے اس کے کہ رنگت اور خوشبو اصل چیز سے ہلکی ہوتی ہے - چنانچہ ولائت میں زعفران کی قسم کے جن پودوں سے نقلی زعفران حاصل کی جاتی ہے - انکے لاطینی نام یہ ہیں :- "کروکس سیلی ری" (CROCUS SELLERIUM) جو یونان سے حاصل کیا جاتا ہے + "کروکس آری اس" (CROCUS AUREUS) + "کروکس اوڈورس" (CROCUS ODORUS) + "کروکس لیوٹی اس" (CROCUS LUTEUS) + "کروکس ورنس" (CROCUS VERNUS) وغیرہ - جن میں سے مؤخر الذکر کی تصویر بھی یہاں درج کی جاتی ہے + زعفران میں ملاوٹ کا دستور بہت پرانا ہے - یہانتک کہ قدیم یونان کے حکیم "ویسقوریدوس" اور رومی مؤرخ پلائنی کے زمانے میں بھی ملاوٹ کا تاریخی ثبوت ملتا ہے - زمانہ حاضرہ میں ملاوٹ کے تین طریقے برتے جاتے ہیں ... (الف) اصل زعفران کی بجائے کسی ہمشکل و ہم رنگ پھول کی تریاں اصل زعفران میں ملانے سے (ب) اصل زعفران کی سالم تریوں میں سے رنگ نکال کے انہیں رنگ دینے سے + (ج) مصنوعی طریق سے اصل زعفران کا وزن بڑھانے سے + بہ نسبت اول - جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کسنبہ اور ہارسنگار کے پھولوں کے علاوہ بعض اوقات خود اصل زعفران کے پھول کی پتیاں اور تریوں کے نیچے کی ڈنڈیاں بھی اصل زعفران میں ملا دی جاتی ہیں - یا بعض گھٹیا قسم کی زعفران بڑھیا میں ملا دی جاتی ہے - ایک ولائتی پھول جسے "کیلنڈولا" (CALENDULA) لیتے ہیں - اور جس کی تصویر بھی یہاں ....

ہے۔ بعض اوقات زعفران میں ملا دیا جاتا ہے۔ اسے چینی کسنبہ سمجھنا چاہئے۔ اس کا رنگ اصل زعفران سے ملانے
کے لئے "کیلنڈولا" کو "میتھل اورنج" (METHYL ORANGE) کے رنگ میں غوطہ دے لیا
جاتا ہے * نسبت امر دوم۔ اصل زعفران کو جس کا اصل رنگ نکال لیا گیا ہے۔ دوبارہ رنگنے کیلئے "ٹارٹرازین"
(TARTRAZINE) اور "پان سیئو سی۔ آر" (PON CEAU C.R) چوب بقم
چوب برازیل۔ "وکٹوریہ ییلو" (VICTORIA YELLOW) اور وکٹوریہ اورنج (VICTORIA
ORANGE) مصنوعی رنگ وغیرہ استعمال کئے جاتے ہیں * نسبت امر سوم۔ اصل زعفران کا وزن کئی
طریقوں سے بڑھاتے ہیں۔ اس غرض سے نباتی اور معدنی تیل برتے جاتے ہیں۔ جن سے زعفران کی ظاہری صورت اور رنگت
بھی بہتر نظر آتی ہے *

شناخت۔ زعفران کی تریوں کو پانی کی سطح پر پھینکیں۔ تو وہ پھول کے پھیل جاتی ہیں۔ اور کھل جاتی ہیں۔
اور ان کے گرد اگرد جو پانی ہوتا ہے وہ گہرے زرد رنگ کا ہو جاتا ہے۔ وہ سنہری مائل زرد۔ سرخ یا گلابی نہ ہونا چاہئے
ایسا ہو تو سمجھ لیں۔ کہ کوئی مصنوعی رنگ برتا گیا ہے۔ تری کھل کے ایک مخروطی نالی سی نظر آتی ہے۔ جبکی ڈنڈی کا سرا چھوٹا
اور بالائی سرا چوڑا ہوتا ہے۔ علاوہ بریں بالائی کنارے پر اندر کی طرف ایک چھوٹا سا شگاف بھی نظر آتا ہے۔ تری کے
بالائی کنارے بیقاعدہ سے کنگری دار ہوتے ہیں۔ کیمیائی شناخت یہ ہے۔ کہ زعفران کی تریوں کو پیس کے کنسنٹریٹڈ سلفیورک
ایسڈ یعنی قوی ترین "تیزاب گندھک" کی سطح پر چھڑکیں۔ تو جہاں پر زعفران کا ذرہ پڑیگا۔ وہاں پر تیزاب گہرا نیلا
نظر آئے گا۔ جو خوردبین میں بخوبی واضح ہوگا * اصل زعفران کو ایتھر یا پٹرولیم سپرٹ میں ڈالیں۔ تو اس کی رنگت
برائے نام نکلے گی۔ لیکن اگر زعفران میں مصنوعی طور پر کوئی رنگ دیا گیا ہو۔ تو ان میں سے اکثر رنگ ایتھر اور پٹرولیم
سپرٹ میں جھٹ پٹ زائل ہو جاتی ہے۔ اگر زعفران میں مصنوعی رنگ برتے گئے ہونگے۔ تو استخوانی کوئلے سے انکی رنگت
اتنی جلدی زائل نہ ہوگی * اصل زعفران ۱ گرام کو ۵۰ مکعب سینٹی میٹر پانی میں گھولنے سے جو رنگت پیدا ہوگی۔ وہ رنگت
رنگت کے برابر ہونی چاہئے۔ تو ۰ء۲۷۵ گرام "کرومک اینہائی ڈرائیڈ" (CHROMIC ANHYDRIDE)
کو مذکورہ بالا مقدار آب میں گھولنے سے پیدا ہوتی ہے * زعفران میں تیل کی ملاوٹ کا شبہ ہو۔ تو اس کی تریاں جہین کاغذ کی
تہ میں کچھ دیر تک رکھنی چاہئیں۔ تیل ہوگا۔ تو کاغذ میں چکنائی کے داغ پڑ جائینگے * خشک زعفران میں عموماً ۱۲ فیصدی
نمی اور ۷ فیصدی راکھ ہوتی ہے۔ زعفران کو پانی میں گھولو۔ تو تقریباً ۵۱ فیصدی قابل حل مادہ پانی میں شامل ہو
جاتا ہے *

اجزائے ترکیبی۔ زعفران میں یہ اجزائے ترکیبی پائے جاتے ہیں۔ ایک خفیف فراری روغنی مادہ۔ ایک تلخ
جوہر جسے بزبان انگریزی "پکرو کروسین"۔ ایک سرخ رنگین مادہ جسے پالی کرو آئٹ اور کروسین کہتے ہیں۔ نیز

ایک بیرنگ بلور نما مادہ اور ایک شفاف ہائیڈروکاربن۔ فراری روغنی مادہ قدرے خوشبو والا ہوتا ہے۔ "پکروکروسین" بیرنگ شفاف۔ بلورنما "گلوکوسائیڈ" اور ایک زردی مائل فراری روغن پایا جاتا ہے۔ جس میں زعفران کی تمام خوشبو بسی ہوتی ہے۔ "پالی کروآئٹ" بھی زیادہ تر "گلوسائیڈز" پر مشتمل ہوتی ہے۔ جن کی نوعیت غیر معمولی ہوتی ہے +

طبی خواص۔ ڈاکٹری میں زعفران محرک۔ دافع تشنج اور مدر حیض کے طور پر مستعمل ہے۔ نیز اسے بعض مرکبات کو رنگ دینے اور خوشگوار بنانے میں برتتے ہیں۔ یونانی میں آنکھ اور قلب کی بیماریوں کیلئے مخصوص ہے۔ آنکھ کے امراض میں اس کا اکتحالاً استعمال مجلی بصر اور محلل مواد ہے۔ نیز خارش چشم کو مفید ہے۔ دل کی بیماریوں میں بطور مفرح۔ اور مقوی کے مستعمل ہے۔ نیز دوسری دواؤں کا اثر قلب اور دیگر اعضاء تک پہنچاتی ہے۔ علاوہ اسکے دافع تشنج اور مدر حیض ہے +

ریاست کشمیر میں
قیمتی معدنیات کی کانیں

کہا جاتا ہے۔ کہ پرانے زمانے میں کشمیر کے پہاڑوں سے بکثرت معدنیات کا ظہور ہوتا تھا۔ جو اس زمانے میں مفقود ہیں۔ صرف لوہے کی کان ظاہر ہے +

ہیرے کی کان:۔ "ہرمکھ" کے پہاڑ میں ہیرے کی کان موجود ہے۔ اس پہاڑ میں سانپ یا بچھو کا زخم مہلک ثابت نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے۔ کہ سانپ وغیرہ وہاں ہیں ہی نہیں +

سونے کی کان۔ ایک سو برس کا زمانہ گزرا ہے۔ کہ علاقہ "دراس" سے "زوجہ بال" کے پہاڑوں میں حصہ شرقی کی جانب بمجادرت دریا وہاں کے باشندوں نے سونے کی کان دریافت کی تھی۔ کچھ عرصہ ان کا یہی شغل میں گزرا۔ پھر ایک عجیب واقعہ ان کے دیکھنے میں آیا جس پر ان کے شغل کا خاتمہ ہوا۔ وہ یہ ہے۔ کہ ایک دن اتفاقاً سونے کی مورت جسکے دو ہاتھ ٹوٹے ہوئے تھے۔ لوگوں نے دیکھی۔ لوگ بطمع نفسانی کلہاڑیوں سے مورت کو توڑنے لگے۔ اسی اثنائے میں یہ مورت خود بخود اچھل کر دریا میں ڈوب گئی۔ اور پہاڑ کی چوٹی سے پہاڑ کا ایک حصہ دفعتہً گر پڑا۔ جس سے سونے کی کان ڈھک گئی + "آئین اکبری" میں لکھا ہے۔ کہ دریائے "اباسند" و "رودیدسی" سے جو "چیلاس" سے عبور کرتے ہیں۔ اور دریائے "کرشنا گنگا" سے سونے کی ریت پائی گئی تھی۔ جسکے حاصل کرنے کا یہ طریقہ تھا۔ کہ اول مٹی کو دھوتے تھے۔ پھر کسی چیز کا چمڑا جسکے لمبے لمبے بال ہوتے۔ پانی میں بچھا کر پتھروں سے دبا کر رکھدیتے۔ بعد دو روز کے نکال کر دھوپ میں رکھتے۔ جب چمڑا سوکھ جاتا۔ تو ریزہ ہائے طلا حاصل کر لیتے +

چاندی اور تانبا۔ مسٹر "ڈوئین" صاحب لکھتے ہیں۔ کہ ... کشمیر میں موجود

ہیں۔ چنانچہ "عیش" مقام "و" کامراج" میں تانبے کی کان ظاہر ہے۔ بلکہ قلعی کی کان بھی ظاہر ہے۔ لیکن بمقابلہ آمد کے خرچ زیادہ ہونے کا احتمال ہے ؂

لوہے کی کان - کشمیر میں لوہا چار جگہ سے نکلتا ہے۔ ایک تو موضع "بیشر و صوف" پرگنہ برنگ سے اعلیٰ قسم کا صاف اور نرم۔ دوم موضع "کھریو شاہ" پرگنہ وتھو سے بدرجہ اوسط۔ سوم موضع "ہرون" علاقہ زینہ گیر۔ مگر یہ بالکل خراب اور ناصاف ہے (اس علاقہ میں لوہے کے اب بھی خراب اور ناصاف ٹکڑے دیکھے جا سکتے ہیں)۔ چہارم موضع "ژوہن" پرگنہ شاہ آباد سے لوہا نکلتا ہے۔ یہ بھی بدرجہ اوسط ہے ؂

سُرمہ کی کان - علاقہ "اوڑی" مقام "بونیار" میں سُرمہ کی کان پائی جاتی ہے ؂

گندھک کی کان - کشمیر سے کچھ چشمے ایسے نکلتے ہیں۔ جن کے پانی سے ہمیشہ گندھک کی بُو آتی رہتی ہے۔ چنانچہ "کامراج" میں غربی پہاڑوں کے دامن میں "کان گوگرد" (گندھک) اکثر مقامات میں ہیں۔ بلکہ علاقہ اودھ مچھی پورہ راجوار کے موضع پچھامہ میں سمت ۳۵-۱۹۳۴ بکرمی میں خود بخود زمین سے دھواں نکلنے لگا۔ بلکہ آگ بھی مشتعل ہو گئی۔ اہل ہنود کا وہاں بڑا میلہ ہوا۔ ان کے اعتقاد میں اس قسم کی آگ کا ظہور ہونا جوالا مکھی تھا جس کو وہ لوگ "سوم جی" کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ مگر اہل اسلام کے نزدیک کان گوگرد کا ظہور تھا یعنی بھونچال کے وقت پتھروں کے آپس میں ٹکرانے سے مادہ گوگرد کو آگ لگ گئی۔ جس کی رُو سے آگ کے شعلے زمین سے نمودار ہوئے۔ اہل یورپ کے خیال میں وہاں کوئلے کی کان ہے ؂

کشمیر کے قیمتی پتھر

سنگِ بلّور - اگلے زمانہ میں بلّور کے پتھر علاقہ "وچھن پارہ" پرگنہ لعل کے پہاڑوں میں بکثرت پائے تھے۔ تھوڑے عرصہ کی بات ہے۔ کہ اس زمانہ کے بعد بھی سیاح اور گلہ بان بلّور کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے پہاڑوں سے اٹھا کر لاتے تھے۔ چنانچہ سمت ۱۹۴۴ میں علاقہ لعل کے پہاڑوں سے بلّور کی کان ظاہر ہوئی تھی۔ جو پھر نابود ہو گئی ؂

سنگِ موسےٰ - موضع "دیکھروشاہ" پرگنہ "وتھو" سے سیاہ رنگ کا پتھر جو غایت درجہ صاف و شفاف بلاہم ہوتا ہے۔ اکثر لوگ لاتے رہتے ہیں۔ اِن سے اعلیٰ قسم کے نگینے انگوٹھیوں کیواسطے بنائے جاتے ہیں ؂

سنگِ چقماق - یہ پتھر بھی موضع مذکورہ میں پائے جاتے ہیں۔ ان پتھروں کو حجر النار بھی کہتے ہیں۔ اگلے زمانے میں جبکہ انگریزی رائفل کا ایجاد نہ تھا۔ تو پرانے فیشن کی بندوقوں کی ٹوپیوں کا کام انہی پتھروں سے لیا جاتا تھا

سنگِ نلچیں - یہ پتھر سُرخ رنگ کے ہوتے ہیں۔ اور بہت ہی ملائم ہیں۔ پرگنہ "وچھن پارہ" موضع پہل گام میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ بلکہ وہاں کے لوگ اس سے اچھے اچھے برتن بناتے ہیں۔ اور عمدہ عمدہ پیالیاں مٹی کے پیالوں کی طرح بنا کر استعمال میں لاتے ہیں ؂

سنگِ ... [illegible] ... اسکے برتن

بناتے ہیں۔ جن میں سونا اور چاندی گالی جاتی ہے +

سنگ شیشہ و کانچ۔ علاقہ سندار متصل دو درہامہ میں اس پتھر کی پیدائش کثرت سے ہے۔ اس کو آگ میں گال کر کانچ بنایا جاتا ہے +

سنگ گنج ۔ یہ پتھر قصبہ بارہ مولا میں بکثرت ہے۔ اس کو گلخنوں میں پختہ کرکے شہر میں لاتے ہیں۔ بہت سفید اور براق ہوتا ہے۔ مکانات و محلات کو اسی سے سفید رنگ بناتے ہیں +

سنگ چونہ ۔ یہ پتھر کوہ آہک ٹینگ میں اکثر جگہ پایا جاتا ہے۔ بلکہ تمام پہاڑ اسی پتھر کا ہے۔ اس پہاڑ کے دامن میں دس بیس گلخن چونہ پزوں کے موجود ہیں۔ اور موضع "اجس" پرگنہ "کوہامہ" میں بھی یہ بکثرت ہے۔ اور موضع ذچلڈار پرگنہ چھچی پورہ میں بھی تھوڑے تھوڑے پتھر اس قسم کے دکھائی دیتے ہیں۔ قصبہ بارہ مولا اور اننت ناگ اور پرگنہ دیوہ سر میں ان پتھروں کا کارخانہ بھی ہے +

سنگ سماق ۔ یہ پتھر تمام کشمیر میں کثرت سے ہے +

سنگ شالمار ۔ اس پتھر کا رنگ نیلا ہوتا ہے۔ اور خالدار بھی۔ اسکے نگینے اور بٹن بنائے جاتے ہیں +

سنگ خارا ۔ یہ پتھر کشمیر میں علی العموم موجود ہے +

سنگ فرشی ۔ کوہ بارہ مولا میں کثرت سے پیدا ہوتا ہے۔ حمام کے فرش میں کثرت سے کام آتا ہے۔ اور پرگنہ کمل موضع نوزمیں بھی اس کی پیدائش ہے۔ وہاں اعلیٰ اقسم کا صاف پتھر پایا جاتا ہے۔ موضع راجدر علاقہ چھچی پورہ کے حصہ غربی کے دامن کوہ میں بھی اسکے اکثر نشان ملتے ہیں +

نیلم ۔ مقام پاڈل۔ صوبہ جموں میں نیلم کی بہت بڑی کان ہے۔ کہ جہاں سے اب بھی نیلم نکلتا ہے۔ یہ تو صرف ریاست کشمیر کا ذکر ہے۔ ورنہ ہندوستان کا ہر کونہ معدنیات سے بھرا پڑا ہے۔ تعجب ہے کہ ایسا زرخیز ملک بھوکوں مر رہا ہے +

اگلی سی تازگی ہے پھولوں میں اور پھلوں میں　　کرتے ہیں رقص اب تک طاؤس جنگلوں میں
اب تک وہی کڑک ہے بجلی کی بادلوں میں　　پستی سی آگئی ہے پر دل کے ولولوں میں

گل شمع انجمن ہے۔ گو انجمن وہی ہے
حب وطن نہیں ہے۔ خاک وطن وہی ہے

ترانۂ فصلِ بہار

کہسار کو سحر کا پیغام مل رہا ہے
ہر پھول کھل رہا ہے ہر غنچہ کھل رہا ہے

اُتری ہیں نرم کرنیں کلیوں کو گدگدانے
چشموں میں جاگ اُٹھے سوئے ہوئے ترانے

تاریک گھاٹیوں میں تنویر بٹ رہی ہے
جلوؤں کی پاک دیوی آنچل اُلٹ رہی ہے

مژدہ سحر کا پا کر سر سے اُتار ڈالے
پیڑوں نے تیرگی کے اوڑھے ہوئے دوشالے

گلزار وادیوں کے مکھڑے نکھر رہے ہیں
دھندلی ترائیوں میں جلوے بکھر رہے ہیں

بربط اُٹھا لئے ہیں شاخوں نے گنگنا کر
نظریں اُٹھا رہے ہیں ذرّات مسکرا کر

کس درجہ دلربا ہے یہ خنکیوں کی بستی
پستی میں نازِ رفعت۔ رفعت میں عجزِ پستی

سردی سے کپکپاتا سورج نکل رہا ہے
ٹھنڈی پہاڑیوں پر سونا پگھل رہا ہے

کرنوں کے تاج پہنے جھونکے جو آ رہے ہیں
بھیگے ہوئے مناظر دامن سکھا رہے ہیں

جہلم مری نظر کے دامن میں بہ رہا ہے
سنگین پیچ و خم کا افسانہ کہہ رہا ہے

جنبش میں آ رہی ہیں امواج کی زبانیں
غلطاں ہیں جن میں لاکھوں سیال داستانیں

محفل میں پتھروں کی لہرا رہا ہے پانی
چشموں میں بہ رہی ہے کہسار کی جوانی

آباد ہے نظر میں فردوسِ خندہ ساماں
دوشیزگی کی گلیاں پاکیزگی کے ایواں

چشمے اُتر اُتر کر دریا میں آ رہے ہیں
گا گا کے مل رہے ہیں مل مل کے گا رہے ہیں

دل بے نیازیوں سے مانوس ہو رہا ہے
میں مر چکا ہوں ایسا محسوس ہو رہا ہے

کشمیر میں تیل کے چشمے

دُنیا میں سب سے بلند اور بوڑھے ہمالہ کو میں نمسکار کرتا ہوں۔ جو کہ بھارت کے پراچین رشی مُنیوں کا مسکن رہا ہے۔ اور کہ جس کے پیٹ میں نہ ختم ہونے والی دولت کے خزانے محفوظ ہیں جس کی پُر فضا وادیاں بہشتی نظاروں سے معمور ہیں۔ اسی پہاڑ کی کانوں میں نیلم کی ایک کان علاقہ "پاڈر" میں ...... پائی گئی ہے۔ جسکے نکالنے کا انتظام دربار کشمیر نے کیا ہوا ہے۔ اور آج میں اُسی "ہمالیہ" میں ناظرین کو مٹی کے تیل کے چشموں کا حال سُناتا ہوں:۔

سرینگر کے گرد و نواح میں ایک مشہور قصبہ اننت ناگ ہے۔ اس قصبہ کے اوپر کی طرف ایک مقام "سپتیاں" ہے اور اسکے نزدیک ہی ایک نہائت خوبصورت "واٹر فال" ہے۔ یعنی پہاڑ کی بلندی سے ایک برفانی دریا کی چادر نیچے میں گرتی ہے۔ گویا کہ آسمان سے چاندی برس رہی ہے۔ سرسبز پہاڑوں میں "یہ فال" نہائت خوبصورت معلوم دیتا ہے۔ اور روح خوشی سے رقص کرنے لگتی ہے۔ اِسی "واٹر فال" کے قریب ہی پیٹرول کی ایک عظیم الشان کان ہے لیکن اس کان سے آجتک کسی نے فائدہ نہیں اُٹھایا۔ اگر کشمیری ایک اعلیٰ پیمانہ کی لمیٹڈ کمپنی بنا کر اس کان سے پیٹرول حاصل کرنے لگیں۔ تو آج ہزاروں بیکار نوجوان کام پہ لگ سکتے ہیں۔ اور جہاں سال مُلک کے اندر کروڑوں روپیہ آسکتا ہے۔ وہاں ہر سال لاکھوں روپیہ بچ سکتا ہے۔ جو کہ غیر مُلکی پیٹرول پر خرچ ہوتا ہے۔ قصبہ اننت ناگ کے علاوہ پہلگام علاقہ سری پرتاپ سنگھ پورہ علاقہ ہاروں۔ علاقہ کامراج میں بھی تیل کی کانیں پائی جاتی ہیں۔ اگر ان کی طرف توجہ دی جائے۔ تو مُلک مالا مال ہوسکتا ہے۔ مگر آج تک کوئی خاص توجہ اسطرف نہیں دیگئی ہے جس کا نتیجہ مُلک کے اندر بیکاری بے روزگاری اور افلاس و غربت ہے۔ مٹی کے تیل کے چشموں سے ایک تو مٹی کا تیل نکلتا ہے۔ جو کہ چراغوں میں جلانے کے کام آتا ہے۔ اور سامان کی صفائی وغیرہ میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے۔ اور مشینوں میں بھی استعمال کیا جاسکتا ہے + دوم۔ ان ہی چشموں سے "پیٹرول" بھی حاصل ہوتا ہے جس سے موٹر اور بڑے بڑے انجن چلائے جاتے ہیں سوم۔ انہی چشموں سے ویسلین سافٹ اور ہارڈ پیرافین بھی ملتی ہے۔ جس سے موم بتیاں بنتی ہیں"۔ لیکوئیڈ پیرافین" بھی انہی چشموں سے برآمد ہوتی ہے۔ جو دوائیوں میں کام آتی ہے۔ مٹی کے تیل سے "وائٹ آئل" بھی تیار ہوتا ہے اور پھر انہی چیزوں سے کیمیائی عمل سے "سنو کریم" اور سینکڑوں قسم کی صنعت و حرفت کے کام جاری ہوسکتے ہیں +

نہ اب تادیب میں شفقت نہ شوخی میں ادب باقی
بزرگوں کی روش بگڑی۔ عزیزوں کا چلن بگڑا

تجارت

تجارت کی ترقی کامرانی کی نشانی ہے ۔ کہ وابستہ تجارت سے نشاطِ جاودانی ہے
تجارت کیا ہے ۔ اک زینہ عروج و کامیابی کا ۔ تجارت جلوہ بخش اہتمامِ شادمانی ہے
تجارت مردہ قوموں کو زمانہ میں جگاتی ہے ۔ تجارت بگڑی تقدیریں سرے سے بناتی ہے
تجارت رہنمائے محرمِ راز بلندی ہے ۔ کہ چاہِ پستی و قعرِ مذلت سے اٹھاتی ہے
تجارت کی اگر ہندوستاں تصویر ہو جائے ۔ تو اس کی خاک بھی دنیا میں اک اکسیر ہو جائے
ہو ہر اک دل میں عکس افگن اگر جلوہ تجارت کا ۔ جوانوں کی جوانی اور عصا پیر ہو جائے
تجارت خار کو گل خاک کو سونا بناتی ہے ۔ کہ گوہر کوڑیوں کے مول دنیا میں لٹاتی ہے

طبی نمبر

اس رسالہ کے بعد ماہ فروری کا رسالہ "طبی نمبر" بے حد قیمتی مضامین سے لبریز
آپ کی سیوا میں آج سے تیس دن بعد حاضر ہو گا ۔ (مینیجر)

اوم

رسالہ
مستانہ جوگی
لاہور

جلد ۲۹	ماہ جون سنہ ۱۹۴۱ع	نمبر ۶

گیان ترازو ہاتھ میں لیکر تول سکے تو تول

نئی زندگی اور جوانی بخشنے والے
نہایت قیمتی خیالات

تمام غیر طبعی حالتیں زندگی کے عمل کو روکتی ہیں۔ زندگی سدا نئی بننا چاہتی ہے۔ اس لئے کچھ مدت کے بعد جسم کے کل اعضاء از سر نو تیار ہوتے ہیں۔ جسم کی پرانی ہڈیاں خارج ہو کر انکی بجائے نئی پیدا ہو جاتی ہیں۔ تمام طبعی اور قدرتی حالتیں زندگی کے اس عمل کی معاون ہوتی ہیں۔ اور تمام غیر قدرتی حالتیں اس عمل میں خلل انداز ہو کر زندگی کو روکتی اور بڑھاپا کو پیدا کرتی ہیں۔ زندگی کا اصول لگاتار ترقی ہے۔ اسلئے وہی حالتیں غیر طبعی کہی جاسکیں گی جو ہماری جسمانی یا ذہنی ترقی کو روک دیں۔ ترقی رکنے پر ہی بڑھاپا آتا ہے۔ کمزوری اور بیماری ترقی کی علامات نہیں۔ بلکہ تنزل کے آثار ہیں۔ اسلئے ان حالتوں سے ہمیشہ بچنا چاہیئے۔ جو ترقی کو روک کرتا ہی۔ کمزوری اور بیماری لاتی ہیں۔ اس قسم کی بڑی بڑی حالتوں کا ہم ذیل میں ذکر کرنیکے ساتھ ساتھ ہی ان کا علاج بھی بتلاتے ہیں:-

مرجھائی ہوئی حالت۔ بہت سے لوگ سدا مرجھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ حالت زندگی کے حق میں بہت مضر ہے۔ مرجھاوٹ سے تمام ذہنی اعمال سست پڑ جاتے ہیں۔ خون کی گردش دھیمی ہو جاتی ہے۔ زندگی کی طاقت گھٹ جاتی ہے [illegible] اور سوکھنے

لگتے ہیں۔ اور ان میں سستی پیدا ہو کر بڑھاپے کی علامات ظاہر ہونے لگتی ہیں۔ یعنی بھقیلیوں میں پتھراؤ کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ اس حالت کا علاج یہ ہے کہ انسان روح کی اعلیٰ منازل میں زندگی بسر کرے۔ جب آدمی ایسی اعلیٰ زندگی بسر کرتا ہے۔ تو اپنے اندر بے حد طاقت محسوس کرتا ہے۔ اسے سب کچھ ممکن معلوم ہوتا ہے۔ اسکی ذہنی صفات سے ناممکن کا لفظ اُڑ جاتا ہے۔ مرجھاوٹ کی حالت اُسوقت طاری ہوتی ہے جب انسان اپنے آپ کو ہیچ۔ محدود۔ کمزور۔ بے بس اور لاچار خیال کرتا ہے۔ لیکن جب وہ یہ جان لیتا ہے۔ کہ میری ممکنات کی حد نہیں۔ میری مخفی طاقتوں کی کوئی انتہا نہیں تو اس کی کل مرجھاوٹ۔ کھچاوٹ اور خوف دور ہو کر کامل طور پر نجات ذہنی حاصل ہوتی ہے۔ اور ہر سو دروازے کھلے نظر آتے ہیں ۔

سنجیدہ حالت :- کئی لوگ جان بوجھ کر ہی سنجیدہ حالت میں رہنا چاہتے ہیں۔ انکے لئے مسکرانا حرام ہے قہقہہ تو انہیں کبھی نصیب ہی نہیں ہوتا۔ کئی آدمی سنجیدگی کو دلیل روحانیت خیال کرتے ہیں۔ مگر یہ جسم و ذہن دونوں پر برا اثر ڈالتی ہے۔ جسمانی اعمال میں خلل آ جاتا ہے۔ بھقیلیوں میں سڑاند پیدا ہو جاتی ہے۔ جسم مواد فاسد سے بھر جاتا ہے۔ اور جب یہ مواد فاضلہ خارج نہیں ہوتے۔ تو پتھرا کر بڑھاپا پیدا کرتے ہیں۔ کہ سنجیدہ لوگوں کی جلد سخت اور چہرے پر جھریاں ہوتی ہیں اس مرض کا علاج یہ ہے کہ انسان اس راز کو ذہن نشین کرے۔ کہ زندگی سرور ہے اور سرور زندگی ہے۔ سرور اور آب حیات ہی کل اجسام میں شکل پذیر ہو کر جلوہ نما ہے۔ جو شخص زندگی کو سرور نہیں سمجھتا۔ وہ اگیانی ہے۔ جو خود مغموم رہتا ہے۔ وہ ناستک ہے۔ جو خود مغموم ہے۔ وہ دنیا میں کسی کی بہتری نہیں کر سکتا۔ جو خود خوش ہے۔ وہی دوسروں کو خوشی دے سکتا ہے۔ مغموم حالت میں لاکھوں اپدیش کرنیکی نسبت روحانی خوشی کی ایک مسکراہٹ زیادہ مفید ہے۔ پس اپنے آپ کو سنجیدہ بنائے رکھنا اصول زندگی کے خلاف ہے۔ اپنی ہستی کو ہی سرور کا چشمہ جاننا چاہئے۔ مسرور ہونا ہی خوشی ہے ۔

بالائی و سطحی حالت ۔ زندگی کے چشمے اندر ہیں۔ مگر ہم مواد باہر سے جذب کرتے ہیں۔ لیکن قوت حیات کے دفینے باطن میں ہیں۔ جو شخص صرف اوپر کی اوچھی زندگی بسر کرتا ہے۔ وہ طاقت کے اصلی چشموں سے واصل نہیں ہوتا۔ کام کرنے سے جونہی اسکی محدود سی طاقت صرف ہو جاتی ہے۔ وہ تھک کر چور ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے وجود کی گہرائی میں جا کر نئی اور تازہ طاقت نہیں پا سکتا۔ تھوڑے سے کام اور محنت سے اسکی پونجی ختم ہو جاتی ہے۔ اس کا جسم طاقت سے کبھی بھر پور نہیں ہوتا۔ بلکہ اس میں طاقت کی تنگی رہتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ جسم میں ضعف بیماری اور بڑھاپے کی حالتیں نمودار ہونے لگتی ہیں ۔ اس خرابی کا علاج سوائے اسکے اور کچھ نہیں۔ کہ ہم اپنی ہستی کی گہرائی میں غوطہ زن ہونا سیکھیں۔ جسم لطیف کو جسم علتی پر اثر ڈالنے کی تربیت دیں۔ یعنی بالائی ذہن کے ذریعہ اندرونی ذہن کو متاثر کرنا سیکھیں۔ کیونکہ ہم اپنے بالائی یا مدرک ذہن سے جو اثر اندرونی ذہن پر ڈالتے ہیں۔ وہی بیرونی زندگی میں واقعی طور پر نمایاں ہوتے ہیں ۔

سے تمام افعال جسمانی میں گڑبڑ پیدا ہو جاتی ہے۔ طاقت جھٹ پٹ اُچھل کر منتشر ہو جاتی ہے۔ اسی طرح طاقت گھٹنے سے لازمی طور پر بڑھاپا آموجود ہوتا ہے ٭ اسکی دوا یہ ہے کہ آدمی سہج او سبھاکی حالت میں رہنے کی عادت ڈالے۔ اپنے اندر ایک ہی وقت میں شانتی اور شکتی کو محسوس کرے۔ جوش اور جذبے سے پیالہ زندگی کو چھلکنے نہ دے۔ بیرونی تبدیلیوں کے درمیان اچل رہے۔ اپنے مرکز میں آسن جمانا سیکھے ٭

خوف سے بڑھ کر انسان کا کوئی بیری نہیں۔ اسکے طاری ہوتے ہی انسانی وجود مثبت حالت سے منفی حالت میں بدل جاتا ہے۔ جو قوائے جسم کو بنانے اور ذہن کو ترقی دینے میں مصروف تھے ....

.... اُن کا رُخ اُلٹ کر جسم و ذہن کی تباہی شروع ہو جاتی ہے۔ خوف میں اپنا آپ بڑا کمزور معلوم ہوتا ہے ایزدی حضوری محسوس کرنا ہی اس کی دوا ہے۔ اسی حضوری کا سبق سکھلانے کے لئے ہی دنیا میں خوف کا وجود ہے جب آدمی اپنے آپ کو آفتاب ذات کی غیر جسمانی۔ نورانی اور غیر فانی کرن جانتا ہے۔ پھر اُسے کسی چیز کا خوف نہیں رہتا۔ وہ جانتا ہے .... کہ جس طرح سازوں کے جلنے سے راگ ودیا کا ناش نہیں ہوتا۔ اسی طرح برہمانڈوں کے نِشٹ ہو جانے سے میری ذات جوں کی توں اپنے آپ میں قائم و مسرور رہتی ہے ؎

اُٹھت سکھیا بیٹھت سکھیا بھے نہیں لاگے جاں ایسے بجھیا
راکھا ایک ہمارا سوامی سکل گھٹاں کل انتریامی
سوئے اچنتا جاگ اچنتا جہاں تہاں پربھ توہے ورتنا
گھر سکھ وسیا باہر سکھ پایا کہو نانک گور منتر دوڑ بایا

جب مجھے یہ راز معلوم ہو گیا۔ تو خوف نہیں ہو سکتا۔ اب اُٹھتا ہوا اور بیٹھتا ہوا سدا اُسکھی اور خوش ہوں۔ وہی ایک مالک میرا محافظ جان ہے جو تمام دلوں کا مالک اور چلانے والا ہے۔ اب یہاں نشچنت ہو کر بیٹھتا اور جاگتا ہوں۔ کیونکہ اے مالک تو ہر جا موجود ہے۔ نانک کہتا ہے کہ گھر میں سکھ ہے۔ اور گھر سے باہر نکل کر سدا سکھ ہے۔ مجھے ہادی نے ایسا راز بتلایا ہے

غصہ۔ غصے میں آدمی دشمن کو مارنے سے پہلے آپ کو مار بیٹھتا ہے۔ غصے سے نظام اعصابی کی تمام تھیلیاں تباہ ہو جاتی ہیں۔ ریشے چھن بھن ہو جاتے ہیں۔ طاقت اُچھل کر بہہ جاتی ہے۔ زندگی کا بھرا پیالہ خالی ہو جاتا ہے۔ سارے رنگ جھلس جاتے ہیں۔ خون میں زہریلے اجزا پیدا ہو جاتے ہیں۔ تھیلیوں کی تباہی سے جسم مواد فاسدہ سے بھر جاتا ہے۔ اور ایسے مُردہ مواد کا اکٹھا ہونا بڑھاپے کی تشریف آوری کا موجب بنتا ہے ٭ جوں جوں انسان اس سچائی کو جانتا اور محسوس کرتا ہے۔ کہ جملہ حالات اور اشیاء میری بھلائی کے لئے کام کر رہی ہیں۔ ہر شے کی انتر آتما کو میری بہبودی مقصود ہے۔ تو پھر اُسے کسی پر غصہ نہیں آتا۔ جب انسان کو سروآتم درشٹی نصیب ہوتی ہے۔ تو ہر طرف اپنا آپ ہی نظر آتا ہے۔ غیریت جاتی رہتی ہے۔ [illegible]

پر چونچیں توڑتے ہوئے کئی دن تک دیکھا گیا۔ اُن کو وہم ہو گیا تھا۔ کہ کمرے میں اُن کے سوائے ایک اور جوڑہ موجود ہے
اِس وہم باطل میں وُہ اپنے ساتھ جنگ کر کے اپنی چونچیں توڑتے رہے۔ یہی حال اِنسان کا ہے۔ جب تک اُسے غیر نظر آتا ہے
وُہ مخالفت۔ مجادلے اور مباولے اور مقابلے پر مُستعد رہتا ہے۔ اور حیوانی زندگی بسر کرتا ہے۔ لیکن جب وُہ اِس راز کی طرف
بیدار ہوتا ہے۔ کہ دُوسرا ہے ہی نہیں۔ تو سب جھگڑے جھمیلے فیصل ہو کر دل میں عالمگیر محبت کی رَوئیں چلنے لگتی ہیں ٭

کھجاوٹ۔ یہ بدترین حالت بالکل غیر طبعی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر بڑھاپا پیدا کرنے والی حالت ہے۔
کھجاوٹ سے جسم میں چونے کے مرکبات بہت پیدا ہوتے ہیں۔ اور اُن کی پیدائش اُسوقت تک رُک نہیں سکتی جبتک اِنسان کھچا
رہتا ہے۔ کھچنے سے ریڑھ کی ہڈی سخت اور بے لچک اور دیگر ہڈیاں کڑکیلی اور ریشے خشک ہو جاتے ہیں۔ ہتھیلیاں پتھرا
جاتی ہیں۔ اور چہرے پر جھُریاں نمودار ہوتی ہیں۔ کھجاوٹ اِنسان کو بہت جلد بدصورت بنا دیتی ہے جس کا علاج وشواس
ہے۔ اگر انسان کو اِیشور پر اپنے آپ پر۔ اور دیگر تمام چیزوں پر اعتماد ہو۔ تو کھجاوٹ نزدیک نہیں آتی۔ وشواس سے ہی سار
کھجاوٹ بیدا ہو جاتی ہے ٭

خُود غرضی۔ اِس سے زندگی سُکڑتی اور خیالات تنگ ہوتے ہیں۔ جسم کی ہتھیلیاں سُکڑتی سخت ہوتی اور پتھرا
ہیں۔ اِنسان کا دِل تنگ اور چال چلن ادنےٰ ہو جاتا ہے۔ زندگی کا قُدرتی رُخ پھیلاؤ کی طرف ہے۔ اِسلئے خود غرضی کیجائی
زندگی کے عمل میں رُکاوٹ ڈال کر بڑھاپے کا موجب ہوتی ہے۔ اور اِنسان کو جلدی تباہ کر دیتی ہے ٭ خود غرضی کا سبب یہ
کہ اِنسان جہالت میں پھنس کر اپنے آپ کو اور اپنی بہبودی کو دُوسروں سے الگ تھلگ خیال کرتا ہے۔ جب اُسکی یہ حالت دُور ہو
کہ باطن میں نُورِ عرفان چمکنے لگتا ہے۔ تو پھر ہستی کا وہم دُور ہو جاتا ہے۔ پھر وُہی جذبۂ خود غرضی عالمگیر محبت میں بدل جاتا
ہے۔ زندگی مرکز کی طرف نہیں سُکڑتی۔ بلکہ محیط کی طرف پھیلتی اور دمبدم حدُود کو توڑتی ہے۔ لوگ عمُوماً جسمانی حالات کا خیال
کر کے جسمانی تدابیر عمل میں لایا کرتے ہیں۔ لیکن کامیابی کے لئے ضروری ہے۔ کہ جسمانی قوانین کے ساتھ ذہنی اور رُوحانی خواہش کو بھی
مدنظر رکھا جائے۔ اِنسان نِرا جسم نہیں۔ اور اِس لئے صرف جسم پر ہی غور دینے سے کامیاب نہیں ہو سکتا۔ پس تدابیر جسمانی کے
ساتھ ساتھ مذکورہ بالا غیر طبعی ذہنی حالتوں سے بھی بچنا لازمی ہے۔ خیال سے جسم ہے۔ جسم سے خیال نہیں۔ اِسلئے خیال و ذہنی
حالات کی طرف جس قدر توجہ دی جائے تھوڑی ہے ٭

تصوّر۔ مَیں نے آہنی سلاخوں سے باہر دیکھا۔ رات سادہ تھی۔ مگر مُہیب۔ میرے تصور میں تُم تھے۔ اچانک آسمان
سے ایک ستارہ ٹوٹا۔ اُسکی سُرخ اور سُنہری چمک سے آسمان روشن ہو گیا۔ اور ایک لمحہ کے بعد یہ چمک رات کی بے پایان تاریکی میں
گم ہو کر رہ گئی + آہ! میری دُنیا تباہ ہو گئی۔ راکھ ہو گئی۔ میں نے آہنی سلاخوں سے باہر دیکھا۔ میرے تصور میں تُم ہی تھے۔ آخر یہ
آہنی سلاخیں کیوں؟ تم کیوں اور میں کیوں؟ آخر یہ دِن رات۔ یہ ماہ و سال کیوں؟ جبکہ ایک دُنیا ایک ہی چمک کے بعد تباہ
ہو جاتی ہے جیسے راکھ ہو جاتی ہے

اپدیشک سے سوال

اُپدیش تو کرنا سیکھا ہے من صاف بھی کرنا سیکھا ہے
لوگوں کو ڈرائے ایشور سے کیا آپ بھی ڈرنا سیکھا ہے
گفتار تو تیری میٹھی ہے کردار کی بات خدا جانے
خلقت کو سنوائے وعظوں سے کیا خود بھی سنورنا سیکھا ہے
تو گیان ہی گیان سُناتا ہے یا دھیان بھی کبھی یا ہر لگا ہے
جس دیش کا کھانا کھاتا ہے اُس دیش پہ مرنا سیکھا ہے
تقریر تو تیری ایسی ہے لاکھوں کو مست بنا ڈالے
کیا منہ سے باتیں کرتا ہے کچھ ہاتھ سے کرنا سیکھا ہے
کمزور کو دنیا نہ مانے شہزور کو دنیا سب جانے
وہ بازی جیت لیجاتا ہے جس جس نے ابھرنا سیکھا ہے

پوجاری

پوجا کی تھالی سامنے رکھی تھی۔ ایک طرف مہاتما بدھ کا پرعظمت بُت اطمینان وسکون کا مجسمہ بنا کھڑا تھا۔ اور دوسری طرف کرشن بھگوان کی مورتی گائے کا سہارا لئے ہوئے بنسری بجا رہی تھی۔ سامنے مہادیو جی کے پتھر رکھے ہوئے تھے۔ اور پوجا کی تھالی کے پاس پجاری بیٹھا وید کا ایک قدیم اشلوک پڑھ رہا تھا جس میں ترک نفس اور روح کی بلندی کی تعلیم دی گئی تھی۔

پجاری پڑھ تو رہا تھا لیکن آج اسکی روح اِن اشلوکوں سے بیزار سی ہو رہی تھی۔ خیالات اسقدر پراگندہ تھے۔ کہ وہ بار بار ایک ہی اشلوک کو پڑھتا اور بھول جاتا۔ وہ چاہتا تھا۔ کہ اسکے خیالات اور وہ خود دونو اشلوک کی لطافت اور پاکیزگی میں گم ہو جائیں لیکن ایسا ہو نہیں رہا تھا۔ پچھلے دس برس میں آج پہلا دن تھا۔ کہ اس کی پوجا میں اسکے خیالات خارج ہو رہے تھے۔ آجتک کبھی ایسا نہ ہوا تھا۔ کہ کوئی دنیاوی خیال اس کی پوجا کی محویت کو کم کر سکا ہو۔ لیکن آج خبر نہیں کیوں۔ وہ اپنے کو بھگتی اور پوجا میں محو نہ کر سکا پر نہ کر سکا۔ اُس نے سینکڑوں مرتبہ ہرنوں اور دوسرے جنگلی جانوروں کو اپنے سامنے سے گزرتے دیکھا تھا۔ لیکن آج جب وہ پوجا کے لئے آ رہا تھا۔ تو ایک چھوٹے سے واقعہ نے ایک غیر اہم نظارے نے اسکے صبر وسکون کے دس سالہ مندر کو گرا کر رکھدیا۔ یہ نظارہ وہ روزانہ دیکھا کرتا تھا۔ لیکن آج نہیں معلوم آج اسکے اندر کون سی سوئی ہوئی چیز جاگ اُٹھی تھی۔ جس نے اسکے خیالات کی دنیا کو ہلا ڈالا تھا۔ اسکے بھگتی کے مندر پر حملہ کر دیا تھا۔ ہرن کا ایک حسین جوڑا تالاب کے کنارے پانی پی رہا تھا اور وہ ان کو دیکھ رہا تھا پھر وہ تالاب کے کنارے ایک گھنے درخت کے

کے نیچے بیٹھ گئی۔ نر آیا۔ اور اُس نے اپنے بڑے بڑے سینگوں والے سر کو اُوپر اُٹھا کر سیاہ آنکھوں سے دُور دُور کی جھاڑیوں کا جائزہ لیا۔ اور خطرہ سے مطمئن ہو کر مادہ کی گردن پر گردن رکھ کر سو گیا + پجاری نے یہ نظارہ دیکھا۔ اور اُس کے دماغ میں کوئی چیز چلتی پھرتی سی محسوس ہونے لگی۔ وُہ پوجا کی تھالی کے لئے ہکا بکا کھڑا رہ گیا جیسے کسی نے اُسکے دماغ کو اب سے دس سال پیچھے کی طرف گھما دیا ہو .... اور پچھلی یاد یکدم تازہ ہو گئی ہو +

عُقاب

بُوڑھا عُقاب ایک مرمریں گُنبد پر آکر ٹھہرا۔ اِس اُونچے گنبد والی عورت کے زیر سایہ اِنسانی جسموں کے بہت سے ڈھانچے پڑے تھے۔ اور بہت سے جاندار مُردہ گوشت کے لوتھڑے بنے زخموں سے سڑ اور گل رہے تھے + بڑا تعفّن تھا۔ گرمی بھی خُوب تھی + بُوڑھا عُقاب اپنے سر کو پروں میں ڈھانپ کر بیٹھ گیا۔ اور زندگی کے کسی مسئلے پر غور کرنے لگا۔ ہڈیوں کی کرکراہٹ کی آواز آئی۔ جیسے کوئی مُردہ قبر سے نکل آیا ہو۔ یا بُہت سے کُتّے کسی ہڈّی کو چبا رہے ہوں ..... کیسی بھیانک آواز تھی؟ ...... عُقاب بازو پھڑپھڑا کر ہوشیار ہو گیا + سامنے سے کوئی آرہا تھا۔ یہ انسانی ڈھانچے کی کرکراہٹ تھی۔ چلنے میں اُسکے ہاتھ پاؤں کے جوڑ چٹ چٹ بول رہے تھے جیسے کوئی سُوکھے ہُوئے پیڑ کی ٹہنیاں توڑ رہا ہو + ... یہ لاتعداد اور بھُوکوں کی فوج کا ایک ادنےٰ سپاہی تھا۔ جو سینما کے دروازہ سے ابھی ابھی اپنی ڈیوٹی انجام دیکر آرہا تھا۔ اِسی طرح خالی ہاتھ اور خالی پیٹ + اُس کا جسم زندگی کا ایک مُستقل پنجرا ہو کر رہ گیا تھا جس سے نکلنے کے لئے رُوح سر ٹپک رہی ہو + اب ...... ایک اور زور کا چٹاخہ ہُوا۔ عُقاب پھر چونک پڑا یہ ایک دُوسرے بھکاری کی ریڑھ کی ہڈّی کا چٹاخا تھا۔ کھوں کھوں کھوں۔ اسکے سڑے ہُوئے پھیپھڑے اُسے دِق کر رہے تھے + عُقاب نے اپنی آنکھوں کو دو تین مرتبہ پھرایا۔ اُنکی روشنی اور تیز ہو گئی۔ اب وُہ دو جلتے ہوئے انگاروں کی طرح چمک رہی تھیں + اُس کی نگاہیں دُور کہیں جمی ہُوئی تھیں + عُقاب سے اُس یتیم بچّے کی جانکنی کی حالت نہ دیکھی گئی۔ جسکی غریب ماں سرہانے بیٹھی ٹھنڈے پانی میں ... اپنے گرم گرم آنسوؤں کو ملا کر اسکے ہونٹوں کو تر کر رہی تھی + بُوڑھے عُقاب کی آنکھوں سے دو بُوندیں ڈھلک آئیں۔ دو جلتے ہُوئے آنسوؤں کی بُوندیں + گُنبد کے اندر چند آوازیں گُونجیں "تو بڑا رحیم ہے۔ تو بڑا رزاق ہے" حمد و ثنا کی ان آوازوں میں دبی ہوئی ایک ننھی سی آواز یہ بھی آئی "امّاں لوٹی یعنی روٹی" ...... بُوڑھا عُقاب بے اختیار ہنس پڑا۔ "ٹھ۔ ٹھ۔ ٹھ" ...... اور پھر پھڑپھڑاتا ہُوا اُڑ گیا .... +

خدا کو بھولنے والے خدا کہلائے جاتے ہیں

زبانِ ہوش پر کب رازِ دل کے لائے جاتے ہیں
یہ نغمے صرف سازِ بیخودی میں گائے جاتے ہیں

دلِ برباد میں جلوے کسی کے پائے جاتے ہیں
یہ ذرّے خود چمک سکتے نہیں چمکائے جاتے ہیں

نگاہوں پر کرم بھی اِس طرح فرمائے جاتے ہیں
فریبِ حُسن میں اہلِ نظر بھی آئے جاتے ہیں

نشاں ہر دور میں خونِ وفا کے پائے جاتے ہیں
یہ افسانے ہزاروں رنگ سے دوہرائے جاتے ہیں

مری آنکھوں میں کچھ آثار شاید پائے جاتے ہیں
سرِ محفل وُہ سب کے سامنے گھبرائے جاتے ہیں

چلے بھی آؤ اب رعنائی صبحِ چمن بن کر
مرے سینے میں جتنے پھول تھے مرجھائے جاتے ہیں

کنول اِس نیلگوں تالاب کے روشن بھی لرزاں بھی
یہیں تک ان میں کچھ اندازِ دل کے پائے جاتے ہیں

جو اپنی لغزشوں کو ناز کے قابل سمجھتے تھے
تری شانِ کرم کو دیکھ کر شرمائے جاتے ہیں

نہ جانے کون سا جادو ہے دُنیائے تصوّر میں
بڑی مشکل سے اپنے آپ میں ہم لائے جاتے ہیں

محبّت کی نظر انجام سے ہٹنے نہیں پاتی
مری خوشبو میں کچھ اجزائے غم بھی پائے جاتے ہیں

وجودِ عشق فانی ادعائے عشق بھی فانی
وہی وُہ محفلِ کون و مکاں پر چھائے جاتے ہیں

صدائیں پردۂ منزل سے یہ آنے لگیں کیسی؟
دھڑکتا جا رہا ہے دل قدم تھرّائے جاتے ہیں

اِدھر دم توڑتی جاتی ہے لو شمعِ تمنّا کی
اُدھر نظروں پہ کچھ تاریک بادل چھائے جاتے ہیں

وُہ جگہ عشق تھی دامن نے پیدا کی وہاں اپنی
جہاں سر اہلِ تخت و تاج کے ٹھکرائے جاتے ہیں

محبّت سادگی کو چھوڑ بیٹھے یہ نہیں ممکن
کسی اُمید پر آخر یہ دھوکے کھائے جاتے ہیں

کہاں تک حُسن بے پروا بچے گا عشق کی زد سے
اُنہیں دیکھا ہے تڑپاتے ہیں جو تڑپائے جاتے ہیں

بدلتا ہے زمانہ کروٹیں منشائے فطرت سے
اسی پردے میں رازِ زندگی سمجھائے جاتے ہیں

خلوصِ دوستی کیا؟ اِنتہائے دردمندی کیا؟
بہت دھوکے ہیں ایسے جان کر جو کھائے جاتے ہیں

خزاں کے کانپتے ہونٹوں پہ کل یہ داستاں ہوگی
چمن پھولوں میں کس کے واسطے تلوائے جاتے ہیں

نظامِ بندگی میں انقلاب ایسا نہ آیا تھا
خدا کو بھولنے والے خدا کہلائے جاتے ہیں

محبّت کی سیاست کوئی سمجھے۔ کون پہچانے
سکوں کے نام سے اربابِ دل تڑپائے جاتے ہیں

ادیب اِس سے انوکھی شعر کی تعریف کیا ہوگی
محبّت کی زباں سے پھول کچھ برسائے جاتے ہیں

جنّت کا مُسافِر

ہر سہ پہر کو لڑکے اسکول سے واپس آتے ہوئے "جن" کے باغ میں داخل ہوتے اور کھیلا کرتے۔ یہ ایک وسیع اور خوشنما باغ تھا۔ اِدھر اُدھر ہری ہری گھاس پر سفید پھول ستاروں کی مانند چمک رہے تھے۔ موسم بہار میں درخت سُرخ و سفید پھولوں سے لد جاتے اور خزاں میں پھلوں سے اُن کی شاخیں جھک جاتیں۔ پرندے اُنکی شاخوں پر بیٹھ کر اپنی میٹھی آوازیں ترانے گاتے۔ کہ لڑکے تھوڑی دیر کے لئے اپنے کھیلوں کو بھول کر چلا اُٹھتے۔ "ہم یہاں کس قدر خوش ہیں" +

ایک دن "جن" واپس آ گیا۔ وہ اپنے دوست "کارنش" کو ملنے گیا ہوا تھا۔ جہاں اسے صرف سات برس گذر گئے تھے۔ پھر ایک دن اُسے اپنے باغ کا خیال آیا۔ اور اُس نے اپنے قلعہ میں واپس آنے کا ارادہ کر لیا۔ لیکن جب وہاں پہونچا۔ تو دیکھا۔ کہ لڑکے باغ میں کھیل رہے ہیں +

"تم سب یہاں کیا کر رہے ہو"؟ اُس نے کرخت آواز میں پوچھا + سب لڑکے بھاگ گئے +

"میرا باغ صرف میرے لئے ہے" وہ بولا۔ اور اسے ہر شخص سمجھتا ہے۔ آئندہ سے یہاں اور کوئی نہ آنے پائے گا +

پھر اُس نے باغ کے چاروں طرف ایک بلند چہار دیواری کھینچ دی۔ اور ایک چوڑی تختی پر حروف جلی میں یہ عبارت لکھ دی۔ "اندر آنا منع ہے" + وہ ایک اِنتہائی خود غرض جن تھا +

اب لڑکوں کے کھیلنے کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ اُنہوں نے سڑک پر کھیلنا چاہا۔ مگر سڑک پر گرد و غبار بہت تھا۔ چاروں طرف پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ اور وہ ایسی جگہ کھیلنا پسند نہیں کرتے تھے جب اُنہیں اسکول سے چھٹی ہوتی۔ تو باغ کی چار دیواری کے گرد چکر لگایا کرتے۔ اور باغ کی دلچسپیوں کا ذکر کرتے ہوئے حسرت سے کہتے "ہم وہاں کس قدر خوش تھے" +

بہار کا موسم شروع ہو گیا۔ چاروں طرف پھول ہی پھول تھے۔ اور چڑیوں کی چہکار سے مست۔ لیکن "جن" کے باغ میں ابھی موسم سرما ہی تھا۔ وہاں چڑیوں نے چہچہانا بند کر دیا تھا۔ اور پھول کھلنا بھول گئے تھے۔ ایک بار اتفاقاً ایک ننھا سا پھول کھلا۔ اور مسکرانے لگا۔ جونہی اُس کی نظر اس تختہ پر پڑی۔ تو اُس کو وہ لڑکے یاد آ گئے۔ اور وفورِ غم سے اُس کا سر جھک گیا۔ ہاں اگر کسی کو مسرت تھی۔ تو برف اور کہر کو + "موسم گل اس باغ کو بھول گیا ہے" وہ آپس میں کہتے "اور اب ہم مزے سے سال بھر یہاں عیش کرینگے" +

اگر برف نے ہری بھری گھاس کو سفید لباس میں ملبوس کر دیا تھا۔ تو کہر نے بھی باغ کے تمام درختوں پر روپہلی رنگ پھیر دیا تھا۔ اور دونو اپنے اپنے کام پر نازاں تھے۔ پھر اُنہوں نے جنوبی ہوا کو دعوت دی۔ کہ آئے اور اُن کے ساتھ باغ میں رہے۔ اور وہ آئی۔ وہ دن بھر باغ میں چکر لگاتی رہی۔ [illegible]

"مَیں اَولوں سے کہونگی۔ کہ مجھ سے ملنے آئیں" ٭

اَولے اپنی طوفانی رفتار کے ساتھ جنوبی ہَوا سے ملنے آگئے۔ روزانہ تین چار گھنٹے وُہ قلعہ کی چھت پر سیر کرتے یہانتک کہ قلعہ کی بہت سی خوبصورت بُرجیاں شکستہ ہوکر گِر پڑیں ٭ "سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ موسم گُل ابھی تک کیوں نہیں آیا"؟ خودغرض "جن" نے ایک دن بڑبڑاتے ہُوئے کہا جبکہ وُہ کھڑکی کھول کر باغ کی حالت دیکھ رہا تھا۔ "اُمید ہے وُہ جلد ہی آجائیگا" ٭ لیکن موسم بہار کبھی نہ آیا۔ اور نہ موسم گرما اور نہ موسم خزاں۔ اگرچہ خزاں نے ہر باغ کو ثمر ہائے رنگین نذر کِئے۔ مگر "جن" کے باغ کو اپنی نظرِ عنایت سے محروم رکھا ٭

وُہ انتہائی خودغرض جن ہے۔" موسم خزاں کا خیال تھا۔ اِس لئے ہمیشہ اسکے باغ میں جاڑے کا موسم تھا اور جنوبی ہوائیں تھیں۔ اولے تھے اور کہر تھا۔ یہ سب مِل کر اُسکے باغ کے درختوں پر چکّر لگایا کرتے ٭

ایک دن صُبح کو جب "جن" اپنے بستر پر پڑا جاگ رہا تھا۔ اُسکے کانوں میں ایک دلکش نغمہ کی آواز آئی۔ اُسے یہ نغمہ بہت بھلا معلوم ہُوا۔ اور اُس نے یہ خیال کیا۔ کہ یقیناً کوئی شاہی مغنّی ہے۔ جو باغ میں گا رہا ہے۔ لیکن دراصل یہ ایک چھوٹی سی چڑیا تھی۔ جو اپنی سُریلی آواز سے سارے باغ پر چھائی ہُوئی تھی۔ اور وجہ یہ تھی۔ کہ "جن" کے باغ میں ایک مُدت سے کسی طائر کا گذر نہ ہُوا تھا۔ اور نہ کسی پرندے کا کوئی گیت اُس کے کانوں تک پہونچا تھا۔ اِس لئے یہ نغمہ اُسے معمُول سے زیادہ مسحُور کُن معلوم ہُوا۔ پھر فوراً ہی عطر بیز ہَوا کا ایک لطیف جھونکا کھڑکی کی راہ سے "جن" کے کمرے میں داخل ہُوا۔ "آخر موسم گُل آہی گیا" "جن" نے خوش ہوکر کہا۔ اور باغ کی طرف دوڑا۔ لیکن اُس نے وہاں کیا دیکھا؟ اُس کے سامنے ایک عجیب منظر تھا۔ چہار دیواری کے ایک مختصر روزن سے لڑکے باغ میں داخل ہوگئے تھے۔ اور درختوں کی شاخوں پر جھول رہے تھے۔ جہانتک اسکی نظر پہونچ سکی۔ اُسے ہر درخت پر ایک بچہ نظر آیا۔ درختوں کو لڑکوں کے دوبارہ دیکھنے پر اتنی خوشی ہوگئی۔ کہ وُہ وفورِ جذبات سے سُرخ وسپید ہوگئے اور شفقت سے اپنے رنگین ہاتھ اُن کے سروں پر ہلانے لگے۔ پرندے چہچہانے لگے۔ غنچوں کے دِل کی کلیاں کھِل گئیں۔ اور وُہ مُسکرا مُسکرا کر اپنی مسرت کا اظہار کرنے لگے۔ یہ بہت ہی پیارا نظّارہ تھا ٭

ہاں! باغ کے ایک کونے میں موسم سرما کی ابتک وُہی حالت تھی۔ اور ایک چھوٹا سا بچہ اُس کونے میں کھڑا رو رہا تھا وُہ اسقدر چھوٹا تھا۔ کہ اُس کی باہیں درخت کی شاخوں تک نہیں پہونچتی تھیں۔ یہ غریب درخت ابتک برف وکُہر کے غلاف میں پوشیدہ تھا۔ اور جنوبی ہَوا اُس کے چاروں طرف منڈلا رہی تھی "چڑھ آؤ میرے پیارے" درخت نے کمسن بچہ سے کہا۔ اور اپنی شاخوں کو اسقدر جُھکا دِیا جس سے زیادہ نا مُمکن تھا۔ تاہم اس بچّہ کے ہاتھ درخت تک نہ پہونچ سکے کیونکہ وُہ بہت چھوٹا تھا ٭ "جن" نے جب یہ دیکھا۔ تو اُس کا پتھر دِل موم ہوگیا ٭ "اُف مَیں کِتنا خودغرض تھا"؟ اُس نے اپنے دل میں کہا۔ "اب میری سمجھ میں آیا۔ کہ کیوں موسم بہار میرے باغ سے آجتک دُور رہتا۔ اَب مَیں اِس بچہ کو

درخت پر بٹھا کر چہار دیواری کو توڑ ڈالوں گا۔ تاکہ باغ ہمیشہ کے لئے اِن لڑکوں کے لِئے وقف ہو جائے.....
ہمیشہ کے لئے"۔

اُسے حقیقتاً اپنی خود غرضی پر بہت افسوس تھا۔ وُہ نیچے اُترا اور باغ میں داخل ہُوا۔ لیکن جب لڑکوں نے اُسے دیکھا۔ تو خوف زدہ ہو کر بھاگ گئے۔ اور باغ میں پھر موسم سرما کی تاریکی چھا گئی۔ صرف وُہ چھوٹا لڑکا نہ بھاگ سکا۔ اُسکی آنکھیں جِن کو نہ دیکھ سکیں۔ کیونکہ ان میں موٹے موٹے آنسو بھرے ہُوئے تھے۔ "جِن" آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ اور پیچھے سے اُس بچّہ کو لیکر درخت کی شاخ پر بٹھا دیا۔ درخت اُسے پاتے ہی پھُولوں سے لد گیا۔ چڑیاں میٹھے میٹھے گیت گانے اور کلیاں مُسکرانے لگیں۔ لڑکے نے مارے خوشی کے "جِن" کے گلے میں باہیں ڈالدیں۔ اور اُسے پیار کرلیا۔ دُوسرے لڑکوں نے جب دیکھا۔ کہ اب "جِن" مہربان ہو گیا ہے۔ تو وُہ بھی دوڑتے ہُوئے باغ میں داخل ہو گئے۔ باغ میں بہار ہی بہار تھی۔

"اب یہ باغ تمہارا ہے میرے بچّو۔" "جِن" نے کہا۔ اور ایک بڑا تیشہ اُٹھا کر چہار دیواری کو مسمار کر دیا۔ جب بارہ بجے۔ جب لوگ بازار جاتے۔ تو "جِن" کو بچّوں کے ساتھ کھیلتا ہُوا پاتے۔ ایک دن جب لڑکے کھیل کُود کے بعد "جِن" سے رُخصت ہونے لگے۔ تو اُس نے پُوچھا:۔ "تمہارا وُہ ساتھی کہاں ہے؟ وُہ جسے میں نے اُس دن شاخ پر بٹھا دیا تھا"؟ جِن کو اُس سے بڑی محبت ہو گئی تھی۔ کیونکہ اُس نے جِن کو پیار کرلیا تھا۔ "ہم نہیں جانتے۔" لڑکوں نے کہا۔ "وُہ کہیں چلا گیا ہے"۔ "تو کل اسے اپنے ساتھ ضرور لانا"۔ جِن نے کہا۔ مگر لڑکوں نے جواب دیا۔ کہ وُہ اسکے گھر سے ناواقف تھے۔ اور نہ اُس دن سے قبل اُسے کہیں دیکھا تھا۔ "جِن" کو یہ سُن کر بہت رنج ہُوا۔ ہر سہ پہر کو اسکول کے بعد لڑکے "جِن" کے ساتھ اسکے باغ میں کھیلا کرتے۔ لیکن وُہ چھوٹا لڑکا جس سے "جِن" کو محبت تھی۔ کبھی دوبارہ نظر نہ آیا۔ اگرچہ "جِن" سب لڑکوں پر مہربان تھا۔ پھر بھی اُسے اپنا پہلا دوست بہت یاد آتا۔ اور وُہ دِل ہی دِل میں کہتا۔ "مَیں اسے دیکھنے کے لئے کِتنا بےچَین ہُوں"۔

سال گُذر گئے۔ جِن عمر رسیدہ ہوتا گیا۔ اور کمزور بھی۔ وُہ بسبب ضعیفی کے اب بچّوں کے کھیل میں شریک نہ ہوتا مگر آرام کرسی پر لیٹے لیٹے وُہ اُن کے کھیل بڑے شوق سے دیکھا کرتا۔ اور اپنے باغ کی تعریف کرتے ہُوئے کہتا "میرے باغ میں ہزاروں رنگین پھُول ہیں۔ مگر یہ بچّے اِن رنگین پھُولوں سے کہیں زیادہ دِلکش ہیں"۔

سرما کی ایک صُبح کو لباس تبدیل کرتے وقت اُس نے اپنے باغ پر ایک نظر ڈالی۔ موسم سرما سے اب اسے اِتنی نفرت نہ تھی۔ کیونکہ وُہ جانتا تھا۔ کہ زمانہ بہار کے سونے اور پھُولوں کے آرام کرنے کا ہے۔ یکایک اُس نے اپنی آنکھیں مَل مَل کر دیکھنا شروع کیا۔ وُہ سخت متعجب تھا۔ اور یہ تھا بھی ایک خلاف اُمید نظارہ۔ باغ کے ایک انتہائی کونے میں ایک خوبصورت [illegible] پھُولوں سے معمور تھا۔ اُس کی چھوٹی چھوٹی سُنہری شاخوں میں روپہلی

پھول جھول رہے تھے۔ اور اُسکے سایہ میں وُہی بچہ کھڑا ہُوا تھا جس سے جن کو محبت تھی ٭ تیزی سے دوڑتا ہُوا اور گھانس کو روندتا ہُوا "جن" لڑکے کے قریب پہونچ گیا۔ مگر قریب پہونچتے ہی اُس کا چہرہ تمتمانے لگا۔ اُسکے غصہ کی کوئی انتہا نہ رہی تھی ٭

"کس کی اتنی ہمت ہُوئی۔ کہ تم کو زخمی کر گیا"؟ جن نے پوچھا۔ کیونکہ بچے کی دونو ہتھیلیوں اور دونو پنجوں پر دو گہرے زخم تھے۔ جن سے خون بہہ رہا تھا ٭

کس کی اتنی ہمت ہوئی۔ کہ تم کو زخمی کر گیا"؟ جن نے دوبارہ چلا کر پوچھا "مجھے بتاؤ۔ تاکہ میں اپنی تلوار سے اُس کا سر قلم کردوں" ٭

"کسی نے نہیں"۔ بچے نے جواب دیا۔ "یہ محبت کے زخم ہیں" ٭

"تم کون ہو پھر"؟ جن نے پوچھا۔ اور ایک عجیب خوف سے مجبور ہو کر وُہ بچے کے آگے دو زانو ہو گیا ٭

بچہ نے مسکراتے ہُوئے جواب دیا:۔ "تم نے مجھے ایک دن اپنے باغ میں کھیلنے کی اجازت دی تھی۔ آج میں تمہیں اپنے باغ میں لے جاؤں گا جس کا نام ہے **جنت**" ٭ اور جب بارہ بجے لڑکے باغ میں کھیلنے کے لئے داخل ہُوئے۔ تو اُنہوں نے جن کو زیر درخت فرش گل پر مسکراتے ہُوئے محو خواب پایا ٭

گیتا کی تعلیم

سختیٔ دوراں سے دب کر رہ نہ جا کچھ غم نہ کر
پستیوں کا ذکر اپنے اوج کا ماتم نہ کر
کام لے سعیٔ عمل سے اور کچھ تدبیر کر

چرخ کے جور و جفا کا شکوۂ پیہم نہ کر
کنج تنہائی میں ہرگز فکر بیش و کم نہ کر
پریم سے رُوٹھی ہُوئی تقدیر کو تسخیر کر

اہل ہمت جو کہیں کر کے دکھا دیتے ہیں وُہ
آگ سی ہر ایک کے دل میں لگا دیتے ہیں وُہ

زور بازو سے زمانے کو ہلا دیتے ہیں وُہ
جاگتے ہیں اور دُنیا کو جگا دیتے ہیں وُہ

پست ہمت کا تو جینا ہی یہاں بیکار ہے
تو سپاہی ہے عدو کی چال سے ہشیار رہ
دُشمنوں کے دل میں بن کر خنجر خونخوار رہ

وُہ گلستان عمل کی راہ میں اک خار ہے
دفع اعدائے جفا جُو کے لئے تیار رہ
موت آجائے تو اس سے برسر پیکار رہ

کام لے ہمت سے فتح و کامرانی ساتھ ہے
تو کمربستہ تو ہو میدان تیرے ہاتھ ہے

کالنگا کی شہزادی

شہنشاہ ہند اشوک اعظم کے حضور میں

(تاریخ ہند کا ایک رومان آفرین باب)

نیلے آسمان پر چاند مسکرا رہا تھا۔ اور تمام کائنات اُس کے حُسن پُر نُور میں ڈوبی ہوئی تھی شہنشاہ اشوک اعظم اپنے محل کے پائیں باغ میں مصروف گلگشت تھا۔ اسکے جلو میں دو تین درباری بھی تھے۔ شہنشاہ اشوک اعظم کسی گہری فکر میں کھویا ہوا تھا۔ شام کی ہوا پھولوں اور درختوں کے درمیان سرسرا رہی تھی۔ پرندے دِن بھر چہچہانے کے بعد سونے کی تیاری کر رہے تھے۔

ایک درباری نے کہا "پریاگ میں بھی مہاراج کے نام پر ایک نیا ستون کھڑا کر دیا گیا ہے"۔

دُوسرے نے پوچھا "کیا وہ ٹیکسلا کے ستون جتنا بڑا ہے"؟

تیسرے نے کہا "اندر پرست میں سب سے نفیس ہے۔ مہابھارت میں پانڈوں کی عظمت و شکوہ کا تذکرہ ہے لیکن ہمارے مہاراج کی شان و شوکت آسمان تک بُلند ہے۔ اور ہر کسی کو نظر آسکتی ہے۔ نسلاً بعد نسل لوگ اِس کارنامے کو دیکھ کر دنگ رہ جائینگے۔ پاٹلی پتر سے ٹیکسلا تک۔ اُجین سے دوارکا تک۔ اور انگا بنگا اور کالنگا تک صرف مہاراج کی شہرت کا ڈنکا بج رہا ہے۔ پُرانوں یا تاریخوں میں کون ہے جو مہاراج کی ہمسری کا دعویٰ کر سکے"؟

اشوک اعظم نے منور آسمان کی طرف نگاہیں اُٹھائیں۔ اُسکی پیشانی فراخ اور بلند تھی۔ اور اُسکی آنکھوں میں تجسس جھلک رہا تھا۔ اُس نے نرم اور متین لہجہ میں کہا "کیا پتھر پر لکھی ہوئی بات غیر فانی ہوتی ہے"؟ درباری خاموش ہو گئے۔

شہنشاہ اشوک اعظم نے کہا "شہرت وُہی غیر فانی ہوتی ہے۔ جو لوگوں کے دِل پر نقش ہو جائے اور نسلاً بعد نسل لوگ اِس کا تذکرہ کریں لیکن افسوس ابھی تک میں نے خود کوئی ایسا کام نہیں کیا۔ جو لوگوں کے دلوں پر میرا سکہ بیٹھ سکے"۔

اُسکے نوجوان درباریوں کی سمجھ میں یہ بات نہ آسکی۔ تاہم ایک درباری نے تامل کے بعد کہا "حضور کی شہرت اور حضور کے پھریرے تو دور دراز کے علاقوں پر بھی لہرا رہے ہیں۔ کئی راجے مہاراجے حضور کے قدموں کی خاک آنکھوں میں لگاتے ہیں اور دشمن حضور کے نام پر کانپتے ہیں۔ کیا یہ حضور کی شہرت نہیں ہے"؟

بادشاہ نے گویا اپنے آپ سے باتیں کرتے ہوئے جواب دیا "میرا نام اشوک ہے۔ جسکے معنی ہیں غم دُور کرنیوالا۔ میرے والدین نے میرا یہ نام کیوں رکھا۔ کیا صرف اسلئے کہ میں دُوسروں کی بادشاہتیں چھین کر اپنی سلطنت کو وسیع کروں؟ کیا ان کو

یہ خیال تھا۔کہ مَیں ان لوگوں کا غم دُور کرُوں گا۔کیا مَیں اشوک ہُوں؟ کیا مجھے کوئی غم نہیں۔کیا میں نے کسی کا غم دُور کیا ہے؟ مَیں نے تو کئی لوگوں کی آزادی چھین کر ان سے خراج وصُول کیا ہے۔کیا مَیں نے ان کے غم میں اضافہ نہیں کیا۔مَیں اسم بامسمّی کیسے کہلا سکتا ہُوں۔کیا مَیں اشوک ہُوں"؟

بات کرنے کی کسی کو بھی جُرأت نہ ہُوئی۔چاند کے سامنے بادل کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا آگیا۔اشوک آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہُوا محل میں داخل ہو گیا ۔

(۲)

شہنشاہ اپنے کمرہ خاص میں داخل ہُوا۔اُسکے ساتھی "جشن ہال" میں چلے گئے۔"جشن ہال" طلائی اور نُقرئی شمعوں سے جگمگا رہا تھا۔ہر طرف عُود و عنبر کی خُوشبُو مشامِ جان کو معطّر کر رہی تھی۔ہال کے ایک طرف زُہرہ جبیں نازنیں اپنے کولھے مٹکا رہی تھیں۔ان کے جسم کی ہر جُنبش دیکھنے والوں کی نگاہوں پر جادُو بکھیر رہی تھی۔شہنشاہ طبیعت بہلانے کے لئے بالعموم اس کمرہ میں آیا کرتا تھا۔لیکن آج وُہ نہ آیا۔وُہ اپنے کمرے میں سر نہوڑائے اُداس بیٹھا تھا۔اُس نے دربار کے کپڑے اُتار کر شب خوابی کا لباس پہنا۔پھر اُس نے شمع گُل کر دی۔اور اچانک باہر نِکل گیا ۔ چاند غروب ہو چکا تھا۔شاہراہ کو چھوڑ کر اشوک ایک تنگ گلی میں پہونچا۔پہرے دار نے اُسے پکارا "کون ہے"؟

اُس نے جواب دیا "ایک شہری" ۔

"کہو زندہ باد اشوک اعظم" ۔

"زندہ باد اشوک اعظم" شہنشاہ نے سُریلی آواز میں دوہرایا اور آگے چلا گیا۔گلی میں رَوشنی زیادہ نہیں تھی۔اِس لئے شہنشاہ کو پُھونک پُھونک کر قدم رکھنا پڑتا تھا۔کچھ فاصلے پر ایک ٹُوٹی پھُوٹی جھونپڑی نظر آئی۔دروازہ نیم وا تھا اندر ایک ٹمٹماتے ہُوئے چراغ سے مدھم سی رَوشنی ہو رہی تھی۔اُس نے دَروازہ کو آہستہ سے کھٹکھٹایا۔اندر سے آواز آئی :-

"دروازہ کھُلا ہے۔اندر تشریف لائیے" ۔

اشوک نے اندر جا کر دیکھا۔کہ ایک بُڑھیا چیتھڑوں کے ایک ڈھیر پر بیٹھی ہُوئی ہے۔وُہ اُسے دیکھتے ہی پکار اُٹھی۔"کیا تم چور ہو۔چوری کرنا چاہتے ہو"؟

شہنشاہ نے کہا "مَیں چور نہیں ہُوں۔بلکہ ایک امیر شہری ہُوں۔مَیں حاجتمندوں کی ضرورت کو پُورا کرتا ہُوں" ۔

بُڑھیا کی آنکھوں میں آنسُو آگئے۔اُسنے کہا "میری ضرورت کون پُوری کر سکتا ہے"؟

اشوک نے جوابدیا "اگر مَیں خُود نہ کر سکوں۔تو شہنشاہ اشوک اعظم کو اِطلاع دیکر تمہاری ضرُوریات کو پُورا کرا دُونگا"

بُڑھیا کی آنکھوں سے آنسُو بہنے لگے۔اُسنے کہا "کیا تم اشوک اعظم کو جانتے ہو"؟

"ہاں! میں جانتا ہُوں"

"کیا وُہ میری ضرورت پُوری کرے گا"؟

"کیوں نہیں۔ اسکی دَولت و طاقت کا کوئی اَندازہ نہیں۔ وُہ سب کچھ کر سکتا ہے"۔

"کیا وُہ رحمدل ہے"؟

"کہتے ہیں"۔

"وُہ اشوک ہے۔ اُسے کوئی غم نہیں ہے لیکن کیا وُہ دُوسرے کے غم بھی دُور کر سکتا ہے"؟

"یہ تو نہیں۔ کہ اُسے خُود بھی کوئی غم نہ ہو۔ لیکن وُہ دُوسرے کے غم کو دُور کرنے کی کوشش ضرور کرتا ہے۔ تنہائی میں وُہ اکثر غمگین رہتا ہے"۔

"اُسے غم کِس بات کا ہے"؟

"اُس نے اپنی سلطنت کو بہت وسیع کر لیا ہے۔ اور وُہ سوچتا ہے۔ کہ آخر اس سلطنت سے فائدہ؟ اگر وُہ تمام دُنیا کو بھی زیرنگین کرلے تو اِس سے کیا ہو گا۔ اسکے گرد ہر وقت خوشامدیوں کا جمگھٹا لگا رہتا ہے۔ سب غرض کے بندے ہیں۔ وُہ کسی سے اپنے دُکھ درد کا حال نہیں کہہ سکتا۔ ضرورتمند تو سبھی ہیں لیکن دوست کوئی نہیں"۔ بڑھیا نے دیا اُٹھا کر اسکے چہرے کو بغور دیکھا اور پُوچھا "تم کون ہو"؟ "میں اشوک ہُوں"۔ شہنشاہ نے بلا تامل کہہ دیا۔ بڑھیا کو کوئی تعجب نہ ہُوا اُس نے دیا نیچے رکھ دیا۔ اُسکے آنسو خشک ہو گئے۔ اُسکی آنکھیں سُرخ کوئلے کی طرح دہکنے لگیں۔ اُس نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں اور زور سے چلا اُٹھی "تم اشوک ہو۔ تم شہنشاہ ہو۔ تم رات کے وقت ایک چور کی طرح ایک بڑھیا کی ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی میں آگھسے ہو۔ لوگ کیا کہیں گے؟ میں جانتی ہُوں۔ تم بادشاہوں کے بادشاہ ہو۔ تمہاری شہرت دُنیا کے کونہ کونہ میں جا پہونچی ہے لیکن "جشن ہال" میں ہنسنے کھیلنے کی بجائے تم چوروں کی طرح اِدھر اُدھر کیوں پھر رہے ہو۔ ہاں ٹھیک ہے قاتل اِس جگہ ضرور آیا کرتا ہے۔ جہاں اُس نے کسی کی جان لی ہو۔ مہاراج! تم میری کوئی ضرورت پُوری کرنی چاہتے ہو۔ لیکن تم چور ہو۔ تم نے میری زندگی چھین لی۔ میں غریب بیوہ ہُوں۔ میرے دو بچے تھے۔ خُدا ہی جانتا ہے۔ کہ میں نے کِس محنت و مشقت سے انکی پرورش کی۔ وُہ میری اُمیدوں کا دیا اور بڑھاپے کا سہارا تھے۔ تمہارے آدمیوں نے۔ موت کے فرشتوں نے اُنہیں مجھ سے چھین لیا۔ اور اُن کو اپنے ساتھ سپاہی بنا کرلے گئے۔ تم ایک جنگ میں جیت گئے۔ اور تمہارا جھنڈا کسی دُوسری سلطنت پر لہرانے لگا۔ لیکن میرے بچے کہاں ہیں۔ آہ! میدانِ جنگ میں گیدڑوں اور چیلوں نے اُنکی ہڈیاں چبا ڈالیں۔ کیا تم میری ضرورت پُوری کر وگے؟ کیا تم میرے بچے مجھے واپس دِلا سکتے ہو؟ تم اشوک ہو۔ تم خُود موت ہو"۔ بادشاہ نے خاموشی سے سر جھکا لیا اور جھونپڑی سے نِکل کر رات کی تاریکیوں میں رُوپوش ہو گیا۔

(۳)

وُہ ایک سادہ کمرہ تھا۔ ایک کونے میں قالین پر شہنشاہ اشوک اعظم دیوار کے ساتھ تکیہ لگائے بیٹھا تھا۔ ایک

ملازم اندر آیا۔ اور سینہ پر ہاتھ باندھ کر عرض کی "جہاں پناہ! سینا پتی حضور کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں" ✤

"دروازہ کھلا ہے اندر آنے دو" اشوک اعظم نے کہا ✤

سینا پتی داخل ہوا۔ اور آداب کے بعد عرض کیا "مہاراج کی فتح ہو" ✤ "کیا بات ہے"؟ شہنشاہ نے دریافت کیا ✤

سینا پتی کہنے لگا "مہاراج کالنگا کی شہزادی نے پیغام بھیجا ہے۔ کہ وہ شام کو یہاں آرہی ہیں" ✤ شہنشاہ بولا "کالنگا کی شہزادی؟ یہاں؟ کیوں"؟ سینا پتی کہنے لگا "مہاراج کے درشن کرنے۔ کالنگا کی فتح کے بعد وہاں کا بادشاہ مر گیا تھا شہزادی یتیم ہے۔ کیونکہ اسکی ماں بھی عالم جاودانی کو سدھار چکی ہے۔ ابھی تک اسکی شادی نہیں ہوئی۔ آج وہ اظہار اطاعت کے طور پر سلطنت میں حاضر ہوگی"✤

"وہ کہاں ٹھہرے گی"؟ شہنشاہ نے فرمایا ✤ "فرمان شاہی فرمان کے لئے حاضر ہوا ہوں"۔ سینا پتی نے جوابدیا

اشوک اعظم تھوڑی دیر تک سوچتا رہا۔ پھر بولا "امراوتی کے باغ والا محل اسکے لئے خالی کر دو۔ اسکے ساتھ درباری کتنے ہونگے"

"قریباً پچاس" سینا پتی نے جوابدیا ✤

"ان کی رہائش وغیرہ کا بھی بندوبست کرو۔ میں بھی آتا ہوں" شہنشاہ نے فرمایا ✤

بادشاہ نے بنفس نفیس امراوتی محل میں جا کر تمام انتظامات مکمل کرائے۔ اور شہزادی کی راحت و آسائش کے لئے ہر قسم کا سامان مہیا کیا ✤ بادشاہ نے کالنگا کے تخت و تاج کو تاراج کیا تھا۔ وہاں کی شہزادی آج اس کے حضور میں حاضر ہو رہی تھی۔ آخر اس کی آمد کا مقصد کیا ہے؟ کیا اسے کوئی تکلیف یا شکائت ہے؟ بادشاہ کسی قدر گھبرا گیا۔ تاہم شام کو اس نے گھوڑ سواروں کی فوج دیکر سینا پتی کو شہزادی کے استقبال کے لئے شہر سے باہر بھیجا۔ اور خود شہر کے دروازہ پر کھڑا ہو کر اسکا انتظار کرنے لگا ✤ عین جس وقت افق مغرب میں سورج غروب ہوا۔ پاٹلی پتر کے دروازے پر کالنگا ماہتاب اپنی تمام تر جلوہ ریزیوں کیساتھ طلوع ہوا۔ جب بادشاہ نے اسے دیکھا۔ تو پیشوائی کے لئے چند قدم آگے بڑھا۔ شہزادی اپنی پالکی سے اتری۔ اور بادشاہ کے قدموں میں گرنے ہی کو تھی۔ کہ بادشاہ نے اسے اٹھا لیا۔ اور کافی دیر تک اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبائے رکھا۔ اس نے کئی خوبصورت لڑکیاں دیکھی تھیں۔ لیکن کالنگا کی شہزادی ایک "سحر حریص" کی طرح اس کے دل و دماغ میں پیوست ہو رہی تھی۔ وہ سڑک کے کنارے صبح کی باوقار دیوی نظر آرہی تھی۔ اور بادشاہ اسکے حسن کی خاموش لہروں میں بہے چلا جارہا تھا۔ اردگرد کے لوگوں نے اس حسین جوڑے کو دیکھا۔ اور ان کے لبوں پر ایک مسکراہٹ نمودار ہو گئی ✤ بادشاہ نے شہزادی کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ نکال لیا۔ اور کہا "پاٹلی پتر" کو تمہاری آمد پر فخر ہے" ✤

"میں آپ کی کنیز ہوں" شہزادی نے مترنم آواز میں جوابدیا ✤

(۲)

دن گزرتے گئے۔ کسی شخص کو معلوم نہیں تھا۔ کہ دارالسلطنت میں شہزادی الاویکا کی آمد کا کیا مقصد ہے؟ کسی نے

پوچھنے کی جرأت بھی نہ کی۔ بادشاہ اُس سے قریبًا ہر روز ملاقات کرتا تھا۔ مختلف موضوعات پر مبادلہ افکار ہوتا لیکن اُسنے بھی ابھی تک یہ دریافت نہیں کیا تھا۔ کہ اُس کی آمد کا مقصد کیا ہے؟ بادشاہ اُس کی علم نوازی۔ شائستہ گفتگو متانت اور اخلاق سے بہت متاثر ہُوا۔ اور یہی وجہ تھی۔ کہ وُہ محسُوس کرتا تھا۔ کہ اُسے شہزادی کا لنگا سے غیر معمولی دلچسپی ہو رہی ہے۔ بادشاہ کو بہت جلد معلوم ہوگیا۔ کہ شہزادی نہ عام نوجوان لڑکیوں کی طرح سنگار و آرائش اور ظاہری ٹیپ ٹاپ کا شوق نہیں ہے۔ اور نہ ہی وُہ موسیقی یا ناچ کو پسند کرتی ہے۔ البتہ وُہ خود کبھی کبھی ستار بجایا کرتی۔ اور بعض اوقات لہر میں آکر کبھی گایا بھی کرتی تھی ؛

بادشاہ صُبح و شام دو وقت شہزادی کو ملنے آتا۔ پہلے وُہ دو چار منٹ سے زیادہ نہیں ٹھہرتا تھا مگر آہستہ آہستہ اُس کی اقامت طویل ہونے لگی۔ اور اُسے شہزادی کی باتوں میں اتنی لذّت محسُوس ہوتی۔ کہ اُس کا دل کہیں اور جانے کو نہ چاہتا تھا۔ بادشاہ کو شہزادی کی محبت بیتاب کئے دے رہی تھی۔ لیکن وُہ اپنے جذبات کا اظہار کس طرح کرتا؟ شہزادی مہمان تھی۔ وُہ اپنے متعلق کوئی بات نہ کرتی۔ اور اگر شہنشاہ اِس موضوع کو چھیڑتا بھی۔ تو وُہ گفتگو کا رُخ فوراً بدل لیتی تھی۔ ایک شام کو وُہ دونوں ایک کھڑکی کے سامنے بیٹھے مصروف گفتگو تھے۔ اشوک نے دیکھا تھا۔ کہ شہزادی نے پاٹلی پتر پہونچتے ہی اپنے تمام زیورات اُتار پھینکے تھے۔ آخر کیوں؟ بادشاہ کی سمجھ میں یہ تغیّر کبھی نہ آیا تھا۔ اب بھی وُہ مقابلتًا نیچے کی نشست پر بیٹھی ہُوئی تھی۔ اور اُسکے جسم پر زیور کا ایک تار بھی نہ تھا ؛

آخر شہنشاہ نے پُوچھ ہی لیا "شہزادی! تم اپنے متعلق تو کوئی بات ہی نہیں کرتیں۔ کیا کوئی راز ہے"؟

"کوئی راز نہیں مہاراج! آپ سب کچھ جانتے ہیں۔ میرا نہ کوئی باپ ہے نہ ماں۔ میں نے محل چھوڑ دیا ہے۔ اور آجکل ایک رشتہ دار کے یہاں رہتی ہُوں۔ اِسکے سوائے میرے متعلق کوئی خاص بات نہیں ہے۔" شہزادی نے کالنگا کی فتح یا اپنے باپ کا بالکل کوئی تذکرہ نہ کیا ؛

بادشاہ نے کہا۔ "بہت سے لوگ اپنا ذکر محض اِس لئے کرتے ہیں۔ کہ ان کی بڑائی ظاہر ہو۔ مگر میں جانتا ہُوں۔ کہ تم اِس طبیعت کی عورت نہیں ہو۔ بلکہ تم تو اپنے متعلق کوئی بات ہی نہیں کرتیں۔ تاہم تمہارے دل میں کئی خواہشیں یا اُمیدیں پیدا ہوتی ہونگی۔ کیا تم ان کا اظہار کر سکتی ہو۔ کیا تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہے"؟

"مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں مہاراج" ؛

"یہ تو ٹھیک نہیں ہے۔ تُم جانتی ہو۔ میں شہنشاہ ہُوں۔ تُم صرف حکم کرو۔ آگے بندوبست کرنا میرا کام ہے" ؛

"جہاں پناہ! میں آپ کی مہمان نوازی اور کرم فرمائی کی ممنون ہُوں۔ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے" ؛

"تُم تکلف کر رہی ہو۔ اپنی حاجت صاف صاف کیوں نہیں بیان کر دیتیں"؟

"مہاراج! خواہش اور اُمید کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہو سکتا"

"یہ ٹھیک ہے۔ کیا اُمید بر آنے سے خوشی حاصل ہو سکتی ہے؟ کون کہہ سکتا ہے۔ تاج پہن کر دردسری کے سوائے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ بادشاہ بننے سے کوئی فائدہ نہیں۔ یہ سلطنت مجھے وِرثہ میں مِلی ہے۔ لیکن مجھے بوجھ محسوس ہو رہی ہے۔ میں لوگوں کی خوشحالی اور بہبودی کی خاطر رات دن ایک کر رہا ہوں۔ اگر میں ایک شخص کے غم کو بھی دُور کر سکا۔ تو مجھے اپنی محنت کا پھل مل جائیگا مالاویکا! جب تم مجھ سے باتیں کرتی ہو۔ تو میں حیران رہ جاتا ہوں۔ تم ایک بادشاہ کی لڑکی ہو۔ تمہاری پرورش ناز و نعم کے آغوش میں ہوئی ہے تمہیں چاہئے تھا۔ کہ تم عیش و آرام کی زندگی بسر کرتیں۔ لیکن تم تو ہر وقت کسی فکر میں کھوئی رہتی ہو۔ میں نے تمہارے لبوں سے علم و دانش کے موتی جھڑتے دیکھے ہیں لیکن دُنیا کی چوکھٹ پر کھڑے ہو کر گھبرانا ٹھیک نہیں۔ دُنیا میں داخل ہو جاؤ۔ اور اپنی زندگی کو واقعات کی رَو میں بہا دو۔ کہ یہی زندگی کا مقصد ہے"۔

(۵)

نیلے آسمان پر ایک دفعہ پھر چاند مسکرا رہا تھا۔ اور تمام کائنات اُس کے حُسن پُر نور میں ڈوبی ہوئی تھی۔ شہنشاہ اعظم اشوک اپنے محل کے پائیں باغ میں مصروف گلگشت تھا۔ اس مرتبہ درباریوں کے بجائے اُسکے ہمراہ کالنگا کی شہزادی "مالاویکا" تھی۔ دونوں خاموش سبز گھاس پر اِدھر اُدھر چہل قدمی کر رہے تھے۔ اشوک اعظم کے دِل میں جذبات کا ایک طوفان اُمڈ آیا تھا۔ وُہ اپنا دِلی راز شہزادی سے کہہ دینا چاہتا تھا۔ وُہ اُس سے محبت کرتا تھا۔ وُہ چاہتا تھا۔ کہ کالنگا کی شہزادی کو اپنی ملکہ بنا کر ہمیشہ اپنے پاس رکھے۔ اُسی رات مالاویکا نے اپنا لباس تبدیل کیا تھا۔ آج وُہ اسی طرح نظر آ رہی تھی۔ جسطرح پاٹلی پتر میں وارد ہوتے وقت نظر آتی تھی۔ اُس نے زرق برق پوشاک پہنی ہوئی تھی۔ اور بادشاہ اُسکے خاموش حُسن کی لہروں میں بہے چلا جا رہا تھا۔ آخر اشوک نے کہا "کیا تم جانتی ہو۔ کہ آج میں نے تمہیں کیوں بُلایا ہے"؟

"مالاویکا" نے اپنی نگاہیں اُوپر اُٹھائیں۔ اور پھر جھکا لیں۔ اور شرماتے ہوئے لہجے میں بولی "میں کیسے کہہ سکتی ہوں"؟

اشوک نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وُہ اپنے جذبات کے اندرونی طوفان کا اظہار کرنے سے نہ رُکا۔ اُس نے کہا "جب تم نے میرے دارالسلطنت میں قدم رکھا تھا۔ تو تم نے میرے تاریک دل کو بھی اپنے حُسن نور پاش سے منور کر دیا۔ میرا نام لے کر پکارو اِس سے مجھے سکون حاصل ہوگا۔ یہ سلطنت تمہاری ہے لیکن تمہارا تخت میرا دل ہے۔ "کیا تم مجھ سے شادی کرو گی"؟

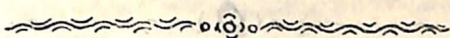
"اشوک! اگر اس دُنیا میں میرے لئے کوئی جگہ ہوتی۔ تو آج رات میں اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتی۔ تم شہنشاہ ہو۔ تمہاری شہرت سُورج کی روشنی کی طرح ہمہ گیر ہے لیکن افسوس میرے لئے اس دُنیا میں کوئی خوشی نہیں ہے میں تمہارے گھر میں کیسے داخل ہو سکتی ہوں۔ میں آج ہی اِس دُنیا کو خیرباد کہہ رہی ہوں"۔

"کیسی باتیں کر رہی ہو" مالاویکا "دُنیا کو خیرباد کہنے کی کیا ضرورت ہے" مالاویکا "مجھے مایوس نہ کرو۔ کہدو۔ کہ میں تم سے شادی کرونگی"۔

[illegible] مجھے تمہاری

پیشکش کو قبول کرنے میں کوئی عذر نہ ہوتا لیکن دُنیا میں اب میرے لئے کوئی کشش نہیں رہی - اِس عارضی زندگی میں ہمیں غیر مستقل چیزوں کی خواہش رہتی ہے جُسن - دولت اور شباب آخر یہ کب تک قائم رہ سکتے ہیں ؟ کوئی دُوسرے کو کیسے خوش رکھ سکتا ہے ؟ میرے باپ نے اپنی سلطنت کھو دی - میں خوش ہُوں - کوئی پُرا سرار ہاتھ مجھے اِس دُنیا سے باہر کھینچے لئے جا رہا ہے - تم مجھے واپس کیسے لا سکتے ہو ؟ اشوک ! شہنشاہ اعظم - میں اب شہزادی نہیں ہُوں - میں ایک راہبہ ہُوں - بھکونی "

مالا دیوی نے اپنی نگاہیں چاند کی طرف بلند کیں - اُسکے چہرے پر غیر زمینی روشنی لہرا رہی تھی - اُس نے اپنے زیورات اُتار کر سبز گھاس پر پھینک دیئے - اور اب شہنشاہ ہند اشوک اعظم کی نظروں کے سامنے ایک بھکونی کھڑی تھی جس کے جسم پر صرف ایک جوگیانہ رنگ کی ساڑھی تھی - اور وہ مذہبی گیت گاتی محل کے پائیں باغ سے نکل کر پاٹلی پتر کے جنگلات میں رُوپوش ہو گئی +



زندگی :- بجلی آکاش کا سینہ چاک کر رہی تھی - جذبات میرا دِل چیرے ڈالتے تھے - ابر پریم رس برسا رہا تھا - آسمان پر سیاہ بادل چھائے تھے - دُنیا پر سیاہ کاری - میرے دِل کو جذبات کے دُھوئیں نے گھیر رکھا تھا +

برسات تھی - بُلبل گُل کی تلاش تھی - شمع پروانہ کے لئے جل رہی تھی - سرو سر اُٹھائے قمری کو دیکھ رہا تھا - میری طرف بھونرے نے دیکھا - مدھو بانسری سنائی - میں مست متوالی اُس کے ساتھ ہو لی - اُس نے ایک ڈنگ مارا - رس چُوس لیا - میری رگ رگ میں زہر سرایت کر گیا +

برسات کا موسم تھا - ابر جھوم جھوم کر آتا تھا - زمین پر بُوند پڑتی تھی + یہ خاک کی دیوی اپنا سینہ چاک لعل اُگل دیتی - اور بُوند کے لئے جگہ بناتی تھی - نہ لعل اپنے نہ بُوند - پھر وُہی خاک کی خاک +

برسات تھی - پروانے شمع پر ٹوٹے پڑتے تھے - چیونٹی کے بھی پر نکل آئے - نہ چیونٹی رہی نہ زمین +

بُلبل گُل کی طرف بڑھا - اُس نے سینہ چاک کر کے خیر مقدم کیا +

بُلبل ہری چُگ تھا - چلتا ہُوا +

پھول کمہلا گیا - مر گیا - خاک میں مِل گیا +

سُورج مغرب کی طرف بڑھا - مغرب نے اپنا خُون اُس کے قدموں میں چھڑکا - اُس سُرخ گرم گرم کو سینہ سے لگا لیا - سُورج رات کی رات وہاں رہا - پھر مشرق سے جا نکلا - یہی لیل و نہار ہے - یہی روز و شب کی داستان +

اب میں سر راہ سُلگتی ہُوئی انگیٹھی ہُوں - ہر راہ گیر جو میرے پاس سے گذرتا ہے - ہاتھ سینک کر جاتا ہے - میں جلتی رہتی ہُوں - میں ...... ایک سڑک ہُوں ...... شارع عام ...... مجھ پر سے ...... دُنیا ...... گذرتی ہے ...... لوگ ...... روندتے ...... ٹھکراتے ...... خاک اُڑاتے ...... چلے جاتے ہیں +

در مدح "مستانہ جوگی"

شان ارفع ہے تری "مستانہ جوگی" دہر میں
اب تو چرچا ہے ترا ہر گاؤں میں ہر شہر میں

سرنگوں خامہ ہے میرا بس تیری توصیف میں
ڈر یہ ہے آئے نہ بل یارب کہیں تصنیف میں

بخششوں سے تو نے اپنی سب کے دامن بھر دیئے
جتنے تھے نقال تیرے سب نے کندھے دھر دیئے

تو ہے گردش میں ابھی تک بزم میں پروانہ وار
جھومتا ہے بنکے ساقی ہر طرف مستانہ وار

سارے بھارت کو جگایا یہ ترا ہی کام تھا
ہندو و مسلم ہو کوئی۔ فیض تیرا عام تھا

کھولدیں راہیں حقیقت معرفت کی تو نے سب
انکشاف راز پنہاں کر دیئے ہیں تو نے سب

صنعت و حرفت طبابت اور زراعت معرفت
ایک پرچے ہی میں کر دی تو نے ہے سبکی کھپت

یک مہینہ قبل سب کے ہاتھ آجاتا ہے تو
دوست دشمن سبکو یکساں فیض پہونچاتا ہے تو

عظمت وارفتگاں کا تو ہی دیتا ہے پتہ
سارے عالم پر تھا سکہ جنکے علم و عقل کا

اے زمانہ کی روش ہے آجکل بدلی ہوئی
منزل مقصود تک پہونچانیوالا ہے تو ہی

پریم کی دلچسپ باتیں نقش دلپر کر گئیں
کچھ نہ کچھ احسان سر پر ہر کسی کے دھر گئیں

خط و کتابت کرتے وقت اپنے "نمبر خریداری" کا حوالہ دینا ضروری ہے ورنہ تعمیل نہ ہو سکیگی (مینیجر)

کال درپن

مہاراجہ اشوک کے دربار میں چاتر رشی کا معجزہ

"شری امرناتھ کی یاترا" کے دوران میں مجھے چند روز "مٹن جوت" میں ٹھہرنا پڑا۔ اور وہاں فرصت کے لمحے گذارنے کے لئے کشمیر کے مشہور فاضل "پنڈت شوشنکر" نے سنسکرت اور ہندی کا بہت سا لٹریچر میرے سپرد کر دیا۔ دوران مطالعہ میں ایک قدیم مسودہ نے میری توجہ کو اپنی سحر کارانہ کشش سے متاثر کیا۔ یہ ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ تھا ہندی بھاشا میں جس کی بھومکا یعنی دیباچہ سے معلوم ہوا۔ کہ یہ ایک قدیم سنسکرت کی پستک کا ترجمہ ہے۔ جو بودھوں کے زمانہ میں معرض تحریر میں لائی گئی تھی۔ ہندی بھاشا کے مسودہ کا سر ورق ضائع ہو چکا تھا جس سے مصنف کی تشخیص نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن اسکی حیرت انگیز علمیت کا ثبوت باقی اوراق میں آشکارا تھا۔ یہ کتاب دراصل فلسفہ اور سائنس کا ایک دلنواز مجموعہ تھا۔ میں نے دلنواز کا لفظ ارادتاً استعمال کیا ہے۔ کیونکہ نامعلوم مصنف نے ایک ایسے مسئلہ کو حل کرنیکی کوشش کی تھی۔ جسکے متعلق بیسویں صدی کے مغربی علماء دماغ سوزی سے کام لے رہے ہیں۔ اور اس مسئلہ کی تشریح خشک اور دور از کار منطقی دلائل سے نہیں۔ بلکہ ایک نہایت عجیب اور دلچسپ کہانی کی صورت میں پیش کیگئی تھی۔ ایک بھکشو جو بودھوں کے مندر میں نیا داخل ہوا ہے۔ اپنے گورو سے سوال کرتا ہے کہ مہاراج جس چیز کو ہم کال سماں یا وقت کے نام سے یاد کرتے ہیں دراصل کیا ہے۔ گورو اپنے چیلے کا سوال سنکر خاموشی اختیار کر لیتا ہے بھکشو اپنے سوال کو دوہراتا ہے۔ گورو کچھ جواب نہیں دیتا۔ بھکشو تیسری مرتبہ پوچھتا ہے۔ کہ اے ست کے مارگ پر لے جانیوالے گورو! فرمائیے۔ کہ "کال کسے کہتے ہیں" ہ گورو کا جواب خاموشی ہے۔ آخر بھکشو کہتا ہے "ہاں آپ نے میرے سوال کا جواب دے دیا" کال خاموشی کا نام ہے" یہ بھکشو کے ان الفاظ کو سن کر گورو ہنس دیتا ہے۔ اور اپنے چیلے کے ذہن رسا کی داد دیتا ہے اور پھر اس مسئلہ پر پہلے فلسفیانہ روشنی ڈالتا ہے۔ اور پھر اسے سمجھانے کے لئے ایک ایسا قصہ بیان کرتا ہے۔ جو اپنی نوعیت میں نہایت ہی سبق آموز اور دلفریب ہے۔ میں آج اپنے پیاروں کو یہ قصہ سنانا چاہتا ہوں۔ اور میں کامل یقین سے کہہ سکتا ہوں۔ کہ میرے پیاروں نے اس سے زیادہ نفیس، لطیف اور لاجواب افسانہ اپنی عمر میں نہیں سنا ہوگا۔ ہندی مسودہ میں اس گورو کا نام "ورکپل" اور چیلے کا نام "مانڈو" ظاہر کیا گیا ہے۔ اور دوران بحث میں جہاں پرماتما کا ذکر آتا ہے۔ وہاں وہ بھگوان "بودھ" کا مترادف لفظ استعمال کرتا ہے۔ گویا اسکے نزدیک بھگوان "بودھ" پرماتما کا سروپ ہیں۔ میں اس بے نظیر پستک کو ختم کرنیکے بعد اس نتیجہ پر پہونچا۔ کہ اس کا مصنف لازمی طور پر کوئی رشی ہوگا۔ ہندو فلسفہ کی اصطلاح میں رشی ایسے پرش کو کہتے ہیں جس کا قول یعنی وچن تین کال درست ہو۔ یعنی جس اصول کو وہ دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اس

کی صداقت پر زمانہ کی تبدیلیاں اور نیرنگیاں کوئی اثر نہیں ڈال سکتیں۔ بلکہ وُہ اصُول عہدِ گذشتہ۔ زمانہ حال اور زمانہ مُستقبل میں لگاتار سچائی کا حامل رہے گا۔ مَیں پیاروں کے سامنے اِس قِصّہ کو کبھی پیش نہ کرتا۔ اگر اس میں ایک خاص نکتہ نہ ہوتا۔ وُہ نکتہ یہ ہے۔ کہ یہ قِصّہ زمانہ حال کے واقعات کے عین مُطابق ہے۔ رِشی نے اپنی دُوربین نگاہ سے بیسویں صدی کے آخر تک کے حالات دیکھ لئے۔ اور ایک افسانہ کی صُورت میں پیش کر دیئے۔ دُوسرے الفاظ میں یُوں کہہ سکتے ہیں۔ کہ ہندو دماغ نے آج سے دو ہزار برس پہلے ۲۱۳۶ء کے واقعات ایسی صفائی سے پیش کئے ہیں۔ کہ اِنسانی عقل حیران رہجاتی ہے *

اصل افسانہ شرُوع کرنے سے پیشتر گورُو اپنے چیلے سے کہتا ہے:۔ "جس چیز کو تم کال کہتے ہو۔ وُہ فی الحقیقت خاموشی ہے۔ خاموشی کا ایک ساگر ہے۔ جس کا کوئی کنارہ نہیں۔ ایک پرمانو یعنی ذرّہ ترقّی کرتا ہُوا آفتاب بن جائے گا۔ تہذیب پھیلے گی۔ پُرش مر جائینگے۔ تہذیب مِٹ جائے گی۔ اور کائنات کے سارے ہنگامے آخرکار کامل سکُون میں محو ہو جائینگے۔ یہ زمانہ کا اُتار چڑھاؤ۔ یہ وقت کا مدوجزر۔ یہ تغیّر و تبدل جسے ہم دیکھتے ہیں۔ اپنی ذات میں خاموشی کے سوائے کچھ نہیں"*

"مانڈو" یہ سُن کر کچھ حیران سا ہو جاتا ہے اور پُوچھتا ہے:۔ "مہاراج! مَیں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔ ایک زلزلہ آتا ہے۔ اور شہر تباہ ہو جاتے ہیں۔ دریا کی موجیں اُچھلتی ہیں۔ اور بستیاں برباد ہو جاتی ہیں۔ لوگ روتے ہیں چلاتے ہیں۔ اور اپنے بچاؤ کا جتن کرتے ہیں۔ مَیں ان کے شور کو خاموشی کسطرح سمجھ لُوں"*

کپل جواب دیتا ہے:۔ "بیٹا! تم نے ٹھیک کہا۔ پُرش کال کی زنجیروں میں جکڑا ہُوا یہ سب کچھ دیکھتا ہے۔ اور کہتا ہے۔ آج وُہ شخص مر گیا۔ آج اسکے ہاں بالک نے جنم لیا۔ کل شام کے وقت مندر میں بھگوان کی کتھا ہُوئی۔ دو گھنٹے بعد ہم سو جائینگے۔ چار دن بعد ہم یاترا کو جائینگے۔ یہ شبد "آج" اور "کل" اور "دو گھنٹے" اور "چار دن" کیا ہیں۔ صرف کال کو ناپنے کی نشانیاں ہیں۔ ہم دریا میں کشتی پر بیٹھے ہُوئے کہتے ہیں۔ وُہ شہر آگیا۔ وُہ سامنے جنگل آرہا ہے۔ کشتی چار کوس آگے نکل گئی ہے۔ اگر ہم کشتی میں سوار ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ اور دریا کے کنارہ کی طرف نہ دیکھیں۔ تو ہم نہیں کہہ سکتے۔ کہ شہر آگیا ہے۔ اور سامنے جنگل آرہا ہے۔ اور کشتی چار کوس آگے نکل گئی ہے۔ گویا کشتی کی رفتار ناپنے کے لئے ہم کنارے کی طرف دیکھتے ہیں۔ اور کنارے پر جو چیزیں ہمیں نظر آتی ہیں۔ جب وُہ پیچھے رہ جاتی ہیں۔ تو ہم کہتے ہیں۔ کہ کشتی آگے نکل گئی ہے۔ اسی طرح وقت کا دریا بہہ رہا ہے۔ اگر کوئی واقعہ رُونما نہ ہو۔ تو ہم نہیں کہہ سکتے ہیں۔ کہ کتنا وقت گذر رہا ہے۔ آپ رات کو سو جاتے ہیں یکایک مندر سے گھنٹی کی آواز آتی ہے۔ آپ اُٹھ بیٹھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ صُبح ہو گئی۔ اگر گھنٹی نہ بجے۔ پرندے اپنی راگنی نہ چھیڑیں۔ سُورج بھگوان اُجالا نہ کریں۔ غرضیکہ کوئی ایسا واقعہ نہ ہو۔ جس سے آپ وقت کے گذرنے کا اندازہ لگا سکیں تو آپ کو وقت کا احساس کیونکر ہو سکتا ہے۔ جسطرح گیا جی کی یاترا میں تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر راجیہ کی طرف سے پتھر کی مُورتیاں بنائی گئی ہیں۔ اور مُورتیوں سے پتہ چلتا ہے۔ کہ یاترا کا اِتنا فاصلہ طے ہو گیا۔ اور ابھی اِتنا فاصلہ باقی ہے۔ اِسی طرح واقعات جو ہمارے سامنے رُونما ہوتے ہیں۔ ہمیں کال یا وقت کے گذرنے کا پتہ دیتے ہیں۔ واقعات کیا

ہیں۔ کال یا ترائیں کو بس کے نشان ہیں۔ واقعات کال کے ٹکڑے ہیں۔ ہم واقعات کے ذریعہ وقت کو صبح دوپہر۔ شام رات ایک دن۔ ایک ہفتہ۔ ایک سال۔ ایک صدی میں تقسیم کر لیتے ہیں۔ اگر کوئی واقعہ معرض ظہور میں نہ آئے۔ تو ہمیں وقت کے منقضی ہونے کا احساس نہیں ہوگا"۔

"مانڈو ورشی" وچن کو سن کر خوش ہو جاتا ہے۔ اور کہتا ہے:۔ "مہاراج! یہ تو میں سمجھ گیا۔ لیکن آپ نے یہ بھی فرمایا تھا۔ کہ وقت کی تبدیلیاں خاموشی کے سوائے کچھ نہیں۔ میں ان شبدوں کا مطلب نہیں سمجھ سکا"۔

"کپل رشی" مسکرا کر کہتا ہے "بیٹا صبر کرو۔ میں یہی نکتہ تمہیں سمجھانے کو تھا۔ پرش کال کی زنجیروں میں قید ہے۔ اپنے گرد و پیش کے واقعات کو دیکھتا ہے۔ اور وقت کا اندازہ لگاتا ہے۔ بیٹا تمہیں کتنی بھی سوتنترتا کیوں نہ ملے۔ تمہیں کتنی بھی آزادی کیوں نہ دیدی جائے۔ تمہیں پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کرنے کی شکتی بھی مل جائے تم میں ساگر کا سارا جل پی جانے کی ہمت ہو لیکن اس ساری آزادی اور طاقت کے باوجود ایک بات ہے جو تم نہیں کر سکتے۔ تم جانتے ہو وہ کیا ہے"؟

"مانڈو" سر ہلا کر کہتا ہے "نہیں مہاراج"۔

"کپل رشی" اپنے سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے:۔ "ہاں دنیا بھر کی شکتیاں تمہیں دے دی جائیں لیکن ایک چیز باقی رہ جائیگی۔ جسکے سامنے تم بالکل عاجز ہو یعنی کال۔ تم دریا کو ساکن کر سکتے ہو۔ لیکن کیا تم میں اتنی طاقت ہے کہ تم وقت کے دریا کو روک لو۔ تم اپنا سارا زور خرچ کر دو۔ لیکن تم یہ نہیں کر سکتے۔ کہ وقت اپنی جگہ پر ٹھہر جائے۔ اسکی رَو رُک جائے۔ وقت ہر حالت میں ہر صورت میں گذرتا جائے گا۔ بیٹا! جب میں نے یہ کہا تھا۔ کہ پرش کال کی زنجیر سے جکڑا ہوا ہے۔ تو میرا یہی مطلب تھا۔ وقت کی لہریں تم میں سے گذر رہی ہیں۔ ایک پل۔ ایک گھڑی ایک پہر۔ ایک دن۔ ایک ہفتہ۔ ایک مہینہ۔ ایک سال۔ ایک صدی۔ اسی طرح لاانتہا صدیاں لگاتار جاری رہنے والی ندی کی طرح گذرتی جائینگی۔ ان کے گذر جانے کا اندازہ صرف واقعات سے ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی واقعہ رونما نہ ہو۔ تو وقت گذرنے کا اندازہ نہ لگ سکے۔ زمانہ گذشتہ۔ زمانہ حال اور زمانہ مستقبل دراصل ایک ہی چیز ہے۔ ہم نے اپنی سہولیت کی غرض سے اس کو تین حصوں میں تقسیم کر لیا ہے۔ ورنہ کیا کہیں وقت ختم ہو جاتا ہے۔ اور پھر شروع ہوتا ہے نہیں نہیں۔ وہ لگاتار جاری رہتا ہے۔ ہم اپنی کمزور درشٹی کے باعث آئندہ کے واقعات نہیں دیکھ سکتے۔ بھگوان تین کال میں رونما ہونیوالے واقعات کو دیکھتے ہیں۔ جو واقعات آج سے ایک لاکھ برس بعد کو ہونگے۔ وہ بھی بھگوان کی نظروں میں ہو رہے ہیں۔ جب کائنات ذرہ ذرہ ہو جائیگی۔ اور یہ ذرے بھی فنا ہو جائینگے۔ اور دنیا میں ہو کا عالم ہوگا اور بس۔ تو وہ حالت بھی بھگوان دیکھ سکتے ہیں۔ اور پھر سکون مطلق کے بعد فضا میں حرکت پیدا ہوگی۔ اور زندگی کا نیا دور شروع ہوگا۔ تو اس نئے دور کی ہماری باتیں بھگوان دیکھ رہے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا۔ کہ بھگوان کے نزدیک یہ ساری باتیں

ہو چکی ہیں۔ صرف پُرش اپنی اگیانتا کے باعث کہتا ہے۔ کہ کل یہ ہوگا۔ ورنہ کل جو کچھ ہوگا۔ وُہ ذاتِ مطلق کے نزدیک ہو چکا ہے"۔

مانڈو۔ "ہاں مہاراج! میں سمجھ گیا۔ آپ کا یہ مطلب ہے۔ کہ جب ہم وقت کی حدود سے بالاتر ہو کر یعنی وقت کی زنجیروں کو توڑ کر کال کے دونوں سروں یعنی اُسکی ابتداء اور اُسکی انتہا کو دیکھ لیں۔ تو سارے واقعات ہماری آنکھوں کے سامنے ہونگے۔ اُسوقت ہم یہ نہیں کہیں گے۔ کہ یہ واقعہ ہو چکا ہے۔ اور فلاں واقعہ ہوگا۔ نہیں سارے واقعات زمانہ حال میں بند ہو جائینگے۔ اِس سے صاف ظاہر ہے۔ کہ بھگوان کے نزدیک زمانہ مستقبل بھی زمانہ حاضر ہے۔ اور جن واقعات کے متعلق ہم کہتے ہیں۔ کہ یہ زمانہ مستقبل میں ہونگے۔ وُہ دراصل رُونما ہو چکے ہیں"۔

کپل۔ "ہمارے بھگوان بودھ نے دُنیا کو امن کی تعلیم دی ہے۔ ممکن ہے۔ لوگ اسپر عمل نہ کریں۔ اور آج سے ہزار دو ہزار برس بعد لڑائی شروع ہو جائے۔ تو ہمارے جیسے سادھارن پُرش تو یہ کہیں گے۔ کہ آئندہ لڑائی ہوگی لیکن دراصل وُہ لڑائی اور اِس لڑائی کے سارے واقعات رُونما ہو چکے ہیں۔ اور بھگوان انہیں دیکھ چکے ہیں گویا ہمارے نزدیک جو کچھ ہوگا۔ وُہ فی الحقیقت معرضِ ظہور میں آ چکا ہے۔ "ہوگا" ہم اِس لئے کہتے ہیں۔ کہ ہماری نظر دُور تک کام نہیں کر سکتی۔ اِس اصول میں انسانی زندگی کا سارا راز مضمر ہے۔ اِسے سمجھنے کے لئے یہ لو اِس پُستک کا مطالعہ کرو۔ اور میرے یاترا سے واپس آنے تک اُمید ہے۔ کہ تم اِس معمہ کو سمجھ جاؤ گے"۔

کپل یاترا کے لئے روانہ ہونے سے پیشتر وُہ اپنے شاگرد رشید مانڈو کو ایک پُستک دے جاتا ہے۔ جس میں چاتر رشی کی مشہور کہانی درج ہے۔ چاتر وُہی شخص ہے۔ جو ایک سائنس دان کی حیثیت میں مہاراجہ اشوک کا درباری بن گیا تھا۔ اسنے اشوک کے سامنے ایک ایسا کرتب دکھایا۔ کہ اُسے دیکھ کر سب تصویرِ حیرت بن گئے۔ اور اشوک نے ازراہِ ظرافت اِس کا نام رکھدیا "کل کا آدمی"۔ "کل کا آدمی" ایک عجیب لقب ہے۔ لیکن اِس کی موزونیت حقیقت پر مبنی ہے۔ بھگوان بودھ کے بعد اسکے پیرو آئندہ کا پروگرام مرتب کرنیکے لئے خاص جلسے منعقد کیا کرتے تھے۔ اِسی قسم کی ایک تاریخی مجلس میں جب رُوحانی اور دُنیوی مسائل پر بحث و تمحیص ہو چکی۔ فلسفہ اور سائنس کے دریا بہائے گئے تو چاتر رشی نے وُہ تجربہ دکھایا۔ جو بودھوں کی پُستکوں میں "کال درپن" کے عنوان سے مشہور ہے۔ ممکن ہے۔ ایران کے تاجدار جمشید نے "جامِ جمشید" کا خیال یہیں سے اخذ کیا ہو۔ "جامِ جمشید" اور "کال درپن" میں صرف اتنا فرق معلوم ہوتا ہے۔ کہ اول الذکر میں صرف زمانہ حاضر کے واقعات منعکس ہوتے تھے۔ لیکن "کال درپن" زمانہ ماضی اور زمانہ مستقبل کے حالات کا آئینہ دار تھا۔ اب اصل کہانی شروع ہوتی ہے۔ راوی لکھتا ہے:۔

"ایک بڑے طویل و عریض کمرے میں "کال درپن" کے ہزاروں شیشے ایک دُوسرے کے بالمقابل میزوں پر رکھے تھے چاتر نے ایک بٹن [illegible] ہیں۔ اسی

طرح بڑے شیشے میں جو درمیان میں واقع تھا۔ بے شمار واقعات کا عکس نظر آنے لگا۔ مرکزی شیشے کے دائیں طرف جتنے شیشے تھے۔ وُہ زمانۂ ماضی کا عکس اُتارتے تھے۔ اور جو شیشے اُسکے بائیں جانب تھے۔ وُہ زمانہ مستقبل کے حالات کو منعکس کرتے تھے۔ دائیں جانب کے شیشوں میں جہاتما بودھ کی پیدائش۔ انکی عظیم الشان زندگی۔ اُن سے پہلے دُنیا کے واقعات۔ یونان اور بابل کی تہذیب۔ اُن سے پہلے مرکزی ایشیا میں تمدن کے آثار۔ اور پھر اس سے پہلے وحشی انسان کی لڑائیاں اور اُن سے پہلے حیوان نما انسانوں کی بستیاں۔ آتش فشان پہاڑوں کی تباہ کاریاں۔ برف کے ہولناک طوفانوں کے ایک نہ ختم ہونیوالے سلسلہ میں نظر آنے لگے۔ ہم اس نظارہ کی تاب نہ لاسکے۔ سائنس دان نے ایک اور بٹن دبایا۔ اور بائیں جانب کے شیشے حرکت میں آنے لگے۔ واضح رہے۔ کہ ہر شیشہ کے درمیان ایک صدی کا فاصلہ تھا۔ اب جہاراج اشوک کے زمانہ سے آگے کے واقعات ظاہر ہونے لگے۔ اور ہم نے بعض ایسی باتیں دیکھیں کہ ہم چاتر کے اس "کال درپن" کو ایک دیوانہ شخص کے کھلونے سے زیادہ اہمیت دینے کو تیار نہ ہوئے۔ چاتر نے ایک بڑا شیشہ اُٹھایا۔ اور اُسے بائیں جانب کے ان دو شیشوں کے درمیان رکھدیا۔ جو نمبر ۲۰۔ اور ۲۱ پر نصب تھے۔ وُہ اُس شیشہ پر لیٹ گیا۔ اور لیٹتے ہی اُس نے ایک لیور دبایا۔ بجلی کی سی لہر سارے کمرے میں پھر گئی۔ پھر ایک کڑک کی آواز آئی۔ ساری روشنی گُل ہوگئی۔ تاریکی کے عالم میں ہمیں کچھ نظر نہ آیا۔ ہم گھبرا کر باہر آگئے۔ جہاراج نے جلدی سے مشعل جلانے کا حکم دیا۔ دیکھا۔ تو ساری مشین ایک ڈھیر کی صورت میں تھی۔ چاتر رشی کا کہیں نشان نظر نہ آیا۔ وُہ گم ہوچکا تھا۔ صرف ایک شیشہ باقی تھا۔ نمبر ۲۱ والا شیشہ۔ مشعل کی مدھم روشنی میں ہم نے اُس شیشے میں ایک حیرت انگیز نظارہ دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا چاتر بیہوشی کے عالم میں جہاراج اشوک کے زمانہ سے ۲۱ صدیاں بعد کے زمانہ میں داخل ہورہا ہے۔ وہاں ایک بڑا سا کمرہ ہے۔ جہاں بجلی کے تجربے ہورہے ہیں۔ وہاں بھی بجلی بُجھ گئی ہے۔ اور جب دوبارہ بجلی کا لمپ روشن ہوا۔ تو دیکھا۔ کہ چاتر نیم غشی کی حالت میں ایک میز پر پڑا ہے۔ اور تین چار وَیدا در سائنس دان اُسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کے حلق سے عجیب قسم کی آوازیں آتی تھیں۔ اور وُہ آوازیں تصویر بنکر ہمارے سامنے ظاہر ہوجاتی تھیں۔ اُن میں سے ایک سائنسدان نے کہا "معلوم ہوتا ہے۔ یہ زمانہ گذشتہ کا کوئی شخص زمان و مکان اور اسباب کی دُنیا سے بالاتر ہوکر بیسویں صدی میں آداخل ہوگیا ہے"۔

نوٹ۔ اسکے بعد کہانی میں ایسی عملی اصطلاحیں درج ہیں۔ جو عوام کی سمجھ میں نہیں آسکتیں مثلاً مشرقی اور مغربی سائنس کی اصطلاحیں ہیں۔ میں نے افسانہ نگاری کے اصول کے مُطابق ان کو زمانہ حال کی روشنی میں پیش کر دیا ہے ...... مستانہ جوگی)

ایک وید نے کہا "معلوم ہوتا ہے کہ ۲۱۳۵ سال کے طویل سفر نے اس مسافر کو بے حال کر دیا ہے۔ اگرچہ حد سے زیادہ کمزور ہے لیکن دل کی حرکت قائم ہے۔ گو نہایت خفیف"۔

[illegible]

مُسافر کے اِرد گِرد دیٹی ہوئی تھیں۔ ان کو کاٹنا شروع کیا ✤

چاتر رشی کو پلنگ پر لٹا دیا گیا۔ وُہ ننھا سا آدمی تھا۔ پانچ فُٹ کے قریب رشری ہیت مہاتما گاندھی سمجھ لیجیے۔ (ایڈیٹر) سر اور مُنہ مُنڈا ہُوا۔ زردی مائِل سفید۔ عُمر پچاس سال کے لگ بھگ۔ خط و خال چھوٹے لیکن مضبُوط ان میں ایک بیقاعدگی سی تھی۔ دِلکش قسم کی پیشانی اُبھری ہُوئی اور نمایاں۔ جسم پر ایک لنگوٹی کے سوائے کچھ نہ تھا۔ پاؤں میں کسی خاص چیز کی بنی ہوئی چپلی تھی۔ ڈاکٹر نے اپنا سٹیتھیسکوپ اُٹھایا۔ اور قلب کی حالت کا مطالعہ کرنے لگا۔ یکایک اُسنے اپنا آلہ ہٹا لیا۔ اور کہنے لگا۔ یہ عجیب بات ہے۔ اُس شخص کا دِل دائیں طرف ہے۔ سائنس دان نے کہا۔ یہاں آپ کا عِلم طِب کام نہیں آسکتا۔ اِس میں تعجّب کی کونسی بات ہے۔ جب ایک چیز اُوپر سے نیچے کو گرتی ہے تو اُوندھے مُنہ گرتی ہے۔ یہ شخص ۲۱ صدیوں کا سفر کرتے ہُوئے اب بیسویں صدی میں آگرا ہے۔ قُدرتی اَمر تھا۔ کہ اسکے اندرُونی اعضا اپنی جگہ سے بدل جاتے ✤

چاتر نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ جو اِستعجاب سے پتھرائی ہوئی معلُوم ہوتی تھیں۔ اس کا رنگ بُہت ہی زرد پڑ گیا تھا۔ اُسنے اپنی کہنیوں کے بل اُٹھنے کی کوشش کی۔ لیکن حیرت و دہشت کے مارے پھر پلنگ پر آرہا۔ آخر اُسنے کہا "مَیں کہاں ہُوں۔ تُم لوگ کون ہو"؟

بھلا بیسویں صدی کے لوگ مہاراجہ اشوک کے زمانہ کی پراکرت کہاں سمجھ سکتے تھے۔ اُنہوں نے آپس میں مشورہ کیا۔ اور اورنٹیل کالج کے پرنسپل کو ٹیلی فون پر بُلا بھیجا۔ اِس دَوران میں چاتر ایک گاؤ تکیہ کے سہارے بیٹھ گیا تھا پرنسپل آیا۔ تو چاتر یُوں کہہ رہا تھا "مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میرے سَت سَنگ والے آدمی کہاں ہیں۔ مہاراج کہاں گئے۔ کیا مَیں مر چکا ہُوں۔ اور مرنے کے بعد یہی نظارے پیش آتے ہیں۔ یا زمان و مکان و اسباب کی دُنیا سے نکل کر میں چوتھے ضِلع میں داخل ہو گیا ہُوں۔ اشوک سے پہلے کا زمانہ ہے یا بعد کا۔ مجھے تجربہ دِکھاتے وقت خیال نہ رہا۔ عالمِ وارفتگی میں مَیں نے اپنی کلا کا بٹن دبا دیا۔ اب معلُوم نہیں مَیں کہاں ہُوں"؟

پرنسپل نے پراکرت میں جوابدیا:۔ "آپ بیسویں صدی میں ہیں" ✤

چاتر نے اُنگلیوں پر حساب کرتے ہُوئے کہا "یہ ہو نہیں سکتا۔ مَیں تو اپنے حساب کے مُطابق گوتم بودھ کے ۲۳۹ سال بعد تک آگیا تھا۔ اور آپ بتا رہے ہیں بیسویں صدی" ✤

پرنسپل:۔ "آپ کا حساب بالکل ٹھیک ہے۔ آپ کا سن مہاراج بودھ سے ہوتا ہے۔ اور ہمارا سن حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے شروع ہوتا ہے جنہیں اُنیس سَو سال سے کچھ اُوپر گذر چُکے ہیں۔ بھگوان بودھ حضرت عیسےٰ سے ۵۰۰ سال پہلے ہُوئے ہیں۔ بہر حال آپ ہمارے مِہمان ہیں۔ اور آپ خُوش ہونگے۔ کہ آپ کے مُقابلہ میں ہمارے زمانہ میں کس قدر ترقی ہُوئی ہے" ✤

"ترقی" - چاتر نے ہنس کر کہا۔"ترقی ممکن ہے بعض باتوں میں اصلاح ہوتی ہو۔ لیکن ہم لوگ تو آنے والے زمانہ کا درشن دیکھ چکے ہیں۔ ہم سے ہنسی مذاق کرنا مناسب نہیں۔ فرق اتنا ہے۔ کہ میں یہ نظارہ کال درپن میں دیکھا کرتا تھا۔ اب اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے۔ آپ کہتے ہیں۔ آپ نے بڑی ترقی کی ہے۔ بات یہ ہے کہ سائنس ابھی گھٹنوں کے بل چل رہی ہے۔ اور تہذیب و ترقی کے اعتبار سے تم ابھی بچے ہو۔ میں نے اپنے کال درپن میں پچاس شیشے لگا رکھے تھے۔ گویا آپ کے حساب کے مطابق میں ۵۰۰۰ سنہ کی متمدن تہذیب کے مناظر دیکھ چکا ہوں۔ اس تہذیب یافتہ دنیا کے مقابلہ میں تم جاہل محض ہو"۔

چاتر نے کمرے کے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ اور حیران ہو کر پوچھا:- "میں کہاں ہوں۔ کیا میں عجائب خانہ میں ہوں اور یہ تصویریں کس وضع کی ہیں۔ اور یہ پرانے زمانہ کے لمپ۔ غالباً تم دن کو بجلی کے لمپ کہتے ہو۔ یہ دراصل زمانۂ جہالت کی یادگار ہے۔ تم برقی لمپ کی بجائے "اٹامک لمپ" کیوں نہیں استعمال کرتے"۔

"اٹامک لمپ"؟ ڈاکٹر نے پوچھا۔

"ہاں ایسے لمپ جن میں برقی رو کے بجائے ذرہ سے حاصل کردہ طاقت کام کر رہی ہو۔ بیسویں صدی کے اندر ہی ان کا عام رواج تھا۔ اور برقی لمپ اسی طرح عجائب گھر میں رکھے جائینگے۔ جسطرح ہمارے زمانہ کے چراغ اور مشعلیں اور قندیلیں رکھی جاتی ہیں"۔

چاتر ایک لمحہ کے لئے چپ ہو گیا۔ پھر اسنے ڈاکٹر اور سائنسدان کی طرف دیکھا اور کہا۔ "اور یہ تمہارے کپڑے کس قسم کے ہیں۔ کیا تم لوگ کسی فینسی بال میں جا رہے ہو۔ ان کپڑوں کو دیکھ کر خواہ مخواہ ہنسی آتی ہے۔ یہ زمانۂ جاہلیت کی یادگار ہیں۔ اگر تم انہیں کسی عجائب فروش کے ہاں لے جاؤ۔ تو وہ یقیناً بیس پچیس سلگو تو ضرور دیگا"۔

"سلگو! سلگو کیا بلا ہے"؟ ڈاکٹر اور سائنس دان نے بے اختیار کہا۔

چاتر۔ "اچھا تو آپ کو "سلگو" کا بھی پتہ نہیں۔ بیسویں صدی کے آخر میں "سلگو" عالمگیر تبادلہ کا سکہ قرار دیا گیا ہے۔ اس "سلگو" میں سلور یعنی چاندی اور گولڈ یعنی سونے کا مرکب ہے۔ اور یہ سکہ ہر ملک میں چل سکتا ہے"۔

ڈاکٹر کسی قدر کھسیانہ سا ہو گیا۔ اسنے تیزی سے پوچھا۔ "معلوم ہوتا ہے۔ آپ منو مہاراج کے زمانہ کی یادگار ہیں۔ اور ذکر کرتے ہیں آئندہ پانچ ہزار سال کا۔ آپ کے زمانہ میں لوگ ننگے ہی پھرا کرتے تھے۔ بھلا آپ کو وضع داری اور لباس سے کیا واسطہ۔ کیا آپ یہ چاہتے ہیں۔ کہ لوگ ہر وقت غسل کا لباس پہنا کریں"؟ چاتر نے کمال اطمینان و سکون سے جواب دیا "میرے دوست! اول تو غسل کے لئے کسی لباس کی ضرورت نہیں۔ آپ میری طرف دیکھئے۔ آپ کے زمانہ سے دو ہزار سال پہلے ہم لوگوں نے معلوم کر لیا تھا۔ کہ انسان کو بہت ہی کم لباس کی ضرورت ہے۔ آفتاب کی شعاعوں کو صحت اور شباب کا پیغام لیکر آ... [illegible] ...گیا۔ آپ

میرے لباس کی طرف دیکھئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ گویا ۱۹۵۰ء میں سنسر نے یہی لباس میرے لئے تجویز کیا ہے۔ لیکن میں ابھی تک نہیں سمجھا۔ اور وہ یہ کہ میں نے "کال درپن" کے شیشہ نمبر ۱۲ کا لیور غلطی سے دبا دیا تھا۔ کیا آپ نے کوئی اسی قسم کی کل تیار کر رکھی تھی۔ یہ کیا معاملہ ہے"؟

سائنس دان نے کہا "ہاں! ہم چار اضلاع والی مشین سے تجربہ کر رہے تھے۔ آپ جانتے ہیں۔ کہ چوتھے ضلع میں تو وقت بے معنی چیز ہے۔ آپ کی مشین اور ہماری مشین حسن اتفاق سے ایک ساتھ چل دیں۔ اور آپ یہاں آ گئے۔ ہمیں خوشی ہے لیکن ساتھ ہی ہماری مشین سراسر ناکارہ ہو گئی۔ آپ ہماری تہذیب میں اور کس شئے کی کمی محسوس کرتے ہیں"؟

چاتر نے کسی قدر بلند آواز سے جواب دیا: "مترو۔ آپ کے پاس رکھا ہی کیا ہے۔ کیا آپ جانوروں اور حیوانوں کی بولیاں سمجھ سکتے ہیں؟ کیا آپ نے بیماریوں کا خاتمہ کر دیا ہے۔ آپ کو تو معاف فرمائیں۔ ابھی کپڑا پہننے کی تمیز نہیں۔ آپ نے کپڑوں سے سارے جسم کو باندھ رکھا ہے۔ کیا آپ زمانہ مستقبل کو دیکھ سکتے ہیں۔ کیا آپ دوسرے کے خیالات کا پتہ لگا سکتے ہیں۔ کیا آپ دوسروں کی عقل کو ناپ سکتے ہیں۔ کیا آپ ابھی تک شادی شدہ لوگوں کو گھریلو مصیبتوں اور لڑائی جھگڑوں سے محفوظ رکھنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ کیا آپ نے ابھی تک اعلیٰ و برتر انسان پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کر لی ہے نہیں نہیں۔ آپ ابھی تک بچے ہیں"۔

چاتر کی تقریر سن کر سب خاموش ہو گئے۔ اب وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ایک کمزور زرد رو ننھا سا انسان۔ اس کے دونوں بازو خمیدہ حالت میں کمر پر تھے۔ سر کسی قدر غرور و رعونت کے انداز میں پیچھے کی طرف تھا۔ وہ چند لمحوں کے لئے چپ رہا۔ پھر اس نے با آواز بلند کہا: "سرمشٹھا۔ سرمشٹھا! ہم کب ملیں گے"؟ اس آواز میں انتہائی رنج و کرب تھا۔ اس نے سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا: "سرمشٹھا میرے دارالتجارب میں میری نائب تھی۔ ممکن تھا۔ کہ باہم کام کرنیکے بعد ہم زندگی بھر کے لئے ایک دوسرے کے رفیق بن جاتے۔ لیکن اب ہمارے درمیان کئیں صدیوں کی دیوار حائل ہے۔ ایک بات ضرور ہے جس کی بناء پر میں امید کی نہایت خفیف سی شعاع دیکھ رہا ہوں ......" "وہ کیا"۔ ڈاکٹر نے پوچھا۔

"یہ تو ظاہر ہے کہ میرا "کال درپن" آپ کی مشین کی طرح بالکل ناکارہ ہو چکا ہے۔ ممکن ہے کہ سرمشٹھا کسی نہ کسی کی مدد سے اسے درست کر لے۔ اور پھر میری تلاش میں نکلے۔ ادھر سے ہم آپ کی مشین کو از سر نو باقاعدہ مرتب کر لیں۔ اور اس کی مدد سے "سرمشٹھا" کو پیغام بھیج سکیں۔ لیکن میری مدد کے بغیر وہ "کال درپن" بنانے میں کامیاب نہ ہو سکے گی یہ میرا خیال ہے"۔

سائنس دان نے پوچھا "آپ نے چار اضلاع کے متعلق جو تجربے کئے ہیں۔ وہ کہاں تک کامیاب ثابت ہوئے"؟

چاتر "چار اضلاع۔ ہم لوگوں کو اتنی ابتدائی باتوں سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ اب تو ہم پانچ اضلاع کی تحقیقات میں مصروف [illegible] اکیسویں صدی

گر پڑا۔ ہم چاند کی دوسری طرف دیکھنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ ہم خیالات کی طاقت سے بجلی کا کام لیتے ہیں۔ ہزاروں برس سے پہلے اور ہزاروں برس بعد کے لوگوں کو اسطرح دیکھ سکتے ہیں۔ جسطرح آپ میرے سامنے کھڑے ہیں۔ ہم ان کی آوازیں سُن سکتے ہیں۔ کیونکہ آواز محض اُن لہروں کا نام ہے۔ جو فضا میں پیدا ہوتی ہیں۔ اور ان کی حرکت ہمیشہ جاری رہتی ہے۔ کوئی شے فنا نہیں ہوتی۔ اگر پانچ اصلاع کا تجربہ پایۂ تکمیل کو پہونچ جاتا۔ تو دوسرے ستاروں اور سیاروں کی آبادی سے باتیں کر سکتے تھے۔ یہ معلوم کر سکتے تھے۔ کہ نظام شمسی سے جو ستارہ "وجے" کے نام سے دس ارب نوری سال کے فاصلہ پر قائم ہے۔ اس میں ایک سال بعد کیا تبدیلی واقع ہوگی"؟

"وجے! وجے!! ہم نے تو یہ نام نہیں سُنا۔" سائنس دان نے کہا +

"اور تم نے سُنا کیا ہے" چاتر نے کسی قدر رعونت آمیز تبسم سے پوچھا +

"ایک ثانیہ میں روشنی ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل کا فاصلہ طے کرتی ہے۔ اگر روشنی ایک سیکنڈ کی بجائے دس ارب سال تک سفر کرتی رہے۔ تو اسکے سفر کا جو طول ہوگا۔ وُہ سورج اور وجے کا درمیانی فاصلہ ہے۔ پانچ اصلاع کی مشین سے وہاں کے حالات بھی معلوم ہو سکتے ہیں" +

ہم سب مرعوب ہو گئے۔ واقعی یہ عجیب و غریب انسان تھا۔ آخر ڈاکٹر نے انتہائی خلق سے کہا:۔ "مہاراج آپ تھک گئے ہونگے۔ اور یقیناً بھوکے ہونگے۔ قدرے ناشتہ کر لیجئے" + ڈاکٹر کمرے سے باہر گیا۔ اور نوکر کے ہمراہ کھانا لایا۔ نوکر نے چند پلیٹ میز پر رکھدیں۔ اور ساتھ ہی پیالہ میں چائے ڈالدی + چاتر میز کے قریب کھڑا تھا۔ اُس کا قد میز سے کچھ ہی زیادہ ہوگا۔ اُسنے پلیٹ پر نظر ڈالی اور پھر چائے کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں علامت استفہامیہ ظاہر ہو رہی تھی گویا وہ کچھ پوچھنا چاہتا ہے۔ اسکے دونو نتھنے پھول رہے تھے۔ گویا وُہ کھانا کی خوشبو سے معلوم کرنا چاہتا ہے۔ کہ یہ کیا شئے ہے۔ پھر اسکے لب ایک نفرت آمیز انداز میں متحرک ہوئے۔ اور یکایک اُسنے ہاتھ کی ایک حرکت سے چائے کی پیالی کو پرے پھینک دیا۔ اور میز سے یوں دُور چلا گیا۔ گویا پلیٹ میں کوئی زہریلی شئے پڑی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر نے گھبرا کر پوچھا۔ "کیوں مہاراج کیا بات ہے۔ یہ کھانا آپ کے حسب منشا نہیں"؟

چاتر "کیا بات ہے۔ بات یہ ہے کہ آپ ابھی تک وحشی ہیں۔ آپ نے میرے سامنے غلاظت کا ڈھیر رکھدیا ہے اگر میں غلطی نہیں کرتا۔ تو یہ گوشت ہے۔ ہمارے رفیق پیارے اور بے زبانوں کے جسم سے کاٹا ہوا اور آگ میں جلایا ہوا گوشت"

ڈاکٹر فوراً معافی کا خواستگار ہوا۔ اُسنے کہا "مجھے یاد نہ رہا۔ کہ آپ بودھ مذہب کے پیرو ہیں۔ اور گوشت آپ کے لئے ایک ممنوع شئے ہے" +

چاتر۔ اس میں مذہب کا کیا تعلق ہے۔ میں ایک سیدھا سادہ ساوھارن انسان ہوں۔ اور عام صحیح الخیال انسانوں کی طرح [illegible] نہیں [illegible] ہوں

آپ نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے"۔

یہ کہکر چاتر نے تھالی کو اُٹھا کر کھڑکی کے باہر پھینک دیا۔ آخر دُودھ اور پھلوں سے اُسکی تواضع کی گئی۔ شام کے وقت "کل کے آدمی" کی شہرت دُور دراز مقامات تک پھیل چکی تھی۔ اخبار نویسوں کا ہجوم ڈاکٹر کی لیبوریٹری میں جمع ہو گیا۔ ایک اخبار نویس نے اپنا سگریٹ کیس کھولا۔ اور چاتر کو پیش کیا۔ سگرٹ کو دیکھکر چاتر اسطرح چونک اُٹھا۔ گویا وہ کسی سانپ کو دیکھ رہا ہے۔ اُسنے کہا۔ "کیا ان چیزوں سے اپنے جسم کو ناپاک اور زہر آلود بنانے کی رسم ابھی تک تم لوگوں میں جاری ہے"؟

اخبار نویس نے قہقہہ لگایا۔ "خوب! میں اس واقعہ کو اخبار میں درج کرونگا۔ اچھا آپ یہ تو فرمائیں۔ آپ کیا کھاتے ہیں اور کیا پیتے ہیں"؟

چاتر نے جوابدیا۔ "آپ لوگ اپنے وقت کو ایسی فضول باتوں میں کیوں ضائع کر رہے ہیں۔ کھانا اور پینا ہر شخص کے لئے ایک پرائیویٹ معاملہ ہے"۔ ایک اور اخباری نمائندہ نے دریافت کیا۔ "آپ کتنے گھنٹے سوتے ہیں۔ آپ چائے پیتے ہیں یا نہیں؟ کیا آپ روزانہ غسل کرتے ہیں۔ آپ شکل وصورت سے سنیاسی نظر آتے ہیں۔ آپ کو کسی نشیلی چیز کی عادت ہے یا نہیں"؟ چاتر نے کہا۔ "اب مجھے کامل یقین ہو چکا ہے۔ کہ آپ لوگوں کی تہذیب ابھی ابتدائی حالت میں ہے۔ ہمارے زمانہ میں ایسی طفلانہ باتیں برداشت نہیں کی جاتیں۔ مجھے ڈاکٹر نے ابھی ابھی بتایا ہے۔ کہ آپ لوگ شراب اور اسی قسم کی دُوسری منشیات کے انسداد کے لئے قانون پاس کرتے ہیں۔ لیکن ۲۱۳۵ء میں ان کا کوئی ذکر نہیں۔ ہر شخص انکے اثرات سے واقف ہے۔ میرے اصل وطن میں یعنی کپل وستو میں اور میرے حقیقی زمانہ میں یعنی بھگوان بودھ کے عہد مسعود میں خاص لوگ "سنجیونی بوٹی" کا رس پیا کرتے تھے۔ عوام پھلوں کے رس پر گذارہ کرتے تھے"۔ ایک اور اخباری نمائندہ نے سوال کیا "مہاراج! عورتوں کو مساوی حقوق دینے کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔ قیدخانوں کی اصلاح کس طرح ہو سکتی ہے۔ بیکاری دُور کرنیکے کیا طریقے ہیں"؟ چاتر کے چہرے پر استعجاب اور غصہ کے آثار نمایاں ہوئے۔ اُسنے کڑک کر کہا۔ "آپ لوگ مجھے کیا سمجھتے ہیں۔ کیا میں دُنیا بھر کے مسائل کے متعلق کوئی ماہر خصوصی ہوں"۔ اخباری نمائندہ نے کہا۔ "مہاراج! آپ ہمارا مطلب نہیں سمجھے۔ ہمیں کسی ماہر خصوصی کی رائے سے واسطہ نہیں۔ ہم تو محض آپ کی ذاتی رائے ان معاملات کے متعلق معلوم کرنا چاہتے ہیں"۔ چاتر رشی نے کہا۔ "ایسی رائے کا کیا فائدہ؟ جو عدم واقفیت پر مبنی ہو۔ آپ مجھ سے آسمان کی باتیں پوچھیں۔ میں جوتشی ہوں۔ آپ مجھ سے طبعیات کے متعلق سوال کریں۔ میں علم طبعیات کا ماہر ہوں۔ آپ مجھ سے فلسفہ پر بات چیت کریں جس سے مجھے خاص دلچسپی ہے۔ اب آپ لوگ تشریف لے جائیں۔ آپ نے میرا کافی وقت ضائع کر دیا ہے"۔ دُوسرے دن اخباروں کے سنڈے ایڈیشنوں میں "اکیسویں صدی کے آدمی کی ملاقات بیسویں صدی میں"۔ "بیسویں صدی کے لوگ طفلانہ باتوں میں وقت [illegible] اپنے جسم کو ناپاک نہ کرو۔ میں آسمان کا حال جانتا ہوں"۔ بھگوان

بودھ کی تعلیم حاصل کرو"۔ غرضیکہ اس قسم کے عنوانات سے ہر اخبار نے چاتر کی طاقت کے حالات با تصویر پیش کئے
ڈاکٹر نے چاتر کو اخباروں کے مضمون پڑھ کر سنائے۔ اور چاتر نہایت برافروختہ ہوا۔ اور اس نے کہا بیسویں صدی کے لوگ
میں سچ بولنے کی عادت نہیں۔ ہر شخص نے میری رائے کا اظہار کرتے ہوئے مبالغہ اور رنگ آمیزی سے کام لیا ہے"۔

اب "چاتر" کے نام ڈاکٹر کی معرفت ہزاروں چٹھیاں روزانہ آ رہی ہیں۔ ان میں کوئی شخص بدنی طاقت کا نسخہ پوچھ
رہا ہے۔ کسی نے اپنے شہر میں آکر لیکچر دینے کی درخواست کی ہے۔ ایک نے یہ لکھا۔ اگر آپ جوتشی ہیں۔ تو بتایئے۔ میرا خاوند جو
آسٹریلیا میں ہے۔ واپس کب آئیگا؟ ایک پبلشر نے یہ لکھا۔ شری یت مہاشہ! ہم ہر سال اپنے دیش کی ایک ہزار مشہور ہستیوں
کے حالات کتابی صورت میں شائع کرتے ہیں۔ ہم نے اس فہرست میں آپ کا نام شامل کر لیا ہے۔ ہم ممنون ہونگے۔ اگر آپ اپنی زندگی
کے حالات لکھ کر بھیجیں۔ ٹمپرنس سوسائٹی نے "چاتر" کی قد آدم تصویر اپنے ہال میں نصب کرنے کا اعلان کیا۔ بین الاقوامی
مجلس علم الطبیعات نے اس سے درخواست کی۔ کہ وہ ۲۱۳۵ء کے آلات حرب کے متعلق تقریر کرے۔

"چاتر" نے ان سب کے جواب میں خاموشی اختیار کی۔ "یہ لوگ پرلے درجے کے جاہل ہیں"۔ یہ کہکر وہ چپ ہو گیا۔
اس دوران میں وہ ڈاکٹر کی لیبورٹری میں بند ہو کر تجربے کرتا رہا۔ اس نے ملاقاتوں کا سلسلہ قطعی بند کر دیا تھا۔ رفتہ رفتہ
یہ افواہ پھیلی۔ کہ اکیسویں صدی کا مرد واپس جانے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ ایک شام کا ذکر ہے۔ کہ چاتر لیبورٹری سے باہر نکل
ہی تھا۔ کہ اسے ایک اخباری نمائندہ نے گھیر لیا۔ چاتر نے کہا: "تم چلے جاؤ یہاں سے ورنہ تمہارے حق میں اچھا نہ
اخبار نویس نے کچھ کہنا چاہا۔ اتنے میں چاتر نے جیب سے پستول نکالا۔ اسکی لبلبی دبائی۔ اخضری یعنی سبز رنگ کا ایک شعلہ
نمودار ہوا۔ اور اخبار نویس بیہوش ہو کر گر گیا۔ وہ دو گھنٹے تک غشی کے عالم میں رہا۔ اسکے بعد وہ خود بخود اٹھا۔ اور
دفتر کی راہ لی۔ دوسرے دن یہ واقعہ اخبار میں شائع ہوا۔ اور چاتر کی شہرت ملک کے طول و عرض میں پھیل گئی۔ چند دن
بعد ایک اور شخص کو "چاتر" نے پستول کا نشانہ بنایا۔ اور ڈاکٹر نے پوچھا۔ تو چاتر نے یہ جواب دیا۔ کہ یہ شخص مجھے رشوت
پیش کر رہا تھا"۔ ڈاکٹر نے دریافت کیا "رشوت"؟

"ہاں رشوت! اس نے کہا۔ کہ اگر آپ بیہوش کرنیوالے پستول کا راز بتا دیں۔ تو ہم آپ کو دس ہزار روپیہ نقد دینگے"۔

ڈاکٹر نے کہا۔ "مہاراج! آپ اسے رشوت کہتے ہیں۔ یہ تو معاوضہ ہے"۔

چاتر نے قطعی انداز میں جواب دیا۔ "رشوت اور معاوضہ میں کوئی فرق نہیں۔ بھگوان نے ساری کائنات کو سکھشا دی
اور کیا اس کا کوئی معاوضہ لیا"۔ اس واقعہ کے بعد چاتر نے حکم دیا۔ کہ اسکی ڈاک کو کھولے بغیر آگ کی نذر کر دیا جائے۔ وہ
قریباً رات دن ڈاکٹر کی لیبورٹری میں کام کرتا۔ ایک شام کا ذکر ہے۔ کہ جونہی وہ لیبورٹری سے باہر نکلا۔ ایک شخص نے چپکے سے
ایک لفافہ اسکی میز پر رکھدیا۔ دوسرے دن چاتر نے لفافہ کھول کر پڑھا۔ اور حیران سا رہ گیا۔ وہ چٹھی یوں تھی۔

دوسری چٹھی چاتر جی مہاراج! آپ نہایت بودھ کے زمانہ کے انسان ہیں۔ یہ بیسویں صدی ہے۔ اسلئے آپ کو

اِس بات کا احساس نہیں۔ کہ آپ ایک بھیک منگے کی طرح ڈاکٹر کے دروازے پر پڑے ہیں۔ آپ کا کیا حق ہے۔ کہ آپ دوسروں کی خیرات پر گُذارہ کریں۔ کیا یہ بات آپ کی عزتِ نفس کے مُطابق ہے۔ کیا آپ کا ضمیر گوارا کر سکتا ہے۔ کہ دوسرا شخص آپ کو مہمان بنائے رکھے۔ جب آپ اپنی روزی آرام سے کما سکتے ہیں۔ آپ ہمارے رسالہ "آئینہ عالم" میں مضمون لکھئے۔ آپ کو فی مضمون ایک سو روپیہ پیش کیا جائے گا"۔ (راقم ایڈیٹر:۔ "آئینہ عالم")

"چاتر" پر ایک گہری افسردگی طاری ہو گئی۔ ڈاکٹر اور اُسکے احباب نے اُس کا دل بہلانے کی ہزار کوشش کی۔ لیکن یُوں معلوم ہوتا تھا۔ اُس پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ آخر اُسنے کہا:۔ "یہ دُنیا میرے مطلب کی نہیں۔ بھگوان کے زمانہ میں لوگ ہم لوگوں کے دروازوں پر ساری دُنیا کی نعمتیں لئے بھٹکا کرتے تھے۔ اور ہم آنکھ اُٹھا کر اُنکی طرف نہیں دیکھتے تھے۔ اب یہاں یہ حالت ہے۔ کہ مجھے بھک منگا ہونے کا طعنہ دیا جاتا ہے۔ میں یہاں نہیں رہ سکتا۔ میں آپ لوگوں کو دھنباد کرتا ہوں اور رخصت ہونے سے پیشتر میں اتنا کہہ دینا چاہتا ہوں۔ کہ جس طرح آج سے دس ہزار سال پہلے مایا قوم تباہ ہو گئی تھی۔ اِس طرح یہ پاپ کی دُنیا سمندر میں غرق ہو جائیگی"۔

ڈاکٹر:۔ "مہاراج! کیا یہ واقعی درست ہے۔ کہ آثار قدیمہ کے ماہرین جس ٹاپو کے مُتعلق بیان کرتے ہیں۔ کہ وہ یکا یک سمندر میں غائب ہو گیا۔ وہ مایا قوم کی بستی تھی"؟

چاتر۔ "ہاں! یُونانی کتابوں میں اِس ٹاپو کا مجمل ذکر آتا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں تو پرانوں میں "سورن ٹاپو" کا مفصل حال موجود ہے۔ بھگوان کے زمانہ میں "تارک" نامی سادھو نے پالی زبان میں "سورن ٹاپو" کے باتصویر حالات قلمبند کئے تھے۔ خیر اِس قصہ کو چھوڑو۔ میں سونا چاہتا ہوں"۔

دُوسرے دن شہر بھر کی دیواروں پر قد آدم پوسٹر نظر آتے تھے۔ جنہیں دیکھ کر ڈاکٹر بہت پریشان ہُوا۔ "ایک نامعلوم اجنبی نے قیدیوں کو رہا کر دیا۔" "کل کے آدمی نے قیدیوں کو چھڑا دیا۔" "ہر شہری کا فرض ہے کہ اِس نو وارد کو گرفتار کرنے میں مدد دے"۔ اِس قسم کے عُنوان واقعی وحشت انگیز تھے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ چاتر جی مہاراج شام کو سیر کرنے کی غرض سے جیل خانہ تک جا پہونچے۔ وہاں جو دیکھا۔ کہ ایک سپاہی بندوق ہاتھ میں لئے پہرہ دے رہا ہے۔ سپاہی نے ان کو مہاتما سمجھ کر کہہ دیا۔ کہ یہ جیل خانہ ہے۔ جہاں لوگ قید رکھے جاتے ہیں۔ "چاتر" نے طیش میں آ کر کہا۔ کہ "بھگوان بودھ نے دُنیا کو قید و بند سے چھڑانے کے لئے جنم لیا تھا۔ اور آپ لوگوں کو زنجیروں میں باندھ رہے ہیں"۔ آپ نے فوراً جیل خانہ میں داخل ہونیکی کوشش کی۔ سپاہی مزاحم ہُوا۔ تو آپ نے جھٹ اخضری شعاعوں کے آلہ سے اُسکو بیہوش کر دیا۔ راستہ میں جو آیا اُسے بیہوش کرتے گئے۔ بیہوش پہرہ دار کی کُنجیاں لیکر آپ نے چند قیدیوں کو چھڑا دیا۔ اور جب الارم کی گھنٹی بجی۔ تو اپنی قیدیوں کی مدد سے باہر نکل گئے۔ اور پھر اُن کا پتہ نہ ملا۔

چند سپاہی ڈاکٹر کے مکان پر آئے کہ ... نہیں پتہ لگا ہے ... یہ شخص جس کا جُرم ... آپ کا

مہمان ہے۔ اُسے ہمارے حوالہ کردیں۔ ڈاکٹر نے ساری داستان بیان کردی۔ اور آخر کار کہا۔ کہ "میرا خیال ہے۔ چاتر جی مہاراج لیبورٹری میں ہونگے"۔ اُن سب نے لیبورٹری کی راہ لی۔ اندر سے دروازہ بند تھا۔ اُنہوں نے کھڑکی میں سے دیکھا کہ کمرے میں "کال درپن" کی مشین حرکت میں ہے۔ اُنہوں نے کھڑکی کو توڑ کر اندر داخل ہونے کی کوشش کی۔ تو اُن کے پاؤں فرش پر ایک برقی تار سے ٹکرائے۔ اور وُہ سب کے سب بیہوش ہو کر زمین پر گر گئے۔ جو آدمی لیبورٹری کے باہر تھے اُنہوں نے ٹیلیفون کے ذریعہ بجلی گھر کو اطلاع دی۔ برقی رَو کو فوراً روک دیا گیا۔ اِس دوران میں چاتر ایک شیشے کے مرتبان میں اُتر چکا تھا۔ اور مرتبان نہایت تیزی سے گھوم رہا تھا۔ یکایک کمرہ کی دیواریں بجلی کی کڑک سے کانپ اُٹھیں۔ لوگوں نے صرف اِتنا دیکھا۔ کہ چاتر مرتبان میں ان کی طرف دیکھکر ہنستا ہوا نظروں سے غائب ہو رہا تھا۔ وُہ "کال درپن" کے قریب پہنچے تو چاتر کا کہیں پتہ نہ ملا۔ ظاہر تھا۔ کہ دوبارہ اشوک کے زمانہ میں پہونچ چکا ہے"۔

اب میں اِس عجیب و غریب واقعہ کے متعلق اپنے پیاروں سے چند الفاظ کہنا چاہتا ہوں۔ دراصل یہ کہانی ایک [illegible] ہے۔ ایک اور بہت بڑے حیرت انگیز واقعہ کا میں نے محض اِسلئے اِس کہانی کو درج کیا ہے۔ کہ میں اپنے پیاروں تک اِس دوسرے واقعہ کو پہونچادوں۔ آپ نے اِس کہانی میں چاتر کے وُہ الفاظ پڑھے ہونگے۔ جن میں اُس نے مایا قوم کا حوالہ دیا ہے۔ میں مدت سے اِس عجوبہ روزگار قوم کے اصل حالات کی تلاش میں تھا۔ مایا قوم کے متعلق چاتر نے بالکل درست کہا ہے۔ کہ یونانیوں کی کتابوں میں اس کا ذکر آتا ہے۔ افلاطون نے اپنی معرکتہ الآرا کتاب "جمہور" میں صرف اتنا لکھا ہے۔ کہ "مجھے اپنے بزرگوں کی زبانی اس سرزمین کے متعلق قدیم روایات سُننے کا موقعہ ملا۔ جسے اٹلانٹس کہتے ہیں۔ یہ بڑی بھاری تہذیب کا گہوارہ تھا۔ جو ہزاروں برس ہوئے سمندر کی لہروں کی نذر ہو گیا"۔ اٹلانٹس کے متعلق میرا شروع سے یہ خیال رہا ہے کہ ہو نہ ہو یہ وُہی جزیرہ ہے۔ جسے ہمارے پرانوں میں "سورن ٹاپو" کہا گیا ہے۔ دو ایسی باتیں گذشتہ سال کے دوران میں رونما ہوئیں۔ جنہوں نے میرے اِس خیال کی تائید کردی۔ میرے پیاروں نے حال میں پڑھا ہوگا۔ کہ امریکہ کا ہوا باز "کرنل لنڈبرگ" ریاست ہائے متحدہ سے انگلستان آگیا ہے۔ یہی "کرنل لنڈبرگ" جسکے پیارے پُتر کو امریکہ کے بدمعاشوں نے موت کے گھاٹ اُتارا۔ پہلا شخص ہے۔ جسنے نیویارک سے پیرس تک کا سفر ایک مسلسل ہوائی پرواز میں ختم کیا۔ بحر اٹلانٹک کو مسلسل پرواز میں عبور کرنے کا فخر اسی شخص کو حاصل ہوا۔ یہ سفر ختم کرنے کے بعد وُہ ریاست ہائے متحدہ کو واپس گیا۔ تو اُسنے ہوائی جہاز کے ذریعہ سنٹرل امریکہ کے اُن دشوار جنگلوں کی سیاحت کی۔ جہاں مایا قوم کے کھنڈر ابھی تک موجود ہیں۔ اس سیاحت کے حالات میں نے امریکن رسالوں میں پڑھے۔ تو میں اِس نتیجہ پر پہونچا۔ کہ بظاہر "سورن ٹاپو" یکایک سمندر کی نذر نہیں ہوا ہوگا۔ کچھ لوگ لازمی طور پر بچ رہے ہونگے۔ جنہوں نے کشتیوں میں سوار ہو کر اپنے نزدیک ترین ساحل پر سلامتی کا سامان پایا۔ اور آخر وہاں آباد ہو گئے۔ اُن کے عظیم الشان شہر ہزاروں برس کے گرد و غبار میں چھپ گئے۔ جو آبادیاں [illegible] وہاں اب بھی ہیں۔ امریکہ کے [illegible] اِن قدیم قوم کے متعلق مزید تحقیقات کر رہے ہیں۔ دوسرا واقعہ

جسنے مجھے "چاتر" کی کہانی لکھنے پر مجبور کیا۔ یہ تھا۔ کہ پالی زبان میں "تارٹ بھکشو" نے مایا قوم کی جو باتصویر کتاب لکھی تھی۔ جرمن ڈاکٹر "بوہن" نے اسکا مکمل ترجمہ انگریزی زبان میں شائع کردیا ہے۔ اور میرے پیارے سشن اور مہتر مسٹر چندر سین ایم۔ اے" نے اس کتاب کا ایک نسخہ مجھے نئے سال کے تحفہ کے طور پر برلن سے بھیجا تھا۔ میں اپنے پیاروں کو "مستانہ جوگی" کے آئندہ اشاعت میں اسکے چند اقتباسات پیش کروں گا۔ جن سے وہ اندازہ لگا سکینگے۔ کہ "مایا قوم" دراصل ہندو قوم کی ایک شاخ تھی۔ ایک زمانہ تھا۔ جب برہما دیش سے پرے جاوا۔ سماٹرا۔ بالی۔ بورنیو اور مجمع الجزائر غربی ہند کا سلسلہ آسٹریلیا تک پھیلا ہُوا تھا۔ ان جزیروں میں ہندو تہذیب کے نشان ابھی تک قائم ہیں۔ اٹلانطیس کے مٹ جانے سے "مایا" قوم کی مفصل تاریخ بھی صفحۂ ہستی سے مٹ گئی۔ اور اس کے متعلق صرف روایات رہ گئیں۔ جن کا ذکر افلاطون نے کیا ہے۔ میں نے اپنے پیاروں کی خاطر نہایت محنت اور جستجو کے بعد "مایا قوم" کے حالات کو بے نقاب کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ یہ حالات نہایت دلکش اور عجیب تصاویر کے ساتھ "مستانہ جوگی" میں پیش کئے جائینگے ۔

حُسن کے گیت گائے جا

لُطفِ اَلم اُٹھائے جا۔ عیش کی چاندنی نہ دیکھ — درد کا دل بڑھائے جا۔ حسن کی بے رُخی نہ دیکھ
غنچوں سے واسطہ نہ رکھ۔ پھولوں کی دلکشی نہ دیکھ — رازِ شگفتگی سمجھ۔ حسنِ شگفتگی نہ دیکھ
دیکھ لے آج حوصلہ۔ ذوقِ نظارہ ساز کا — بڑھ کے نقاب اُلٹ بھی دے حسن کی برہمی نہ دیکھ
حسنِ مجاز سے گذر۔ دُور ہے منزلِ سکوں — تیز قدم اُٹھائے جا۔ فرصتِ بندگی نہ دیکھ
عشق کو مُلتمس نہ کر۔ حسن کی بارگاہ میں — تُو تو خود آفتاب ہے۔ ذرّہ کی روشنی نہ دیکھ
ضبط کی ہمتیں بڑھا۔ شوق کی دار و گیر سے — چوٹ پہ چوٹ کھائے جا۔ دل کی طرف کبھی نہ دیکھ
عزم کو مستقل بنا۔ جوشِ عمل سے کام لے — مقصدِ زندگی سمجھ۔ قیمتِ زندگی نہ دیکھ
حدِ جنوں سے بڑھ گئی۔ وحشتِ دل تو کیا ہُوا — ضبط کو ہاتھ سے نہ دے۔ شوق کی سرکشی نہ دیکھ
حسن کو متہم نہ کر۔ شائقِ رنگ و بُو نہ ہو — چشمِ حقیقت آشنا۔ جلوۂ ظاہری نہ دیکھ
درد کو بے نیاز کر۔ خواہشِ التفات سے — مرتبۂ خودی سمجھ۔ حاصلِ بیخودی نہ دیکھ

کون سمجھ سکا سرور۔ عشق کی سربلندیاں
حسن کے گیت گائے جا عشق کی برتری نہ دیکھ

گلاب کی پتیاں

(انگلستان کی مشہور افسانہ نویس "مارجری لون" کا ایک افسانہ)

(۱)

"جیمز ڈوڈ" ہر سرما میں سوچا کرتا۔ کہ اب وہ بوڑھا ہو رہا ہے۔ بہار میں اُسے وقت کی تیز رفتاری کا احساس نہ ہوتا تھا۔ مگر سال کی ابتدا ہوتے ہی اُسے یہ محسوس ہونا شروع ہو جاتا۔ کہ پتوں اور پھولوں کے ساتھ وہ بھی کسی غیر معلوم قیامت یا انحطاط کی جستجو میں مرجھایا جا رہا ہے۔ اپنی عادت کے خلاف وہ اب مطالعہ میں زیادہ مصروف رہتا تھا۔ اس کی مشہور خوش اخلاقی میں اب ہلکی سی ریاکاری پیدا ہو گئی تھی۔ اُسے اپنی روز افزوں دولت۔ دیرینہ احباب کے جمگھٹوں لندن کی شہرت اور اپنے ان خوشامدیوں سے کچھ حظ حاصل نہ ہوتا تھا۔ جو اس نشستگاہ میں آکر گرم آتشدان کے سامنے شراب نوشی کرتے تھے ✦ اس سال ہوا بہت زیادہ سرد تھی۔ اور محل کی چھت پر لگے ہوئے "موسم نما" کو دائیں بائیں ہلاتی رہتی تھی۔ "جیمز ڈوڈ" کی دوکان کا سائن بورڈ "ٹیلی ہیڈ" باہر کی طرف جھکا ہوا الگ سے نظر آتا تھا۔ کھڑکیوں میں سے قیمتی کتابوں کی عنبری۔ بادامی اور روغنی جلدیں، بصورتی سے سجی ہوئی دکھائی دیا کرتی تھیں۔ باہر کی تاریکی مائل شفق اور سردی سے بچنے کے لئے محفوظ دوکان میں آگ کے سامنے ایک میز کے گرد فانوسِ شمع کے نیچے چند آدمی بیٹھے تھے دوکان کے اندر بھی نئی چمکدار اور تازہ چمڑے کی بو والی جلدوں کی کتابیں قطار در قطار سجی ہوئی تھیں منتشر اوراق اور نسخوں وغیرہ کے رکھنے کے لئے نہایت فینسی جزدان کھلے ہوئے اپنے سرپرستوں کی خریداری کا انتظار کر رہے تھے "جیمز ڈوڈ" فنونِ لطیفہ۔ شاعری اور بذلہ سنجی کا سطحی دلدادہ چپ چاپ اپنی نشست گاہ میں لیٹا کرتا تھا۔ اگر ایک طرف جیبوں میں کنجیاں اور بنکوں میں روپیہ موجود تھا۔ تو دوسری طرف اسکو شہرت و ناموری حاصل تھی ✦ سب لوگ اس کتب فروش کی عزت کرتے تھے۔ مگر محبت نہ کرتے تھے۔ کیونکہ وہ خود بھی اپنی شفقت و محبت کے معاملے میں بہت محتاط تھا۔ اُسنے آجتک شادی نہ کی تھی۔ اور سوائے ایک بھانجے کے اُس کا کوئی رشتہ دار زندہ نہ تھا ✦ گو "جیمز" نے کبھی اس بات کا اقرار نہ کیا تھا۔ کہ وہ اپنے بھانجے سے محبت کرتا ہے۔ مگر ہاں یہ بات ضرور تھی۔ کہ اُسے دنیا میں اگر کسی چیز سے دلچسپی تھی۔ تو صرف اپنی بہن کے اُس بیٹے سے۔ پھر بھی "جیمز ڈوڈ" اُس سے ناراض تھا۔ لیکن اس ناراضگی کو ریاکاری کے پردے میں چھپا رکھا تھا۔ کیونکہ اُسے یہ بات عجیب معلوم ہوتی تھی۔ کہ ایک شخص جس نے پچاس سالہ گوشۂ تنہائی میں جذباتِ انسانی سے بے پروا زندگی گزار دی ہو۔ اس عمر میں آکر دنیا کی کسی چیز کے پیچھے پریشان ہو ✦ وہ کسی سے اُٹھا [illegible] نہیں وہ مشفقانہ

شان سے ادا کیا کرتا تھا) اور اپنی نشست گاہ کا دروازہ نہایت آہستہ سے کھول کر تنگ مگر گاہکوں سے پُر دوکان کی طرف دیکھا۔ جس میں ہلکی ہلکی روشنی ہو رہی تھی۔ اور جو سالہا سال سے فیشن۔ خواہشات اور رقابتوں کا مستقل مرکز رہی تھی ✦

"جیمز ڈوڈ" نے ترش مگر پُرشوق نگاہوں سے اپنے بھانجے "مروان" کو دیکھنا شروع کیا جس کا چہرہ زردی مائل اور بال سنہری تھے۔ وہ ایک چاندی کا بکسوا لگائے ہوئے تھا ✦ وہ شمعدان کی روشنی کے نیچے بیٹھا ہوا تھا جس کی کرنیں اسکی سیاہ ساٹن کی واسکٹ پر جس میں ریشم کے سفید پھول کڑھے ہوئے تھے پڑ رہی تھیں ✦ مروان کتابیں الٹ پلٹ رہا تھا۔ اور لیڈی "میری لیجن" سے باتیں کرتا جاتا تھا۔ خاتون موصوفہ بھی کتابوں پر انگشت نمائی کر رہی تھیں اور جب دونو نگاہیں دوچار ہوتی تھیں۔ تو ہاتھ بھی ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے تھے...... اور بس یہی کافی تھا ✦ "جیمز ڈوڈ" ریاکارانہ مہربانی اور کسی پوشیدہ ارادے سے متاثر ہو کر ان کی طرف دیکھکر مسکرایا ✦

(۲)

"جیمز ڈوڈ" شاہانہ استغنا سے آگے بڑھا۔ اور اپنی توجہ کو ہٹانے والی تمام کوششوں سے چشم پوشی کرتا ہوا سیدھا لیڈی "میری" کے پاس پہونچا۔ جو منتشر اوراق کی مطبوعہ کتاب میں مستغرق اور مسٹر "جیمز" کی آمد سے بالکل بے خبر تھی ✦ مسٹر "جیمز" نے ایک بوڑھے آدمی کی طرح نہایت پُرتپاک سلام کیا۔ اور کہا۔ کہ "آپ نے اشعار کی جس کتاب کا ذکر کیا تھا۔ وہ حال ہی میں پیرس سے آگئی ہے۔ اور میں اسے دکھا کر بہت خوش......" ✦ نوجوان مروان نے فقرہ کو یوں پورا کیا۔ "مجھے معلوم نہ تھا...... میں ابھی یہ کتاب لاتا ہوں........." ✦

"نہیں نہیں...... ٹھہرو۔ میں لیڈی صاحبہ کو خود دکھانا چاہتا ہوں بشرطیکہ وہ میرے غریب خانہ تک چلنے کی تکلیف گوارا فرمائیں" ✦

"بسر وچشم" ۔ خاتون نے کہا۔ اور کتاب بند کر کے نہایت آہستہ سے زیر لب مسکرایا۔ اور مروان کی جانب دیکھا جو وہاں سے اٹھ کر لوگوں کی بھیڑ میں جا ملا تھا۔ اور ابتک اسکی طرف گھور رہا تھا۔ گویا کمرہ میں بس ایک وہی ذی روح تھی ✦ "میری" متحیر تھی (مروان کے چہرے سے بھی حیرت کا اظہار ہو رہا تھا) میری نے اپنے چہرے سے اس تحیر کو ظاہر نہ ہونے دیا۔ وہ چپ چاپ اٹھی اور "جیمز ڈوڈ" کے پیچھے پیچھے اس خاموش اور گرم کمرے میں پہونچی جو روشنی سے جگمگا رہا تھا ✦ کمرے میں پہنچکر "میری" نے پوچھا۔ "مہربانِ من! وہ کتاب کہاں ہے"؟ میری آتشدان کے سامنے کھڑی تھی۔ ایک بوڑھے گوشہ نشین کا آتشدان بھی کیا ہی عجیب نظارہ ہوتا ہے۔ یہ نظارہ ویسا ہی خوشنما تھا۔ جیسا خاتون کے گلابی ساٹن کے ہیٹ میں چمکدار ہیروں کا گچھا جو سیاہ آنکھوں پر ڈھکی ہوئی تھیں۔ اور اسکے بھاری کوٹ پر پڑی ہوئی تھیں۔ اسکی نگاہیں خنداں اور بے غرض تھیں۔ عمر ابھی بیس سے زیادہ نہ تھی ✦ مگر "جیمز ڈوڈ" اسکے حسن کو ہمیشہ

رقیبانہ نظروں سے دیکھتا تھا + "جیمز ڈوڈ" نے میری کو فرانسیسی اشعار کی وُہ کتاب دکھائی جس کی جلد پر سُنہری گلابوں کا ایک ہار چھپا ہُوا تھا۔ جیمز ڈوڈ" نے سنجیدگی سے کہا۔" میری اب میں ایک اور بات کہنا چاہتا ہوں۔ جو کوئی معمولی بات نہیں ہے" +

"میری" اِس اندازِ خطاب کی عادی نہ تھی۔ اِس وجہ سے اُس کی آنکھوں میں سے جوش ٹپکنے لگا۔ اور رخسارے تمتما اُٹھے۔ جیمز نے کہنا شروع کیا۔" آپ تشریف رکھئے۔ اور جو کچھ عرض کروں۔ اُسے تحمل کے ساتھ سُنئے ...... (مسکراکر) "اب میں اسقدر بُوڑھا ہو چکا ہُوں کہ میری طرف سے مُسابقت (ریہل) ہونی مُشکل ہے"+ نوجوان خاتون یہ جملہ سنکر مدافعت کی فکر میں پڑ گئی۔ بُوڑھا کُتب فروش لڑکی کے چھوٹے سے گول مول چہرے کی طرف دیکھ کر مُسکرایا اور بہت آہستہ سے بولا کہ" آپ کو مروان سے محبت ہے"+ میری کے جسم میں اُس کو ایک جھرجھری دی۔ مگر اُسنے جلد قابُو پالیا + جیمز بولا۔ کہ "مروان کو بھی آپ سے محبت ہے"+ لیڈی میری نے نہایت بُردباری سے جواب دیا۔" تو کیا یہ جناب کو ناگوار معلوم ہوتا ہے"؟ جیمز نے جواب دیا۔" جی ہاں! ...... بہت ناگوار۔ اتنا ناگوار کہ اِس سے زیادہ کوئی چیز ناگوار نہیں معلوم ہوتی"+ لڑکی نے اپنی پتلی پتلی نازک اُنگلیوں سے "گل پوش" کتاب کو پکڑا۔ اسفید فیتوں کے نیچے نازک سینے نے اُبھر کر ٹھنڈا سانس بھرا۔ اور چہرے پر ہیجانِ جذبات بپا ہُوا مگر اُسنے سنبھل کر جواب دیا۔" مسٹر جیمز! آپ کی زبان سے یہ بات مجھے بہت ہی عجیب معلوم ہوتی ہے۔ غالباً اِس فقرے کا کچھ اندرونی مطلب ہے"+ بُوڑھا کُتب فروش لڑکی کی اِس معاملہ فہمی پر دل ہی دلمیں خوش ہُوا۔ اور پُوچھا۔ کہ" کیا آپ کو مروان سے کسی چیز کی اُمید ہے"؟ لڑکی اِس سوال کو سُن کر اسطرح مُسکرائی۔" جی ہاں! بعض اوقات کچھ اُمید ہوتی ہے"! جیمز نے کہا" تو تشریف اور تحمل کے ساتھ میری گزارش سُنئے"+ میری اُس کُرسی پر بیٹھ گئی۔ جو فیتوں سے ڈھکی ہُوئی تھی+ "جیمز ڈوڈ" آگ کی طرف پُشت کئے ہُوئے کھڑا تھا۔ اور میری کے ناقابلِ اختیار جوش کو غیر محبانہ انداز سے دیکھ رہا تھا۔ اُسنے میری کو مخاطب کیا۔" مروان میرا بھانجا ہے۔ اور وارث بننے والا ہے۔ لیکن اگر وُہ بیوقوف نکلا۔ اور محبت کے جھگڑے بکھیڑوں میں پڑ گیا۔ تو مُفلس و نادار ہوگا"+

(۳)

لڑکی کی سیاہ خوبصورت آنکھیں اُس کی طرف دیکھ کر اسطرح دمکنے لگیں۔ گویا وُہ اِس جُملے کا مطلب ہی نہ سمجھی تھی۔ "جیمز ڈوڈ" نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔ کہ" اگر مروان کسی عورت سے شادی کریگا۔ یا ایسی خواہش کرے گا۔ کسی عورت کا پیچھا کریگا۔ یا کسی عورت کو اپنا پیچھا کر لے دیگا۔ وُہ عورت خواہ خادمہ ہو۔ دوشیزہ ہو۔ یا نوبل زادی۔ بہر حال وُہ وراثت سے محروم کر دیا جائیگا۔ اور چونکہ اُس کی پرورش ناز و نعم میں ہوئی ہے۔ اِسلئے اپنے قوتِ بازو سے کچھ نہ کما سکیگا" میری نے متکبرانہ انداز میں سوال کیا۔" لیکن مسٹر ڈوڈ۔ اِس چیز کا مجھ سے کیا تعلق ہے"؟ ڈوڈ نے تعظیماً جُھک کر کہا۔ "جناب! آپ کو چونکہ مروان سے دلچسپی ہے۔ اِسلئے میں نے اسے یہ کہدیا ہے...... علاوہ ازیں مروان بھی آپکا گرویدہ ہے"

اِس آخری جملے سے میری تو کسی قدر محجوب سی ہوگئی۔ رُخساروں پر رنگِ شباب دَوڑ گیا۔ اور سرنگوں ہوگئی۔ مگر بُہت کشمکش کے بعد ہجومِ جذبات کو پامال کرتے ہُوئے کڑی آواز میں بولی:- "گو یہ مُمکن ہے۔ کہ آپ کے بھانجے سے میری کچھ اُمیدیں وابستہ ہوں۔ مگر آپ نے یہ نتیجہ کیسے نکال لیا۔ کہ وُہ میرا خاوند بھی ہوگا" ÷ ڈوڈ مُسکرایا اور جواب دیا:-

"جی ہاں! مَیں جانتا ہُوں۔ اور یہی وجہ تھی۔ کہ مُجھے لب کُشائی کی ضرورت محسُوس ہُوئی" ÷

میری خاموش ہوگئی۔ وُہ اندرُونی کشمکش میں مُبتلا تھی۔ آگ کی روشنی اسکے سُنہری رنگ پر پڑکر عجب بہار دے رہی تھی۔ اور بُوڑھا کُتب فروش بیٹھا اُسکے حُسن کی بلائیں لے رہا تھا ÷ میری نے قابلِ تعریف صاف گوئی اور نازک خیالی سے جوابدیا "غالبًا آپ نے یہ سمجھا ہوگا۔ کہ مَیں عِشوہ باز عورتوں کی طرح اپنے ناز و انداز سے آپ کے بھانجے پر ڈورے ڈال رہی ہُوں۔ اگر واقعی آپ نے یہی سمجھا ہے۔ تو یقینًا ایک فاحش غلطی میں مُبتلا ہیں" ÷ یہ کہکر "میری" پھر خاموش ہوگئی۔ اُس کی آنکھیں اِس بات کی جستجو کرنے لگیں۔ کہ شاید بُڈھے کا دِل پسیجے۔ مگر وُہ ابتک تیکھی نظروں سے دیکھ رہا تھا ÷ میری نے پھر کہنا شروع کیا "اگر آپ نے میری اِتنی ناقدری کی۔ تو سخت غلطی کی۔ لیکن یہ بھی کہے دیتی ہُوں۔ کہ اگر "مروان" نے مجھ سے شادی کی درخواست کی۔ تو مَیں یقینًا "ہاں" کہدُونگی" ÷

"جیمز ڈوڈ" نے اپنے ہاتھ اِس طرح ہلائے۔ گویا وُہ تمام صاف گوئی کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتا۔ اور سرد مہری سے جوابدیا "اگر یہ بات ہے۔ تو مَیں اِس کا جواب "نہیں" سے دُونگا۔ اگر آپ نے مروان سے شادی کی۔ تو سمجھ لیجئے ایک ایسے شخص سے کی جس کی دُنیا میں نہ کوئی تجارت ہے نہ پیشہ جانتا ہے۔ نہ پلّے کوڑی ہے۔ قصہ مختصر یہ ہے۔ کہ اس صُورت میں وُہ وراثت سے محرُوم کردیا جائے گا" ÷ "جیمز ڈوڈ" ایک دولتمند آدمی تھا۔ مگر "میری" کا باپ ایک لارڈ ہونے کے باوجود مُفلس اور مفلوک الحال۔ اِس پریشانی کے علاوہ چند خوبصُورت لڑکیاں تھیں۔ اور بس۔

جُونہی لیڈی "میری" کو اِس صُورتِ حال کا خیال آیا۔ وُہ اِس صاف گوئی سے متاثر ہوکر دِل ہی دِل میں کُڑھی مگر بُوڑھے کُتب فروش کو اس کی حالت پر مُطلق ترس نہ آیا۔ اِس لئے چبا چبا کر یُوں باتیں کرنی شروع کیں۔ "مَیں نہیں سمجھتا۔ کہ میرا "مروان" کسی ایسی عورت سے شادی کریگی۔ جو فیشن ایبل ہو۔ نواب زادیوں کے سے عالی دماغ رکھتی ہو۔ اگرچہ جیب میں ایک حبّہ نہ ہو" ÷

میری یہ سُن کر طیش میں کھڑی ہوگئی۔ اور آنکھوں میں آنسُو ڈبڈبا کر یُوں جوابدیا:- "مَیں جناب کو اِس بےفرد ر سرد مہری اور مضحکہ خیز بے رُخی پر جو اخلاق کی کُھلی توہین ہے۔ معاف کرتی ہُوں" ÷ خاتُون کی ریشمی گود سے عاشقانہ اِشعار کی کتاب آتشدان کے قریب گر پڑی۔ مگر دونوں میں سے کسی نے اِسطرف توجہ نہ کی ÷

مسٹر ڈوڈ نے مُسکرا کر کہا "جناب! آپ کو چھوڑنا گویا ایک بہت اچھے گاہک سے ہاتھ دھونا ہے۔ اور یہ تجارت دُوکانداری کے آداب و اصُول کے خلاف ہے۔ مگر ایک دوکاندار کے لئے یہ" ÷

خاتون نے اِس طنز آمیز جُملے کے جواب میں صِرف سر جُھکا دینا کافی سمجھا۔ اور کہا کہ "میری ہمجولیاں میری مُنتظِر ہونگی" +

(۴)

جیمز نے خُشک تپاک کے ساتھ دروازہ کھولا۔ اور میری وہاں سے نِکل کر دوکان میں پہونچی۔ اُسکے چلے جانے کے بعد کمرے میں مُردنی اور بے رونقی چھاگئی + کُتب فروش نے اپنی بھاری کُرسی آتشدان کے آگے سرکائی۔ دہکتی ہوئی آگ پر لکڑی ڈال کر کُرسی پر دراز ہوگیا۔ اب اُس نے اُس سمت کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ جہاں تھوڑی دیر پہلے ایک شُعلہ جوالہ افروز تھا۔ اُسوقت ایک بُوڑھے کے . . . دِل میں بھی جوانی کے خواب موجزن تھے۔ وُہ اِسطرح بہت دیر تک سوچتا رہا۔ مگر مروان نے کمرے میں داخل ہوکر اُس کی توجہ اپنی طرف مبذُول کرلی +

مروان۔ "سب لوگ چلے گئے۔ اور دوکان بند کردیگئی ہے" +

ڈوڈ۔ "کیا واقعی بہت دیر ہوچکی ہے"؟

"جی ہاں! بہت دیر ہوچکی ہے۔ دُوسرے ہوا بھی تیز چل رہی ہے۔ برف کی بارش ہو رہی ہے۔ اب کے کرسمس بہت اُداس اور پھیکا رہے گا" + کسی قدر بددِل ہوکر ماموں کو دیکھا۔ اور کہا۔ "لیڈی میری دفعتاً چلی گئی؟ . . . غالباً آپ سے برگشتہ ہوکر . . . . . ." + جیمز ڈوڈ نے کہا:۔ "تو کیا یہ بہت اہم بات ہوئی"؟ مروان نے کہا۔ "مَیں تو یہی سمجھتا ہُوں" + جیمز ڈوڈ بولا:۔ "اچھا اگر یہی بات ہے۔ توسمجھ لو۔ اور ہمیشہ کے لئے سمجھ لو۔ کہ مَیں نے اسے ہمیشہ کے لئے خیرباد کہدیا ہے"۔ یہ کہکر مسٹر ڈوڈ نے فرش پر پڑی ہُوئی کِتاب کو اپنے پیر سے چھُوا۔ اور کہا کہ جس طرح اُس نے اِس کِتاب کو زمین پر ٹپک دیا ہے۔ اِسی طرح ہم بھی اُسے . . . . + نوجوان نے وفورِ محبت سے بیقرار ہوکر اُس کِتاب کو اُٹھالیا۔ اور بیچین ہوکر بولا:۔ "خیرباد کیوں کہدیا"؟ ڈوڈ نے کہا۔ "مَیں نے اُسکی توہین کی ہے۔ اور اُسے بہت ذلیل کیا ہے۔ اب اُسے ہمیشہ کے لئے فراموش کرتا ہُوں" +

"فراموش! مگر مَیں تو اُس سے محبت کرتا ہُوں"۔ مروان نے کہا +

ڈوڈ۔ "مجھے خُوب معلُوم ہے" +

مروان "مگر آپ نے پھر بھی قطع تعلق کرلیا" +

"ہاں۔ ہاں"۔ بُوڑھے کُتب فروش نے نوجوان کے غُصے کو ٹھنڈا کرنیکے لئے کہا۔ "اِسی طرح کی ایک عورت نے میری زندگی برباد کردی تھی۔ پہلے واقعہ سُن لو۔ پھر کہنا . . . . ." + مروان اپنے غُصہ کو پی گیا۔ اور بادلِ ناخواستہ اپنے بوڑھے ماموں کے تحکمانہ اندازِ خطاب اور پدرانہ نصیحت سے مغلُوب ہوکر سُننے کے لئے آمادہ ہوگیا + مسٹر ڈوڈ نے فرمایا۔ "جب مَیں تمہاری عُمر کا تھا۔ تو ایک عورت سے محبت کرتا تھا۔ گو وُہ خاندانی حیثیت سے مجھ سے کمتر تھی۔ مگر دولت کے اِعتبار سے نہیں . . . . کیونکہ مَیں اپنے والد کی دولت کا اسی طرح وارث بننے والا تھا جسطرح تم

میری دولت کے بننے والے ہو۔ اس عورت کا خاندان بھی اُسی طرح دیوالیہ ہوگیا تھا۔ جسطرح لیڈی میری کا"۔

(۵)

اپنی محبوبہ کا اسطرح ذکر سُن کر مروان دیوانہ وار بیچ میں بول پڑا۔ مگر مسٹر ڈوڈ نے اُسے خاموش کر دیا اور کہا:۔"میں اپنے واقعے کو سہل ترین بنانے کے لئے جو بات کہنی چاہتا ہوں۔ کہوں گا۔ خیر میں اس عورت سے محبت کرتا تھا۔ اور شاید وُہ بھی مجھ سے کرتی تھی۔ اِس بات کو پورے پچاس سال گذر گئے"۔ (خود بخود مسکرا کر) "میں نے کرسمس کے اِنہی دنوں میں اپنا دل اُس عورت کے قدموں پر ڈال دیا۔ اور کلیجہ نکال کر کاغذ پر رکھدیا۔ ایک خط لکھا ویسا ہی جیسا تُم اِس لڑکی کو لکھ سکتے ہو۔ پھر اس خط کو عاشقانہ اشعار کی ایک خوبصورت کتاب کے ساتھ اُسے بھجوا دیا۔ اِس واقعے کو آج پُورے پچاس سال گزر چکے ہیں۔ وُہ چیزیں یعنی مجھ جیسے غریب کی ساری پونجی نہایت احتیاط سے اُس کے ہاتھ میں پہونچا دی گئی۔ اور میرا آدمی بیان کرتا تھا۔ کہ اس نے اُس خط کو خود اُس کی موجودگی میں ہی اپنے سینے سے لگایا ...."۔ ڈوڈ یہاں پہونچکر ٹھہر گیا۔ اور آگ کی طرف دیکھکر ایک ایسی سرد آہ کھینچی۔ جو بڑھاپے میں شاذو نادر ہی نکلتی ہے"۔ میں نے اِس خط میں شادی کی درخواست کی تھی .... مجھے اِس کی جرأت اسلئے ہُوئی۔ کہ بظاہر وُہ بھی مجھ سے محبت کرتی تھی"۔ مروان نے پُوچھا۔"پھر کیا ہُوا"؟ ڈوڈ نے کہا۔"دو دن کے بعد کتاب واپس آگئی جس کے ساتھ نہ تو کوئی خط تھا۔ نہ زبانی پیغام۔ وُہ دیکھو۔ وُہ کتاب وہاں رکھی ہے ...."۔ "وُہ کتاب واپس آئی۔ تو میں اُسی کمرے میں بیٹھا ہُوا تھا۔ میں نے لانے والے سے پُوچھا۔ کہ"کچھ اور بھی لائے ہو"؟ اس نے جواب دیا"نہیں اور کچھ نہیں"۔ میں نے دل برگشتہ ہو کر اُس کو وُہیں ٹھونس دیا۔ اور اِس کے بعد اُسے کبھی ہاتھ نہیں لگایا۔ اُس دن سے اُسے دیکھکر ہمیشہ اپنی حماقت .... محبت .... یاد آتی رہتی ہے"۔

مروان نے کہا۔ کہ"اور غالباً یہی وجہ تھی۔ کہ آپ نے شادی نہیں کی"۔

"ہاں اِیہی وجہ .... میں اِسی ریاکارانہ عشوہ و انداز کا شہید ہُوں"۔ ڈوڈ کا سر سینہ کی طرف جُھک گیا۔ اور پھر کہنا شروع کیا"۔ چند ہی دن بعد میں نے اخبار میں پڑھا۔ کہ اُس کا انتقال ہوگیا"۔ تاریک کمرے میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اور سرما کی سرد ہوائیں آگ کی لپٹوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ مسٹر ڈوڈ نے کہا۔ کہ"صاحبزادے! میں نے اپنے آپ کو بچا لیا ہے۔ اور اِسی طرح دُوسروں کو بھی بچانا چاہتا ہُوں۔ پس یا تو اِن شان و شوکت والی لیڈیوں سے کنارہ کشی کرو۔ یا مجھ کو چھوڑ دو۔ میں ہرگز اِس کی اجازت نہیں دے سکتا۔ کہ جسطرح میرا دل ٹوٹا ہُوا ہے۔ اسیطرح کوئی اور بھی اپنا دل توڑے"۔ نوجوان نے نہایت نرمی سے کہا۔ کہ"حضرت! اگر میں چلا گیا۔ تو آپ اکیلے رہ جائینگے"۔ مسٹر"ڈوڈ" نے اِس کا کوئی جواب نہ دیا۔ مگر مروان نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھا۔"اگر میرے لئے یہ دو نو راہیں کھلی ہُوئی .... اگر اِن سے میرا دل ٹوٹ بھی جائے۔ تو کوئی پروا

نہیں...... کیونکہ میں محبت کرتا ہوں"۔ ڈوڈ نے سنا ان سنا کر کے یوں کہنا شروع کیا۔ "یہ لڑکی ویسی ہی خوبصو
ہے جیسی میری محبوبہ تھی...... یہ اُسوقت بالکل ویسی ہی حسین معلوم ہو رہی تھی آہ! کتنی رعنا! بظاہر میں
محسوس کر رہا ہوں۔ کہ گذشتہ پچاس سال گزرے ہی نہ تھے"۔ مروان نے کہا "اگر یہ لڑکی بھی ویسی ہی ثابت ہوئی
جیسی آپ کی محبوبہ تھی۔ تب بھی میں اس کا ساتھ دونگا"۔ ڈوڈ نے سر اُٹھا کر اوپر دیکھا "تو پھر تم مجھے ہمیشہ کے
چھوڑ کر چلے جاؤ۔ جسطرح تمہاری مرضی آئے۔ روزی کماؤ۔ میں بوڑھا یونہی اکیلا مر جاؤں گا"۔ مروان بولا۔ "
کیا آپ واقعی یہی چاہتے ہیں"؟ ڈوڈ کی طرف سے جواب ملا "قطعی طور پر ــــــــــ یہی"
مروان نے کہا"........ اچھا تو شب بخیر........ خدا حافظ"۔

(۶)

وہ چلا گیا۔ اور ڈوڈ نے اپنی نظر اُس کی پشت سے ہٹائی۔ تو مسکرا کر کہا "بیشک اس نے وہی کیا۔ جو خو
میں اس عمر میں کرتا۔ اس عمر کا تقاضا یہی ہوتا ہے۔ مگر میں اسے یہاں دیکھنا نہیں چاہتا۔ مجھ سے یہ نہیں دیکھا جا
کہ اپنا دل اسی طرح توڑے۔ جسطرح میرا ٹوٹ چکا ہے"۔ ہوا دود کش (چمنی) اور دروازوں میں شور مچاتی ہوئی
آئی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ کہ کمرے کی تاریک فضا میں سے کسی حسین عورت کی شبیہ نکل کر "ڈوڈ" کے سامنے والی
پر بیٹھ گئی ہے۔ "ڈوڈ" اپنی کرسی سے اُٹھا۔ اور الماری میں سے عاشقانہ اشعار کی وہ کتاب نکالی۔ جو پچاس سا
سے بے چھوئے جوں کی توں رکھی ہوئی تھی۔

(۷)

غم و اندوہ کے جذبات سے مجروح و مغلوب ہو کر ایک غضب ناک جوان نے اس کتاب کو الماری میں ٹھونس
تھا۔ مگر آج پچاس سال بعد اُسی جوان نے جو اب ایک صلح جو۔ خاموش اور مرنجان مرنج بوڑھا تھا۔ اُسی جگہ
وہی کتاب نکالی۔ اُس نے بہت جرأت کے ساتھ اُسی دقیانوسی کتاب کو کھولا۔ اور اوراق اُلٹتے پلٹتے۔ اس میں بھ
رنگ کی کوئی چیز کھڑ کھڑ کرتی ہوئی دکھائی دی۔ اور اُسے ڈوڈ نے اپنی سخت اُنگلیوں سے چھوا۔ یہ کیا چیز تھی
ایک پھول کی خشک پتیاں یعنی کرسمس کے **گلاب کی پتیاں**۔ کیا کتاب کے سرورق کے نیچے کوئی کا
نہ تھا؟ مسٹر "ڈوڈ" نے بہت تکلیف کے ساتھ ایک شمع روشن کی۔ اور پھر بہت اذیت کے ساتھ ناک پر عینک
لگا کر اس خط کو پڑھنا شروع کیا۔ جو عاشقانہ اشعار کی اس کتاب میں رکھا ہوا ملا تھا۔ جیسے پچاس برس سے شجر ممنو
کی طرح الگ تھلگ رکھ دیا گیا تھا۔ خط حسب ذیل تھا۔

"میرے پیارے محبوب! میں اس کتاب کو دوبارہ آپ ہی کے پاس بھیجتی ہوں۔ اور کرسمس کے پھولوں میں
ایک پھول کے ہمراہ [illegible]

تشریف لائیں ــــــــ پھر میرے محبوب! یہ ہماری شادی شدہ زندگی رجوبُت ہی پُر مسرت اور طویل ہوگی) ایک عہد نامہ ہوگا! جلد آؤ! تاکہ دِل کو تسکین ہو۔ اور ہماری حقیقی محبت پر مُہر ثبت ہو جائے ۔ یہ خط تمہاری بھولی بھالی "جینی" نے لکھا ہے ــــــــ جو اے پیارے تمہیں لبیک کہہ رہی ہے ــــــــــــــــ میں تمہاری بیوی بننے کے لئے تیار ہوں ــــــــــ"

اِن الفاظ کو لکھے ہوئے پچاس برس گزر گئے تھے۔ "جیمز ڈوڈ" نے اپنی طبیعت کے ہیجان کی وجہ سے جو مُہلک غلطی کی تھی۔ وُہ یہ تھی۔ کہ جب وُہ کتاب واپس آئی۔ تو اُسے کھول کر نہ دیکھا۔ کاش! وُہ اسے کھول کر دیکھ لیتا۔ تو دونوں کی مسرتیں فنا نہ ہوتیں ۔ وُہ "جینی" کے پاس نہ گیا۔ اور "جینی" اس کی منتظر رہی ــــــــــ حتّٰی کہ انتظار کرتے کرتے دَم دے دیا ــــــــــ "اوہ! جینی! جینی!! میری محبوب بیوی ــــــــ" ۔

(۸)

بوڑھے کا سر آہستہ آہستہ اسکے سینے پر آلگا۔ آتشدان کی آگ بھی ہلکے ہلکے مدھم پڑ گئی۔ اور شمع دان میں شمع بھی ٹمٹمائی ۔ اُسوقت غزلوں کی قدیم کتاب "ڈوڈ" کے سینہ سے لپٹی ہوئی تھی! اس سے پہلے کہ کامل تاریکی مسلط ہوتی دو نوجوان عاشق و معشوق اُس کمرہ میں دوبارہ داخل ہوئے ۔ مروان نے آتے ہی کہا۔ "جناب! لیڈی میری اِس غرض سے تشریف لائی ہیں۔ کہ اپنی نظموں کی کتاب لے جائیں۔ اور میں آخری الوداع کہنے آیا ہوں" ۔ زود پشیمان بوڑھے نے ان دونوں کی جانب دیکھا۔ یہ جوڑہ کس قدر خوبصورت و دلنشین تھا۔ آہ! دونوں حبیب و محبوب کس قدر دلدادہ تھے۔ مگر یہ بھی ایک دن بوڑھے ہو جانے والے تھے۔ لیکن محبت غیر فانی ہوتی ہے ......

اب یہ لڑکی "جینی" کی جگہ پر تھی ۔ نوجوان نے عزت و تاسف سے کہا۔ "جناب! یہ مجھے حاصل کرنا چاہتی ہے اور میں آپ کو" ۔ "ٹھہرو۔ ٹھہرو۔ میرے عزیز ایک غمزدہ بوڑھے پر ترس کھاؤ! جینی ایک لمحہ ٹھہر" ۔ کمرے میں اسقدر تاریکی تھی۔ کہ "جیمز ڈوڈ" یہ نہ دیکھ سکتا تھا۔ کہ اسکے سامنے کون عورت کھڑی کہہ رہی تھی۔ کہ "میں ٹھہری ہوئی ہوں" ۔ مروان نے لڑکی کی جانب متوجہ ہو کر کہا۔ "پیاری! میرا خیال ہے۔ کہ مسٹر "ڈوڈ" یا تو بیمار ہیں یا دَم توڑ رہے ہیں" ۔ لڑکی نے "ڈوڈ" کے سامنے دوزانو ہو کر اُسکے ہاتھ کو اُٹھا کر جس میں وُہ اشعار کی کتاب پکڑے ہوئے تھا۔ جواب دیا۔

"خاموش! ــــــــ اُن کو سچی مسرت حاصل ہو چکی ہے ــــــــ اِس ابدی مسرت میں دخل نہ دو" ۔

پاؤں میں زنجیر ہے اور پاؤں میں زنجیر میں ۔ حسرت پرواز آخر رہ گئی نخچیر میں

گلشنِ رُوحانی

یہ دیکھو بلبلِ فردوس کیسی چہچہاتی ہے — نئے نغمے سناتی ہے نرالے گیت گاتی ہے

اُدھر بلبل کا دلکش لَے سے اُونچی شاخ پر گانا — اُدھر یادِ خدا میں عاشقوں کا محو ہو جانا

بھلا پھر ذکر کیا باقی رہے دنیائے فانی کا — بقا کے باغ میں گونجا ہے نغمہ زندگانی کا

یہی رُوحانیت کا باغ ہے جو غیر فانی ہے — اسی کا ہر ثمر مرغوب ہے اور جاودانی ہے

یہی منظر وہ ہے جسکی بشارت ہوتی آئی ہے — اسی کے شوق میں سب کو مسرت ہوتی آئی ہے

طیورِ قدس اسمیں نغمۂ توحید گاتے ہیں — کسی کو جلوہ فرمائی کا یوں مژدہ سناتے ہیں

کہ اپنے عالمِ باطن سے وہ ظاہر میں آئے ہیں — زمانہ منتظر تھا جن کا وہ تشریف لائے ہیں

خدا کا شکر ہے وہ آنیوالے آج آ پہونچے — ہزاروں اہلِ دل محبوب کی خدمت میں جا پہونچے

اسی کی دید کو دنیا میں ہر انسان آیا ہے — زمانے کو اسی دن کیلئے حق نے بنایا ہے

دلِ مشتاق کو دلدار کی قربت میسر ہے — ہر اک عاشق کو وصلِ یار کی جنت میسر ہے

کھلے ہیں رازِ سر بستہ حقیقت آشکارا ہے — سجا ہے نور کا دربار۔ دلبر جلوہ آرا ہے

کھلے ہیں پھول گلشن میں مسرت اور فرحت کے — نظر آتے ہیں جلوے ہر طرف حسن و لطافت کے

تجلّی گاہ کو دیکھا۔ جمالِ یار کو دیکھا
بصیرت کی نظر نے عالمِ انوار کو دیکھا

کشمیر کا چشمۂ ویری ناگ

"چشمہ ویری ناگ" اپنی خوبصورتی۔ صفائی۔ دلفریبی۔ عالمگیر شہرت۔ غرضیکہ ہر لحاظ سے لاجواب اور اپنی نظیر آپ ہے۔ یہ ایک نہایت ہی سرسبز و شاداب۔ بہشت بریں کو مات کرنے والی پہاڑی کے دامن میں واقع ہے جسکو "کوہ بانہال" کہتے ہیں۔ یہ چشمہ نہایت خوش نما۔ نظر نواز اور پُرفضا ہے۔ اِس کو دیکھ کر انسان کی عقل حیران رہ جاتی ہے۔

یہاں ایک پختہ و سنگین حوض بنا ہے۔ جس کے اندر سے اِس بہتات کے ساتھ پانی نکل رہا ہے۔ کہ ایک اچھی خاصی نہر بہہ رہی ہے۔ کسی طرح بھی یہ معلوم نہیں ہوتا۔ کہ اسقدر پانی اِس کثرت و زور کے ساتھ کہاں سے چلا آرہا ہے۔ چشمہ کا پانی اِس گول اور فراخ حوض کے اندر اپنی آمد و خرچ کی سادیت کے باعث ٹھہرا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ مگر اِس قابل دید حوض کی ایک جانب سے اِس زور اور بہتات سے خارج ہوتا ہے جس کا ذکر اوپر بیان۔۔ کیا گیا ہے۔ پانی ایسا شفاف کہ اسمیں صدہا مچھلیاں اِدھر اُدھر پھدکتی ہوئی چکر وگشت لگاتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ شیشہ میں ہیں۔ بایں ہمہ گہرا اسقدر کہ اسکی تہ تک نظر کچھ کام نہیں کرسکتی۔ بہاؤ میں اسقدر تیزی کہ اگر کوئی مچھلی حوض سے کسی طرح باہر نکل جائے تو پھر اُس کو لوٹ کر واپس آجانا مشکل بلکہ بعض اوقات ناممکن ہوجاتا ہے۔ یہ چشمہ ہزاروں برس سے اِسی طرح جاری ہے عہد شہنشاہ جہانگیر میں اس کا یہ قابل دید حوض بنا تھا۔ پرانی روایت ہے کہ "سری شوجی مہاراج" کے ترشول سے یہ بہشت پہلو خوبصورت چشمہ بہہ نکلا ہے۔ چشمہ ۳۷ گز چوڑا اور ۵۰ فٹ گہرا ہے۔ اِسکے گرد ۲۷ محرابیں ہیں۔ جن میں سے ایک پتھر پر حسب ذیل عبارت و اشعار کندہ ہیں:۔

"بادشاہ ہفت کشور۔ عدالت گستر ابو المظفر نور الدین جہانگیر ابن اکبر بادشاہ غازی بتاریخ ۱۵ جلوس۔ دریں سرچشمۂ فیض آئین نزول اجلاس فرمودند

(تاریخ) از جہانگیر شاہ اکبر شاہ | این بنا سر کشید بر باک
بانئے عقل یافت تاریخش | قصر آباد و چشمہ ورناگ"

چشمہ سے باہر دوسرے سنگ موسیٰ پر جواب ٹوٹ گیا ہے۔ یہ اشعار کندہ ہیں:۔

"حیدر بحکم شاہجہاں بادشاہ دہر | شکر خدا کہ ساخت چنیں آبشار و جوئے
این جوئے داده است ز جوئے بہشت یاد | زیں آبشار یافتہ کشمیر آبروئے
تاریخ جوئے بگفت بگوشم سروش غیب
از چشمہ بہشت بروں آمدست جوئے"

یہ وُہی چشمہ ہے۔ جو دریائے جہلم کا منبع مانا گیا ہے بعض لوگ پہلے دریائے جہلم کا منبع "ویتھرو" مانتے تھے لیکن فی زمانہ جغرافیہ دان اصحاب نے "چشمۂ ویری ناگ" کو ہی منبع تسلیم کیا ہے۔ یہ دونو چشمے ایک دوسرے سے تھوڑے ہی فاصلہ پر واقع ہیں۔ مگر جو رونق و دلفریبی اور خوبصورتی اِس چشمہ کو قدرت نے عطا کی ہے۔ اور اسکے ساتھ بھاری عمارات و سنگین محرابوں۔ ہشت پہلو سنگین محرابوں۔ ہشت پہلو سنگین دیواروں نے تو اسکی رونق کو دوبالا کر دیا ہے۔ نیز آبادی قصبہ و دوکانات و آمد و رفت نے بھی اسکی عظمت بڑھادی ہے۔ چونکہ زمانہ قدیم میں پنجاب سے کشمیر آنے کا یہ خاص راستہ تھا۔ اِسلئے بھی اس کی اہمیت بڑھ گئی تھی۔ اگرچہ موجودہ شاہی خاندان نے یہاں عالیشان عمارات و محلات شاہی نہیں بنائے۔ پھر بھی اس کی قدر و منزلت بڑھ گئی ۔ "ویتھ وتر" کو ان باتوں میں سے کوئی بات حاصل نہیں ہے۔ ورنہ وہاں سے بھی پانی بہتات سے نکلتا ہے۔ اور صاف و شفاف ہونیکے علاوہ بہت زور سے بہتا ہے۔ یوں تو اِس نمائش گاہ دنیا میں ایک معمولی سے معمولی چیز بھی چشم حقیقت بین کے واسطے قابلِ دید اور انوکھی ہے۔ مگر یہ چشمہ اپنے مناظر کے لحاظ سے نہایت ہی عجیب اور دلکش ہے۔ مانا کہ اُسکی پُشت پر کوئی برفانی پہاڑ یا دریا ہوگا لیکن بظاہر جس طرح یہ پتہ نہیں چلتا۔ کہ ایک ننھے سے بیج کے اندر کہاں درخت چھپا ہوا ہے۔ اُسی طرح یہ معلوم نہیں ہوتا۔ کہ اِس چھوٹے سے چشمے کے نیچے ٹھنڈے اور شیریں پانی کا عظیم الشان سمندر کہاں لہریں مار رہا ہے۔ اور جس طرح دنیا میں نت نئی صورتیں جلوہ فگن ہوتی ہیں۔ اور پُرانی نیست و نابود ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح اِس چشمہ کے پانی کا حال دیکھنے میں آتا ہے۔ نیا پانی نکلتا اور پُرانا خارج ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور جو ایک دفعہ بہ جاتا ہے۔ پھر لوٹ کر واپس نہیں آتا ۔ موسم سرما میں جب تمام سڑکوں۔ میدانوں۔ مکانوں۔ درختوں اور پہاڑوں پر برف ہی برف دکھائی دیتی ہے۔ اکثر ندی نالوں کا پانی جم جاتا ہے۔ گھروں میں رکھے ہوئے پانی کے گھڑے یخ بستہ ہو جاتے ہیں۔ یہانتک کہ چراغوں کا تیل بھی جم جاتا ہے۔ لیکن اِس چشمہ کا پانی گرم رہتا ہے۔ اور اسکے اندر سے دھوآں اُٹھتا نظر آتا ہے۔ یہ ایسا گرم ہے کہ انسان آسانی کے ساتھ نہا سکتا ہے۔ موسم گرما میں پانی کا یہ عالم ہے۔ کہ اُس میں گھڑے ہو کر بدن ملنا اور پانی میں رہنا دشوار ہو جاتا ہے۔ القصہ یہ چشمہ چشمۂ دہر کے سلسلۂ پیدائش و فنا کیطرح ہر موسم اور ہر وقت میں برابر جاری رہتا ہے۔ اِن دونو میں اتنا فرق ضرور ہے کہ یہاں کا خارج ہو جانیوالا پانی جو پُرانا ہو کر بہہ جاتا ہے۔ ہزاروں جانداروں کیواسطے باعث برکت و رحمت ثابت ہوتا ہے۔ وُہ صدہا میلوں تک خشک اور بنجر زمینوں کو سیراب کرتا چلا جاتا ہے۔ مختلف اقسام کا غلہ اور میوہ جات اسکی بدولت پیدا ہوتے ہیں۔ مگر چشمۂ دہر سے جو انسانی نسلیں پیدا ہو کر اور پُرانی ہو ہو کر راہ عدم کو چلی جا رہی ہیں۔ اُنہیں اکثر فضول ہی تلف ہو جاتی ہیں۔ البتہ مسئلہ آواگون اسکی تلفی کو نہیں مانتا۔ لیکن ظاہری صورت میں نتیجہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ جس کا ذکر اُوپر کیا گیا ہے۔ خوش قسمت ہیں وُہ لوگ جو اِن قدرت کے عطیات سے فائدہ اُٹھاتے اور لطف اندوز ہوتے ہیں۔ مگر اکثر باشندگان کشمیر ایسے بھی ہیں جنہوں نے اس چشمہ کو اب تک نہیں دیکھا ہے

اوم
رسالہ
مستانہ جوگی
لاہور

جلد ۲۹	ماہ ستمبر سنہ ۱۹۴۱ء	نمبر ۹

گیان ترازو لیکر بابا تول سچ تو تول

مہابھارت کی اٹھارہ روزہ خونریز جنگ کے بعد
بھیشم پتامہ کا اُپدیش راجاؤں کے فرائض پر

دہلی اور پانی پت کی درمیانی سرزمین نے جس کے ایک وسیع حصہ کا نام "کوروکشیتر" بھی ہے۔ آج سے پانچ ہزار برس پیشتر صرف اٹھارہ دن کے اندر وہ خونین منظر دیکھا ہے۔ کہ یورپ کی جنگ عظیم جس میں قریباً قریباً دنیا کی تمام بڑی بڑی سلطنتیں کسی نہ کسی فریق کے ساتھ شامل تھیں۔ اپنے نئے جنگی آلات کی فراوانی اور سائنس کی تباہ کن ایجادات کی موجودگی کے باوجود چھ سال کے عرصہ میں بھی وہ منظر پیش نہ کر سکی * کورو اور پانڈو کا قصہ۔ ارجن اور بھیم کی عداوت۔ اور بالآخر مہابھارت کی لڑائی کا حال کس کو معلوم نہیں؟ یہ مشہور واقعات ہیں۔ اسلئے ہم ان کی تفصیلات میں جانا مناسب نہیں سمجھتے۔ صرف یہ بتانا چاہتے ہیں۔ کہ جب کورو کی تباہی و پامالی کے بعد پانڈو کامیاب ہو گئے۔ اور سری کرشن۔ بیاس جی اور دھرت راشٹر کے کہنے سے راجہ یدھشٹر نے جو پانڈو میں سب سے بڑا بھائی تھا۔ ہستناپور (دہلی) کا تخت و تاج قبول کر لیا۔ تو سری کرشن جی نے بھیشم پتامہ سے جو زندگی کی آخری منزلیں طے کر رہا تھا۔ کہا۔ کہ راجہ یدھشٹر تمہارا فرزند ہے۔ وہ اسقدر لاتعداد انسانوں کے کشت و خون سے جو محض اسی کے سبب سے ہوا ہے۔ بہت پشیمان ہے۔ وہ چاہتا ہے۔ کہ آپ کی زبان

مُبارک سے ایسی پاکیزہ نصائح سُنے۔ جو اُس کی ذات کے لئے اور اُس کی آئندہ نسلوں۔ جانشینوں اور تمام راجاؤں کیلئے فائدہ بخش اور کارآمد ہوں۔ تاکہ وُہ ان پر عمل کرکے اپنی زندگی بھی امن و امان سے بسر کریں اور اُن کی رعایا بھی خُوشحال اور فارغ البال رہ سکے +

بھیشم پتامہ نے جو قیمتی نصائح کیں۔ وُہ مہابھارت کے آخری تین پربوں بالخصُوص بارھویں پرب میں جس کا نام "شانت پرب" ہے۔ بالتفصیل درج ہیں۔ ہم اُن نصائح میں سے چند ایک یہاں پیش کرتے ہیں کاش ہندوستان کے والیانِ ریاست اِن پر عمل کر سکیں +

(۱) اگرچہ جھوٹ بولنا سب کے لئے بُرا ہے۔ مگر راجاؤں کے لئے بہت ہی بُرا ہے۔ اِسلئے کہ جھوٹ بولنے سے اُن کا اعتبار جاتا رہتا ہے۔ اور دوست دُشمن سب بد دِل ہو جاتے ہیں۔ راجہ کے جھوٹ بولنے سے پرجا کو بھی جھوٹ بولنے کی عادت ہو جائیگی۔ اور مُلک میں بہت سی خرابیاں پیدا ہونگی۔ جن کا گناہ راجہ کی گردن پر ہوگا +

(۲) راجے آبِ رواں کا چشمہ ہیں چشمہ سے جسقدر پانی نکالا جائیگا۔ چشمہ صاف اور شیریں ہوتا جائے گا۔ اِس لئے سخاوت اور فیاضی راجاؤں کے لئے لازمی ہے +(۳) راجاؤں کو چاہیئے۔ کہ قہر و غضب اور نرمی و شفقت سے مُساوی درجہ پر کام لیتے رہیں۔ اگر وُہ ہر وقت غضب ناک رہیں گے۔ تو مارے خوف کے کسی کو اُن سے عرض معروض کرنے کی جُرأت نہ ہوگی۔ اور انتظام مملکت میں ایسا اُلجھاؤ پیدا ہوگا۔ کہ سُلجھانا مُشکل ہو جائے گا۔ اور اگر ہر وقت نرمی اختیار کرینگے۔ تو اُن کا رُعب جاتا رہے گا۔ اور نوبت یہانتک پہونچے گی۔ کہ تمام دُنیا کا خُون بہادینے پر بھی اُن کا رُعب قائم نہ ہو سکے گا+ (۴) کارداروں کو ایسا سلوک کرنا چاہیئے۔ کہ تمام رعایا اُن کو اچھا جانے۔ اور اُن کے لئے دُعا کرے + (۵) راجاؤں کو لازم ہے کہ رعایا پہ سختی نہ کریں۔ ورنہ ایسے فتنے برپا ہونگے۔ کہ کسی تدبیر سے اُن کا تدارک نہ ہو سکے گا + (۶) راجاؤں کے لئے فرمان بردار۔ وفاشعار اور مضبُوط فوج سے بڑھ کر کوئی اچھی چیز نہیں + (۷) راجاؤں کے لئے نہائت ضرُوری ہے۔ کہ وُہ شراب سے پرہیز کریں۔ کیونکہ پرمیشور نے اُنہیں اِس لئے سردار بنایا ہے۔ کہ وُہ لوگوں کی حفاظت و نگہبانی کریں۔ اگر راجہ ہی مدہوش و بدمست ہے۔ اور اُسکی حالت یہ ہے۔ کہ دُوسروں کو اِس کی نگہبانی کرنی پڑتی ہے۔ تو وُہ رعایا کی حفاظت کیا کریگا؟ (۸) راجاؤں کو مُناسب ہے۔ کہ وُہ قماربازی اور عورتوں کی صحبت اور مصاحبوں کے ساتھ ہنسی مذاق سے پرہیز کریں + (۹) راجاؤں کو اپنے مُلازموں کی تقرری میں اتنی احتیاط رکھنی چاہیئے۔ کہ وُہ عزت داروں کو ذلیل و خوار نہ کر سکیں۔ اور رعایا کے جان و مال پر دست درازی نہ کرنے پائیں +(۱۰) راجاؤں کو لازم ہے۔ کہ اپنی رعایا کے جان و مال کی ویسی ہی حفاظت کریں جیسی کہ حاملہ عورت اپنی اور اپنے شکم کے بچہ کی حفاظت کرتی ہے۔ کیونکہ رعایا راجاؤں کے لئے بطور خزانہ کے ہے ۔۔۔ راجاؤں کو لازم ہے کہ رعایا ۔۔۔ دست درازی نہ

کریں۔ اور اسی قدر محصول وصول کریں۔ جس کی انصاف و عدل اجازت دیتے ہوں + (۱۲) راجاؤں کو چاہئیے۔ کہ رموز مملکت میں ہر کس و ناکس سے مشورہ نہ کریں۔ بلکہ صاحبان دُور اندیش و تجربہ کار سے صلاح لیا کریں۔ اور مشورہ سُننے کے بعد غور و تامل کریں۔ اور جو بات اچھی نظر آئے۔ اُسپر عمل کریں + (۱۳) راجاؤں کو لازم ہے۔ کہ عالموں اور پنڈتوں کی صحبت کے لئے ایک خاص وقت مقرر کریں۔ اور ان کی اچھی باتوں سے فائدہ اُٹھائیں + (۱۴) راجاؤں کو لازم ہے۔ کہ عفو جرائم کی عادت اختیار کریں + (۱۵) راجا کو لازم ہے کہ ظالموں کو رعایا پر مسلط نہ کرے۔ ورنہ جسقدر جور و ظلم ان سے سرزد ہونگے۔ وہ سب راجا کے نامۂ اعمال میں لکھے جائینگے + (۱۶) راجاؤں کو مصاحبت کے لئے راست باز۔ ودوان۔ خاندانی رئیس اور بہادر و شجاع لوگوں کی ضرورت ہے۔ جو ان کو نیک کاموں کی رہنمائی کریں۔ ملک کے صحیح صحیح حالات بتائیں۔ اور جن کی صحبت سے دونو جہان کا فائدہ ہو + (۱۷) راجاؤں کے لئے مناسب ہے کہ وہ دیانت دار اور انصاف پرور حاکموں کے جاہ و منصب میں افزونی کریں۔ اور ایسے لوگوں کو واجبی سزا دیں۔ جو تھوڑے سے لالچ کے لئے رعایا کا خون چوس لیتے ہیں + (۱۸) راجہ رعیت و سپاہ کے سبب راجہ کہلاتا ہے۔ اگر رعیت معمور و آباد ان ہے تو سپاہ بھی آسودہ ہے۔ اور جب سپاہ آسودہ ہے۔ تو رعایا بھی خوشحال ہے + (۱۹) پرچہ نویس اور مخبر جو خبریں راجاؤں کو دیتے رہتے ہیں۔ وہ غرض سے خالی نہیں ہوتیں۔ راجاؤں کو مناسب ہے۔ کہ عمل کرنے سے پیشتر ایسی خبروں کا حسن و قبح میزان دانش میں تول لیا کریں + (۲۰) راجہ کو لازم ہے۔ کہ برہمن۔ کھتری۔ ویش اور شودر ہر فرقہ کے لوگوں کے نمائندے اپنے حضور میں رکھے۔ تاکہ ہر فرقہ کے حالات اُسے معلوم ہوتے رہیں + (۲۱) راجہ کو لازم ہے۔ کہ اپنی رعایا کو خویشاوندوں کے برابر سمجھے۔ جو عمر میں بڑے ہوں۔ اُن کو اپنا بزرگ۔ ہم عمروں کو برابر اور چھوٹوں کو فرزندوں کے برابر تصور کرے + (۲۲) راجہ کو کوشش کرنی چاہئیے۔ کہ اس کی سپاہ اور رعیت دونو آباد رہیں۔ تاکہ ضرورت کیوقت سپاہی جان دینے سے اور رعایا مال پیش کرنے سے دریغ نہ کرے + (۲۳) راجہ کو لازم ہے۔ کہ جو برہمن نہ خود علم پڑھے اور نہ دوسرے کو پڑھائے۔ اس کو اپنی ولائت سے نکال دے + (۲۴) راجہ کو لازم ہے کہ کسی کاردار اور اہل کار کے دیانت دار اور صاحب اعتبار ہونے کے باوجود اُس کے حال سے غافل نہ رہے۔ بلکہ اپنے پرچہ نویسوں کے ذریعہ سے اُس کے حالات کی تفتیش کرتا رہے۔ اور ایسا عمل اختیار کرے۔ کہ ہر ایک اہل کار کو یہی معلوم ہو۔ کہ راجہ اُسکے نیک و بد سے خبردار رہتا اور اس کے کاروبار کو خود ملاحظہ کرتا رہتا ہے (۲۵) راجہ کو لازم ہے۔ کہ جو قدیم عمارتیں اُس کی مملکت میں خراب ہوگئی ہوں۔ اُن کو نئے سرے سے آباد اور اُن کی تعمیر و مرمت کرے + (۲۶) راجہ کو لازم ہے۔ کہ زراعت پیشہ لوگوں کا خاص خیال رکھے

تاکہ وہ اپنے پیشہ کو خاطر خواہ ترقی دے سکیں ۔ (۲۷) راجہ کو لازم ہے۔ کہ ہر ایک عامل اور کاردار کے دربار میں خفیہ نویس مقرر کرے۔ جو اُن کے کاروبار اور مشاغل سے اُس کو آگاہ کرتے رہیں۔ راجہ کو یہ بھی لازم ہے۔ کہ عاملوں کے حالات جو اُس کو معلوم ہوا کریں۔ کبھی کبھی اُن پر بھی ظاہر کر دیا کرے۔ تاکہ وہ ہر وقت اُس سے خائف رہیں۔ اور ظاہر و غائب اُس کا رعب اُن کے دلوں میں جما رہے ۔ (۲۸) دشمن گو کیسا ہی ادنیٰ و کم تر ہو۔ اُس کو حقیر نہ سمجھے۔ سانپ اگرچہ بظاہر چھوٹا سا جانور ہے۔ مگر اپنے زہر سے بڑے بڑے جانوروں کو ہلاک کر دیتا ہے ۔ (۲۹) راجاؤں کو کسی حالت میں مکر و فریب نہ کرنا چاہیئے۔ ہاں دشمنوں کے ساتھ فریب کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ۔ (۳۰) راجہ کو لازم ہے کہ زراعت پیشہ لوگوں سے اپنا مقرر حصہ وصول کرے۔ اور اگر پیداوار کم ہو۔ تو اپنے حصہ میں بھی کمی کر دے۔ اور اُن پر کسی قسم کی زیادتی و تعدی نہ کرے ۔

(۳۱) راجہ جن لوگوں کو شہروں کی حفاظت اور عدل و انصاف کا کام سپرد کرے۔ اُن کے حالات کی پوشیدہ جستجو رکھا کرے۔ تاکہ اہل شہر پر زیادتی نہ ہونے پائے ۔ (۳۲) کوئی راجہ حرام مال اپنے خزانہ میں جمع نہ کرے۔ کہ یہ برکت کو زائل کر دیتا ہے۔ کسی گنہگار پر جرمانہ کرتا ہو۔ تو اسقدر نہ کرے۔ کہ وہ نانِ شبینہ کو بھی محتاج ہو جائے اور گدائی کرنے لگے ۔ (۳۳) راجہ کو مناسب ہے۔ کہ کمینہ اور بد اصل لوگوں کی صحبت سے کنارہ کش رہے۔ اور ملک کی کوئی خدمت بھی اُن کے سپرد نہ کرے ۔ (۳۴) راجاؤں کو چاہیئے۔ کہ دوسروں کے گناہ سر دربار معاف کریں۔ بشرطیکہ معاف کر دینے سے ملکی انتظام میں کوئی خلل واقع نہ ہوتا ہو ۔ (۳۵) راجہ کو لازم ہے کہ ملک کے حالات اور اہلکاروں کے نیک و بد سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے جاسوس مقرر کرے ۔

(۳۶) راجہ اگر عادل ہو۔ تو کھیشتروں اور پنڈتوں کے برابر نیکیوں کا پھل ملتا ہے۔ اسلئے برہمنوں اور کھیشتریوں کا قول ہے۔ کہ راجہ کو سلطنت ترک نہ کرنی چاہیئے۔ کیونکہ جو پھل اُس کو جنگل میں ہزار سال عبادت کرنے سے مل سکتا ہے۔ وہ سلطنت میں ایک روز عدل کرنے سے حاصل ہو جاتا ہے ۔ (۳۷) راجاؤں کا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے ملک کے حالات سے باخبر رہیں۔ نیکوں کی پرورش کریں۔ اور بُروں کو سزا دیں ۔ (۳۸) جو راجہ بھوکوں کو پیٹ بھر کر کھانا دیتا ہے۔ برہمنوں کو کپڑا پہناتا ہے۔ غریبوں کی دستگیری کرتا ہے۔ جو درجہ امارت سے گر گئے ہوں۔ اُن کی دلجوئی کرتا ہے۔ وہ ظاہر میں تو راجہ ہے۔ مگر باطن میں دیوتا ہے ۔ (۳۹) راجہ کو لازم ہے کہ اپنے نفس پر غالب رہے۔ اور ہوا و ہوس کو ترک کرے۔ اور لوگوں کے زن و اطفال و فرزند کو اپنا عیال تصور کرے۔ جب وہ اپنے نفس پر جو اندرونی دشمن ہے۔ غالب آ جائے گا۔ تو اُس کی برکت سے بیرونی دشمن خود بخود مغلوب ہو جائیں گے ۔ (۴۰) راجہ جو جاسوس اپنی راجدھانی اور دوسرے شہروں میں مقرر کرے۔ وہ ایسے ہونے چاہئیں۔ جو بظاہر ابلہ و بے وقوف معلوم ہوں۔ مگر باطن میں بڑے بڑے زیرک ہوشیار اور ودوان ہوں

لیکن ایک مرتبہ بھی اگر کوئی جاسوس جھوٹی خبر پہنچائے۔ تو فی الفور اُس کو معزول کر دے۔ نیز جاسوس ایسے جفاکش ہونے چاہئیں۔ جو بھوک پیاس اور سردی گرمی کی پرواہ نہ کریں۔ بلکہ پیدل چلنے اور سفر کرنے میں مضبوط ہوں۔ ہر اٹھارہ کوس پر ایک جاسوس ہونا چاہئے۔ اور ایسا کہ وہ سب حالات سے واقف ہو۔ مگر اُس کی تقرری اور اُس کے حالات سے کوئی واقف نہ ہو۔ (۴۱) جب ملک خوب سرسبز و آباد ہو۔ تو اُس وقت راجہ اگر محاصل میں کچھ ایزادی کر دے تو مضائقہ نہیں۔ مگر یہ زیادتی صرف محاصل زمین پر ہونی چاہئے۔ اہل حرفہ و تجارت پر کوئی محصول لگانا موجب بدامنی ہے۔ (۴۲) ہر ایک شخص کو اُسکے رتبہ کے مُوافق سزا ملنی چاہئے۔ بعض لوگ ایسے ہیں جنکو صرف چشم نمائی کافی ہوتی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں۔ جو شریف اور خاندانی ہیں۔ بعض ایسے ہیں۔ جن کو زبانی جھڑک دینا ہی اُن کے لئے کافی سزا ہے۔ بعض ایسے ہیں جن کو دربار سے نکال دینا یا اُن کے درجہ میں تنزل کر دینا بھی اُن کے لئے کافی ہوتا ہے۔ مگر کمینوں اور رذیلوں اور عادی مجرموں کی سزائیں اُن لوگوں سے مختلف ہوا کرتی ہیں۔ اس لئے اُن کو سخت سزائیں ملنی چاہئیں ؂

اِنقلاب

بھگوان نے ”گیتا مقدس“ میں فرمایا ہے۔ کہ جب غریبوں کو امیرانہ ناز یبا حرکات اور بے رحمیوں سے ستاتے ہیں۔ جب کروڑپتی سیٹھوں کے رتھوں کے نیچے غریب کچلے جاتے ہیں۔ اور کوئی باز پرس نہیں ہوتی۔ جب قانون و انصاف نابُود ہو جاتے ہیں۔ جب مظلوم کی دادرسی نہیں ہوتی۔ جب ظالم کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے دھرم و ایمان پر پھبتیاں اُڑانا باعث شان تصور کیا جاتا ہو۔ جب انسانیت بدکردار انسانوں کے اعمال قبیحہ شرمناک افعال سے تڑپتی ہے۔ اتفاق و اتحاد کا نام و نشان مٹ جاتا ہے۔ لاتعداد انسانی جانوں کا طبقہ فاقہ کشی میں مبتلا زندگی پر موت کو ترجیح دیتا ہے۔ اُس وقت تیری رحمت جوش میں آکر ایک انقلاب عظیم برپا کر دیتی ہے۔ انسانیت کا درس دُنیا کو ملتا ہے جنسی منافرت کا زہر ہلاہل پریم و محبت کے امرت میں جذب ہو جاتا ہے ؂

اُونچی دیواروں کے اندر لوہے کی سلاخوں کے پیچھے ۔۔۔ بیٹھے ہیں مقفل کچھ انساں انساں جو نہیں کہ گنتی ہیں

انکے بھی کبھی دن آئینگے۔ انپر بھی کریگی لطف کبھی ۔۔۔ وہ اندھی بڑیاں جو قسمت کا تانا بانا تنتی ہیں

جاگے گی کبھی سوئی قسمت ٹوٹے گا کبھی قفلِ زنداں

کچھ سکیں روحیں آس لگائے۔ عمر کی گھڑیاں گنتی ہیں

کون کس کیلئے

مندروں میں گونجتی ہے روز سنکھوں کی صدا جسکو سنکر خوش ہوا کرتے ہیں سارے دیوتا

مسجدوں میں روز آتی ہے مؤذن کی صدا تا کہ کچھ قائم رہے تقدیس و توحیدِ خدا

پھول کھلتے ہیں سکونِ قلبِ بلبل کیلئے پیچ و خم پیدا ہوئے گیسوئے سنبل کیلئے

نغمہ نے کیواسطے نے نغمہ زن کیواسطے پھول بلبل کیلئے بلبل چمن کیواسطے

اک سرورِ دائمی روحِ بشر کے واسطے دردِ دل کیواسطے سوزش جگر کیواسطے

ابرِ بارش کیلئے بارش بہاراں کیلئے پھول گلشن کیلئے گلشن ہزاراں کیلئے

حسن عاشق کیلئے عاشق محبت کیلئے عشق مرنے کیلئے مرنا حقیقت کیلئے

نغمۂ رنگیں فضا میں کیف بھرنے کیلئے کیفِ نغمہ پر وجودِ شوق مرنے کیلئے

اہلِ دل پر برقِ ہستی بنکے گرنے کیلئے ہے نگاہِ ناز بجلی بن کے گرنے کیلئے

جنبشِ ابرو کی حرکت خونِ حسرت کیلئے خونِ حسرت کیلئے خونِ محبت کیلئے

زلفِ مشکیں وش رندان پہ بکھرنے کیلئے بوئے گیسو اہلِ دل کو مست کرنے کیلئے

تابشِ رخ تیرگیٔ دل مٹانے کے لئے سحرِ الفت فتنۂ غم کو جگانے کے لئے

حسنِ جاناں اکتسابِ نورِ الفت کیلئے عشقِ صادق امتحانِ جذبِ وحشت کیلئے

ہے متاعِ دل بھی فرحتِ اہلِ دل کیواسطے عشق کا ایثار حسنِ منفعل کے واسطے

ہندی ادب کے چند دلکش نمونے

اُس پار

میں ندی کے اُس پار وہاں جانا چاہتا ہُوں۔ جہاں بُہت سی کشتیاں بانس کے ڈنڈوں سے بندھی ہُوئی ایک جگہ کھڑی رہتی ہیں۔ وہاں لوگ ہمیشہ اپنی کشتیوں میں بیٹھ کر کندھوں پر ہل رکھے ہُوئے دُور دُور کھیت جوتنے جاتے ہیں۔ اور وہیں چرواہے اپنے بیلوں اور گائیں بھینسوں کو دریا میں سے گزار کر اس چراگاہ میں لاتے ہیں۔ وہاں سے وُہ سب شام کو گھر لوٹ آتے ہیں۔ اور گھاس پھُونس کے ڈھکے ہُوئے اس حصّہ میں صرف گیدڑ ہی چلانے کو رہ جاتے ہیں ٭ "امّاں! اگر تمہیں بُرا نہ لگے۔ تو میں چاہتا ہُوں۔ کہ بڑا ہو کر اس جگہ کا مالک بنوں۔ لوگوں کا کہنا ہے۔ کہ اس اونچے دو ٹیلوں کی آڑ میں دو عجیب و غریب گڑھے ہیں۔ وہاں برسات کے بعد بُہت سی جنگلی بطخیں آتی ہیں۔ اور چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں اپنا مُنہ نکالتی ہیں جن کے درمیان پانی کی بطخیں انڈے دیتی ہیں۔ وہاں مُرغیاں اپنی دُم نچا نچا کر صاف کیچڑ پر اپنے پنجوں کے نشان چھوڑ جاتی ہیں ٭ امّاں! سچ مچ اگر بُرا نہ مانو۔ تو بڑا ہونے پر میں وہاں کا مالک اور محافظ ہی بن جاؤں گا۔ میں اِس پار سے اُس پار اور اُدھر سے اِدھر اُتر کر آیا کرُونگا۔ گاؤں کے لڑکے لڑکیاں نہاتے وقت مجھے دیکھکر حیرت کرینگے ٭ جب سُورج چڑھتے چڑھتے آسمان کے درمیان کھڑا ہو جائے گا۔ اور سویرے سے دوپہر ہو جائے گی۔ تو میں دوڑتا ہُوا تمہارے پاس آکر کہُوں گا۔ "امّاں! مجھے بھُوک لگی ہے۔" جب دن ختم ہو جائے گا اور سائے درختوں کے نیچے چھُپنے لگیں گے۔ تو میں اندھیرے میں لوٹ آؤں گا۔ میں بابو جی کی طرح تمہیں چھوڑ کر شہر میں کام کرنے کبھی نہ جاؤں گا ٭ امّاں! سچ کہو۔ اگر تمہیں بُرا نہ معلوم ہو۔ تو میں بڑا ہونے پر اُس جگہ کا محافظ بن جاؤں گا" ٭

نیند کا چور

مُنّو کی آنکھ سے نیند کون چُرا کر لے گیا۔ مجھے بتاؤ تو سہی۔ کمر پر گگری رکھ کر ماں پڑوس کے گاؤں میں پانی بھرنے گئی تھی۔ دوپہر ہو گئی تھی۔ لڑکوں کے کھیلنے کا وقت گزر چکا تھا۔ اور تالاب کی بطخیں چپ تھیں ٭ بڑ کے درخت کے سایہ میں گڈریا کا لڑکا سو گیا تھا۔ اور امرائی کے قریب دلدل میں سارس چپ چاپ کھڑا تھا۔ اسی میں نیند کا چور آیا اور ... [illegible] ... تو مُنّو گھر بھر میں چکر لگا رہا ہے ٭ میرے مُنّو کی آنکھوں سے نیند کون چُرا کر لے گیا۔ مجھے بتا دو۔ میرا خیال

ہے۔ کہ میں اسے ڈھونڈھ کر باندھ دُوں ÷ لاؤ اس اندھیرے دّرہ میں دیکھیں۔ یا بہول کے درخت کے اُونچے
سایہ میں دیکھیں۔ جہاں کونوں میں کبوتر بولتے ہیں۔ اور اُجلی رات کے سناٹے میں پریوں کے پازیب بجتے ہیں ÷

پھولوں کا مدرسہ

آندھی والے بادل آسمان پر گرجتے ہیں۔ اور پانی کے قطرے گرانے لگتے ہیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا مشرقی
جانب جھاڑیوں کے اُوپر سے دوڑتی ہوئی بانسوں میں اپنی بانسری بجانے آتی ہے۔ اُسوقت ڈھیر کے ڈھیر
پھول نہ جانے کہاں سے آجاتے ہیں۔ اور مست ہو کر خوشی سے گھاس پر ناچنے لگتے ہیں ÷ اماں! سچ مچ میں تو
کہتا ہوں۔ کہ یہ پھول نیچے ہی نیچے کسی مدرسہ میں پڑھنے جاتے ہیں۔ کواڑ بند کر کے وہ اپنا سبق یاد کرتے ہیں۔
وقت سے قبل جو کہیں وہ کھیلنے کے لئے باہر جانا چاہتے ہیں۔ تو اُن کے اُستاد اُنہیں ایک کونے میں کھڑا کر دیتے
ہیں۔ برسات کے ایام میں انہیں تعطیل رہتی ہے ÷ جنگل میں ڈالیاں آپس میں لڑتی ہیں۔ پتیاں پاگل ہوا میں سرسراتی
ہیں۔ اور آندھی والے بادل بھوتوں کی طرح تالیاں بجاتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ پھول بھی لال پیلے اور سفید
کپڑے پہن پہن کر باہر نکل پڑتے ہیں ÷ اماں! کیا تم جانتی ہو۔ کہ وہ تاروں کے گھر کے پاس آسمان میں رہتے ہیں
دیکھتی نہیں ہو۔ کہ وہاں جانے کے لئے کتنے دروازے ہیں۔ جانتی ہو۔ کہ وہ اتنی جلدی میں کیوں ہیں؟

میری کشتیاں

میں اپنی کاغذ کی کشتیاں تیار کرتا ہوں۔ اور اُنہیں تیراتا ہوں۔ اُن پر بڑے بڑے کالے حرفوں میں
اپنا اور اپنے گاؤں کا نام لکھ دیتا ہوں میں سمجھتا ہوں۔ کہ کسی نہ کسی مُلک میں کوئی انہیں دیکھے گا۔ پھر جان
لے گا۔ کہ میں کون ہوں؟ اپنی چھوٹی سی کشتی میں میں باغوں سے پھول لا کر اُس میں لاد دیتا ہوں۔ اور یہ
رنگین پھول کشتی کے ہمراہ بہتے بہتے کسی ملک کے کنارے لگ ہی جائینگے ÷ کاغذ کی ان کشتیوں کو پانی میں
چھوڑ کر جب میں آسمان کی طرف دیکھتا ہوں۔ تو ننھے ننھے بادل اپنی کشتیوں پر سفید سفید بادبان چڑھاتے
دکھائی دیتے ہیں۔ شاید اُوپر آسمان میں میرا کوئی ساتھی رہتا ہے۔ وہی میری کشتیوں کے ساتھ دوڑنے کے لئے
ہوا میں انہیں نیچے بھیج دیتا ہے۔ جب رات ہوتی ہے۔ تو ہاتھوں میں مُنہ چھپائے میں سو جاتا ہوں۔ خواب دیکھتا
ہوں۔ کہ آدھی رات کو تاروں کے نیچے میری کشتیاں بہتی چلی جارہی ہیں۔ ندی کی پریاں پانی میں بیٹھی ہوئی
ہیں۔ اور اُوپر پھولوں سے بھری ہوئی ٹوکریاں لدی ہیں ÷

سوداگر

اماں! بھلا تھوڑی دیر کے لئے مان لو۔ کہ تم گھر بیٹھی ہو۔ اور میں دُور دُور ملکوں میں پھرنے جارہا ہوں۔
مان لو۔ کہ گھاٹ پر میری کشتی لدی تیار ہے۔ اچھا تو سوچ کر بتاؤ۔ کہ لوٹتے وقت تمہارے لئے کیا لاؤں؟

اماں! کیا تمہیں انبار کا انبار سونا چاہیئے؟

ملاح

اُس ملاح کی کشتی راج گنج گھاٹ پر بندھی ہے۔ بغیر کسی کام کے اُس میں سن لدا ہے۔ اور نہ جانے کتنے دنوں سے یونہی اپاہج سی کھڑی ہے۔ اگر وُہ کشتی مجھے اُدھار دے دیتا۔ تو میں اس میں سو پتوار لگاتا۔ میں اسے ایسی ویسی جگہ کبھی نہیں لے جاتا۔ میں تو اُس میں چڑھ کر سات سمندروں اور تیرہ ندیوں میں اچھی طرح گھومتا پھرتا۔ مگر اماں! تم کہیں کسی گوشہ میں بیٹھ کر میرے لئے رؤوگی تو نہیں؟ میں رام چند رجی کی طرح کب بن میں جا رہا ہوں۔ کہ چودہ برس کے بعد واپس آؤں گا۔ میں کہانی والا راجکمار بن جاؤں گا۔ اور جو کچھ چاہوں گا۔ اپنی ناؤ میں بھر دونگا۔ اپنے ساتھ عاشو کو بھی لے جاؤں گا۔ اور پھر تو سات سمندر اور تیرہ ندیوں کی خوب سیر ہوگی۔ دھوپ نکلتے ہی ہم دونو چل دینگے۔ دوپہر کو جب تم تالاب پر نہانے جاؤ گی۔ تب تک تو ہم نہ جانے کس راجہ کے راج میں پہونچ جائینگے۔ جو کچھ ہم دیکھیں گے۔ سب تم سے آکر کہیں گے ✤

رات

آفتاب مغرب کی عمیق وادیوں میں آہستہ آہستہ اُتر رہا ہے۔ شام کا ستارہ بلندی پر چمک رہا ہے طیور اپنے آشیانوں میں آ چھپے ہیں۔ مجھے بھی اپنا خیال کرنا چاہیئے ✤ پھول کی مانند ماہتاب آسمان کے بلند دائروں میں خاموش مسرتوں کے ساتھ رات کو مسکراتا ہے ✤ اُلوداع! اے سبزہ زار باغ اور خوبصورت جھاڑیو۔ لوگ اپنے گھروں میں اطمینان و مسرت کی انگڑائیاں لے رہے ہیں۔ مویشیوں نے اپنی جائے پناہ میں سکوت قائم کر رکھا ہے۔ فرشتوں کے تلکے اور نورانی قدم متحرک نظر آ رہے ہیں ✤ وُہ چپ چھپ کر رحمتوں کی بارش کرتے ہیں۔ اور رات کی خاموش فضا میں مسرت کی لہریں بکھیرتے ہیں۔ تمام پھولوں اور کلیوں پر اور تمام خوابیدہ سینوں پر ✤ فلک بوس ڈالیوں پر وُہ گھونسلوں میں جھانکتے ہیں۔ جہاں طیور گرمائے پڑے ہوتے ہیں۔ وُہ درندوں کے غاروں کی سیر کرتے ہیں۔ تمام تکالیف سے اُن کو محفوظ رکھنے کے لئے اگر وُہ کسی کی آنکھوں میں آنسو دیکھتے ہیں۔ حالانکہ انہیں میٹھی نیند کے مزے لینے تھے۔ تو اُس کی آنکھوں میں خواب کا نشہ انڈیلتے ہیں۔ اور اسکے بستر کے قریب بیٹھ جاتے ہیں ✤

کہتے کہتے تھک چکی ہے رگ ربیرہ لاڈلے۔ اب بس بس تو کیسے جاؤں کی کہانی "ہمیرے لئے

درسِ جانبازی

پھر درسِ وفا دے عالم کو اے شمعِ وطن کے پروانے
پھر رُوح دلوں میں پھونک نئی اے آزادی کے دیوانے

گنگا جمنا کی لہروں میں طوفانی جوش اُٹھا دیکھو
وہ جھوم کے کالی گھٹا اُٹھی وہ ابرِ کرم برسا دیکھو
اک پیکرِ ناز و ادا بنکر وہ چرخ پہ کون ہنسا دیکھو

تو بھی اُٹھ بن کر ابرِ کرم رحمت کی بُوندیں برسانے
پھر درسِ وفا دے عالم کو اے شمعِ وطن کے پروانے

وہ جنگ چھڑی آزادی کی وہ لال زمیں خونخوار ہوئی
وہ تیر چلے سن سن کرتے وہ تیغوں کی جھنکار ہوئی
وہ شور ہوا۔ آزادی کی دیوی کی جے جے کار ہوئی

اے محوِ تغافل جنگ کو اُٹھ میدان میں جا سینہ تانے
پھر درسِ وفا دے عالم کو اے شمعِ وطن کے پروانے

پھر کاٹ پرستارِ ہمت زنجیرِ غلامی کی کڑیاں
پھر توڑ دے سب اک اک کر کے گلپوش غلامی کی لڑیاں
ورنہ پیغامِ فنا اک دن لائینگی غلامی کی گھڑیاں

کیا سوچ رہا ہے دیوانے ہنستے ہیں تجھ پر فرزانے
پھر درسِ وفا دے عالم کو اے شمعِ وطن کے پروانے

وہ فکرِ اماں میں چھپنے سے گلشن میں بادِ خزاں آئی
آغوشِ نشیمن میں گویا چھپنے کو برقِ تپاں آئی
اک حشر بپا ہے ہر شے کے ہونٹوں پر آہ و فغاں آئی

تو مچلے پھر کی بنکے گھٹا سرسبز بنانے کاشانے
پھر درسِ وفا دے عالم کو اے شمعِ وطن کے پروانے

پھر اپنے رسیلے نغموں سے بیدار وطن کو کر اپنے
آزاد وطن کو کر اپنے ہشیار وطن کو کر اپنے
اور عشق و محبت کی مے سے سرشار وطن کو کر اپنے

اُٹھ کاٹ غلامی کے پھندے دہرا دے بھولے افسانے
پھر درسِ وفا دے عالم کو اے شمعِ وطن کے پروانے

رہگذارِ کہکشاں پر تھک کے تارے سو گئے
اوڑھ کر اک نور کی چادر ستارے سو گئے
رات کی آغوش میں گردش کے مارے سو گئے
سارا عالم سو رہا ہے ایک میں بیدار ہوں
[illegible] زندگی کا [illegible] تار ہوں

گاؤں کی برسات

برسات کی رُت، ٹھنڈی ہوا۔ آم کے باغ اور لہلہاتے کھیت۔ گاؤں والوں کو اور کیا چاہیئے یہی آم
کے باغ اور جامنوں کے پیڑ۔ اُن کے کلب گھر اور کمپنی باغ ہیں۔ "کنور پور" کہنے کو تو چھوٹا سا گاؤں ہے
مگر برسات کی رُت میں یہ گاؤں سچ مچ جنّت نشان بن جاتا ہے۔ اِس گاؤں کے چاروں طرف آم کے باغ ہیں۔
دُور دُور سے لوگ آم کھانے اور مول لینے آتے ہیں۔ لوگوں میں مشہور ہے۔ کہ کنور پور کی مٹی کو دودھ اور شہد میں
گوندھ کر بنایا گیا ہے۔ خیر یہ تو لوگوں کا مُبالغہ ہے۔ لیکن یہ واقع ہے۔ کہ کنور پور کے آم مٹھاس میں اپنا جواب نہیں
رکھتے ۔ کنور پور کے بڑے باغ میں لوگ جمع تھے۔ اُودی گھٹائیں ہرے بھرے پیڑوں پر سایہ کئے ہوئے تھیں
ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ درختوں کے پتّے پانی میں شرابور تھے۔ اور ڈالیاں پانی سے بوجھل ہو کر نیچے کو جُھک
گئی تھیں۔ باغ میں درختوں کے آس پاس پانی بھرا ہُوا تھا۔ جن میں شاخوں سے ٹپکے ہُوئے آم پڑے ہوئے تھے
باغ والوں کی تو آج چاندی ہی چاندی تھی۔ دھڑا دھڑ بکری ہو رہی تھی۔ شوقین لوگ ٹوکرے کے ٹوکرے
خالی کئے دیتے تھے ۔ باغ کی چہل پہل دیکھنے کے قابل تھی۔ خوشی۔ انبساط۔ قہقہے۔ نغمے۔ بھاگ دوڑ ایسا
معلوم ہوتا تھا۔ جیسے ساری دُنیا کی خوشی آج یہیں سمٹ کر آ گئی ہے۔ مسرّت بیفکری کا نام ہے۔ اور اُس باغ
میں سارے بیفکرے لوگ جمع تھے۔ جو اس باغ میں سیاست اور فلسفہ کے مسائل پر غور کرنے کے لئے نہیں۔ بلکہ
خوش ہونے کے لئے آئے تھے۔ لوگوں نے غلطی سے زر و جواہر کے ڈھیروں کو مسرّت کا مرکز سمجھ رکھا ہے۔ حالانکہ
خوشی زر و جواہر میں نہیں۔ دِل کے اطمینان اور طبیعت کے سکون میں ہے۔ بے فکری اور اطمینان ہو۔ تو پتھریلی زمین
نرم و گداز مسہری بن جاتی ہے۔ اور اطمینان نہ ہو۔ تو پھولوں کی سیج پر آدمی کانٹوں کے بستر کی طرح لوٹتا ہے۔
گاؤں کا زمیندار نیچے پلنگ پر بیٹھا آم کھا رہا تھا۔ چند خوشامدی اُسکے آس پاس بیٹھے اِدھر اُدھر کی گپ ہانک رہے
تھے۔ زمیندار کی کھاٹ سے بہت قریب جامنوں کے درختوں کی روش تھی۔ اُس باغ کی جامنیں مٹھاس اور بڑ...
پن میں گاؤں کے تمام باغوں کی جامنوں سے بڑھکر تھیں۔ گاؤں کی عورتیں چھوٹی چھوٹی ٹوکریاں لئے ہوئے
جامنوں کے درختوں کے نیچے گھوم رہی تھیں۔ اُن کے پیروں کے موٹے موٹے کڑوں کے ٹکرانے اور بچھوؤں
بجنے سے ایک خاص قسم کا نغمہ پیدا ہوتا تھا۔ جس کو نہ تو "حاصلِ بربط" کہا جا سکتا ہے۔ اور نہ "جلترنگ"
لیکن اگر نغمہ کا کام تاثیر ہے۔ تو یہ آوازیں واقعی فردوس گوش تھیں۔ گاؤں کی بیاہی عورتیں ٹول کے دو ٹول
گھر ... تو پانی کی بوندوں سے بھیگ گئے تھے۔ ہاتھوں میں نر...
... بجاتے ہوئی جیں ...

ہری چوڑیاں۔ کانوں میں بالے۔ اور ماتھوں پر چاندی کے جھومر۔ بھرے ہوئے شانے۔ گدازجسم۔ صحت۔ تندرستی
ٹھوڑیوں۔ رخساروں اور پیشانیوں پر نیل کے نشان۔ بعض کے سینوں پر بھی نیل کے پھول بنے ہوتے تھے۔ یہ
عورتیں ذرا تکلف اور حجاب کے ساتھ پھر رہی تھیں۔ انگلیوں سے گھونگٹ کو اٹھا کر لوگوں کو دیکھ بھی لیتی
تھیں۔ حجاب اور مسکراہٹ نے مل جل کر ان کو جاذبِ نگاہ بنا دیا تھا۔ گاؤں کی کنواری لڑکیاں نہایت
بے باکی کے ساتھ جامنیں اٹھا اٹھا کر کھا رہی تھیں۔ ان کے ہونٹ جامنوں کے رنگ سے اودے ہو گئے تھے
ہنس مکھ چہرے ساون کی ہلکی ہلکی پھواروں میں کتنے بھلے معلوم ہوتے تھے۔ ان میں بعض بہت زیادہ شوخ اور
چنچل تھیں۔ ایک دوسرے پر پانی اچھالتیں۔ بدن میں گدگدیاں کرتیں۔ جامنیں پھینکتیں۔ یہ لڑکیاں ساون
کی ملہاریں ایک دوسری کی لے میں لے ملا کر اس تاثیر کے ساتھ گاتی تھیں۔ جیسے یہ سچ مچ آپ بیتی سنا رہی ہیں۔
ٹھنڈی اور نمناک ہواؤں میں ان کے میٹھے بول گھل مل کر ایک عجیب سماں پیدا کر رہے تھے۔

انصاف

آ رہا ہوں فاصلے سے جانا ہے دور مجھ کو
دلچسپ تھے مناظر دم بھر ٹھہر رہا ہوں

جہاں انصاف کے نام پر دور دور سے لوگ آ کر اکٹھے ہوتے ہیں۔ جہاں حق و صداقت کے مقابلہ کی تاب
باطل و دروغ لانے کی مجال نہیں رکھتا۔ جہاں جھوٹ کے پاؤں نہیں جمتے۔ جہاں سچائی کے نام پر اپیلیں دائر
ہوتی ہیں۔ جہاں انسانیت کا درس ملتا ہے۔ جہاں مظلوموں کی دادرسی ہوتی ہے۔ فریادیں سنی جاتی ہیں۔
زبردست و زیردست کا ایک درجہ رکھتے ہوئے شیر و بیر نثار کر رکھ دیا جاتا ہے۔ جہاں ظالم اور ستم گر کیفر
کردار کو پہونچ کر باعثِ عبرت ہوں۔ جہاں ہر کسی سے بلا امتیاز سفارش و وسیلہ انصاف برتا جاتا ہو۔ وہاں ایک
ہی خدا کے بندے دو حصوں میں منقسم ہوں۔ ایک حصہ تکلیف میں اور دوسرا آرام میں ہو۔ کتنے تعجب کا مقام ہے؟

ارواح

قوسِ قزح میں بادلوں کے پیچھے پیچھے۔ ستاروں کی لرزشوں میں۔ چاند کی روشنی میں۔ سورج کی ابتدائی
کرنوں میں۔ گلاب کے پھولوں میں۔ انگور کے خوشوں میں۔ اس نور میں جو افق سے جھانکتا ہے۔ صبح کے کیف بار
دھندلکوں میں پاک روحیں نظر آتی ہیں۔

مجھے معلوم ہے جو حسن کا انجام ہوتا ہے
مری آنکھوں نے دیکھا ہے عروجِ ماہِ تاباں کو

"نغمے"

(۱)

میری دُنیا میرے نغمے — تم کیا جانوں اِن نغموں کو؟

ساون کے جب شور مچاتے بادل میں گاتا ہوں — تم بتلاؤ اِس دُنیا میں کس کو گیت سناتا ہوں

کیوں میرے تخیل کا ساگر یہ رنگین سیپ اُگلتا ہے — اور جب ننھی بوندو میں وہ سیپ چھپا نہیں آتے ہیں

جنکی پہنائی میں اک خوابوں کی دُنیا ہوتی ہے، — عرش سے جو رازابدی لیکر دُنیا کو بتلاتے ہیں؟

دُنیا اُن کو چُن چُن کر پھر ہنستی ہے اور روتی ہے،

میری دُنیا میرے نغمے — تم کیا جانوں اِن نغموں کو

(۲)

میری دُنیا میرے نغمے — تم کیا جانو اِن نغموں کو؟

ساون کے جب شور مچاتے بادل پر میں گاتا ہوں — تم بتلاؤ اِس دُنیا میں کس کو گیت سناتا ہوں

میرے دل کی گہرائی میں موجیں کیوں اُمنڈ آتی ہیں — یہ موجیں جو شعر و سخن کے رنگیں سیپ اُگلتی ہیں

انکی سطح سے تم کیا سمجھو کیسے "موتی" لاتی ہیں — تم کیا جانو کس شدت کے پیچ و تاب میں جلتی ہیں

کتنے غاروں کی گہرائی سے اُوپر اُٹھ آتی ہیں؟

میری دُنیا میرے نغمے — تم کیا جانو اِن نغموں کو

دل کو تیری ذات سے جو ربط پنہاں تھا کبھی — وہ تو اب بھی ہے مگر اُس کی خوشی جاتی رہی

حسن کی اک اک ادا پر جان و دل صدقے مگر — لطف کچھ دامن بچا کر ہی نکل جانے میں ہے

خُدا رسیدہ بُزرگ کی بددُعا

ہندوستان کے مشرقی جنگلوں میں زلزلے سے تباہ شدہ بہت سی عمارات کے کھنڈر موجود ہیں یہاں سرو وصنوبر اور شاہ بلوط کے بلند قامت درختوں کے نیچے عجیب وغریب پتھروں کے ٹکڑے سبزہ میں دبے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس سنسان علاقے میں کبھی کبھی کوئی چرواہا اپنی بکریوں کی حفاظت کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اور مچھلی کے شائقین شکار کھیلنے اِدھر آ نکلتے ہیں ÷ ایک دن مجھے وہاں ایک بوڑھا شخص ملا۔ جو سنگ مرمر کی تختیاں تلاش کر رہا تھا میں نے دیر تک اس سے گفتگو کی۔ اِس جگہ کے متعلق پوچھتا رہا۔ اُس نے مجھے صفید گلاب کی طرح پتھر دکھائے۔ جو اُسی جگہ سے ملے تھے۔ اور کہا "یہ پتھر ایک تاریخی اہمیت رکھتے ہیں۔ کیا تم اس شہر کی کہانی سُننا چاہتے ہو۔ جو اب بالکل تباہ ہو چکا ہے۔ اور جس کی یاد بھی دِلوں سے محو ہو چکی ہے" میں نے آمادگی ظاہر کی تو وہ بولا:- "سنو سنو۔ اور غور سے سنو۔ ایک زمانہ میں یہاں بڑے بڑے عالی شان قصر موجود تھے۔ ان کے گرد سنگ مرمر کے چبوترے بنے ہوئے تھے۔ شام کے وقت حسین دوشیزہ لڑکیاں بربط پر مِل کر گایا کرتی تھیں۔ ان سب میں ایک لڑکی اپنے حُسن وجمال اور طرحداری میں سب پر فضیلت رکھتی تھی۔ ایک دن اُسطرف ایک خدا رسیدہ بزرگ کا گذر ہوا۔ یہ بزرگ اُن لڑکیوں کا گانا سُن کر بہت ہی محظوظ ہُوا۔ اور مونگے کی ایک مالا اُس حسینہ کو عنائت کر کے دُعا دی۔ کہ "تو ہمیشہ جوان اور حسین رہے گی۔ مگر کسی انسان کی محبت کو دِل میں جگہ نہ دینا۔ ورنہ یہ تمام حُسن وجمال غارت ہو جائیگا" ÷ ایک دن اُس شہر میں چند مسافر آئے۔ جو تقریباً سب کے سب خوبصورت اور جوان تھے۔ لیکن اُن کا سردار سب سے زیادہ حسین تھا۔ اُسکی سیاہ آنکھیں اور لانبی کاکلیں بہت ہی بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ چہرہ نہایت حسین اور با وقار معلوم ہوتا تھا یہاں کی حسین لڑکیاں بھی اُسے دیکھ کر حیران اور ششدر تھیں۔ اُس دوشیزہ پر بھی اُس کے حُسن کا اثر ہوا دِل دھڑکنے لگا۔ اور قلب کی عجیب کیفیت ہو گئی۔ وہ ضبط نہ کر سکی۔ اور ایک دن شام کو خود اُسکے پاس پہونچی۔ معاً اُسے اُس بزرگ کی فہمائش یاد آئی۔ اور وہ ٹھٹکی۔ اُس نے چاہا۔ کہ اِس خیال کو دِل سے نکال دے نقوشِ محبت کو قلب پر مرتسم نہ ہونے دے۔ اُس نے لاکھ دِل بہلایا۔ مگر بے سود۔ جب احساسِ محبت پیدا ہو گیا۔ تو پھر اُسے فراموش کرنا ناممکن تھا۔ محبت ہوتی ہے کی نہیں جاتی ÷ چنانچہ تھوڑے ہی دِنوں میں حسینہ محبت کی آگ کے شعلوں میں گھر گئی۔ مگر آہ! ابھی وہ اُس کی قیمت بھی وصول نہ کرنے پائی تھی۔ کہ یکایک طلسمی مالا ٹوٹ گئی۔ چہرہ زرد پڑ گیا۔ بڑھاپا نمودار ہُوا۔ اور وہ صرف ایک مرجھائے ہوئے گلاب کی طرح رہ گئی

اَب جو آئینہ اُٹھا کر دیکھتی ہے۔ تو عجیب ہی حُلیہ نظر آیا۔ سیاہ بال سفید ہو گئے تھے۔ آنکھوں کا خمار کافور ہو ہو گیا تھا۔ لب ہائے نازک کی شیرینی اور تبسّم غائب تھا۔ وُہ بہت مایُوس ہُوئی۔ اور خُوب روئی۔ آخر فرطِ غم سے مجبُور ہو کر سمندر میں کُود پڑی۔ اور پھر نظر نہ آئی۔ چند سال کے بعد شہر بھی برباد ہو گیا۔ بعض لوگوں نے دیکھا ہے۔ کہ نصف شب کے سنّاٹے میں کوئی سفید چیز ان کھنڈروں میں پھرا کرتی ہے۔ اور ان بکھرے ہُوئے موتیوں کو جمع کر کے شُعاعِ مہتاب کے رشتہ میں پرونا چاہتی ہے۔ لیکن وُہ سب نہیں ملتے۔ اِسلئے صُبح کی شفق نمودار ہوتے ہی وُہ خاموشی کے ساتھ سمندر میں چلی جاتی ہے۔ ماہی گیر کہتے ہیں۔ کہ وُہ جب نظر آتی ہے۔ تو ہمیں کثرت سے مچھلیاں مِل جاتی ہیں"۔ اِتنا کہہ کر بڈھا خاموش ہو گیا ۔

ماں کی مامتا

رات سرد۔ تاریک اور طوفانی تھی۔ پہاڑ برف سے ڈھنکا ہُوا تھا۔ ہوا سرد سرد چل رہی تھی۔ رات لمحہ بہ لمحہ زیادہ تاریک اور خوفناک ہوتی جا رہی تھی۔ اور ہوا میں خُنکی اور تیزی بڑھتی جا رہی تھی۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ایسے دہشت ناک وقت میں ایک ماں اپنے بچّہ کو سینہ سے لگائے چلی جا رہی تھی۔ تمام راستے برف سے ڈھکے ہُوئے تھے۔ ہوا کا تیز جھونکا جیسے جیسے بڑھتا جا رہا تھا۔ وُہ اپنے بچّہ کو اپنے سینہ سے چمٹاتی جاتی تھی۔ اُسکے ہاتھ پاؤں سردی سے شل ہو رہے تھے۔ ہوا کی تیزی اور برف باری زیادتی پر تھی۔ اور وُہ برف کی مانند ٹھنڈی جمی جا رہی تھی۔ سردی سے اُس کی قُوّت و توانائی رُخصت ہو رہی تھی۔ آخر اُس میں چلنے کی سکت باقی نہ رہی۔ وُہ چلا اُٹھی۔ "اوخُدا۔ او خُدا! مجھے اپنی زیست کی مُطلق تمنّا نہیں۔ مجھے موت کا کوئی خوف نہیں۔ . . . . مجھے مار ڈال۔ لیکن میرے بچّہ کو بچالے" ۔ اُس نے اپنا لبادہ اُتار کر اُس میں بچّہ کو اچھی طرح لپیٹ دیا۔ اور اپنے سینہ کو طُوفان کے مقابلہ میں عُریاں چھوڑ دیا۔ وُہ اِس خیال سے کہ اُس کا بچّہ اب گرم ہے۔ اُسے کوئی ڈر نہیں ہے مُسکرائی۔ اُس نے اپنے بچّہ کو برف پر لٹا دیا۔ اُس نے اپنے لال کا آخری بوسہ لیا۔ آنسُو کا ایک قطرہ بچّہ کے رُخسار پر ٹپک کر رہ گیا۔ وُہ اُسی برف پر بیہوش ہو کر گر پڑی۔ اور اُس کی رُوح قفسِ عنصری سے نِکل گئی ۔ تڑکے ایک مُسافر اُسی طرف سے گُزر رہا تھا۔ جہاں ماں مری پڑی تھی۔ اور بچّہ کپڑوں میں لپٹا لپٹایا حوادثِ زمانہ سے بے خبر پڑا تھا۔ شبنم کا قطرہ جم کر ماں کی آنکھ پر رہ گیا تھا۔ اُس کا چہرہ ٹھنڈا سخت اور زرد پڑ گیا تھا۔ مُسافر نے وُہ لبادہ ہٹایا . . . . بچّہ نے اُس . . . . مُسافر پر نظر ڈالی۔ اور معصُومیت اور پیار سے . . . . مُسکرا دیا ۔

آبشار

ہے رواں اشعار کی مانند نغمے کی مثال
بانسری کی لے ہے یا دوشیزہ کی مستانہ چال

وادیٔ یمین یا کسی آہو کا "بے پرواخرام"
ساقیٔ نوخیز کے یا ہاتھ میں گلرنگ "جام"

چاندکی "سیال چاندی" یا "ستاروں کی زمین"
"تابشِ انوار" ہے یا ایک "دنیائے حسین"

یا کسی بھولے ہوئے افسانہ ماضی کی یاد
زندگی کیواسطے یا کوئی پیغامِ جہاد

چاند تاروں کا محافظ ہر کرن کا پاسباں
نور کا "اک قصرِ رنگیں" "حسنِ فطرت کا جہاں"

(۲)

ہے کسی جانب رواں انگڑائیاں لیتا ہوا
حسن کے دریا میں کشتی نور کی کھیتا ہوا

سینچتا ہے جن کو تو اے دامنِ ابرِ بہار
ہیں مرے محبوب کو مرغوب انہیں پھولوں کے ہار

عظمتِ دیرینہ کے پوشیدہ ہیں تجھ میں نشاں
کسقدر پاکیزہ ہے "تیری رنگیں داستاں"

کرچکا ہے یا کسی دیوی سے تو بھی گفتگو
میری صورت کیا تجھے بھی ہے کسی کی جستجو

زندہ باد اے میری "دیرینہ محبت کی بہار"
لے سلامِ آخری اب مجھ سے تو اے "آبشار"

میں شہر پر چاند کی بے باک چاندنی میں جھیل کے کنارے بیٹھا ہوا تھا۔ خاموش تاروں کی جھلملاہٹ متحرک پانی میں رقص کر رہی تھی۔ تمام فضا ایک خواب آور کیف اور غیر مبہم سی مستی میں ڈوبی ہوئی تھی پتیاں خواب آلود کروٹیں لے رہی تھیں۔ نوخیز اور نیم شگفتہ غنچے ایک نہایت ہی پیارے اور معصومانہ انداز سے جھوم جھوم کر درسِ بے خودی دے رہے تھے۔ میں نے ستار ہاتھ میں لیا۔ اور ایک پیڑ کے سہارے کھڑے ہو کر اسکے خاموش تاروں کو جنبش دی۔ نغمہ کی مستیاں تمام فضا پر چھا گئیں ؎

انسانی دماغ میں ریڈیو کی صلاحیت

اکثر دیکھا گیا ہے۔ کہ دو اِنسانوں کے دماغوں میں بیک وقت ایک ہی خیال پیدا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک صاحب نے اپنا ایک مرتبہ کا یہ تجربہ بیان کیا۔ کہ وُہ اپنے ایک دوست کو ٹیلیفون کرنے کی نیت سے فون کرنے کے قریب پہونچے ہی تھے۔ کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اور دریافت کرنے پر معلوم ہُوا۔ کہ وُہی دوست انہیں ٹیلیفون کر رہے ہیں۔ اِن دونو اِنسانوں کے دماغوں میں بیک وقت ایک دُوسرے کا خیال کیوں پیدا ہُوا؟ کیا یہ ٹیلی پیتھی ہے؟ اِسے محض حسنِ اِتفاق کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر بار بار یہی وقوعہ ظہور پذیر ہو۔ تو کیا پھر اُسے ٹیلی پیتھی ہی کہا جائیگا؟ اکثر ایسا ہُوا ہے۔ کہ خاوند بیوی دونو قریب قریب کرسیوں پر نیم دراز ہو کر مُطالعے میں مصرُوف ہیں۔ کہ اِتنے میں خاوند نے بیوی سے مخاطب ہو کر کوئی بات کہی۔ اور بیوی نے حیرت سے جواب دیا۔ کہ مَیں بھی آپ سے یہی پُوچھنے والی تھی ✤ کیا یہ بھی ٹیلی پیتھی ہے؟ ایسا تو متعدد بار ہوتا ہے۔ اِسے حُسنِ اِتفاق کیونکر کہا جا سکتا ہے؟ قُدرت نے اِنسانوں کو چار حواس دِئیے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا اِنسان اِن کے عِلاوہ کسی پانچویں ذریعہ سے بھی اپنے خیالات۔ تصوّرات اور تخیلات دُوسروں تک پہونچا سکتا ہے؟ سائنسدان اِس سوال کو حل کرنے میں مصرُوف ہیں ✤ تجربات سے بعض عجیب وغریب باتیں روشنی میں آتی جاتی ہیں۔ مثلاً یہ ثابت ہو گیا ہے۔ کہ اِنسانی دماغ ایسے برقی رحجانات اپنے اندر سے باہر کی طرف پھینکتا ہے۔ جن کی پیمائش کی جا سکتی ہے۔ یہ پیمائش بعض خاص قسم کے آلات سے کی جاتی ہے۔ جنہیں سر سے باندھ دِیا جاتا ہے۔ اِسی طرح تجربات سے ذہنی شعُور کی حالتوں کا بھی اندازہ لگایا گیا ہے۔ اور یہ معلُوم کیا گیا ہے۔ کہ خواب کی حالت میں۔ دوائیوں کے اِستعمال کے بعد مسمریزم کے زیرِ اثر آکر۔ یا خوف اور غُصّے کے وقت اِنسانی دماغ سے کس قسم کے فوری رُحجانات کی لہریں خارج ہوتی ہیں ✤ ہر شخص کو کم از کم ایک آدھ مرتبہ ضرُور اِس کا کوئی تجربہ ہُوا ہوگا۔ کہ کسی نئی جگہ میں پہونچکر یہ محسُوس ہوتا ہے۔ گویا ہم اِس سے پیشتر سے واقف ہیں۔ یا کوئی بالکل نیا کام کرتے وقت یہ اِحساس ہوتا ہے۔ کہ ہم نے اب سے قبل بھی ٹھیک یہی کام کر رکھا ہے۔ اِس صُورتِ حال کے ثبوُت میں درجنوں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ بعض واقعات بجلی کی رَو کے ساتھ اِس طرح ذہن نشین ہو جاتے ہیں۔ کہ گویا ہم اِن سے اور اِن کی ہیئت سے پہلے ہی سے خوب اچھّی طرح واقف تھے ✤ بعض مستند سائنسدانوں اور مفکّران عصر نے یہ رائے ظاہر کی ہے۔ کہ ٹیلی پیتھی (یا دماغوں کے غیر مُرئی تعلّق) کا وجُود ناقابلِ اِنکار ہے۔ مگر دُوسری طرف متعدد سائنسدانوں کا یہ خیال ہے۔ کہ یہ سب وہم وگمُان کی کرشمہ سازیاں ہیں ✤ انگلستان کے مشہُور سائنسدان "ڈاکٹر چارلز

فرانسس پوٹر" نے ایک جگہ یہ لکھا ہے۔ کہ ٹیلی پیتھی کے وجود کو حقیقی مظاہرات سے ثابت کیا جا سکتا ہے۔ اور اِس کے وجود کو دریافت کرنے کا عملی فن سُست رفتار سے مگر یقینی طور پر ترقی کر رہا ہے +

آگے چل کر آپ لکھتے ہیں کہ" اگر لوگ کھلے دماغ لے کر اِس مسئلے پر غور کرنے بیٹھیں۔ تو انہیں معلوم ہو گا۔ کہ ہر چالیس انسانوں میں سے ایک اِنسان ایسا ہوتا ہے۔ جسکے دماغ میں ریڈیو بن کر دُوسروں کے خیالات بغیر بتائے معلوم کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے" +

ڈاکٹر صاحب موصوف نے اِس موضوع پر ایک شاندار کتاب بھی لکھی ہے جس کا نام ہے" حواسوں کے اُس طرف"۔ اِس عجیب و غریب تصنیف میں آپ نے حواسوں کے دائرے سے باہر کی جُملہ قوتوں کا جائزہ لیا ہے اور یہ رائے ظاہر کی ہے۔ کہ لوگ مادی دُنیا سے غیر متعلق ہو جانے کے نادانستہ خوف سے اپنے دماغوں کی اِس صلاحیت کو استعمال نہیں کرتے۔ آپ لکھتے ہیں:۔" اِنسانی دماغ دُنیائے قُدرت کی تمام اشیاء سے زیادہ حیرت انگیز طور پر پیچیدہ نازک اور صلاحیت پذیر شے ہے۔ یہ عمل اِرتقائے اِنسانی کی بیش قیمت ترین پیداوار ہے۔ اور ٹیلی پیتھی اِس شے کا سب سے زیادہ حیرت پرور عمل ہے۔ ابھی تک اِنسان نے اِس عمل کو اچھی طرح سمجھا نہیں ہے" + آپ کا خیال ہے۔ کہ اگر چاہیں۔ تو دو اِنسان اپنے اپنے گھروں میں سادگی کے ساتھ ٹیلی پیتھی کے تجربات کر سکتے ہیں۔ ایک ایجنٹ بنے۔ دُوسرا ریسیور بن جائے۔ ایک خیالات بھیجے۔ دُوسرا اُنہیں موصول کرے۔ اگر کسی گھر میں اِس قسم کا تجربہ کرنا ہو۔ تو اُس کی مندرجہ ذیل شکل ہو سکتی ہے:۔ فرض کیجئے۔ کہ خاوند ایجنٹ یا خیالات بھیجنے والا بنتا ہے۔ اور اس کی بیوی ان خیالات کو موصول کرنے کا کام اپنے ذمہ لیتی ہے۔ شوہر کوئی شئے کہیں چھپا دے۔ جیسے کنگھی یا برش وغیرہ۔ بیوی آرام کُرسی پر نیم دراز ہو کر اپنی آنکھیں بند کرتے ہوئے اپنے اُوپر مکمل آرام و اطمینان کی حالت طاری کرے۔ جب وُہ اِس حالت میں نیم دراز ہو گی۔ تو اُسے اپنی بند آنکھوں کے پردوں پر چند سائے حرکت کرتے نظر آئیں گے۔ جیسے پردہ فلم پر تصویریں حرکت کرتی ہیں۔ یہ سائے جن کی مُعیّنہ شکلیں ہونگی۔ پردہ چشم پر آئینگے۔ اور چلے جائینگے اِدھر اُدھر حرکت کرینگے۔ اور پھر واپس ہو کر سامنے چلے آئینگے۔ بیوی کو چاہیئے۔ کہ وُہ بہ آوازِ بلند اُنکی شکل بیان کرتی رہے۔ اِس دوران میں خاوند اپنے لوحِ ذہن یا آنکھوں کے پردے پر اُس چیز کی تصویر یا سائے یا شکل کو دیکھنے کی کوشش نہ کرے۔ بس اِتنا کافی ہے۔ کہ اسے یہ بات یاد رہے۔ کہ میں نے کیا چیز چھپائی ہے، پھر دفعتہً وُہ اُسے بھُول جائے۔ اور اپنے حواسوں کی گہرائی کے زیادہ سے زیادہ عمیق حصّے کے حوالے کر دے۔ اگر بیوی میں ٹیلی پیتھی کی صلاحیت ہے۔ تو جو سایہ یا شکل بار بار اُس کی نظر کے سامنے آئیگی۔ وُہ خاوند کی چھپائی ہُوئی چیز کے مُشابہ ہو گی۔ اگر چھپائی ہُوئی شئے کسی کاغذ یا کپڑے میں لپٹی ہُوئی ہے۔ تو بیوی کو نظر آنے والی شئے کی ظاہری شکل صاف اور مُعیّنہ نہیں ہو گی۔ اور اگر وُہ اِس کے باوجُود بھی چیز کو صاف اور غیر مبہم شکل میں دیکھ

لے۔ تو یہ سمجھنا چاہیئے۔ کہ وُہ غیر مرئی چیزوں کو دیکھ لینے کی حیرت انگیز قوت کی مالک ہے + "ڈاکٹر" "پوٹر" نے اپنی کتاب میں لکھا ہے۔ کہ ہم میاں بیوی نے بارہا اِس قسم کے تجربات کامیابی کیساتھ کئے ہیں +

اِس طرح مشہور ماہر سیاسیات و ادبیات "مسٹر" "اپٹن سنکیئر" کا بھی یہی بیان ہے۔ کہ "ہم اِس قسم کے تجربات میں کامیاب ثابت ہوئے" + اِن تجربات میں خیالات موصول کرنے والا یعنی معمول اپنی طرف سے کسی شئے کو دیکھنے کی کوشش نہیں کرتا۔ بلکہ کوئی نہ کوئی شکل یا سایہ از خود اُسکے پردۂ چشم پر نمودار ہوتا ہے۔ "مسِز" "پوٹر" کا بیان یہ ہے۔ کہ "میں اپنے ذہن و دماغ کو ہوش و حواس کی نگرانی سے بے نیاز کر دیتی ہوں جب مسِز "سنک لیئر" کہتی ہیں۔ کہ میں خالی الذہن ہو کر بیٹھ جاتی ہوں" +

عامل کے طرزِ عمل کے بارے میں یہ ہے۔ کہ ایک شئے کو کسی جگہ چھپا دینے کے بعد ایک بار اپنے دماغ میں اسے ہیولی قائم کرتا ہے۔ ایک لمحہ تک اِس کا خیال کرتا ہے۔ اور پھر اسے ذہن و دماغ سے باہر نکال پھینکتا ہے اب معمول اپنی قوتوں سے کام لیتا ہے۔ اور ... ایک منٹ کی کوشش کے بعد اُسے بتا دیتا ہے۔ کہ وُہ کس چیز کا خیال کر رہا تھا۔ ڈاکٹر "پوٹر" لکھتے ہیں۔ کہ "اگر عامل چھپائی ہوئی شے کے خیال کو فوراً ہی اپنے دماغ سے باہر نکالے گا۔ بلکہ اُس کا تصوّر باندھے رہیگا۔ تو معمول کے دماغ کو اپنا کام کرنے میں زیادہ دِقت پڑیگی" +

ڈاکٹر "پوٹر" نے ٹیلی پیتھی کی تعریف اِن الفاظ میں کی ہے :۔ "خیالات اور ذہنی مرقعوں کو جو بعض اوقات بالکل صاف ہوتے ہیں۔ مگر اکثر صرف مدھم سے نقوش ہوتے ہیں۔ ایک دماغ سے دُوسرے دماغ میں بلا ارادہ یا اِرادے کے ساتھ منتقل کرنا ایک ایسی قوت ہے۔ جو حواسِ خمسہ سے باہر کی چیز ہے" +

مشہور ماہر نفسیات ڈاکٹر "گارڈ نیر مرفی" نے عامل اور معمول کے تعلق پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "ان دونوں میں ذاتی رشتہ و تعلق ہو تو زیادہ عمدہ نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ اور جب عامل و معمول رشتہ ازدواج میں منسلک ہوں۔ یا ایک دُوسرے سے محبت کرتے ہوں۔ تو عمل بے انتہا کامیاب رہتا ہے۔ پیرانہ سال مردوں اور عورتوں کو ٹیلی پیتھی کے عمل میں کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہوتی۔ مگر بچے غیر معمولی طور پر کامیاب ثابت ہوتے ہیں۔ بعض لوگ غصّے کے وقت اور بعض دیگر افراد آرام و اطمینان کی حالت میں "ٹیلی پیتھی" کیلئے بہترین عامل و معمول ثابت ہوتے ہیں۔ مرد عامل کی حیثیت میں اچھے ثابت ہوتے ہیں۔ جبکہ عورتیں معمول بنتی ہیں۔ تجربہ اِس حالت میں بہت کامیاب ہوتا ہے۔ جبکہ مرد کسی دُوسرے مرد یا عورت کے ذہن میں خیالات منتقل کرے۔ عورتیں عامل کی حیثیت میں عمدہ کام نہیں کر سکتیں" +

اور ہونگے مثلِ بلبل آشنائے رنگ و بو ہم نے دامن سے نہ پھینکے پھول مُرجھانے کے بعد

پریم

پریم سکھی سنسار پیارے پریم ہی جیون ہار پیارے
پریم ہی جیون ہار

بھونرا بولے ڈالی ڈالی تتلی چوسے پھول کی لالی
چھائی گھٹا آکاش پہ کالی چاروں اور بسی ہریالی
لوبھ کی ہے بھرمار پیارے پریم سکھی سنسار پیارے
پریم ہی جیون ہار

کوئل کوکے بوندیں ٹپکیں جھکی چھاتی پھول کی دھڑکیں
سندر چڑئیں پھدکیں چہکیں جیون ہالیں ڈولیں بہکیں
برسے پریم پھوار پیارے پریم سکھی سنسار پیارے
پریم ہی جیون ہار

دُعا

وُہ غریب تھا۔ بیحد غریب۔ دِن بھر جان توڑ کر محنت و مُشقت کرتا۔ اور شام کیوقت اپنا خُون پسینہ ایک کرکے حاصل کی ہوئی کمائی کو لیکر خوشی خوشی گھر آتا۔ اُسکے بچے دیوانہ وار دَوڑتے ہُوئے آتے اور اُس سے لپٹ جاتے۔ اُسکی نیک بیوی کو دو خُشک نِوالے جو اُسے بصد دِقت مُیسّر آتے۔ امرت کیطرح معلُوم ہوتے تھے۔ وُہ غریب تھا۔ لیکن خُوش۔ اُسے ہر طرح کی رُوحانی خوشی حاصل تھی۔ مگر جسمانی خوشی کا نام عُنقا۔ پھر نصیبا جاگا۔ اُس نے محنت کی۔ خُوب محنت کی۔ روپیہ کمایا۔ اُسے بڑھایا۔ اور پھر بڑھایا۔ اَب وُہ امیر تھا۔ اور ایک عالی شان مکان میں رہتا تھا۔ نوکر نوکرانیاں کام کرتی تھیں۔ اُسکی بیوی کا اَب سارا دِن حُکم چلانے کے سوائے دُوسرا کام نہ تھا۔ اور اُس کا نتیجہ یہ تھا۔ کہ وُہ اُسکی طرف سے بھی لاپرواہ ہوگئی تھی۔ نیز بچے کئی کئی دِن تک اُسکی صُورت نہ دیکھتے تھے۔ اَب وُہ امیر تھا۔ مگر خُوش نہ تھا۔ اُسکو ہر طرح کی جسمانی خوشی میسّر تھی۔ مگر رُوحانی خُوشی قطعی مفقُود تھی۔ یہ نام کو بھی نہ تھی۔ رات کے بارہ بجے تھے۔ دِن بھر کا شور و غُل رات کی تاریکی میں جذب ہو کر رِہگیا تھا۔ وُہ مکان جہاں صُبح سے شام تک نوکروں کی دَوڑ دھوپ سے کان پڑی آواز سُنائی نہ دیتی تھی۔ اب بالکل خاموش اور سُنسان تھا۔ گھڑی اَب بھی کسی پریمی کے بے چین دِل کی طرح چل رہی تھی۔ اُسوقت وُہ فرش پر دوزانو بیٹھا ہُوا مالک کے حضُور میں سر بسجدہ محوِ دُعا تھا۔ "اے پروردگار! مجھے غریب بنا دے"۔

شاعر اور تنگدستی

"شاعر خواہ مشرق کے ہوں یا مغرب کے ہمیشہ تنگدست اور مفلوک الحال رہے ہیں۔ فرانس کے ایک شاعر نے کہا۔ کہ اگر میری جائداد سے میرا قرضہ بیباق نہ ہو۔ تو میری لاش فروخت کر کے میرا روپیہ ادا کیا جائے * عرب اور انگلستان کے کئی شاعر فاقہ کشی سے جان بحق ہو گئے۔ غالب تو غربت سے اس قدر تنگ آیا۔ کہ اُسنے خدا سے شکوہ کرتے ہوئے کہا ع ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے
اسی طرح آجکل شاعروں کی آشفتہ حالی اظہر من الشمس ہے" *

مشاہیر عالم کی سوانح حیات لکھنے کے لئے تاریخ کی ورق گردانی کرنی پڑتی ہے۔ لیکن ایک شاعر کے کوائف حیات اُس کا اپنا دیوان ہی ہو سکتا ہے۔ دیوان سے حسب و نسب اور خاندانی حالات کا پتہ تو شاید ہی لگ سکے گا لیکن عادات و خصائل سیرت۔ طرز بود و ماند اور مالی حالت کا اندازہ اُسکے اشعار سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ اِسلئے شاعر کی زندگی کے حالات لکھنے کے لئے زیادہ دِقّت پیش نہیں آتی مگر اس بیان سے میرا یہ ہرگز مطلب نہیں۔ کہ میں شعراء کے حالات لکھنا چاہتا ہوں۔ بلکہ میرا مقصد شعراء کی بدقسمتی اور اُنکے حادثات پر تبصرہ و تصریح کرنا ہے اور بس * تاریخ مشاہیر کے متعلق انگلستان کا ایک مصنف کہتا ہے۔ کہ :- "سوانحعمری چلا چلا کر اور سمندر کے طوفان کی طرح شور مچا مچا کر یہ آواز دیتی ہے۔ کہ جاؤ۔ تم بھی دنیا میں ایسے کام کرو لیکن برخلاف اسکے شعراء اپنے کفن پھاڑ پھاڑ کر اور چیخ چیخ کر پکارتے ہیں کہ آدمی شاعر نہ بنے۔ شاعر کی زندگی دنیا والوں کے لئے درس عبرت ہوتی ہے" * انگلستان کا مشہور بذلہ سنج شاعر "گولڈ اسمتھ" اپنے ایک دوست کو شعرائے مغرب کے متعلق لکھتا ہے :- "میرا خیال ہے۔ کہ شاعر کی سیرت ہر ملک میں تقریباً ایک سی ہوتی ہے۔ یعنی حال کو خوشی سے گذارنے کا شائق اور مستقبل سے غافل۔ اُس کے اقوال عاقلانہ اور افعال احمقانہ ہوتے ہیں۔ اسکے استقلال کی یہ کیفیت کہ اگر زلزلہ بھی آجائے۔ تو ٹس سے مس نہیں ہوتا مگر احساس کا یہ عالم کہ اگر چائے کی پیالی ٹوٹ جائے۔ تو ساتھ ہی اُس کا شیشۂ دل بھی چور چور ہو جاتا ہے۔ یہ اُسکی سیرت ہے۔ جو ہر لحاظ سے شاہراہ دولت کی طرف رہنمائی کرنے کے قابل تصور نہیں کی جاتی۔ لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ اگر میں آپ کو حال یا ماضی کے شعرائے مغرب کے حالات قلمبند کر کے ارسال کروں۔ تو آپ ضرور یہ خیال کریں گے۔ کہ یہ شخص انسانی بدبختی کی تاریخ مرتب کرنے کی غرض سے مسودہ بہم پہنچا رہا ہے" * ایک معاصر کسی شاعر کے متعلق لکھتا ہے :- "کسی کام کے بغیر مصروف رہنے کے فن میں مشتاق"۔ "بیکار مباش کچھ کیا کر" کا مصداق۔ شہر کے اندیشے میں دُبلا [illegible] فراموش سوگوار ماضی۔ بغیر فیس لئے لیلٰی و مجنوں کا وکیل۔ دل و

دماغ کی بے تعلقی کی دلیل۔ خیالات کے جال میں جذبات کو پکڑنے والا شکاری اظہار سے محجوب۔ احساس سے عاری۔ کُل کائنات کا خواہ مخواہ رازدار۔ کسی بیماری کے بغیر بیمار۔ الغرض ایک خدائی فوجدار ع

"آوارہ و مجنوں نے رُسوا سر بازارے" +

شعراء فی الحقیقت انسانی بدبختی کے مرجع ہوتے ہیں۔ "گولڈ سمتھ" صرف سیرت کے متعلق لکھتا ہے۔ لیکن میں کہونگا۔ کہ شاعر کی سیرت کیساتھ اُس کی قسمت بھی ہر مُلک میں ایک جیسی ہوتی ہے۔ روز ازل سے بدقسمتی شاعروں کے حصے میں آئی ہے۔ کیونکہ جو بھی شاعر ہُوا۔ دُنیا اُس پر ہمیشہ تنگ رہی۔ اور جو لوگ بدقسمت واقع ہُوئے۔ اُن کو زمانے کے صدمات و آفات نے مجبور کر دیا۔ کہ وُہ اپنی قسمت واژگون کا گلہ اور اپنی مرثیہ گوئی آپ ہی کرتے رہیں۔ اور شاعر بن جائیں۔ یہ وُہ کلیہ ہے۔ جو تاریخ اور شعراء کے تذکروں سے منضبط ہے۔ اور ننانوے فیصدی شاعر بدقسمتی کے عنوان کے ذیل میں آتے ہیں۔ شاعر خواہ شہزادے ہی کیوں نہ ہوں۔ لیکن اگر شاعری اُنہیں بدقسمت نہ بنادے۔ تو وُہ شاعر ہی نہیں +

"شیلے" کی زندگی نہایت تنگ دستی میں بسر ہُوئی۔ حالانکہ وُہ ایک امیر آدمی "ٹموتھی شیلے" کا بیٹا تھا + **ظفر** دہلوی بادشاہ بھی تھا۔ اور شاعر بھی لیکن اِمتدادِ روزگار نے بادشاہی چھین لی۔ اور وُہ فقط اقلیمِ سخن کا بادشاہ رہا۔ جو صدمے اُسنے اُٹھائے ہیں۔ وُہ اہلِ بصیرت سے نہیں + شاعر بدقسمت ہیں اور شاعری بدقسمتی۔ کیونکہ شاعری کو عروج ہمیشہ قوم کی پستی کے زمانے میں ہُوا + شاعر قوم کے انحطاط کی زندہ تصویر ہے۔ کوئی غم ہو یا شادی۔ شاعر کی حِسّی رگ پھڑک اُٹھتی ہے۔ اور وُہ حسب موقعہ قصیدہ و مرثیہ کہہ دینے کا عادی ہے۔ اور طُرّہ یہ کہ اگر خوشی کا موقعہ ہو۔ تو اپنی بدقسمتی کو بھول جاتا ہے۔ شعرا کی تنگ دستی کا تو یہ حال ہے۔ کہ ہمیشہ زبانی جمع خرچ کرتے رہتے ہیں۔ اور اگر کہیں خدمت کی ضرورت پڑے۔ تو ہدیۂ دل و جگر پیش کرتے ہیں۔ ورنہ بقول حافظ ع "بخالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را" دُوسرے کے مُلک و مال کو اپنی ملکیت سمجھ کر بخش دیتے ہیں + شعرائے مغرب اپنے افلاس کے لئے ویسے ہی قابلِ ذکر ہیں۔ جیسے اپنی مسلّمہ قابلیت کے واسطے۔ اُن بے شمار شفاخانوں میں سے جو غُربا کے لئے قائم کئے گئے۔ صرف ایک مفلوک الحال مصنفین کے استفادہ کے لئے تعمیر کیا گیا تھا۔ اسکے بانی پوپ اربن ہشتم نے اس کا نام "مایوس لعلاجوں کا مأمن" یہ کہتے ہُوئے رکھا۔ کہ دُوسرے مریضوں کے ساتھ اُن مریضوں کی دوا کرنا بھی برابر ہی کا مشکل امر ہے۔ جو اِس دُھن میں بھر رہے ہوں۔ کہ اُنہیں کوئی بُلائے۔ اور وُہ مریض خواہ مُفلسی کے مریض ہوں۔ خواہ شاعری کے + زمانہ قدیم کے شاعروں میں "ہُومر" پہلا مشہور شاعر تھا۔ وُہ اندھا تھا۔ لیکن اُس نے اپنی مشہور نظم "الیڈ" میں ایک شہر کے جلنے کا ہولناک نظارہ اسقدر خوبی سے نظم کیا ہے۔ کہ نیرو شہر روم کو جلا کر اس

کی نظم کی مثال پیش نہیں کرسکا۔ ہومر اپنا کلام گلیوں میں گاتا پھرتا تھا۔ لیکن اکثر یہ دیکھا جاتا تھا۔ کہ اُس کا مُنہ بجائے روٹی کے شعروں سے زیادہ پُر رہتا تھا۔ ظریف طبع "پلاٹس" ہومر کی بنسبت خوش قسمت تھا۔ وُہ دو کام سرانجام دیتا تھا۔ ایک یہ کہ تفنن طبع کے لئے شعر کہتا تھا۔ دُوسرے اپنی روزی کمانے کے لئے چکی پیسا کرتا تھا۔ ٹیرنس ایک غلام تھا۔ اور بوتھیئس کا جیل میں انتقال ہوا۔

اطالویوں میں "پالو بورگیس" قریب قریب تیسو جیسا اچھا شاعر تھا۔ وُہ انواع و اقسام کی چودہ زبانیں جانتا تھا مگر پھر بھی اِس کشمکش میں راہیٔ عدم ہوا۔ کہ اُسے کہیں بھی کوئی جگہ نہ ملی۔ تیسو جو ہر دلعزیز شعرا کی جملہ صفات کا مجسمہ تھا۔ اکثر اپنے دوست سے ایک کراؤن قرض لینے پر مجبور ہوا۔ تاکہ وُہ ماہ گذشتہ کی خوراک کا بل ادا کرے۔ وُہ ہمارے لئے ایک مثنوی چھوڑ گیا ہے جس میں اُس نے بلی کو مخاطب کرتے ہوئے یہ درخواست کی ہے۔ کہ وُہ اُسے لکھنے کے لئے آنکھوں کی روشنی دے۔ کیونکہ وُہ اِس قدر مُفلس ہے۔ کہ ایک شمع بھی نہیں خرید سکتا لیکن غریب "نبیٹی واگلیو" خاصکر ہمارے رحم کا مُستحق ہے۔ اُسکے لطیفے اطالوی زبان کے ساتھ ہمیشہ رہیں گے اُس نے ہر دلعزیزی اور خیرات کے کاموں میں اپنی تمام موروثی جائیداد خرچ کر دی۔ اور بڑھاپے میں اِسقدر مُفلس و نادار ہو گیا۔ کہ اُسے اِس ہسپتال میں داخل ہونے سے روکا گیا۔ جو اُسنے خود تعمیر کرایا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ہسپانیہ میں مشہور "سروینٹیز" فاقہ کشی سے مرا۔ اور یہ بھی یقینی ہے۔ کہ شہرہ آفاق "کیموانیز" نے اپنے دن ہسپتال میں گزارے۔ اگر ہم فرانس کیطرف رجوع کریں۔ تو ہمیں پبلک کی ناقدر شناسی کی زیادہ زبردست مثالیں ملیں گی "واگیلاس" جو نہایت سلیس لکھنے والا شاعر اور اپنے زمانہ کا راست باز اِنسان تھا۔ "اُلو" کے نام موسُوم تھا کیونکہ وُہ قرضخواہوں کے تقاضوں کے ڈر سے دن بھر گھر میں رہنے پر مجبور رہتا تھا۔ اور باہر صرف رات کیوقت نکلا کرتا تھا۔ اُسکی آخری خواہش قابلِ ذکر ہے۔ وُہ اپنی تمام جائیداد قرضے کی نذر کرنے کے بعد مرنے کے وقت حسب ذیل وصیت کرتا ہے:- "لیکن باوجود میری ساری جائیداد فروخت ہو جانے کے بھی اگر بعض رقوم واجب الادا ہیں۔ تو اِس صورت میں میری آخری خواہش ہے۔ کہ میری لاش سرجن کے پاس معقول معاوضے میں فروخت کر دینی چاہئے۔ اور اُس کی قیمت میرے قرض خواہوں کو دیدی جائے۔ کیونکہ میں اگر زندگی میں نہیں تو مر کر ہی فایدہ مند ہو سکوں"۔ "کینڈر" اپنے زمانہ کے بڑے عالموں سے تھا لیکن اُس کی لیاقت اُسکے لئے خوراک پیدا نہ کرسکی۔ وُہ لوگوں کی بے رحمی اور اُن میں حقیر ہونیکے باعث اپنی بدبختی اور ناشکری سے خُدا کو بھول گیا۔ وقت نزع جب پادری نے اُس کو خُدا کے انصاف پر بھروسہ رکھنے اور رحم مانگنے کی تلقین کی۔ تو اُسنے جوابدیا۔ "اگر خُدا نے مجھے یہاں کوئی انصاف نہیں دکھایا کوئی وجہ نہیں۔ کہ میں آئندہ کسی انصاف کی اُمید رکھوں"۔ پادری نے کہا۔ "انصاف کا مُتعلق ہونا اُس کی حقیقت میں شُبہ ڈالنے کے لئے کوئی دلیل نہیں ہے۔ میں تم سے پھر درخواست کرتا ہوں بار بار چاہتا ہوں کہ تم جو

تمہارا باپ۔ خالق اور دوست ہے"۔ مگر اس بدبخت رنجیدہ شاعر نے جواب دیا" نہیں! تم اس طریق سے تو واقف ہو جس میں اس نے مجھے زندہ رکھا ہے"۔ اور پھر اس گھاس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جس پر وہ پڑا تھا، اس نے کہا" کیا تم دیکھتے ہو۔ کہ وہ کس حالت میں مجھے مرنے کے لئے چھوڑتا ہے"؟

لیکن شعرائے انگلستان کے مقابلہ میں دوسرے ملکوں کے شاعروں کے مصائب کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔ سپنسر۔ آوٹ وے۔ بٹلر۔ اور ڈرائیڈن وغیرہ شاعروں کے ناموں کا تذکرہ روزمرہ کی قومی ملامتوں میں کیا جاتا تھا۔ انمیں سے چند تو اتفاقیہ یا مسلکوک تنگدستی کی حالت میں رہے۔ اور باقی یقیناً فاقہ کشی سے ہی ہلاک ہوئے۔ "ولیم شیکسپیئر" انگلستان کا وہ مایۂ ناز اور بلند پرواز شاعر اور ڈرامہ نویس تھا جسکے کلام کی بلاغت و فصاحت اور انوکھی لفظی ترکیبوں کو قائم رکھنے کے لئے انگریزی لغت میں نئے نئے الفاظ کا اضافہ ہوا۔ وہ ایک غریب آدمی "جون شیکسپیئر" کا بیٹا تھا جس میں اتنی استطاعت بھی نہیں تھی۔ کہ اپنے بیٹے کی تعلیم کو جاری رکھے ولیم ایک دفعہ انتہائی افلاس کی وجہ سے اسقدر مجبور ہوا۔ کہ اس نے "سرتھومس" کا ہرن چرا لیا۔ جسکے الزام میں ماخوذ ہونے کے خوف سے "سٹراٹ فورڈ" سے لنڈن بھاگ کر چلا گیا۔ یہاں تھیٹر کے تماشائیوں کے گھوڑوں کی نگہبانی کیا کرتا تھا۔ اس کی شاعری اسکے لئے سامانِ خورد و نوش بہم نہ پہنچا سکی۔ اسلئے وہیں ایکٹری کا پیشہ اختیار کیا۔ "ولیم بلیک" اپنے معصروں سے جداگانہ انداز رکھتا تھا۔ مغرب میں پہلا شاعر ہے۔ جس نے تصوف پر شعر کہے۔ وہ شعر میں ہر دعوی کے ساتھ دلیل پیش کرتا تھا۔ پھر بھی اس کی زندگی اس کے لئے ایک راز ہی رہی۔ اور ناداری کے باعث لوگوں نے اتنا بھی نہ جانا۔ کہ وہ شاعر ہے۔ "رابرٹ بلوم فیلڈ" ایک کسان کا بیٹا تھا۔ یہ فطری مناظر کا شیدائی "ورڈز ورث" سے کسی حیثیت میں کم نہ تھا۔ لیکن باوجود وسعی بلیغ کے وہ نہایت کس مپرسی کی حالت میں مرا۔ "لیہ ہنٹ" دام و درم کے معاملہ میں تمام عمر اپنے دوستوں کا دست نگر رہا۔ اور جب ایک اخبار کی ایڈیٹری سے پیٹ پالنا شروع کیا۔ تو ازالہ حیثیت عرفی کے ایک مقدمہ میں جیل کی ہوا کھائی۔ "ورڈز ورتھ" انگریزی زبان کے مشہور شعرا میں سے تھا۔ لیکن ع

آنچہ شیراں را کند روباہ مزاج ۔۔۔ احتیاج است احتیاج است احتیاج

کی مثال اس شاعر پر صادق آتی ہے۔ جسنے غریبی سے تنگ آکر اپنے اصول کو خیرباد کہی۔ اور اپنے سیاسی خیالات یکدم بدل ڈالے۔ براؤننگ کی نظم "کھویا ہوا لیڈر" کا مشارٌ الیہ یہی ہے۔ جس میں وہ کہتا ہے" اس نے مٹھی بھر چاندی کے لئے ہمیں چھوڑ دیا"۔ "ڈاکٹر جانسن" انگریزی علم ادب کے ماہرین میں نہایت ممتاز تصور کیا جاتا ہے۔ وہ شاعر نہیں تھا مگر شاعر گر تھا۔ لیکن اس کی حالت ایسی بری تھی۔ کہ ایک جلسے میں جانے کے لئے [illegible] واپس

واپس آکر پھاڑ کر پھینک دی ۔ مشہور ظریف و ضاحک شاعر "گولڈ سمتھ" در گفتہ آید در حدیث دیگراں کی آڑ لیتا ہوا شعراء کی غریبی پر ایک نہایت پُر مغز اور بسیط مضمون لکھتا ہے۔ لیکن وُہ مضمون فی الحقیقت اُس کی اپنی مالی حالت کا آئینہ دار ہے ۔ "شیلے" ایسا انقلاب پسند شاعر تھا۔ کہ کسی چیز کو اپنی اصلی حالت پر دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر اُس کی اپنی قسمت نہ بدلی پر نہ بدلی۔ باپ نے گھر سے جواب دیدیا۔ مدت تک آوارہ پریشان رہا۔ اُس نے اپنی عمر کا بہت سا حصہ اپنے ہمعصر لارڈ "بائرن" کی معیت میں گزارا۔ جو اُسکے اخراجات کا ہمیشہ کفیل رہا۔ آخر اٹلی میں جاکر مر گیا ۔ جب شاعری "الیگزنڈر پوپ" کے لئے ذریعہ معاش نہ بن سکی۔ تو اُسنے ایک گرجے کی امامت اختیار کی۔ اور وُہیں پیوند خاک ہو گیا ۔ "جون کیٹس" اپنے زمانہ کا اچھا شاعر تھا۔ فطرت کے مناظر کو نہایت دلآویز پیرائے میں نظم کرتا تھا۔ لیکن شومئ قسمت کو کیا کیجئے۔ دنیا میں کہیں بھی کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ یہانتک کہ ایک دفعہ سخت بیمار ہو کر اپنے ایک دوست کا محتاج ہو گیا۔ اور اُسکے ساتھ نیپلز کی راہ لی۔ روم میں پہنچکر مادر زمین کی آغوش میں ہمیشہ کے لئے سو گیا ۔

امریکہ اور انگلستان بلحاظ شاعری اور زبان اصلاً اور نسلاً ایک ہیں۔ امریکہ کی ملکی زبان انگریزی ہے۔ اسلئے وہاں کے لوگ انگلستان کے شعراء کا کلام پڑھتے رہے ہیں۔ اُنمیں معدودے چند شاعر ہوئے ہیں۔ ان میں "والٹروٹ مین" مشہور ہے۔ یہ اپنے زمانہ کی جمہوریت اور بنی نوع انسان کا سچا ہمدرد تھا۔ لیکن مقام افسوس ہے کہ محض شاعر ہونیکے الزام میں جہاں وُہ کلرکی کا کام کرتا تھا۔ نکالدیا گیا ۔

اگر عرب اور عراق کے شعراء کا حال بیان کیا جائے۔ تو اچھی خاصی مرثیہ خوانی ہوتی ہے۔ یہ تمام ملک جنگجو تھا۔ اِس لئے اسکے شاعر بھی سپاہی ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ عرب کی شاعری رجز خوانی سے شروع ہوئی۔ یہ سادہ لوح اور بہادر صحیفہ فطرت پڑھ کر شاعر ہوتے تھے۔ اور تلامیذ الرحمٰن کہلاتے تھے۔ مگر "نابغہ ذبیانی" پہلا شاعر ہے۔ جس نے عرب میں مدح خوانی شروع کی۔ جو وبائی مرض کی طرح اقصائے ملک میں پھیل گئی۔ صوبوں کے فرمانرواؤں نے خزانوں کے مُنہ کھول دیئے اور شعراء اچھے خاصے بھانڈ بن گئے۔ قوم کے عضو معطل امراء کے رحم و کرم پر زندہ رہنے لگا۔ یہانتک کہ شاعری بجائے فن کے ایک پیشہ اور ذریعہ معاش قرار پائی۔ لیکن یہ امر مسلمہ ہے۔ کہ جن لوگوں نے شاعری کو بطور پیشہ اختیار کیا۔ وُہ نہایت عسرت اور تنگ دستی میں مبتلا رہے۔ اور جنہوں نے [illegible] شغل و تفریح سمجھا۔ وُہ عافیت اور آرام کی زندگی بسر کرتے رہے۔ کہنے والا اس مفہوم کو کس خوبی سے ایک مصرعہ میں کہہ گیا ہے ع "کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے"

"اسحٰق موصلی" وُہ مشہور شخص ہے۔ جسنے موسیقی اور شاعری کو معراج کمال پر پہنچایا۔ اپنے ہمعصروں میں باعتبار شہرت مقبولیت اور کمالات شاعری و موسیقی سب پر فائق تھا۔ ادب

انساب روایات۔ فقہ۔ نحو۔ اور دیگر علوم میں مجتہدانہ کمال رکھتا تھا۔ لیکن یہ عبرت کا مقام ہے۔ کہ موسیقی کے انتساب نے اُسے صرف مغنی کے حقیر نام سے دُنیا میں بدنام کیا۔ کیونکہ شاعری پیٹ پر پتھر باندھنے کے لئے مجبور کرتی تھی ٭

"ابو نواس" ایک جلیل القدر شاعر تھا۔ نشہ کے عالم میں بھی شعر کہتا تھا۔ مزاج میں مسخرا پن بہت تھا۔ اُس کی کوئی بات نکتہ سنجی اور ظرافت سے خالی نہیں ہوتی تھی۔ مگر باوجود اس علم و فضل کے اُس کا ذریعہ معاش خلفائے عباسیہ کی مدح سرائی اور خاندان برامکہ کی قصیدہ گوئی تھا ٭ "سلم الخاسر" یہ خلیفہ مہدی کا درباری شاعر تھا۔ اور فن شعر میں کامل تھا تحصیل علوم و فنون کے بعد گردش فلک نے جب اُسے بہت مجبور کیا۔ تو اُس کی حالت یہاں تک تباہ ہوئی۔ کہ اُس نے زُہد و پارسائی کو چھوڑ کر فسق و فجور اختیار کیا۔ اور مذہب سے اِس قدر دُور ہو گیا۔ کہ قرآن مجید فروخت کر کے طنبورہ خریدا۔ اور گانے بجانے کا کسب اختیار کیا۔ اور بسر اوقات کرنے لگا ٭ "ابو الہبول حمیری" اِس باکمال شاعر نے ایک مرتبہ "فضل برمکی" کی ہجو لکھی۔ لیکن تنگدستی کی وجہ سے پھر دربار میں حاضر ہوا۔ "فضل" نے پوچھا۔ اب کس مُنہ سے میرے سامنے آتا ہے۔ حمیری نے جواب دیا۔ "اُس مُنہ سے جسکے ساتھ خدا کے سامنے جاتا ہُوں۔ حالانکہ جتنا خدا کا گنہگار ہُوں۔ اُتنا تمہارا نہیں۔ فضل نے اُس گدائے متکبر کے حال پر رحم کیا۔ اور کچھ دے کر چلتا کیا ٭ علاوہ اسحٰق کل بصل سیف۔ کلثوم اور رقاشی کے سیکڑوں شعراء کا جمگھٹا اُمرائے عراق و عرب کے دروازوں پر رہتا تھا۔ یہ سب اُمراء کی سخاوت اور فیاضی کے طفیل دُنیا میں زندہ تھے ٭

ایران کی شاعری کی ابتدا قصیدہ گوئی سے ہُوئی۔ شعراء ہمیشہ اُمراء کے انعام و اکرام سے مالا مال ہوتے تھے۔ لیکن وہاں بھی یہ طبقہ حاجتمند رہا۔ "سُلطان محمُود غزنوی" کے دربار میں چار سو شاعر تھے۔ جن میں سے بیشتر ایران سے وارد ہوئے تھے۔ یہ سب اُسکے خوانِ کرم سے خوشہ چینی کرتے تھے۔ اُسکی فیاضیاں صرف مدح پسندی کے لئے نہیں۔ کچھ علم و ادب اور تاریخ کی ترقی کا خیال تھا۔ اور کچھ "غریب پروری" ملحوظ تھی ٭ علاوہ ازیں اکبر اعظم "کے عہد حکومت میں ایران سے کم و بیش ساٹھ شاعر ہندوستان میں آئے۔ جن میں غزالی۔ عُرفی نظیری۔ شکیبی۔ حکیم سنائی۔ غیرتی۔ قاسم جعفر۔ ظہوری اور صائب وغیرہ مشہور نام ہیں۔ یہ سب قصیدہ گوئی کے صلے پاتے تھے اور جیتے تھے ٭ "فردوسی" جیسا وقائع نگار شاعر ایک عرصے تک باغبانی کر کے پیٹ پالتا رہا۔ بے چارے نے پندرہ سال خُونِ جگر پیا۔ اور شاہنامہ کی تکمیل کی۔ لیکن کچھ حاصل نہ کر سکا۔ جب "محمُود غزنوی" نے اُسکے لئے انعام بھیجا۔ تو لوگ اُس کا جنازہ لئے جا رہے تھے ٭ "انوری" ایران میں صنف قصیدہ کا پیغمبر مانا جاتا ہے۔ ہجو میں بھی کمال رکھتا تھا۔ ذرا سی بات پر بگڑ جاتا تھا۔ طبیعت کا دھنی تھا۔ زبان قابُو میں نہیں تھی۔ اِس وجہ سے جگہ جگہ ذلتیں اُٹھاتا تھا۔ مُدت العمر تک مارا مارا پھرتا رہا۔ ایک قصیدے

میں کسی امیر کو مدح کے بعد لکھتا ہے "میرے بدن پر مدت کے پھٹے پرانے کپڑے ہیں۔ چادر ابو طالب کی دی ہوئی ہے۔ اور پیرہن ابو الحسن عمرانی کا عطا کیا ہوا ہے" اسوقت ابو الحسن کو مرے ہوئے پندرہ سال گزر چکے تھے وہ اپنی قسمت پر ہمیشہ نالان رہا چنانچہ کہتا ہے ؎ ہر بلائے کز آسماں آید خانۂ انوری تلاش کند

"سعدی" یہ فرزانہ روزگار بھی اپنے دیگر ہمعصروں کی طرح بمصداق ع "سعدی از دست خویشتن فریاد" اپنی قسمت کا شاکی رہا۔ وہ شاعر بھی تھا۔ اور سیاح بھی۔ اس سلسلے میں اس کی دعوت شیراز مشہور ہے۔ شاعری میں قصیدے کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ اسلئے بغیر اس صنف کے قدر ناممکن تھی۔ ایک دفعہ پاؤں میں جوتا نہیں تھا۔ دلمیں بہت گھبرایا۔ اور ناشکری کے چند کلمات بھی بیساختہ منہ سے نکل گئے۔ نماز کا وقت ہو رہا تھا۔ مسجد میں گیا۔ تو ایک شخص پر نگاہ پڑی۔ جسکے پاؤں نہیں تھے۔ وہیں سجدے میں جھک گیا۔ اور مالک کا شکر ادا کیا۔ "بارے میرے پاؤں تو ہیں۔ بلا سے۔ اگر جوتا نہیں نہ ہو" یہی وہ شاعر ہے۔ جس نے عزت نفس کو برباد نہیں کیا ✤ "عمر خیام" کی رباعیاں مشہور ہیں۔ بہت بلند پایہ حکیم اور فلسفی شاعر تھا۔ باپ کے ساتھ خیمہ دوزی کا کام کرتا تھا۔ زمانہ کے ہاتھوں ہمیشہ نالاں رہا ✤ "حافظ" یگانۂ روزگار اور بے بدل شاعر تھا۔ ریاکاری اور اظہار تقدس سے ہمیشہ پرہیز کرتا تھا۔ دولتمند باپ کا بیٹا تھا۔ مگر ترکہ میں کچھ نہ پایا۔ کیوں نہ ہو۔ شاعر ہی تو تھا۔ جب فاقوں پر نوبت آئی۔ تو خمیر بنانے کا پیشہ اختیار کیا ✤ "فغانی" شیراز کا رہنے والا تھا۔ اسے تمام اہل سخن مجدد سخن مانتے تھے۔ پہلے چاقو بنایا کرتا تھا۔ لاابالی اور رند مشرب تھا۔ جگہ جگہ پھرا کرتا تھا۔ آخر ہرات کے حاکم نے شراب اور گوشت روزینہ مقرر کر دیا۔ اسی پر بسر اوقات کی ✤ "عرفی" نہایت مغرور شاعر تھا۔ امیر اور امیرزادہ تھا۔ لیکن چونکہ شاعر تھا۔ غریبی کا جھونکا اس پر سے بھی گذر گیا۔ جب ایران سے ہندوستان آیا۔ تو راستہ ہی میں ڈاکہ پڑا۔ اور سب کچھ لٹ گیا۔ آخر جھکنا پڑا۔ اور حکیم ابو الفتح کا مدحیہ قصیدہ لکھکر پیش کیا ✤ "نظیری" شاعر بھی تھا۔ اور زرگر بھی۔ پہلے خانخاناں کے دربار میں رہا۔ پھر مراد سے تعارف پیدا کیا جب اکبر نے وفات پائی۔ تو جہانگیر نے دربار میں بلایا۔ اسنے متواتر تین مہینے خاک چھانی۔ اور شاہی فرمان کو قرآن سے تشبیہ دی ✤ "طالب" وہ باکمال شاعر تھا۔ جس نے بیس سال کی عمر میں ملک الشعرائی کا خطاب حاصل کیا۔ نہایت دوست پرور۔ وفاشعار اور خوش اخلاق تھا۔ مگر زمانہ کی ضرورتوں نے اس سے در در کی خاک چھنوائی ✤ "ابن یمین" امیر آدمی تھا لیکن خود ہی فقر و قناعت اختیار کی ✤

ہندوستان کی شاعری اور ایرانی شاعری میں کوئی فرق نہیں۔ اور اگر فرق ہے۔ تو صرف زبان کا اور وہ بھی کچھ ایسا زیادہ نہیں۔ اردو شاعری فارسی شاعری کی رہین منت ہے۔ اور اسی جہت سے فارسی کے نقش قدم پر چلی ہے۔ لیکن اس کی ابتدا بجائے قصیدے کے غزل سے ہوئی۔ تاہم قصیدے میں ایرانی

شاعری کے پہلو بہ پہلو رہی۔ اور بہت سے شعراء نوابوں اور امیروں سے تعلق رکھتے تھے۔ قصیدے کہتے تھے انعام پاتے تھے۔ اور اپنا پیٹ پالتے تھے۔ ہندوستان میں بھی **سعدی** جیسے عزت نفس کے پاسبان تھے۔ انکی خودداری اسپر مستزاد تھی۔ **تلسی داس** نے ایک جگہ لکھا ہے ؎

مایا کو مایا ملے لمبے کر کر ہات تلسی داس گریب کی کوئی نہ پوچھے بات

"نظیر" اکبرآبادی جسے اورنگ آباد کے پروفیسر شہباز نے شیکسپیئر آف انڈیا کا خطاب دیا ہے۔ آزاد منش شاعر تھا۔ روپیہ پیسہ کے متعلق بالکل "ورکس" تھا۔ کہتا ہے ؎

پیسہ ہی رنگ روپ ہے پیسہ ہی مال ہے پیسہ نہ ہو تو آدمی چرخے کی مال ہے

"سودا" جیسے اپنی علمی استعداد کے لئے مشہور تھا۔ ویسے ہی اپنی وضعداری کے لئے بھی۔ قصیدہ میں ہندوستان کا انوری تھا۔ اور ہجو میں ید طولیٰ رکھتا تھا۔ جب نواب شجاع الدولہ نے لکھنؤ بلا بھیجا۔ تو معذرت چاہی۔ مگر جب دہلی سے فرخ آباد ہوتا ہوا لکھنؤ پہنچا۔ تو نواب کی ملازمت اختیار کرلی۔ ایک دن دوران گفتگو میں نواب نے اسکی معذرت کا ذکر کیا۔ تو سودا بپھر بگڑا۔ اور نواب کی زندگی میں پھر کبھی دربار میں نہ گیا۔ "میر تقی" متقدمین میں مسلم الثبوت استاد مانا جاتا ہے۔ اسکی یہ حالت تھی۔ کہ اکثر فاقہ کشی تک نوبت پہونچ جاتی تھی۔ اس پر بھی اس نے نواب سعادت علی خان کا فرستادہ خلعت اور ہزار روپیہ یہ کہتے ہوئے واپس کردیا۔ کہ "مسجد میں بھجوا دیجئے گا یہ گنہگار اتنا محتاج نہیں" گورنر جنرل تک سے ملنا معیوب اور کسر شان سمجھتا تھا۔ اور کہتا تھا۔ کہ جو کوئی مجھ سے ملتا ہے۔ یا تو میرے کلام کے باعث یا مجھے انعام دینے کے لئے۔ "جرأت" جب لکھنؤ پہونچا۔ تو "مرزا سلیمان شکوہ" کی ملازمت اختیار کی۔ ایک تنخواہ کو دیر ہوگئی حسن طلب میں ایک غزل کا مقطع لکھا ؎

جرأت اب بند ہے تنخواہ تو کہتے ہیں یہ ہم کہ خدا دیوے نہ جبتک تو سلیماں کبتک

سید **انشا** نہایت ہی ظریف طبع شگفتہ مزاج اور فصیح شاعر تھا۔ نواب سعادت علی خان کا ملازم تھا۔ نواب کا حکم تھا۔ کہ ہمارے سوا کسی اور کے پاس نہ جایا کرو۔ اس قید بے زنجیر اور جوان بیٹے کی جوان موت نے اسکے حواس مختل کردیئے۔ یہانتک کے ایک دن نواب کو سر راہ بے نقط سنائیں۔ سعادت یار خان کہ سید کا ایک دوست تھا لکھتا ہے۔ کہ انشا کے لکھنؤ میں وہ رنگ دیکھے ہیں۔ کہ جن کا خیال کرکے دنیا سے جی بیزار ہوجاتا ہے۔ ایک تو وہ عروج کا زمانہ تھا۔ کہ سید انشا نواب کی مونچھ کا بال تھا۔ اور دروازے پر پالکی نالکی ہاتھی گھوڑوں کا شمار نہ ہوتا تھا۔ دوسرا وہ وقت تھا۔ کہ انشا خود کہتا ہے۔ کہ ظالم (یعنی نواب) کی قید میں ہوں۔ سوائے دربار کے گھر سے نکلنے کا حکم نہیں۔ تیسرا وہ دور تھا۔ کہ ایک دفعہ لکھنؤ میں مشاعرہ ہونے والا تھا۔ انشا پھٹے پرانے چیتھڑوں میں آیا حلیم پر شلغہ جمایا۔ اور ایک دو کش لگائے۔ در قبل مشاعرہ ایک نئے میں غزل پڑھ کر چلا گیا۔ حالت بھی

کہ جب میں سعادت یار خان لکھنؤ گیا ہوں۔ تو کیا دیکھتا ہوں۔ کہ جہاں ہاتھی جھومتے تھے۔ وہاں کُتے بھونکتے ہیں۔ دروازے پر پہونچا۔ دستک دی۔ تو اندر سے ایک بُڑھیا جو انشاء کی بیوی تھی۔ باہر آئی۔ جب میں گھر میں گیا۔ تو انشاء کو دیکھا۔ کہ تن برہنہ ہے۔ دونو زانوؤں پر سر دھرا ہے۔ سامنے راکھ کا ڈھیر اور ٹوٹا ہوا حقہ پاس رکھا ہے۔ یا تو وہ شان و شوکت کے جمگھٹے دیکھے تھے۔ یا یہ حالت دیکھی۔ بے اختیار دل بھر آیا میں بھی وہیں زمین پر بیٹھ گیا۔ اور دیر تک رویا کیا۔ جب ذرا سنبھلا۔ تو "سید انشاء سید انشاء" کہکر پکارا۔ سر اٹھا کر اس نظر حسرت سے دیکھا جو کہتی تھی "کیا کروں۔ آنکھیں آنسو نہیں" میں نے پوچھا۔ کیا حال ہے؟ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "شکر ہے" اور اسی طرح گھٹنوں پر سر رکھ لیا۔ کہ پھر نہ اٹھایا ؛ شیخ "مصحفی" مطلب کو نہایت خوبی اور خوش اسلوبی سے قلمبند کرتا ہے۔ اس کا کلام تمام اسقام سے منزہ ہوتا تھا۔ مگر باوجود ان خوبیوں کے اس بزرگوار کی مالی حالت یہ تھی۔ کہ عین مشاعرہ کے دن لوگ آتے تھے۔ اور دس دس بارہ بارہ آنے دیکر نو۔ نو۔ اور گیارہ گیارہ اشعار کی غزلیں لکھوا کر لے جایا کرتے تھے۔ ایک دن مشاعرے میں جب اسے داد نہ ملی۔ تو اس نے تنگ آکر غزل زمین پر دے ماری اور کہا "روئے فلاکت سیاہ جس کی بدولت کلام کی یہ نوبت پہونچی ہے کہ اب کوئی سنتا بھی نہیں ہے" ؛ "آتش" رندانہ طبع اور آزادانہ وضع رکھتا تھا۔ اس کا کلام تمام عیوب و اغلاط سے پاک ہوتا تھا۔ قصیدہ گوئی اور مدح خوانی سے احتراز کرتا تھا ہمیشہ بوریئے پر صبر و قناعت سے لنگ باندھے بیٹھا رہتا تھا۔ انتقال کے بعد اسکی تکفین و تدفین ایک دوست میر دوست علی خلیق نے کی۔ کیونکہ فقیر کا ترکہ اس کا بھی کفیل نہ ہو سکا ؛ "غالب" ہندوستان کی شاعری کا سہرا مرزا نوشہ غالب کے سر ہے مضمون آفرینی میں اس کا دماغ فلک الافلاک تک پہونچتا تھا مگر قسمت کا یہ بھی دھنی تھا۔ تمام عمر میں شاید ہی کوئی دن فارغ البالی اور خوشحالی سے گزرا ہو۔ کہتا ہے ؎

زندگی اپنی جو اس شکل سے گذری غالب　　ہم بھی کیا یاد کرینگے کہ خدا رکھتے تھے

ایک دفعہ مرزا کا ایک قرابت دار لڑکا پیسہ مانگنے آیا۔ پیسہ پاس نہیں تھا۔ جواب دیا ؎

دام و درم اپنے پاس کہاں　　چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں

مرزا کی عمر کا آخری حصہ سید انشاء کی طرح کٹا۔ چنانچہ ایک دوست کو خط لکھا۔ جس میں اپنی شومئے قسمت کا ذکر کرتے ہوئے متعدد و مثالیں دیکر یہ ظاہر کیا ہے۔ کہ میں اسقدر بد قسمت ہوں۔ کہ جو سرکاری عہدہ دار یا والئ ریاست مہربان ہوتا ہے۔ یا تو اپنے عہدے سے معزول ہو جاتا ہے یا مرجاتا ہے۔ پھر ایک دوست کو اپنے گھر کا حال یوں لکھا ہے کہ مکان بیقدر بوسیدہ ہو گیا ہے۔ کہ چھت چھلنی ہو گئی ہے۔ ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔ یہ شاعر کی زندگی کا مرقع ہے ؎

گفتنی نیست کہ بر غالب ناکام چہ رفت　　می تواں گفت کہ این بندہ خداوند نداشت

سرور جہاں آبادی نہایت اچھا لکھنے والا شاعر تھا۔ زمانہ نے اُسے بھی چار چار آنے پر غزلیں فروخت کرنے پر مجبور کر رکھا تھا۔ "ناسخ۔ نصیر اور مومن" اِن حضرات کی زندگی اچھی کٹی۔ شاید تقسیم مُقدر کے وقت یہ سب شعراء کے زمرے میں شمار نہیں کئے گئے۔ کیونکہ ناسخ پہلوان تھا۔ نصیر مُلّا۔ اور مومن حکیم۔ یا ممکن ہے۔ کہ یہ خود ہی الگ تھلگ رہے ہوں۔ ورنہ کوئی وجہ نہیں۔ کہ باقی شاعروں کی بدقسمتی کا حصّہ تناسب کے لحاظ سے اُن کو نہ پہونچتا۔ شاعری اور غریبی لازم و ملزوم چیزیں ہیں۔ کسی ثبوت کی چنداں ضرورت نہیں۔ متعدد مثالیں لکھی جا چکی ہیں۔ ہر کُلیہ کا مستثنیٰ ہوتا ہے۔ اگر کسی مُلک کے کچھ شاعر اُس زمانہ کے حوادث سے بچ رہے ہوں۔ تو پھر بھی شاعری اور غریبی کے کلیہ کی ہمہ گیری میں کوئی فرق نہیں آتا + انیس و دبیر کی مالی حالت گو اچھی ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن انہوں نے اپنی جولانئ طبع کے لئے "عرصۂ کربلا" منتخب کیا۔ اور تمام عمر اسی سیاحی میں گذار دی۔ طبیعت میں قدرت نے سوز و گداز ودیعت کیا تھا۔ اور موضوع بھی ان کے حسب حال تھا۔ اگر وہ شاعر نہ ہوتے۔ تو اور کیا +

آجکل شعراء کی ضروریاتِ زندگی کا انحصار بڑے لوگوں پر نہیں۔ وہ سوائے پبلک کے دوسرا مُربّی نہیں رکھتے۔ اور پبلک مجموعی حیثیت سے اچھا اور فیاض سرپرست خیال کی جاتی ہے۔ درحقیقت ہر ایک شخص سے داد کی اُمید رکھنے میں اکثر اوقات غلطی کی جاتی ہے۔ مگر یہ غلط فہمی زیادہ دیر تک نہیں رہتی اگر ایک تصنیف تھوڑے عرصہ کے لئے شہرت پذیر ہو بھی جائے۔ تو حقیقی لیاقت کے فقدان کی وجہ سے بازاری غزلوں کی طرح بہت جلد لوگوں کے ذہن سے اُتر جاتی ہے۔ وقت جو اصلی قابل قدر چیزوں کے لئے کسوٹی ہے۔ بہت جلد دھوکے کو پالے گا۔ اسلئے مصنّف کو کسی کامیابی کا دعوٰے باطل نہیں کرنا چاہیئے۔ جبتک اسکی تصانیف کم از کم دس سال کیلئے متواتر نہ پڑھی جائیں +

موجودہ زمانے میں ایک شاعر یا ادیب جس کی تصانیف واقعی قابلِ قدر ہوں۔ وہ اُن کی قدر و منزلت سے بخوبی واقف ہوتا ہے۔ اور قوم کا ہر فرد اسکی تصنیف شدہ کتابیں خریدنے سے اُس کی محنت کا معاوضہ اور اُس کی قابلیت کی داد دیتا ہے۔ اوّل تو کسب معاش شاعری کے علاوہ کچھ اور ہونا چاہیئے۔ ورنہ اشاعت ہی کو ذریعۂ روزگار قرار دیا جائے۔ جوں جوں کلام کو فروغ ہوگا۔ شاعر کی تصنیفات میں اضافہ ہوتا چلا جائیگا۔ اسلئے اپنے گھر میں پڑے رہنے اور قسمت سے شکوہ و شکایت کرنے کا مضحکہ خیز رویہ شاید گذشتہ زمانہ میں پسند کیا جاتا ہو۔ مگر اب اسے کوئی بھی اچھی نظروں سے نہیں دیکھتا۔ کیونکہ جو لوگ کشمکش حیات میں [illegible] ہیں۔ اُن [illegible] شاعری نہایت آسانی

سے امیر بن سکتا ہے۔ بشرطیکہ اُس کا دِل صرف دولت کی دُھن میں لگا ہو۔ لیکن وُہ جو اچھا نہیں لکھ سکتا اُسکے لئے یہی بہتر ہے۔ کہ گمنامی کی حدُود سے باہر نہ نکلے۔ ایسا آدمی بدوں کسی مُربّی کی ناراضی کے اپنے گھر میں فاقہ کشی کر سکتا ہے۔ وُہ اپنے معمُولی لباس میں ہر ایک سوسائٹی میں جا سکتا ہے۔ اور آزادی کی دولت سے کافی طور پر بہرہ اندوز ہو سکتا ہے +

ملکۂ شب کی اٹھکیلیاں

بارہ کا گجر بج چکا ہے۔ چاندنی سمُندر کی لہروں سے کھیل رہی ہے۔ آسمان کے جوہری نے اپنی دوکان پُوری شان کے ساتھ سجا رکھی ہے۔ ابر کی ٹکڑیاں فضائے بسیط میں سیر کے لئے نکلی ہیں۔ سُرمئی اور نقرئی رنگ کے ٹکڑے شرط بد کر چاند کو چھُونے کے لئے دوڑ رہے ہیں۔ چاند نے ایک سیم گوں پردہ میں سے جھانک کر کہا۔ تا + سمُندر کا دِل اِس معصُومانہ شرارت سے بلّیوں اُچھلنے لگا۔ مینخانہ فطرت کے متوالوں کی چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ جاری ہے + لو! چاندنی پھر پھیکی پڑ گئی۔ لہروں کو آواز آئی "مجھے ڈھُونڈو"! میں بستر پر خاموش پڑا سوچ رہا ہُوں کہ شاید پہلے بھی مُنہ چھپانے اور دکھانے کا یہ کھیل کبھی دیکھا ہے .... یاد نہیں۔ کہاں؟

بیداری

میں اپنی چھوٹی سی ندی کو جانتا ہُوں۔ جہاں نے کے سر ہلاتے ہُوئے پودے اور خوبصُورت خوشبودار بُوٹیاں اُگی ہیں۔ اسکی گہرائیوں میں جل دیو ایک دُوسرے سے لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ آہ! مجھے کس قدر تمنا ہے کہ میں وُہیں بیٹھا رہُوں ..... لیکن اب میں زیادہ دیر تک اس خوشنما مقام پر ہرگز نہیں ٹھہروں گا۔ اب میں وہاں بیٹھ کر خیالوں میں وقت نہیں کھویا کرُونگا۔ مجھے اپنے فرض کا احساس ہو چکا ہے۔ میں اپنے آسمانی آقا کا حکم مانوں گا۔ اُس نے انسان کو بہُت مختصر زندگی عطا کی ہے۔ اِس مختصر زندگی کو یُوں کاہل بن کر گذار دینا کہاں کی دانش مندی ہے +

راتوں کو تصوّر اُن کا ہے اور چھُپکے چھُپکے رونا ہے
اے صُبح کے تارے تُو ہی بتا انجام مرا کیا ہونا ہے

سُورج نے جاتے جاتے شام سیہ قبا کو
طشتِ اُفق سے لیکر لالے کے پھُول مارے

تڑپنا بلبلانا بے کسوں کا
کوئی پُوچھے دلِ درد آشنا سے

ابرِ گوہر بار

ابر گوہر بار اُٹھا کروٹیں لیتا ہوا اہلِ عالم کو پیامِ زندگی دیتا ہوا

چھا گئیں پانی کی رکھکر دوش پر اُٹھی گھٹا چل رہی ہے ہر طرف جاروب کش بنکر ہوا

ابر کے پردے میں آتشبازیاں چھٹنے لگیں کھل گیا مینہ کا خزانہ دولتیں لٹنے لگیں

ڈالیوں سے ڈالیاں پتوں سے پتے مل گئے سُنکے پیغامِ مسرت آج غنچے کھل گئے

روح جاکر پھر پلٹ آئی تنِ بیمار میں پھوٹ نکلیں کونپلیں سوکھے ہوئے اشجار میں

مے بنا پانی کا قطرہ پھول ساغر بن گیا بن گیا صحرا چمن غنچۂ گل تر بن گیا

وردیاں تقسیم ہوتی ہیں ہری بانات کی چل کے دیکھو باغ میں دریادلی برسات کی

وہ شفق کی چادریں قدرت کی وہ گلکاریاں نیلے نیلے آسماں پر اودی اودی دھاریاں

تیری ہر ہر بوند ہے وجہِ حیاتِ کاشتکار ہے تیرا ممنون عالم کا ہر اک سرمایہ دار

لیکے ہل نکلا ہے قسمت آزمانے کے لئے کوششیں کرتا ہے کیا کیا ایک دانے کیلئے

کھیت اسکا ملک ہے اس کا خزانہ ہے اناج زورِ بازو دیکھئے مٹی سے لیتا ہے خراج

تخم ریزی کر کے قسمت کے حوالے کر دیا اسنے دامن کو زمیں کے موتیوں سے بھر دیا

ان غریبوں سے ہوا سرمایہ داروں کا بھلا کاشتکاروں کا ہوا بارش سے حاصل مدعا

چاہیئے بن جاؤ محسن بے زبانوں کی زباں

اہلِ عالم کو سُنا دو بیکسوں کی داستاں

ہندوستان میں جرنلزم کی ابتدا کب ہوئی؟

ہندوستان میں "جرنلزم" کی صبح اٹھارھویں صدی کے اواخر میں ہوئی۔ غالباً سنہ ۱۷۸۰ء سے کچھ پہلے یورپ سے پہلا چھاپہ خانہ ہندوستان پہونچا۔ اور ۲۹۔جنوری سنہ ۱۷۸۰ء کو ہندوستان کا پہلا انگریزی اخبار "بنگال گزٹ" کلکتہ سے شائع ہوا۔ اُسکے بعد سے متواتر کئی انگریزی اخبارات یکے بعد دیگرے کلکتہ اور بمبئی سے نکلتے گئے۔ یہانتک کہ مُلک کے انگریزی خوان حلقے میں صحافت کی ایک اچھی خاصی فضا پیدا ہوگئی۔ ان اخبارات نے ولائتی اخبارات کی دیکھا دیکھی حکومت اور کمپنی پر سختی کے ساتھ نکتہ چینیاں شروع کیں۔ جب ان کا لب و لہجہ ضرورت سے زیادہ سخت ہونے لگا۔ تو لارڈ "ولزلی" گورنر جنرل کمپنی نے اس لامحدود آزادی کو قانون کی حدود میں گھیرنے کی ضرورت محسوس کی۔ چنانچہ ۱۳ مئی سنہ ۱۷۹۹ء کو صحافتی مطبوعات کے متعلق پہلا قانون پاس ہوا۔ جس کی رُو سے ایڈیٹروں کو مجبور کیا گیا۔ کہ وہ اپنے اخبارات کو شائع کرنے سے پہلے اُس کی ایک نقل منظوری کی غرض سے چیف سکرٹری کے آفس میں بھیج دیا کریں۔ اِسکے بعد سے تقریباً ستّرہ سال تک ہندوستانی صحافت کے حوصلے قانونی پابندیوں کے تنگ دائرے میں بند ہو کر گھٹتے رہے۔ یہانتک اگست سنہ ۱۸۱۸ء میں "مارکیوس ہیسٹنگس" نے ان سب پابندیوں کو منسوخ کرتے ہوئے اخبارات کی آزادی کا اعلان کیا۔ ہندوستان کے صحافتی ماحول میں اِس اعلان پر بڑی خوشیاں منائی گئیں۔ صحافت کے حوصلے بڑھنے لگے۔ اور ہندوستانیوں کے حلقے میں بھی یہ خیال گشت کرنے لگا۔ کہ ملک کی زبانوں میں بھی اخبار کی ضرورت ہے + ہندو دھرم کے مصلح اوّل و برھمو سماج کے بانی اوّل "راجہ رام موہن رائے" اُس وقت کمپنی کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر کلکتہ میں اقامت گزین ہوچکے تھے۔ اور ملک کی اصلاح کا کام شروع کر چکے تھے۔ وہ فطرت کی طرف سے بلند عزائم اور درد مند دل لیکر پیدا ہوئے تھے۔ اُنہوں نے کسی مُلکی زبان میں اخبار کی اشاعت کو وقت کی ایک ناگزیر ضرورت سمجھا۔ چنانچہ اُنہوں نے اِس مقصد کے لئے یہ اعلان ہند کے گوشے گوشے میں شائع کرا دیا۔ بنگالیوں نے اِس اعلان کا پُرجوش خیر مقدم کیا۔ یہی وجہ ہوئی۔ کہ راجہ جی نے سب سے پہلے ایک بنگالی اخبار "سمبد کمودی" ۴۔ دسمبر سنہ ۱۸۲۱ء کو کلکتہ سے شائع کیا۔ "رام موہن رائے" کا قلم اخبار کی مقبولیت کا ضامن تھا۔ تمام صوبے میں ہر گوشے سے اُسکی مانگ ہونے لگی۔ لیکن ابتدا ہی میں اخبار کے پرنٹر پبلشر "بھوانی چرن بنرجی" بعض اختلافات کی بنا پر راجہ صاحب سے الگ ہوگئے۔ اور الگ ہو کر اُنہوں نے سنہ ۱۸۲۲ء میں بنگالی زبان کا دوسرا اخبار "سماچار" شائع کیا۔ بنگالی زبان میں اخبار کا نکلنا تھا۔ کہ کلکتہ کے ہندوستانی بولنے والوں کا احساسِ غیرت

بھی دفعتاً چونک اٹھا۔ اور انہوں نے کمر ہمت باندھ کر "جام جہاں نما" نامی ایک اردو اخبار کی اشاعت ۲۸ مارچ ۱۸۲۲ء سے شروع ہوئی۔ غالباً اردو زبان کا یہ پہلا اخبار تھا۔ اسی کے قریب العہد شمس العلماء "مولوی محمد حسین آزاد" کے والد ماجد نے دہلی سے ایک اخبار شائع کیا۔ چونکہ اس اخبار کی پہلی اشاعت کی تاریخ معلوم نہیں۔ اسلئے نہیں کہا جا سکتا۔ کہ ان دو اخباروں میں اولیت کا فخر کس کو حاصل ہے؟ بہرکیف یہی دونوں اخبار ہیں۔ جنہیں اردو جرنلزم بسم اللہ کہا جا سکتا ہے؟ "راجہ رام موہن رائے" نے اپنے بنگلہ اخبار کی اشاعت کے بعد ہی سے یہ محسوس کیا کہ بنگال سے باہر کی دنیا ان کے خیالات سے غیر متاثر ہے۔ بلکہ خود کلکتہ میں جو ہندوستانی بولنے والے ہیں۔ وہ بھی ان کی تحریروں سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ اس لئے انہوں نے ایک اخبار ایک ایسی زبان میں نکالنے کا ارادہ کیا۔ جو تمام ملک میں سمجھی اور بولی جاتی ہو۔ اولاً ان کی نظر اردو پر پڑی۔ لیکن اردو اسوقت تک تحریر کی زبان نہ بن سکی تھی اس کے پاس الفاظ کا اتنا کافی ذخیرہ موجود نہ تھا۔ کہ وہ کسی مصلح کے اچھوتے خیالات کو اپنے دامن میں سمیٹ سکتی۔ اسلئے اس مقصد کے لئے فارسی زبان کو منتخب کیا تھا۔ فارسی زبان اسوقت تمام ہندوستان کی دفتری زبان تھی۔ اور ہر صوبے کے تعلیم یافتہ طبقے میں اسکے کچھ نہ کچھ سمجھنے والے موجود تھے۔ اسلئے انہوں نے فارسی کا پہلا اخبار "مرۃ الاخبار" کے نام سے ۱۲ اپریل ۱۸۲۲ء کو شائع کیا۔ اس اخبار کی کاپیاں آج بھی "امپیریل لائبریری" میں موجود ہیں۔ ان کے سرسری مطالعہ سے ایک شخص بآسانی راجہ صاحب کے متبحر علمی اور وسعت فکر کا اندازہ کر سکتا ہے۔ اس عہد کے اخبارات کے کالم صرف مقامی خبروں اور کمپنی کی حکومت پر مؤدب تنقیدوں تک محدود تھے "راجہ رام موہن" نے اپنے فارسی اخبار کو معنوی حیثیت سے اخبار بنا دیا۔ تمام دنیا کی دلچسپ خبروں کو طبع کرنے کی کوشش کی۔ وقت کے تمام مسائل حاضرہ پر روشنی ڈالی۔ ایران چین۔ روس اور انگلستان و اسپین اور فرانس کے معاملات پر تنقیدیں کیں۔ ان کے افتتاحیہ مقالوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ اس عہد میں بھی ایک بین الاقوامی دماغ کے مالک تھے۔ انکے اخبار کی پہلی اشاعت ہمارے سامنے ہے۔ ہم اس کی مندرجہ ذیل فہرست سے ان کی وسعت معلومات اور علوئے فکر کا اندازہ کر سکتے ہیں:- "۱۔ عرض حال۔ فارسی میں اخبار نکالنے کی وجہ + ۲۔ کمپنی کے ملازموں کے جائز حقوق کے لئے کمپنی سے اپیل + ۳۔ ان سے اختلاف کی وجہ اور اس پر ایک نظر + ۴۔ روس اور انگلستان کی سیاسی دشمنی کے اسباب و تشریح + ۵۔ ہندوستان میں غلوں کی پیداوار اور ملک کی اقتصادی حالت پر ایک تبصرہ + ۶۔ شرفائے دہلی کو مدرسہ جاری کرنے کا مشورہ" دوسری یا تیسری اشاعت میں انگریزوں کی ترقی کے اسباب پر جو مقالہ سپرد قلم کیا گیا ہے۔ وہ اسقدر معلومات سے پُر ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ اس عہد کا ایک ہندوستانی [illegible]

واقف ہو سکا۔ اِس مقالہ میں انگریزوں کی ترقی کے بہت سے اخلاقی اور اِقتصادی اسباب پر بحث کی گئی ہے۔ آخر میں ایڈیٹر یہ فیصلہ کرتا ہے۔ کہ اِس قوم کی ترقی کا اصلی سبب اِس کا دستوری اور آئینی نظام ہے۔ بلاشبہ برطانیہ کی عظمت کا راز اِس کی دستوری آئینی حکمت میں پنہاں ہے ٭ "راجہ رام موہن" نے اُنیسویں صدی میں جو فیصلہ انگریزوں کے متعلق کر دیا ہے۔ آجتک بیسوی صدی میں بھی دُنیا کی زبان وُہی کہہ رہی ہے۔ اِس مقالے میں اُنہوں نے انگریزوں کے جمہوری نظام پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنی سیاسی بصیرت کو جابجا نمایاں کیا ہے۔ اِسکے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُنیسویں صدی کا ایک ہندوستانی دماغ جمہوری سیاست کے معاہدہ اور نقائص کو کس کامیابی سے سمجھا۔ ہند میں اُسوقت ملوکیت کا دور تھا لیکن "راجہ رام موہن رائے" اُس عہد میں بھی جمہوریت پسند تھے۔ گو اُنہوں نے جمہوریت کے نقائص پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اور جابجا اُن نقائص کے علاج بھی بتلائے ہیں ٭ یہ تھا اُنیسویں صدی کا ایک ہندوستانی جو وقت سے بہت پہلے پیدا ہُوا۔ اور وقت سے بہت پہلے مر گیا ٭

برسات کی ایک رنگین شام

تمہیں بھی یاد ہے وُہ شام رنگیں — فضا پر دُھند لکا جب چھا رہا تھا
سماں بارش کی چھینٹوں سے نکھر کر — حسین شادابیاں برسا رہا تھا
ہوائے سرد کا ہر ایک جھونکا — فضا میں لڑکھڑاتا جا رہا تھا
فضا انگڑائیاں سی لے رہی تھی — مناظر پر نشہ سا چھا رہا تھا
اُفق پر اُودے اُودے بادلوں میں — حسین پریوں کا دل مُڈلا رہا تھا
فلک پر غول آوارہ لکوں کا — نظر سے دُور ہوتا جا رہا تھا



سُنا مُغنی مجھے وُہ نغمہ کہ جھوم جائے شباب تیرا — اگر ذرا بھی کیا تکلف تو چھین لوں گا رباب تیرا
صُبح کلیوں میں مَیں نے سُونگھی ترے تبسم کی لپٹے نازک — عمیق چشموں سے مَیں نے دیکھا اُبل رہا ہے شباب تیرا
یہ تیری روشن نگاہیاں ہَیں کہ رات بجلی بنی ہُوئی ہے
لطیف پردوں میں سونے والے چمک رہا ہے شباب تیرا

بلبل اور شہنشاہِ چین

شہنشاہِ چین کا محل نہایت ہی نفیس و نایاب چینی کا بنا تھا۔ لیکن یہ اتنا نازک اور اس قدر بھربھرا تھا۔ کہ کوئی ڈرتے ڈرتے ہی اسے ہاتھ لگانے کی جرأت کرتا۔ باغ رنگ رنگ کے خوشنما پھولوں سے رشکِ ارم بن رہا تھا۔ خوش نما پیڑوں کی گودیں سفید۔ سرخ۔ نیلی اور زرد کلیوں سے آباد تھیں۔ اُن کی ننھی ننھی ڈالیوں سے نقرئی گھنٹیاں بندھی تھیں۔ ہوا آتی۔ تو یہ ڈالیاں انتہائے نزاکت سے ہلنے لگتیں۔ اور گھنٹیوں کے سُریلے نغمات سُننے والے پر وجد کی کیفیت طاری کر دیتے۔ یہ سب شاید اس لئے تھا۔ کہ باغ سے گزرنے والے اُن پر ایک التفات آمیز نگاہ ڈالے بغیر آگے نہ نکل جائیں۔ غرضیکہ باغ کا ہر منظر گذرنے والے کو دعوتِ شوق دیتا تھا۔ یہ باغ اتنا وسیع و عریض تھا۔ کہ خود وہاں کا مالی بھی نہیں جانتا تھا۔ کہ اُسکی حدِ اختتام کہاں ہے باغ سے پرے ایک جنگل تھا۔ جیسے نیلی نیلی جھیلوں اور فلک بوس درختوں کے دلنشین مناظر نے چار چاند لگا رکھے تھے۔ اس جنگل کی سہانی وسعتیں کہیں سمندر کی وادیوں سے جا ملتی تھیں۔ ایسے سمندر سے جو دھوپ میں اخضر و سیمین لمعات پیدا کرتا ایک نرالے ہی انداز سے موجزن تھا۔ ساحلِ بحر کے عظیم الہیئت درختوں کے سائے میں آ کر بڑے بڑے جہاز لنگر انداز ہوتے تھے۔ ان ہی درختوں کی شاخوں میں ایک بلبل رہتی تھی۔ یہ اس شیریں انداز اور اس حسنِ نزاکت سے گاتی تھی۔ کہ محنت کا مارا غریب ماہی گیر بھی اس سے پہلے کہ سمندر میں جال پھینکنے کے لئے اپنی کشتی پر سوار ہو کر دُور چلا جائے۔ اپنی سانس روک کر بلبل کے سُریلے نغمات سُننے کے لئے ٹھہر جاتا۔ وُہ دل ہی دل میں کہتا۔ "کیسے شیریں گیت گاتی ہے یہ بلبل"! بالآخر اُسے اپنے کام میں مصروف ہو کر بلبل کے خیالوں کو دل سے بھلا دینا پڑتا۔ لیکن دوسری شب جب وُہ واپس آتا۔ تو ایک دفعہ پھر بلبل کے گیت سُننے کے لئے اسی درخت کے نیچے ٹھہر جاتا۔ اور کہتا۔ "کیسے بہترین گیت گاتی ہے یہ بلبل"! دُنیا کے گوشے گوشے سے سیاح آکر شہنشاہ کا محل اور باغ دیکھتے۔ لیکن جب وُہ سرسبز و شاداب جنگل میں جا کر بلبل کے نغمے سُنتے تو بے اختیار پکار اُٹھتے "بلبل ان سب سے اچھی ہے"۔ جب وُہ اپنے اپنے وطن واپس آتے۔ تو لوگوں کے سامنے اس خوبصورت پرندہ کی تعریفوں کے پُل باندھ دیتے۔ اب تک کئی آدمی شہنشاہ کے محل اور باغ کی تعریف میں کتابیں لکھ چکے تھے۔ اور بلبل کا ذکر تو ہر کتاب کے اولین اوراق میں ہوتا تھا۔ کئی شاعروں نے بھی اس بلبل کی تعریف میں جو نیلے سمندر کے کنارے جنگل کے ہرے بھرے درختوں میں گیت گایا کرتی تھی۔ دلکش نظمیں کہیں یہ کتابیں دُنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیل چکی تھیں۔ ایک دن اتفاق سے یہی چند کتابیں شہنشاہ کے ہاتھ آگئیں

اور اپنے مطلّا تخت پر بیٹھ کر اُنہیں پڑھنے لگا۔ ہر فقرے پر جھومتا۔ اور نہائت فخر سے اپنا سر ہلاتا...... اسے چمکتے ہوئے الفاظ میں اپنے شہر۔ باغ اور محل کی تعریفیں سُن کر بڑی خوشی حاصل ہوتی تھی "لیکن نیلے سمندر کے کنارے جنگل کے ہرے بھرے درختوں میں گیت گانے والی بلبل سب سے اچھی ہے"۔ اب اُس نے کتاب سے یہ فقرہ پڑھا۔ کہنے لگا۔ "بلبل؟ میں تو کسی بلبل سے واقف نہیں!! کیا واقعی میری سلطنت کے کسی باغ میں ایسا پرند موجود ہے؟ اور میں نے ابتک اس کا ذکر تک نہیں سنا۔ اور پہلی مرتبہ اس کا حال ان کتابوں میں پڑھ رہا ہوں"؟ آخر اُس نے وزیراعظم کو بُلایا۔ وزیراعظم اپنی بلند شخصیت کا مالک تھا۔ کہ جب کوئی کم رُتبہ آدمی اُس سے کوئی بات کرتا۔ تو وُہ جواب میں "پی" کہکر وہاں سے چلا جاتا۔ یقیناً "پی" کا لفظ بالکل بے معنی ہوتا تھا۔ شہنشاہ نے وزیراعظم سے کہا "سُنتا ہُوں۔ کہ میری ممالکات میں ایک نہائت قابلِ تعریف پرند موجود ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ میری سلطنت کی سب چیزوں میں سے زیادہ قابلِ تعریف ہے۔ کیا وجہ ہے۔ کہ تم لوگوں نے ابتک مجھ سے اس کا ذکر نہیں کیا"۔

وزیراعظم نے جواب دیا۔ کہ "میں نے بھی تو کبھی اس کا ذکر نہیں سُنا۔ حیران ہوں۔ کہ اسے دربار میں کیوں نہیں پیش کیا گیا"۔

"اُسے آج میرے سامنے حاضر کرو۔ کہ آکر مجھے اپنے گیت سُنائے۔ ایک دُنیا جانتی ہے۔ کہ میرے پاس ایک نادر چیز موجود ہے لیکن خود مجھے اسکی خبر نہیں"۔ شہنشاہ نے کہا۔

"کم از کم میں نے تو اس کا ذکر آجتک نہیں سُنا۔ بہرحال میں اُسے تلاش کروں گا"۔ وزیراعظم نے جواب دیا۔

"لیکن یہ کہاں سے ملے گی"؟ وزیراعظم کئی سیڑھیاں چڑھا۔ اور کئی اُترا۔ مسقف راستوں اور بڑے کمروں میں ہر ایک سے پُوچھتا رہا۔ کہ تم نے کبھی کسی ایسے پرندے کا ذکر سُنا ہے۔ یا اُسے دیکھا ہے۔ لیکن ہر ایک نے نفی ہی میں جواب دیا۔ آخر وزیراعظم شہنشاہ کے پاس واپس گیا۔ اور کہنے لگا "شاید کتاب لکھنے والوں نے افتراپردازی سے کام لیا ہے۔ کوئی ایسا پرند ہماری سلطنت میں موجود نہیں۔ حضور کو لکھی ہوئی سب باتوں پر یقین نہیں کرنا چاہئے۔ کتابوں کا زیادہ تر حصہ جھوٹ اور افترا ہے۔ اور انہیں "سیاہ آرٹ" سے تعبیر کیا جاسکتا ہے"۔

شہنشاہ نے جواب دیا "لیکن جس کتاب سے میں نے اس پرند کا حال پڑھا ہے۔ وُہ میرے "شہنشاہی بھائی" شاہ جاپان نے بھیجی ہے۔ اسلئے یہ غیر معتبر نہیں ہوسکتی۔ میں بلبل کے گیت سُن کر رہونگا۔ آج ہی رات اسے میرے سامنے حاضر کرو۔ اُس پرندے سے میں انتہائی نوازش کے ساتھ پیش آؤں گا۔ اور اگر تم لوگوں نے اُسے حاضر نہ کیا۔ تو میں رات کو کھانا کھانے کے فوراً بعد تمام درباریوں کو پاؤں تلے مسل ڈالوں گا"۔

چینی وزیراعظم نے چلا کر کہا۔ "تسک پی" اور وہاں سے اٹھ بھاگا۔ کئی [illegible] کئی اُترا

کئی مسقف رستے اور بڑے کمرے اُس نے چھان مارے۔ ایک ایک آدمی سے اُس عجیب و غریب بُلبل کے متعلق پُوچھا۔ تقریباً نصف درباری بھی اُسکے ساتھ تھے۔ کیونکہ کوئی نہیں چاہتا تھا۔ کہ میں آج رات "پاؤں تلے مسلا جاؤں"۔ سو دربار کا ہر رُکن اُس پرندے کے متعلق دُوسروں سے پُوچھتا رہا جس سے تمام درباری تو نا آشنا تھے۔ اور تمام شہر آشنا۔ آخر کار وُہ شاہی مطبخ کے قریب پہونچے۔ وہاں اُسی بُلبل کا ذکر ہو رہا تھا۔ کہ باورچی خانے کا کُوڑا کرکٹ اُٹھانے والی نوکرانی آموجود ہوئی۔ اور کہنے لگی "بُلبل کا ذکر ہو رہا ہے؟ میں اُسے جانتی ہُوں اور وُہ تو بہت ہی شیریں گیت گاتی ہے۔ ہر شام کو جب میں چھُٹی لے کر اور کھانا کھانے کی میز پر سے بچا کھچا کھانا اُٹھا کر اُسے اپنی غریب اور بیمار ماں کے پاس لے جاتی ہُوں۔ تو وُہ مجھے سمندر کے کنارے پر ملتی ہے۔ اور وُہیں رہتی ہے۔ اور جب میں تکان سے چُور ہو کر لوٹتی ہُوں۔ تو جنگل میں بیٹھ کر اکثر اُسکے نغمے سُنتی ہُوں۔ اُس کا گیت سُن کر میری آنکھوں میں آنسُو آجاتے ہیں۔ اور مجھے یُوں محسُوس ہوتا ہے۔ جیسے میری ماں نے مجھے انتہائے محبت سے چُوم لیا ہے"۔

"اری او ننھی چھوکری"۔ وزیر اعظم نے چلّا کر کہا۔ "اگر تم مجھے اُس جنگل میں لے چلو۔ جہاں بُلبل گیت گاتی ہے۔ تو میں تمہیں مطبخ میں کوئی اعلیٰ عُہدہ دِلا دُوں گا۔ تمہیں اجازت لے دُونگا۔ کہ جب شہنشاہ کھانا کھا رہا ہو تم اُسے دیکھ سکو۔ کیونکہ آج رات بُلبل کو دربار میں دعوتِ آمد دیگئی ہے"۔ آخر یہ سب لوگ اُس جنگل کی طرف چل پڑے۔ جہاں بُلبل گیت گایا کرتی تھی۔ نصف درباری بھی اُن کے پیچھے پیچھے تھے۔ جب وُہ کافی دُور نکل گئے تو ایک گائے کے ڈکرانے کی آواز سُنائی دی۔ ایک درباری بول اُٹھا "لو ہم نے اسے ڈھونڈ لیا۔ ایک چھوٹے سے جانور کے لئے اِتنی بڑی جماعت جا رہی ہے۔ میرا خیال ہے میں نے پہلے بھی کہیں اِس کا گیت سُنا ہے"۔ نوکرانی بولی "نہیں نہیں۔ وُہ تو گائیں ڈکرا رہی ہیں۔ بُلبل تو ابھی دُور ہے"۔

کچھ دُور آگے بڑھے۔ تو ایک دلدل سے کسی مینڈک کے ٹرانے کی آواز آئی۔ درباری پادری چلّا کر کہنے لگا "بھئی! واہ کیسے شیریں نغمات ہیں۔ میں نے بُلبل کی آواز صاف صاف سُن لی ہے۔ اِس کی آواز چھوٹے چھوٹے نقرئی گھنگھرؤں کی سی ہے"۔ ننھی نوکرانی بولی "نہیں یہ تو کوئی مینڈک تھا۔ لیکن میرا خیال ہے۔ اب ہم جلد ہی اُس کا گیت سُننے والے ہیں"۔ اب بُلبل کے گیت کی آواز سُنائی دی۔ نوکرانی چلّا کر بولی "وُہ بُلبل بول رہی ہے۔ سُنو سُنو۔ وہاں وُہ بیٹھی ہے"۔ اِس کے بعد اُس نے بُلند شاخوں میں بیٹھے ہُوئے بھورے رنگ کے ایک پرندے کی طرف اِشارہ کیا۔ وزیر اعظم کہنے لگا "ہیں یہ بُلبل ہے؟ میرا خیال تو نہیں تھا۔ کہ یہ ایسی ہوگی کتنی سادہ سی ہے۔ یقیناً اُس نے بڑے آدمی دیکھ کر اپنا رنگ بدل لیا ہوگا"۔ نوکر لڑکی نے باآواز بُلند کہا "ننھی بُلبل ہم ... چاہتے ہیں ... "

"کیوں نہیں بڑی خوشی سے" کہکر بلبل نے گیت گانا شروع کیا۔ اِس انداز سے کہ سُننے والے خوش ہوجائیں ۔

وزیر اعظم نے کہا "اُس کی آواز بلّور کے گھنگھروں کی سی ہے۔ اُسکے گلے میں کس غضب کی شیرینی ہے۔ ایسے نرالے نغمات سے اَبتک ہمارے گوش نا آشنا تھے۔ دربار میں تو اِس کا گانا بہت ہی کامیاب رہیگا" ۔

"کیا اب مَیں شہنشاہ کو گیت سُناؤں"؟ بلبل نے کہا۔ اُس کا خیال تھا۔ کہ شہنشاہ بھی اِن ہی لوگوں میں موجود ہے ۔

وزیر اعظم نے کہا۔ "پیاری بلبل! مَیں آج شام کے جشن دربار میں تمہیں دعوت شمول دینے کی بے انتہا مسرت حاصل کر رہا ہوں۔ وہیں جا کر تم "ہز امپیریل ہائینس" کو اپنے سحر آفرین نغموں سے بیخود بنانا" ۔

بلبل نے جواب دیا "میں تو جنگل کی کھلی فضا ہی میں اچھے گیت گا سکتی ہوں" لیکن جب اس نے سُنا کہ شہنشاہ کی خوشی ہے۔ کہ وہ اُس کا گیت سُنے۔ تو وہ اُنکے ساتھ ہولی ۔ محل کو نہایت شاندار طریقے سے سجایا گیا۔ چینی کے فرش اور دیواریں لاکھوں سُنہری لیمپوں کی روشنی سے چمکنے لگے۔ شاندار پھول جن سے نقرئی گھنگروؤں کی جھنکار سُنائی دیتی تھی مُسقّف راستوں میں بچھا دیئے گئے۔ وہاں اتنی بھاگڑ مچی۔ اور گھنٹیوں کی آواز نے اتنا شور مچایا۔ کہ کان پڑی آواز سُننی مشکل ہوگئی ۔ بڑے کمرے کے درمیان جہاں شہنشاہ اپنے تخت پر بیٹھا تھا بلبل کے لئے ایک سُنہری جگہ بنائی گئی ۔ تمام درباری موجود تھے۔ کوڑا کرکٹ اُٹھانیوالی نوکرانی کو بھی دروازے کے پیچھے کھڑا رہنے کی اجازت دیدی گئی۔ کیونکہ اب اُسے "دربار شاہی کے مطبخ کی باورچن" کا خطاب دیا گیا تھا ۔

ہر آدمی اپنے پورے پورے لباس میں تھا۔ اور ہر ایک کی نگاہ بھورے رنگ کے چھوٹے سے پرند پر جمی ہوئی تھی۔ شہنشاہ نے سر ہلایا۔ بلبل نے اپنا شیریں گیت گانا شروع کیا۔ اُس نے اِس حسن انداز کے ساتھ گایا۔ کہ شہنشاہ کی آنکھوں سے آنسو نکل کر اُسکے رخساروں پر بہنے لگے۔ اِسکے بعد اُسنے کہیں پہلے سے بھی زیادہ نزاکت آفرینی سے گانا شروع کیا۔ اور اُسکے نغموں سے کئی دلوں میں ایک جوش سا پیدا ہوگیا۔ شہنشاہ اُسکے گیت سے بہت خوش ہؤا۔ اور کہنے لگا "میں بلبل کو اجازت دیتا ہوں۔ کہ وہ میرے سُنہری سلیپر گلے میں پہن لے" لیکن بلبل نے اُس کا شکریہ ادا کیا۔ اور کہنے لگی "میں کافی انعام پا چکی ہوں میں نے شہنشاہ کے آنکھوں میں آنسو دیکھے ہیں اور یہی میرا سب سے بڑا انعام ہے۔ شہنشاہ کے آنسوؤں میں ایک خاص قوت ہوتی ہے۔ خدا جانتا ہے۔ کہ مجھے اپنا صلہ مل گیا" اِسکے بعد اُس نے ایک دفعہ پھر انتہائے شیرینی سے گانا شروع کیا ۔ [illegible] کی کی ایسی جلوہ اور دلفریب

تعریف ابتک نہیں ہوئی"۔ اور انہوں نے اپنے اپنے منہ میں پانی کا ایک ایک گھونٹ ڈال لیا۔ تاکہ وہ غرارے کی آواز پیدا کرکے لوگوں سے بولیں۔ اور ان کی آواز بھی سحر طراز ثابت ہو۔ انہوں نے سمجھا۔ کہ شاید وہ بھی اب بلبلیں بن گئی ہیں۔ نوجوان لڑکیوں نے بھی بلبل کے نغموں کی داد دی۔ اور ان سے داد حاصل کرنا کوئی اتنی آسان بات نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہ اپنے آپ کو بلبلوں سے کسی طرح کم نہیں سمجھ سکتیں۔ غرضیکہ بلبل کی کامیابی مسلمہ قرار دیدی گئی +

اب بلبل کو مجبوراً دربار ہی میں رہنا پڑا۔ اسے ایک پنجرے میں بند کر دیا گیا۔ البتہ یہ اجازت دیدی گئی۔ کہ وہ دن میں دو بار اور رات میں ایک بار باہر آ جا سکتی ہے۔ بارہ خدمت گار اسکی نگرانی کے لئے مقرر کر دیئے گئے ہر ایک کے ہاتھ میں وہ ریشمی دھاگا تھا۔ جو بلبل کے پاؤں سے باندھ دیا گیا تھا۔ اگرچہ اسکو اسطرح پابند ہو کر اڑنے میں خاک بھی لطف نہ آتا تھا + شہر کے بچے بچے کی زبان پر بلبل کی تعریف تھی۔ جب کوئی آدمی دوسرے سے ملتا تھا۔ تو سلام کرنے کی بجائے ان میں سے ایک کہتا تھا۔ "بل"...... اور دوسرا جواب میں "بل"...... کہکر بلبل کے لفظ کو پورا کر دیتا تھا یہی ان کے لئے سلام اور سلام کا جواب تھا + گیارہ بساطیوں نے بھی اپنے اپنے بچے کا نام بلبل رکھ لیا تھا۔ حالانکہ ان میں سے ایک کی آواز بھی بلبل جیسی نہ تھی + ایک دن شہنشاہ کو ایک بڑا سا پارسل موصول ہوا۔ جسپر لکھا تھا...... بلبل...... شہنشاہ کہنے لگا "ہمارے مشہور پرند کے متعلق یہ کوئی نئی کتاب شائع ہوئی ہوگی" +

لیکن یہ کتاب نہیں تھی۔ بلکہ ایک چھوٹا سا کھلونا تھا۔ جو پارسل میں بند تھا۔ یہ ایک نقلی بلبل تھی جو لعل نیلم اور جواہرات کی بنی تھی جب اسے کہا گیا۔ تو اس نے وہی گیت سنایا۔ جو اصلی بلبل سنا چکی تھی۔ یہ اصلی بلبل کی طرح گاتی لیکن سُر تال کے ساتھ نہ کر سونے اور چاندی کی جگمگاتی ہوئی دم بھی ہلاتی۔ اسکی گردن کے گرد ایک تار تھا جس کے ساتھ ایک چھوٹی سی تختی ٹنگی تھی۔ تختی پر یہ الفاظ کندہ تھے :- "شہنشاہ جاپان کی بلبل شہنشاہ چین کی بلبل کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں" + تمام دربار چلا اٹھا۔ "بھئی واہ" اور جو آدمی یہ نئی بلبل لایا تھا۔ اسے فوراً "بلبل بردار اعظم دولت چین" کا خطاب دے دیا گیا + ان دونو کو مل کر گانے کے لیے ایک جگہ رکھا گیا۔ لیکن یہ گانا کامیاب نہ رہا۔ کیونکہ پرانی بلبل اپنے طریقے سے گاتی تھی لیکن نئی بلبل مقررہ سُر اور مقررہ تال ہی پر گا سکتی تھی + جس شخص نے یہ بلبل بنائی تھی۔ کہنے لگا۔ "میری بلبل کا کوئی قصور نہیں۔ اس کے منہ سے مقررہ وقفے پر الفاظ نکلتے ہیں۔ اور یہ میرے سوچے ہوئے طریقہ سے گاتی ہے" + اسکے بعد صرف نقلی بلبل سے اکیلے ہی گیت سنا گیا۔ اسنے بالکل اصلی بلبل ہی کی طرح دلنشین انداز سے گیت گایا۔ اسکے علاوہ اس میں بڑی خوبی جو تھی۔ وہ ...... وہی گیت سنایا

اور نہ تھکی۔ حاضرین ابھی کچھ دیر اور اس کا ہی گانا سننا چاہتے تھے۔ لیکن شہنشاہ نے کہا۔ کہ "اب اصلی بلبل کی باری ہے"۔ لیکن وہ کہاں تھی؟ کسی نے نہ دیکھا۔ وہ چپکے سے کھڑکی سے اپنے سرسبز جنگلوں کی طرف اُڑ چکی تھی۔ شہنشاہ نے چلا کر کہا۔ "یہ کیا ہوا"؟ تمام درباریوں نے اسے لعن طعن کی۔ اور اسے بے وفا پرند کہا۔ آخر میں سب کہنے لگے۔ "خیر دونوں میں سے جو اچھی بلبل تھی۔ وہ تو ہمارے پاس موجود ہے نا۔ وہ تو نہیں اُڑی نا"۔ اس کے بعد انہوں نے پھر نقلی بلبل کا گیت سننا شروع کیا۔ چونتیس دفعہ انہوں نے ایک ہی گیت کو سنا۔ لیکن ابھی تک انہیں یہ زبانی یاد نہ ہوا تھا۔ یہ اتنا مشکل تھا۔ صناع نے بلبل کی بڑی تعریف کی۔ اور کہا۔ کہ "اصلی بلبل سے بدرجہا بہتر ہے۔ اس میں صرف یہی خوبی نہیں۔ کہ اسکے پر و بال سنہری ہیں۔ اور یہ ہیروں کی بنی ہے۔ بلکہ اسکی بڑی خوبی اس کی مہارتِ فن ہے۔ ذرا سوچئے تو سہی "یور امپیریل میجسٹی"! اصلی پرند کے گیت سے ہمیں معلوم نہیں ہو سکتا۔ کہ گیت کے ایک مصرعہ کے بعد دوسرا کیا ہے لیکن یہ تو خاص قواعد اور ضوابط کے ماتحت بنی ہے۔ اور ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ آگے کونسا مصرعہ ہے۔ اسکی مشینری کی تشریح کی جا سکتی ہے۔ اسے کھول کر بتایا جا سکتا ہے۔ کہ اس کا سُر تال کیسے مقرر کیا گیا ہے"؟

درباری بولے "ہمارا بھی یہی خیال ہے" صناع نے اجازت لے لی۔ کہ وہ اتوار کے دن لوگوں کے سامنے اسکی نمائش کرے۔ شہنشاہ نے حکم دیا۔ کہ وہ اسے گاتے ہوئے پیش کرے"۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ لوگ اس کا گانا سن کر ایسے مدہوش ہوئے۔ جیسے انہوں نے چینیوں کے خیال کے مطابق مزیدار چائے پی لی ہو۔ انہوں نے چٹکیاں بجا کر اور سر ہلا ہلا کر اسے داد دی۔ لیکن ماہی گیر نے جس نے اصلی بلبل کو گاتے سنا تھا۔ کہا "اس کا لہجہ تو اچھا ہے۔ لیکن اسکی آواز میں کمی سی ضرور ہے۔ گو میں جانتا نہیں۔ کہ وہ کمی کیا ہے۔ اب بادشاہ نے حکم دیا۔ کہ "اصلی بلبل کو اسکے حدود مملکت سے باہر نکال دیا جائے"۔

اب نقلی بلبل کو شہنشاہ کے بستر کے قریب مخملیں گدیلوں پر جگہ ملی۔ اس نے نادر موتیوں کے جو تحائف اُسے ملے تھے۔ وہ اسکے گرد رکھ دیئے۔ اور اسے "شبستانِ شاہی کی مطربہ اعلیٰ" کا خطاب دیا گیا۔ اسے شہنشاہ سے بائیں جانب جگہ ملی شہنشاہ کا خیال تھا۔ کہ بائیں طرف زیادہ عزت افزا ہوتی ہے۔ کیونکہ دل بھی بائیں طرف ہوتا ہے۔ نقلی بلبل کے متعلق صناع نے پچیس جلدوں کی ایک کتاب بھی لکھی۔ یہ اتنی بڑی تھی۔ اور اس میں ایسے فاضلانہ فقرات اور الفاظ تھے۔ کہ ہر ایک کو کہنا پڑتا۔ کہ میں اسے پڑھ چکا ہوں۔ تاکہ وہ بیوقوف اور جاہل نہ تصور کیا جائے یا بادشاہ اُسے اس جرم میں پاؤں تلے نہ مسل دے۔ ایک سال گذر گیا۔ شہنشاہ، درباری اور باقی سب کو نقلی بلبل کا گانا زبانی یاد ہو گیا۔ وہ اسے بہت پسند کرتے تھے۔ کیونکہ وہ خود بھی اسے گاتے تھے۔ بازاری لڑکے بھی گاتے پھرتے تھے "زِ زِ زِ.... گلگ گلگ گلگ"۔ اور شہنشاہ

بھی...... کتنا شیریں گیت تھا یہ ٭ لیکن ایک شب جبکہ بُلبل گا رہی تھی۔ اور شہنشاہ بستر میں میٹھا گیت سُن رہا تھا۔ پرندے کے اندر کوئی چیز "پھر پھر پھر" کرنے لگی۔ یکایک تمام پہیئے چل گئے۔ اور موسیقی ختم ہو گئی ٭ شہنشاہ کُود کر بستر سے اُٹھ کھڑا ہوُا۔ اور اپنے فیملی ڈاکٹر کو بُلایا۔ لیکن وُہ کیا کر سکتا تھا۔ اسکے بعد اُنہوں نے گھڑی ساز کو بُلایا۔ بہت دیر تک تبادلہ خیال۔ بحث مُباحثہ اور غور و خوض کرنے کے بعد گھڑی ساز نے تھوڑی دیر کیلئے ٹوٹی ہوُئی بُلبل کو جوڑ دیا۔ لیکن اُس نے کہا۔ کہ "اس سے نہایت احتیاط کے ساتھ کام لینا چاہئے۔ اس کے پُرزے گھِس گئے ہیں۔ اگر نئے ڈالے گئے۔ تو اِس کی آواز خراب ہو جائیگی" ٭ اِس وحشت ناک خبر سے تمام دربار میں سنسنی پھیل گئی۔ اور اب اس بُلبل سے سال میں صرف ایک مرتبہ گیت سُنا جاتا۔ اور وُہ بھی اُسوقت جبکہ اسکے سُننے کو جی بہت ہی چاہتا۔ اس موقع پر صناع تقریر کرتے ہوُئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا۔ کہ یہ اب بھی ایسی ہے۔ جیسے پہلے تھی ٭ پانچ سال گزر گئے۔ اسکے بعد اُس مُلک پر بہت مُصیبت آئی۔ جیسی اپنے شہنشاہ کے بڑے وفادار تھے۔ اب وُہ بیمار پڑا تھا۔ اور لوگ کہتے تھے۔ کہ وُہ بسترِ مرگ پر ہے۔ کوئی ہی دم باقی ہے۔ اُنہوں نے اپنے لئے ایک نیا شہنشاہ چُن لیا تھا۔ گلیوں بازاروں میں ہجُوم کھڑا تھا۔ جو وزیرِ اعظم سے پُوچھ رہا تھا۔ کہ شہنشاہ کا مزاج کیسا ہے؟ وزیرِ اعظم جواب میں "پی پی" کر کے اور سر ہلا کر چلا گیا ٭ شہنشاہ اپنے بڑے سے شاہی بستر پر لیٹا تھا۔ اُس کا چہرہ زرد ہو چکا تھا۔ اور جسم ٹھنڈا اب ہر کوئی نئے بادشاہ کا خیر مقدم کرنے کے لئے تیز تیز قدم اُٹھاتا جا رہا تھا۔ نوکر دوڑتے پھرتے جھوٹی سچی افواہیں پھیلا رہے تھے۔ نچلی منزل میں خواتین کی خدمت گار عورتیں شاندار دعوتِ چاء اُڑا رہی تھیں۔ تمام راستوں پر کپڑا بچھا دیا گیا تھا۔ تاکہ قدموں کی آواز نہ سُنائی دے۔ سکوت ٹُوٹتا ہی نہیں تھا۔ ابھی شہنشاہ زندہ تھا۔ وُہ اُسی پلنگ پر زرد رُو اور ٹھنڈا ہو کر پڑا تھا۔ جسکے سامنے مخمل کے بھاری پردے اور پھندنے دیواروں پر لٹک رہے تھے۔ کھڑکی سے چاند اُسکے مُنہ اور سُنہری پرندہ پر چمک رہا تھا۔ شہنشاہ کی سانس بمُشکل چل رہی تھی۔ اُس نے محسُوس کیا۔ جیسے کوئی اُسکے سینے پر بیٹھا ہے اُسنے اپنی آنکھیں کھول لیں۔ اور دیکھا۔ کہ موت اُسکے سینے پہ بیٹھی ہے اُس نے اس کا عظیم الشان تاج پہن رکھا ہے۔ ایک ہاتھ میں شہنشاہ کا خنجر ہے۔ اور دُوسرے ہاتھ میں شہنشاہ کا وہ جھنڈا جسپر پھُول کڑھے تھے۔ اِرد گِرد کے پردوں سے رُوحیں جھانک رہی تھیں۔ بعضوں کے چہرے تو ڈراؤنے اور بھیانک تھے۔ اور بعضوں کے مُلائمت آمیز اور پُر شفقت۔ یہ شہنشاہ کے اچھے اور بُرے کام تھے۔ جو اُسوقت اُسکے سامنے کھڑے تھے۔ جبکہ موت ایک بھاری بوجھ کی طرح اُسکے سینے پر سوار تھی ٭ یکے بعد دیگرے ہر رُوح پکار اُٹھی "میں تُمہیں یاد ہُوں۔ میں تمھیں یاد ہوُں" جب وُہ یہ سوال کر رہی تھیں شہنشاہ کے ماتھے پر ٹھنڈا پسینہ آ رہا تھا ٭ شہنشاہ چلا اُٹھا "موسیقی، موسیقی! ڈھول بجاؤ۔ اور گیت گاؤ۔ تاکہ شور کے سیلاب میں یہ خوفناک آوازیں ڈوب جائیں" [illegible] موسیقی!

موسیقی! شہنشاہ نے چلاّ کر کہا۔ "او سنہری پرند۔ اب تو مجھے اپنے گیت سنا۔ میں نے تجھے موتیوں اور تحائف سے لاد دیا ہے۔ میں نے اپنا سنہری سلیپر تیرے گلے میں ڈال دیا ہے۔ اب مجھے تو گیت سنا"۔

لیکن پرند خاموش تھا۔ یہاں کوئی آدمی نہ تھا۔ جو اسے کوک دے۔ اور کوک کے بغیر یہ بلبل گیت نہیں گا سکتی تھی۔ موت نے اپنی کھوکھلی آنکھیں شہنشاہ کے چہرے پر گاڑ رکھیں۔ بھیانک اور خاموش فضا میں۔

یکایک کھلی کھڑکی سے شیرین نغمات کا ایک سیلاب ہوا کے خوشگوار جھونکوں کے ساتھ اندر آ داخل ہوا۔ اصلی بلبل ایک درخت کی شاخ پہ بیٹھی گا رہی تھی۔ اس نے شہنشاہ کی آواز سن پائی تھی۔ اور اسے امید اور تسلی کے گیت سنانے آئی تھی۔ جونہی اس کے گیت سنائی دیئے۔ بدروحیں غائب ہو گئیں۔ اور شہنشاہ کے کمزور اعضا میں خون تیزی کے ساتھ گردش کرنے لگا۔ خود موت بھی یہ گیت توجہ سے سننے لگی۔ اور کہنے لگی۔ "گاتی جا۔ گاتی جا او بلبل گاتی جا"۔

"کیا تم مجھے یہ خوبصورت خنجر۔ ریشمی جھنڈا اور شہنشاہ کا تاج دے دو گی"؟

موت نے ہر گیت کے عوض اسے ایک ایک کر کے یہ سب کچھ لوٹا دیا۔ اور بلبل گیت گاتی رہی۔ اس نے خاموش قبرستان کا گیت سنایا۔ جہاں سفید پھول اگے تھے۔ جہاں لالے کے پھول بہار دکھا رہے تھے۔ اور جہاں گھاس نوحہ گروں کے آنسوؤں سے شبنم آلود ہو رہی تھی۔ موت کے دل میں اپنے پرسکون باغ کو جانے کی بے انتہا خواہش پیدا ہونے لگی۔ اور وہ کھلی کھڑکی سے سفید و سرد دھند کی طرح ہوا میں تیرتی ہوئی باہر نکل گئی۔

"باغ بہشت کے پرند! میں تیرا بہت ممنون ہوں"۔ شہنشاہ نے چلاّ کر کہا۔ "اب میں تیری قدر و قیمت سمجھا ہوں۔ میں نے تجھے جلاوطن کیا۔ اور تو نے اس کے عوض میرے بستر سے بدروحوں کو بھگایا۔ اور موت کو میرے دل سے۔ میں کس طرح اس کا بدلہ اتار سکتا ہوں"؟

بلبل نے کہا۔ "مجھے اپنی خدمات کا بدلہ مل چکا ہے۔ جب میں نے پہلے پہل گیت سنایا۔ تمہاری آنکھوں میں آنسو نکل آئے میں کبھی ان آنسوؤں کو نہیں بھولوں گی۔ ایک مغنیہ کے دل میں ایسے آنسوؤں کی قدر لعل و جواہر سے زیادہ ہے۔ لیکن اب سو جاؤ۔ تاکہ تم ذرا اچھے ہو جاؤ۔ اور تم میں طاقت آ جائے۔ میں تمہیں ایک لوری سناتی ہوں"

بلبل گاتی رہی۔ اور شہنشاہ میٹھی صحت بخش اور سرور انگیز نیند سو گیا۔ جب وہ بیدار ہوا۔ تو سورج اس کی کھڑکی پہ چمک رہا تھا۔ اس کے بدن میں طاقت آ چکی تھی۔ ابھی تک اس کا کوئی نوکر واپس نہیں آیا تھا۔ کیونکہ وہ اسے مردہ خیال کر چکے تھے۔ لیکن بلبل ابھی وہیں بیٹھی گا رہی تھی۔

شہنشاہ نے کہا۔ "اب مجھے چھوڑ کر چلی نہ جانا"۔ اب اپنی ہی مرضی کے مطابق گیت گایا کرنا۔ میں سنہری پرند کے ہزار ہا ٹکڑے کر دوں گا"۔

"نہیں نہیں ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔ اُس نے تمہیں اُسوقت تک کام دیا۔ جب تک یہ دے سکتا تھا۔ ابھی اسے یہیں رکھو۔ میں محل میں اپنا گھونسلہ نہیں بنا سکتی۔ شام کو میں اُس ٹہنی پر آبیٹھا کرونگی۔ یہانتک کہ تم مسرت فزا خیالات میں کھو جایا کروگے۔ میں تمہارے اچھے اور بُرے اعمال کے متعلق جن کی اچھائی اور بُرائی کا تمہیں احساس نہیں گیت گایا کرونگی۔ مجھ ننھے سے پرند کو گیت گاتے ہوئے دُور اور نزدیک جانا پڑتا ہے۔ محل سے دُور غریب ماہی گیر کی جھونپڑی تک۔ تمہارے تاج کی بجائے تمہارے دل کی میرے دل میں زیادہ عزت ہے۔ اگرچہ اپنی جگہ اس تاج کی شانِ تقدس بھی ضرور ہے۔ میں آکر تمہیں ضرور گیت سُنایا کرونگی۔ بشرطیکہ تم مجھ سے ایک وعدہ کرو" +

"ایک وعدہ؟ نہیں تم مجھ سے ہزاروں وعدے لے سکتی ہو"...... شہنشاہ شاہی لباس پہنے کھڑا تھا۔ اپنی سنہری وزنی تلوار اُسکے ہاتھ میں تھی +

بُلبل نے کہا "صرف ایک وعدہ چاہتی ہوں۔ وہ یہ کہ کسی کو نہ بتانا۔ ایک چھوٹی سی چڑیا تمہیں ہر بات بتادیتی ہے۔ یہ کوئی اتنی اچھی بات نہیں"........ یہ کہکر بُلبل اُڑ گئی۔ بادشاہ کے خدمت گار اندر آئے۔ تاکہ شہنشاہ کی لاش پر ایک نگاہ ڈالیں۔ وہ حیران و ششدر ہو کر بُت بنے کھڑے تھے۔ شہنشاہ نے انہیں دیکھکر کہا "آداب! تسلیمات"! +

نغمۂ مسرت

گائے جا میری رُوح! نغمۂ مسرت گائے جا! ایسا نغمہ جو مسرور طیور گاتے ہیں..... "قوسِ قزح" کی حسین کمان تلے۔ موسمِ بہار کے آغاز میں + موت کا تصور نہ کر۔ اپنے عہدِ شباب میں تو کیوں اِس ظالم سے ڈرتا ہے؟ اس سے پیری میں بھی خوف نہ کھا۔ خواہ وہ تیرے کس قدر نزدیک ہو + زر و مال کا لالچ نہ کر۔ حرص و ہوا سے دُور رہ۔ حریص اپنا غریبوں سے موازنہ نہیں کرتے۔ وہ امیروں سے اپنا معیار دیکھتے ہیں۔ اس لئے ہمیشہ غریب رہتے ہیں + اپنے دماغ کو تربیت دے قناعت کی۔ پاکیزہ خیالات کو دماغ میں جگہ دے + گائے جا 'نغمۂ مسرت' اے میری رُوح! گائے جا! ایسا نغمہ جو ایک چشمہ گاتا ہے جنگل میں تمام رات آسمان تلے۔ تاروں کی لطیف چھاؤں میں +

کوئی پوچھے دلِ دردآشنا سے ۱ تڑپنا بلبلانا بے کسوں کا

ٹھہر جا اے شررِ ہم بھی تو آخر مٹنے والے ہیں ۲ نہیں بے گانگی اچھی رفیقِ راہِ منزل سے

سادگی گہنا ہے اس بن کیلئے ۳ ہے جوانی خود جوانی کا سنگھار

مجھے دل تو میں دل کو سمجھا رہا ہوں ۴ عجب کشمکش میں مزا پا رہا ہوں

دلچسپ دھوکا

زبانِ شعر میں شبنم کو چاندی کہہ تو سکتے ہیں مگر شاعر کے کہنے سے وہ چاندی ہو نہیں سکتی
کہا جاتا ہے پتّی دھو رہی ہے مُنہ کو شبنم سے مگر خود کوئی پتّی اپنے مُنہ کو دھو نہیں سکتی
کہا جاتا ہے لالہ کے جگر پر داغِ فرقت ہیں مگر لالہ کو احساسِ جدائی ہو نہیں سکتا
کہا جاتا ہے بادل رو رہا ہے یادِ جاناں میں مگر بادل برس سکتا ہے لیکن رو نہیں سکتا"
حقائق کا یہی ہے حال اے ہمراز دُنیا میں زمانہ بہہ رہا ہے جہل و نادانی کے دریا میں
وہ کچھ پرچھائیاں سی ہیں تجلّی نام ہے جن کا وہ ہیں بے تابیاں دل کی تسلّی نام ہے جن کا
وہ ہیں الفاظ کے دھوکے حقائق جنکو کہتے ہیں جہاں کے اہلِ دانش جہل کی بستی میں رہتے ہیں
یہ سارے استعارے اور یہ رنگین تشبیہیں نتیجے فکرِ انسانی کے اور پھر انکی توجیہیں
یہ افسانے ہیں افسانے یہ سب کہنے کی باتیں ہیں زمانہ جن کو دن سمجھا ہے وہ تاریک راتیں ہیں
حقیقت کو کوئی سمجھا نہ اشراقی نہ مشّائی یہاں مجروح ہو کر رہ گیا وجدانِ سینائی

زمانہ کرمکِ شب تاب کو فانوس سمجھا ہے
حقیقت کا تصوّر بھی بڑا دلچسپ دھوکا ہے

میری نظروں سے جو تُو دیکھ لے جلوے اپنے اپنی تصویر کا خود آپ ہی دیوانہ بنے
دیر و حرم سے منزلِ جاناں میں آ پہنچے پرستش کر کے بیٹھ گئے ... میں پہنچ کے ہم

کیا بڑے آدمی "بدخط" ہوتے ہیں؟

چند مشہور ہستیوں کے دلچسپ کارنامے

اکثر بڑے لوگوں کا خط خراب ہوتا ہے۔ گو ہر بدخط آدمی بڑا آدمی نہیں ہوتا۔ سائنسدانوں اور اہل قلم حضرات میں بالخصوص بدخطی عام طور پر پائی جاتی ہے۔ اور دُنیا کے مختلف ممالک میں بہت سے بڑے آدمی بدخط ہوئے ہیں۔ اِس کی بڑی وجہ یہ ہے۔ کہ اکثر بڑے لوگ تعلیم میں اِتنے بڑے نہیں ہوتے جتنا کہ ذہانت میں۔ ذہانت اُنہیں ترقی کے رستہ پر ڈال دیتی ہے لیکن عمدہ تعلیم نہ ہونے کے باعث اُن کا خط اور املا و انشاء خراب رہتے ہیں۔ انگلستان میں بھی بڑے لوگوں کے خط خراب ہوتے ہیں۔ بعضوں کے خط تو پڑھے نہیں جاتے۔ یونانی زبان لکھنے سے انگریزی کا خط عام طور پر خراب ہو جاتا ہے۔ ٹائپ رائٹر کی ایجاد سے خط کی مشکلات بڑی حد تک حل ہو گئی ہیں۔ اور اب چھپی ہوئی کتابوں میں طباعت کی اِتنی غلطیاں نہیں ہوتیں۔ جسقدر پہلے ہوتی تھیں۔ انگلستان کے ایک مشہور عام اخبار کے ایڈیٹر "ہوریس گریلی" ایک بے مثال جرنلسٹ گزرے ہیں۔ اُن کا خط اِنتہائی خراب تھا۔ اور بعض دفعہ تو وُہ سمجھ میں بھی نہیں آتا تھا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ کہ اُنہوں نے ایک پیراگراف لکھ کر کمپوزیٹر کو دیا۔ کسی کمپوزیٹر کی سمجھ میں نہیں آیا۔ کہ اُنہوں نے کیا جھک مارا تھا۔ پروف ریڈروں نے سر کھپایا۔ دو چار سب ایڈیٹروں نے مغز مارا۔ مگر کسی کی سمجھ میں نہ آیا۔ آخر کار ایک ستم ظریف اُسے ایک دوا فروش کی دوکان پر لے گیا۔ کہ جناب یہ دوا دے دیجئے۔ دوا فروش نے اُسے اوپر سے نیچے تک ...... دائیں سے بائیں ...... تک پڑھا۔ مگر اُسکی سمجھ میں نہ آیا۔ جھلا کر اُسے پردے کے پیچھے لے گیا۔ اور تنہائی میں اُس پر خوب غور کیا۔ مگر اُس کا کچھ سر پیر نہ معلوم ہوا۔ آخر کار ایک بوتل دوا کی اُٹھا کر باہر لایا۔ اور یہ کہا۔ کہ میں نے اِس نسخہ کو نقل کر لیا۔ بڑی عمدہ طاقت کی دوائی ہے۔ "لارڈ بروہیم" کے بارے میں سُنا گیا ہے۔ کہ اُن کے تین خط تھے۔ ایک خط تو سوائے اُن کے خاص مُنشی کے دُوسرا کوئی نہیں پڑھ سکتا تھا۔ ایک خط ایسا لکھتے تھے۔ کہ اُسے سوائے اُن کے اور کوئی نہیں پڑھ سکتا تھا۔ ایک اور خط تھا اُن کا جسے دُنیا بھر میں کوئی متنفس نہیں پڑھ سکتا تھا۔ خود بھی وُہ لکھنے کے بعد اُس کا سر پیر معلوم نہیں کر سکتے تھے۔ امریکہ کے ایک کروڑپتی کا ذکر ہے۔ کہ اُس کی ایک ریاست میں ریل گاڑیاں چلتی تھیں اور سینکڑوں ہزاروں آدمی اُس کے ہاں ملازم تھے۔ اُسکے ایک ملازم نے درخواست بھیجی۔ کہ مجھے ایک مُفت پاس ریلوے سفر کا مِل جائے۔ اُس ریلوے کے مالک نے جو جواب لکھا۔ اُس میں یہ ذکر تھا۔ کہ "عدم گنجائش کے باعث ریلوے کا مُفت پاس [illegible] چِٹھی اُس ملازم کے پاس پہنچی۔ تو اُس

نے دیکھا۔ کہ اُس کا سر پیر کچھ نہیں ہے۔ البتہ حاکمِ اعلیٰ کے دستخط تو اِسقدر عام تھے۔ کہ اُس نے فوراً پہچان لیا۔ اور یہ سمجھا۔ کہ مجھے ریلوے کا مفت پاس جسکی درخواست کی تھی۔ مل گیا ہے۔ یہ شخص تقریباً ایک سال تک اُس خط کو دِکھا کر ریل میں مفت سفر کرتا رہا۔ کوئی آدمی ایسا نہ ملا۔ جو اُس خط کو پڑھ کر اُس شخص کے بیان کو جھٹلا سکتا۔ دستخط بیشک ہر ایک پہچان لیتا تھا۔ اور یہ سمجھتا تھا۔ کہ حاکم نے لکھا ہے۔ اور پاس تسلیم کیا جاتا رہا ۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ مشہور ہے۔ کہ ایک مشہور اخبار کے ایڈیٹر کے پاس کوئی عورت روزانہ کچھ اشعار لکھ کر چھپنے کے لئے بھیجی رہتی تھی۔ جو بالکل لغو ہوتے تھے۔ اور اشاعت کے لئے ناقابل۔ آخر ایک روز تنگ آکر اُس نے ایک خط اُس عورت کے نام لکھا۔ کہ تم شعر گوئی کے لئے قطعی ناموزون ہو۔ اِس سے باز آؤ۔ تمہیں کہیں ماماگیری یا کپڑے دھونے وغیرہ کا کام کرنا چاہئے۔ شعر گوئی بہت اُونچی چیز ہے جب یہ خط اُس لڑکی کے گھر پہونچا۔ تو اُس کے باپ اور بھائیوں اور تین چچا زاد بھائیوں نے مل کر اُس کو پڑھنے کی کوشش کی۔ لیکن خط اِسقدر خراب تھا۔ کہ پڑھا ہی نہیں گیا۔ البتہ سب کی رائے یہ ہوئی۔ کہ لکھنے والا ہماری لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے چنانچہ ایڈیٹر صاحب کو اطلاع دے دی گئی۔ کہ "آپ کا پیغام شادی منظور ہے"۔ یہ لڑکی معمولی اور پست درجہ کی لڑکیوں میں سے تھی۔ ایڈیٹر صاحب سخت پریشان ہوئے۔ کہ اب کیا کریں لیکن بدنامی اور خرچے کے خوف سے چپ چاپ اُس سے زبردستی شادی کرنی پڑی۔ مگر خدا کا شکر ہے۔ کہ اُس نے بیوی بن کر ایڈیٹر کو مایوس نہ کیا۔ اور شعر گوئی چھوڑ دی ۔

ہندوستان کا بادشاہ اکبر اعظم بھی لکھنا پڑھنا نہیں جانتا تھا۔ اور صرف خراب خط میں اکبر لکھ سکتا تھا۔ مہاراجہ سیوا جی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ۔ حیدر علی اور کئی حکمران لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ مگر قدرت نے عقل و فراست اور علم و حکمت کی دولت اُنہیں اِسقدر دی تھی۔ کہ بڑے بڑے عقلمند اور منشی و دبیر و خطاط اُن کے آگے سرنگوں رہتے تھے ۔ ہندوستان کے حکیموں میں بھی بے نقط شکستہ تحریر کا رواج ہے۔ جسے رواجاً اچھا سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ عمدہ خط میں نسخہ لکھنا طبیب کی کسرِ شان سمجھی جاتی ہے ۔

شباب جلوۂ حسنِ ازل کی مستیاں توبہ   مجھے تو آجتک دُنیا جواں معلوم ہوتی ہے

تمناؤں میں اُلجھایا گیا ہوں   کھلونے دیکے بہلایا گیا ہوں

شیخ حرم کی بندگی شاہدِ دلنواز ہے   مجھ کو کرم نواز کے لطف و کرم پہ ناز ہے

سُنتا ہوں بڑے غور سے افسانۂ ہستی   کچھ اصل ہے کچھ نقل کچھ انداز ادا ہے

موسیقی

مغربی ادیبوں کی نظر میں

موسیقی کو اگر غور سے دیکھا جائے۔ تو وہ ایک اخلاقی قانون ہے۔ اس سے تمام کائنات میں رُوح پڑ جاتی ہے دل میں پر لگ جاتے ہیں۔ خیالات میں قوّتِ پرواز پیدا ہو جاتی ہے۔ غم دُور ہو کر خوشی پیدا ہوتی ہے۔ الغرض اس سے ہر چیز میں جان پڑ جاتی ہے ۔ (افلاطون)

موسیقی خدا کا ایک اعلیٰ درجہ کا انعام ہے۔ پس مجھ کو اگر کوئی شخص تمام دُنیا کی نعمتیں دینے کا وعدہ کرے اور یہ کہے کہ موسیقی کا شوق چھوڑ دو۔ تو میں اسے ہرگز منظور نہ کروں ۔ (لوتھر)

موسیقی کا اثر رُوح پر ہوتا ہے۔ اس سے رُوح میں بالیدگی اور پاکیزگی پیدا ہو جاتی ہے۔ راگ سے انسان کے دل میں نہایت شریفانہ خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ اور عُمدہ کاموں کی ترغیب ہوتی ہے جن لوگوں کا دل مُنتشر ہو۔ ان کو راگ سے ہر طرح تسکین ہو جاتی ہے۔ اور کلفت کا نام باقی نہیں رہتا ۔

موسیقی سے ہمیں ایک نئی زندگی حاصل ہوتی ہے لیکن کسی شخص میں اس بات کا نہ ہونا بالکل نابینا ہونیکے برابر ہے۔ موسیقی حقیقت میں رُوح کی زبان ہے لیکن وہ ترجمہ کرنا پسند نہیں کرتی ۔ (میکس مُولر)

موسیقی مجھ میں رُوح پھونکتی ہے۔ میرے خیالات کو مجتمع کرتی ہے۔ میرے کانوں کو بھلی معلوم ہوتی ہے۔ میرے دل میں حوصلہ پیدا کرتی ہے۔ اور اسطرح نہ صرف مجھ کو آیندہ کاموں کے قابل بناتی ہے۔ بلکہ موجودہ وقت بھی میرے دل کو پاک اور مُنوّر خیالات سے مُنوّر کرتی ہے۔ جسوقت راگ مجھ کو زیادہ اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اُسوقت عام طور پر راستبازی اور سچائی میرے دلمیں موجزن ہوتی ہے ۔ (بشپ ہورج)

موسیقی سے دل کو فرحت اور خوشی حاصل ہوتی ہے۔ اگر کسی راگ سے عُمدہ خیالات پیدا ہوں تو اُس کو اچھا کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر اس کے کسی حصّہ سے رنجیدگی پیدا ہو۔ تو اُس کو بُرا سمجھنا چاہئے ۔ (جانسن)

موسیقی کا فن خدا نے ہمیں ایسا عطا کیا ہے جس سے دُنیا کی تمام قوّتیں نہایت خوبی کے ساتھ ایک ہی وقت میں مُتفقہ طور پر دُعاؤں کو ادا کر سکتی ہیں ۔ (ریلوی)

موسیقی جسقدر زیادہ سادہ ہوگی۔ اسی قدر دل پر اُس کا اثر بھی زیادہ ہوگا ۔ (سٹفورڈ)

نمودِ جلوۂ بیرنگ سے ہوش اِس قدر گُم ہیں
کہ پہچانی ہوئی صُورت بھی پہچانی نہیں جاتی

ہیں۔ اِس گھر کی دیواروں پر مُنقش اینٹوں سے نقاشی کے طور پر بہت سی دِلکش تصویریں کھودی ہوئی ہیں۔ اور اُن سب تصویروں میں سے ایک ایسی ہے۔ جو مقدونیہ کے بادشاہ سکندر اعظم اور ایران کے تیسرے بادشاہ "دارا" کی جنگ ایسوسی (۳۳۳ قبل مسیح) کا نقشہ پیش کرتی ہے۔ یہ تھوڑا عرصہ بعد کندہ ہوئی ہے۔ اور اُس کی تمام چھوٹی چھوٹی چیزیں مثلاً گھوڑوں کے ساز۔ لڑائی کے اسباب اور ہتھیار وغیرہ بالکل واقع کے مُطابق ہیں۔ پتھر کے تختے کے بائیں طرف سکندر اپنی فوج کے درمیان گھوڑے پر سوار ہے اور دائیں طرف سکندر کے روبرو "دارا" شاہِ ایران ایک جنگلی پہاڑی کے سامنے کھڑا ہے۔ اور وُہ ایرانی لشکر کے درمیان ہے۔ جو سکندر اعظم کے لشکر کی بھیڑ سے بھاگنا چاہتا ہے۔ "دارا" کے پیچھے ایک سوار کاویانی جھنڈا ہاتھ میں لئے کھڑا ہے۔ افسوس ہے کہ تصویر کے خصوصاً اُس حصہ پر دراڑ پڑ گئی ہے۔ جس کے باعث جھنڈے کا پتھر اچھی طرح ظاہر نہیں ہوتا۔ لیکن اِس کے باوجود جھنڈے کے اُوپر کا حصہ اور نیزے کی نوک جو اُس سے ملی ہوئی ہے۔ اور اسی طرح سجاوٹ کے لئے لٹکاتے ہوئے پھریروں کا حصہ بھی بخوبی واضح ہے۔ ایک انگریز مُصنف "لارڈ ملن" نے "پومپیائی کے آخری دن" "LAST DAYS OF POMPIAI" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ جو پڑھنے کے قابل ہے۔ کیونکہ مُصنف نے بہت محنت سے کوشش کی ہے۔ کہ اُس زمانے کی تمام معاشرتی زندگی کے متعلق دلچسپ معلومات اور موجودہ تاریخوں اور تحقیقات سے نقشہ کھینچکر رکھ دے۔ اور حقیقت یہ ہے۔ کہ وُہ اِس کام سے اچھی طرح عہدہ برآ ہوا ہے۔

خموشی سے مُصیبت اور بھی سنگین ہوتی ہے ۔۔۔ تڑپ اے دل تڑپنے سے ذرا تسکین ہوتی ہے

اے جوشِ جنون بیکار نہ رہ کچھ خاک اُڑا ویرانے کی ۔۔۔ دیوانہ تو بننا مُشکل ہے صُورت ہی بنے دیوانے کی

جی ڈُوب گیا جب یہ حقیقت ہوئی ظاہر ۔۔۔ جس بحر میں کشتی ہے وُہ ساحل نہیں رکھتا

کشتی کے ٹُوٹنے سے مَیں کیوں دِلکو توڑ لوں ۔۔۔ اب ناخدا نہیں تو خُدا کارساز ہے

دمِ پیری ہر اک شے ناتواں معلُوم ہوتی ہے ۔۔۔ مگر حسرت جوانی کی جواں معلُوم ہوتی ہے

جل بجھا وُہ شمع پر مَیں مر مِٹا اِس رشک سے ۔۔۔ موت پروانے کی تھی یا موت کا پروانہ تھا

نہائت اہم اعداد و شمار

دُنیا کے بڑے بڑے شہر اور اُن کی آبادی

شہر کا نام	مُلک	آبادی	شہر کا نام	مُلک	آبادی
لنڈن	برطانیہ	۷۷۴۶۲۱۶	پیکن	چین	۱۲۹۷۷۱۹
نیویارک	جمہوریہ متحدہ امریکہ	۶۹۳۰۴۴۶	سڈنی	آسٹریلیا	۱۲۶۲۴۴۰
ٹوکیو	جاپان	۵۳۱۱ ۰۰	لاس انجلس	امریکہ	۱۲۳۸۰۴۸
برلن	جرمنی	۴۲۸۸۳۱۴	وارسا	پولینڈ	۱۱۷۸۲۱۱
پیرس	فرانس	۳۷۷۳ ۰۰	بمبئی	ہندوستان	۱۱۶۸۳۳۸
شکاگو	امریکہ	۳۳۷۶۴۳۸	ریو دی جنیرو	برازیل	۱۱۵۷۸۷۳
ماسکو	رُوس	۲۷۸۱۳۰۰	گلاسکو	اسکاٹ لینڈ	۱۰۸۸۴۱۷
اوساکا	جاپان	۲۴۵۳۵۷۳	ہمبرگ	جرمنی	۱۰۷۹۰۹۲
لینن گراڈ	رُوس	۲۲ ۲۸۳۰۰	ہانگ کانگ	چین	۱۰۷۵۶۹۰
بوینس آئرس	ارجن ٹائن	۲۲۱۴۷۰۰	قاہرہ	مصر	۱۰۷۴۵۶۷
فیلاڈلفیا	امریکہ	۱۹۵۰۹۶۱	ملبورن	آسٹریلیا	۱۰۲۸۰۰۰
وی آنا	آسٹریا	۱۸۶۸۳۲۸	روما	اطالیہ (اٹلی)	۱۰۰۸۰۸۳
ڈی ٹرائٹ	جمہوریہ متعلقہ امریکہ	۱۵۶۸۶۶۲	بڈاپسٹ	ہنگری	۱۰۰۶۱۷۰
شنگھائی	چین	۱۵۳۹۰۰۰	برمنگھم	برطانیہ	۱۰۰۲۷۱۳
ہانکاؤ	چین	۱۵۰۰۰۰۰	ھانچاؤ	چین	۱۰۰۰۰۰۰
کلکتہ	ہندوستان	۱۴۸۵۵۸۲	استنبول	ترکیہ	۱۰۰۰۰۰۰

دُنیا کی بڑی بڑی بندرگاہیں

بندرگاہ	مُلک	وزن	بندرگاہ	مُلک	وزن
نیویارک	امریکہ	۲۶۶۴۷۰۰۰ ٹن وزن	مارسیلز	فرانسہ	۱۳۵۸۳۰۰۰ ٹن وزن
لنڈن	برطانیہ	۲۰۱۴۳۰۰۰ " "	لورپول	برطانیہ	۱۳۰۳۵۰۰۰ " "
ہمبرگ	جرمنی	۱۸۲۵۳۰۰۰ " "	کوبی	جاپان	۱۱۹۸۷۰۰۰ " "
انٹ ورپ	بلجیم	۱۶۹۱۵۰۰۰ " "	جنیوا	اطالیہ	۹۶۷۶۰۰۰ " "
واٹرڈ[illegible]	[illegible]	[illegible]			

جدید معلومات

سردی سے جسم کیوں لرزتا ہے؟ یہ ایک مسلمہ اصول ہے۔ کہ سردی پاکر چیزیں سکڑتی ہیں۔ اور گرمی سے پھیلتی ہیں۔ سوائے پانی کے کہ وہ سردی سے بھی پھیلتا ہے۔ اور گرمی سے بھی۔ جسوقت ہمیں شدید سردی محسوس ہوتی ہے۔ تو ہمارا جسم اینٹھ جاتا ہے۔ اور اسکے ساتھ تمام عضلات و اعصاب بھی متشنج ہوجاتے ہیں۔ لیکن چونکہ جسم زندہ ہے۔ اور خون پوری طاقت سے گردش کر رہا ہے۔ اِس لئے خون کی حرارت سے اعصاب گرم ہوکر پہلی حالت پر آنا چاہتے ہیں۔ اب وہ کبھی تو اندرونی حرارت کی وجہ سے کھلتے ہیں۔ اور کبھی باہر کی سردی سے سکڑتے ہیں۔ اور یہ عمل اتنی جلدی ہوتا ہے کہ جسم لرزنے لگتا ہے۔ لیکن بیرونی سردی غالب آجائے۔ تو پھر جسم بالکل اینٹھ کر بے حس و حرکت ہوجاتا ہے ✦

موسیقی اور امراض کہنہ۔ ایک ماہر موسیقی کا بیان ہے۔ کہ "آجکل ہندوستان کے مردوں میں عموماً اور خواتین میں خصوصاً کھانسی اور پھیپھڑوں کی کمزوری کے امراض اکثر پائے جاتے ہیں۔ جو اکثر مہلک ثابت ہوتے ہیں۔ اور بعض صورتوں میں موروثی ہوکر پورے خاندان کو تباہ کر دیتے ہیں۔ پھیپھڑوں کی کمزوری کے لئے "سا۔ رے۔ گا۔ ما" کی آواز نکالنے سے بیحد فائدہ ہوتا ہے۔ اِس قدر فائدہ ایک سو من مچھلی کے تیل پینے سے بھی نہیں ہوسکتا۔ علم موسیقی سے صرف تفریح ہی نہیں ہوتی۔ بلکہ صحت پر بھی اِس کا خاطر خواہ اثر پڑتا ہے نیز پھیپھڑوں کی ورزش کے لئے **نغمہ** جو کام کرتا ہے۔ وہ اکھاڑہ بھی نہیں کرسکتا۔ انسانی صحت کے لئے گانا ازبس ضروری ہے ✦

افریقہ میں ہاتھیوں کا قتل عام۔ افریقہ میں ہر سال ۳۶ ہزار ۵ سو ہاتھی ہلاک کئے جاتے ہیں۔ اگر ہلاکت کی اِس رفتار کو نہ روکا گیا۔ تو وہ زمانہ دور نہیں۔ جب ہاتھی صفحہ ہستی سے مٹ جائینگے۔ اور ان کا نام و نشان تک نہیں رہیگا۔ ہاتھیوں کی زندگی کا خاتمہ صرف ہاتھی دانت حاصل کرنیکی غرض سے کیا جاتا ہے۔ کیونکہ جو چیزیں ہاتھی دانت سے تیار کی جاتی ہیں۔ وہ گراں قیمت پر بکتی ہیں۔ یہ اشیا ایسی نفیس اور دلپسند ہوتی ہیں۔ کہ تہذیب انسانی ہاتھیوں کے قتل عام کو جائز سمجھتی ہے۔ حالانکہ لندن میں ایک ایسی انجمن بھی موجود ہے۔ جو جنگل کے جانوروں کی حفاظت کے لئے قائم کیگئی ہے ✦

کوئلہ سے تیل نکالا جائیگا۔ "ہیڈنسبرگ" (جرمنی) یونیورسٹی کے ڈاکٹر فریڈرک برجیس" نے ایک ایسی ترکیب ایجاد کی ہے۔ جس کی بدولت کوئلہ سے تیل نکالا جاتا ہے۔ جو جلانے کے کام آتا ہے۔ ترکیب یہ ہے۔ کہ کوئلے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کسی تیل ... [illegible] ... خاص

مستین میں فارن ہیٹ کے آٹھ سو درجے تک حرارت پہونچائی جاتی ہے۔ اِس عمل سے کاربن کا بہت سا حصہ ہائیڈروجن کے ساتھ مل جاتا ہے۔ اور اُس سے جو رقیق اور ٹھوس کمپاؤنڈ بن جاتے ہیں۔ اُن سے ایسا تیل بنایا جاتا ہے۔ جو ایندھن کا کام دیتا ہے ٭

زمین بال بال بچ گئی۔ حال ہی میں زمین ایک بہت بڑے شہاب ثاقب کے تصادم سے بچی ہے۔ اِس سے پہلے بھی مختصر طور پر اِس واقعہ کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ مگر اَب اِس کی تفصیلات موصول ہوئی تھیں۔ جن سے معلوم ہوا۔ کہ اِس شہاب ثاقب کا قطر دو میل اور وزن دس لاکھ ٹن تھا۔ یہ آسمان سے ٹوٹ کر ستر ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے نیچے آرہا تھا۔ لیکن خوش قسمتی سے جب زمین صرف چار لاکھ میل دُور رہ گئی۔ تو یہ اپنے راستہ سے ہٹ گیا۔ چونکہ ماہرینِ افلاک کے نزدیک چار لاکھ میل صرف چند انچوں کے برابر ہیں۔ اِسلئے کہا جاسکتا ہے۔ کہ زمین ایک بڑے تصادم سے بال بال بچی ہے ٭ "اگر یہ شہاب ثاقب زمین پر آگرتا۔ تو کیا ہوتا؟" اندازہ لگایا گیا ہے۔ کہ اس کے گرنے سے زمین میں ایک پچاس میل گہرا گڑھا پڑ جاتا۔ اور اِس قدر تمازت اور حرارت پیدا ہوتی۔ کہ ارد گرد دو سو میل تک تمام چیزیں جُھلس جاتیں۔ پھر ہوا میں اِس قدر زبردست لہریں پیدا ہوجاتیں۔ کہ ہزاروں میل تک ہر چیز ہوا میں اُڑتی پھرتی نظر آتی۔ اور کئی لاکھ جانیں تلف ہوجاتیں۔ اسکے علاوہ ایک ہولناک زلزلہ آتا۔ اور سمندر میں ایک خوفناک طوفان برپا ہوجاتا۔ الغرض اِس شہاب ثاقب کے گرنے سے زمین پر قیامتِ صُغریٰ سے کم نظارہ نہ ہوتا ٭ چونکہ ہماری زمین کا بیشتر حصہ پانی یا صحراؤں پر مشتمل ہے۔ اِس لئے سیارے کا آبادی پر گرنے کا بہت کم احتمال ہوتا ہے ٭ سب سے بڑا دھما کا آج سے تیس برس قبل ہُوا تھا۔ جو چالیس ہزار ٹن وزنی شہاب ثاقب کے صحرائے سائبیریا میں گرنے سے پیدا ہُوا۔ اُس سے اِرد گرد کے دس میل تک تمام زمین اُڑ گئی تھی۔ ۳۵ مربع میل کے حلقہ میں قریباً تین کروڑ درخت تباہ ہوگئے۔ اور ہواؤں کی لہریں واشنگٹن تک جا پہونچیں ٭ اِس سے بھی بڑا شہاب ثاقب ایک دفعہ "اری زونا" کے صحرا میں گرا تھا۔ یہ قبل از تاریخ کے زمانہ کا ذکر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اُس کا وزن ایک لاکھ ٹن تھا۔ جس جگہ یہ گرا تھا۔ وہاں آجتک میلوں میں لمبا اور چوڑا گڑھا نظر آتا ہے ٭

کیا ہم رات کی نسبت صُبح کو لمبے ہوتے ہیں؟ بظاہر یہ سوال بالکل مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اِس کی کچھ نہ کچھ اصلیت ضرور ہے۔ ہماری پُشت کے درمیانی حصّہ میں گردن سے لیکر کمر تک ایک اُستخوانی عمود ہے۔ جسے ریڑھ کہتے ہیں۔ یہ عمود بہت سی گول گول ہڈیوں سے بنا ہے۔ ان ہڈیوں کو "فقرات" کہتے ہیں۔ ہر دو فقرات کے درمیان ایک ایک لچکدار ہڈی ہوتی ہے۔ ان لچکدار ہڈیوں کا یہ فائدہ ہے۔ کہ جب ہماری کمر مُڑتی تُڑتی ہے۔ تو ریڑھ ٹوٹ نہیں جاتی۔ اگر یہ ہڈیاں موجود نہ ہوتیں۔ تو ہم اپنی کمر کو کبھی خمیدہ نہ کرسکتے۔ اگر خمیدہ کرنے کی کوشش بھی کرتے تو کوئی نہ کوئی فقرہ ٹوٹ جاتا۔ اور ہم ہمیشہ کے لیئے کُوزپشت ہوجاتے

صنعت و حرفت

لیمن گراس یعنی لیموں کی خوشبو والا گھاس

جو کہ سونا اُگلتا رہتا ہے

سیلون یعنی جزیرہ لنکا۔ برما اور ملک آسام میں نرسل (کانا جس کو پنجابی کہتے ہیں، کاہی کہ جس سے لکھنے کی قلم بنتی ہیں۔ پتلی قسم کا ایکھ یعنی گنا۔ اسی قسم کا "لیمن گراس" جنگلوں میں خود رو پیدا ہوتا ہے۔ جو کہ جھنڈ کی شکل میں ملتا ہے۔ اسکے پتے کاہی یا نرسل کی مانند۔ شاخیں گانٹھ دار لیکن بہت پتلی۔ بظاہر یہ آدم قد پتوں کا جھنڈ ہی دکھائی پڑتا ہے۔ اور اسمیں بظاہر کوئی خاص خصوصیت نظر نہیں آتی۔ بارہ ماہ یہ گھاس سرسبز رہتی ہے۔ اگر اس کے سبز پتوں کو انگلیوں سے مل کر سونگھا جائے۔ تو تیز لیموں جیسی خوشبو آتی ہے۔ اور اسی لئے اس گھاس کا نام بھی لیمن گراس پڑ گیا ہے۔ جس زمین میں ایکھ یعنی گنا۔ نرسل۔ کاہی پیدا ہو سکتی ہے۔ وہاں لیمن گراس بھی لگ سکتی ہے۔ اس گھاس کا بیج نہیں ہوتا۔ اس کی بیشمار جڑیں بنتی رہتی ہیں۔ اس کی سبز جڑوں کو زمین میں گاڑ دینے سے یہ جھنڈ دار گھاس بکثرت پیدا ہونے لگتی ہے لاہور کے "لارنس گارڈن" کے اندر جو "بوٹانیکل گارڈن" کے نام سے حصہ مخصوص ہے۔ یہاں ایک قطعہ زمین میں یہ گھاس لگا ہوا ہے۔ اور گذشتہ دس سال سے میں اس کو سرسبز دیکھ رہا ہوں۔ لنکا اور آسام میں تو میں نے اس گھاس کے میلوں تک گھنے جنگل دیکھے ہیں۔ پنجاب اور یو۔ پی کے کئی باغوں میں بھی اسکو دیکھا ہے۔ اور پنجاب کے جنگلوں میں بھی۔ انگریزی میں اس گھاس کا دوسرا نام "سیٹرونیلا گراس" بھی ہے جزیرہ لنکا میں انگریزوں کی ایک کمپنی ہے۔ جو کہ اس گھاس کو کشید کر کے "سیٹرونیلا گراس آئیل" یعنی "سیٹرونیلا گھاس" کا تیل تیار کرتی ہے۔ اور دُنیا کے تمام ملکوں میں اس تیل کی ہر سال لاکھوں روپوں کی تجارت کرتی ہے۔ اس تیل میں لیموں کے چھلکوں کی نہایت تیز خوشبو ہوتی ہے۔ اس لئے تل کے تیل میں "سیٹرونیلا تیل" ملا کر سر لگانے کا خوشبودار تیل تیار ہوتا ہے۔ اس تیل کو "رکٹی فائیڈ سپرٹ" میں حل کر کے سوڈا واٹر میں ملاتے ہیں۔ تاکہ "لیمونیڈ" بن جائے۔ اور اس میں سے سنگترہ جیسی خوشبو آنے لگے۔ اسی تیار شدہ خوشبو کو شربت میں ملا دیتے ہیں۔ تاکہ پینے والے کو سنگترہ کا شربت معلوم دے "سیٹرونیلا آئیل" کو بیرونی طور پر سوجن اور درد کے مقام پر مالش کرتے ہیں۔ کہ جس سے آرام آجاتا ہے۔ ان تمام صفات کے علاوہ "سیٹرونیلا گراس آئیل" میں خاص خوبی ہے۔ کہ اس کی خوشبو سے مچھروں

کو انتہا نفرت ہے۔ اگر اس تیل کو "وائٹ آئل" یا سرسوں کے یا ناریل کے تیل میں ہموزن ملا کر جسم کے ننگے مقاموں پر ملا جائے۔ تو مچھر ہر گز نزدیک نہیں آئیگا۔ اسی لئے مندرجہ بالا طریقہ سے تیل تیار کر کے گرم ملکوں میں کہ جہاں مچھر بکثرت ہوتا ہے۔ "مچھر مار تیل" اور دیگر ناموں سے بکثرت فروخت ہوتا ہے۔ اور اس تیل کو تیار کرنے والی کمپنیاں خوب روپیہ کماتی ہیں +

ملک ہندوستان کے وُہ علاقے کہ جہاں بکثرت گھاس پیدا ہونے کے باعث فصلیں تیار نہیں ہو سکتیں مثلاً ہلدوانی منڈی۔ رانی کھیت وغیرہ ضلع نینی تال یعنی کوہ ہمالہ کا نزدیکی میدانی علاقہ مثلاً نواب کا رام پور ریاست یو۔پی۔ ضلع مُراد آباد اور ضلع بریلی کا علاقہ۔ ضلع کھیری لکھیم پور۔ یو۔پی۔ کچلی بن صوبہ بنگال۔ گنگا اور جمنا کے کنارے۔ پنجاب کا تمام میدانی علاقہ۔ ضلع کانگڑہ اور ریاست جموں کا علاقہ اور وُہ گرم پہاڑیاں کہ جن کو "کنڈی" کہتے ہیں۔ کہ جہاں بجز گھاس اور کچھ پیدا نہیں ہوتا۔ پنجاب کے پانچوں دریاؤں کے کنارے اور دلدلی زمین کہ جہاں بجز گھاس اور کچھ پیدا نہیں ہو سکتا۔ یہ تمام زمین **لیمن گراس** کے لئے عین موزوں ہے۔ اِن علاقوں میں موسم برسات میں اس گھاس کی صرف سبز جڑوں کو دبا دینا کافی ہے۔ پھر یہ خود بخود سرسبز ہو کر پھیلتی جائیں گی۔ اور جنگلوں پر چھا جائینگی۔ کوئی بھی جانور اس کو نہیں کھاتا۔ اسلئے اسکی حفاظت کی کچھ ضرورت نہیں ÷ اس کو ایک دفعہ لگا دینے کی ضرورت ہے۔ پھر یہ جھنڈ خود بخود بکثرت پھیلنے لگتے ہیں۔ اور صرف دو تین سال میں ہی ہر طرف "لیمن گراس" ہی "لیمن گراس" نظر آنے لگتی ہے +

ہندوستانیوں کو چاہئے۔ کہ سیلون اور آسام وغیرہ سے اسکی سبز جڑیں منگا کر دلدلوں اور بیکار زمینوں میں لگا دیں۔ پھر دیکھیں۔ کہ یہ گھاس کس طرح سے سونا اُگلتی رہتی ہے ؟ آپ نے دیکھا ہوگا۔ کہ بڑے شہروں میں بڑے بڑے آلہ کشید جدید طرح کے لگ رہے ہیں۔ کہ جو "ڈسٹلری" کہلاتے ہیں۔ اور بڑے ہر روز سینکڑوں من شراب کشید کرتے رہتے ہیں۔ اور اس شراب سے ہندوستانیوں کی دولت اور صحت کو بھاری نقصان پہونچا رہتا ہے۔ اگر انہی ڈسٹلریوں کے ذریعہ اس "لیمن گراس" سے تیل کشید ہونے لگے تو ہندوستان تمام دُنیا کو "سیٹرونیلا گراس آئل" مہیا کر سکتا ہے۔ اس تیل کے ایک پونڈ کی قیمت آجکل قریباً ۲ دو روپیہ ہے۔ اگر اس کو خود تیار کیا جائے۔ تو اسپر زیادہ سے زیادہ چار آنہ فی پونڈ لاگت آتی ہے میں حیران ہوں۔ کہ محکمہ زراعت نے اس قیمتی پیداوار کی طرف توجہ کیوں نہیں دی ؟ اسکی کاشت سے ملک کی خوشحالی میں بہت اضافہ ہو سکتا ہے۔ جدید قسم کے کم قیمت کے آلہ کشید یعنی "ڈسٹلری" کے ذریعہ ہم اس کا تیل نکال کر بھاری نفع حاصل کر سکتے ہیں۔ اس گھاس کے جھنڈ کے نزدیک مچھر ہرگز نہیں آتا۔

اِس لئے گھروں۔ کوٹھیوں اور باغوں میں اِس کو لگانا مچھروں سے حفاظت کرتا ہے۔ "لیمن گراس" کے پتّوں کو بطور چائے اُبال کر پینے سے اِنفلوئنزا۔ نزلہ اور زُکام فوراً دُور ہو جاتے ہیں۔ ہندوستان کے وُہ علاقے جو کہ پہاڑوں کے دامن اور نشیب میں واقع ہیں۔ اور کہ جہاں مچھر بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔ اور وہاں بارہ ماہ موسمی بُخار تباہی مچا تا رہتا ہے۔ ایسی زمینیں "لیمن گراس" کے لئے عین موزوں ہیں۔ اِن علاقوں میں اگر اِس گھاس کو لگا دیا جائے۔ تو یہ علاقے ملیریا بُخار سے محفُوظ ہو سکتے ہیں۔ اگر آپ ملیریا بُخار کو مُلک بدر کرنا چاہتے ہیں۔ کہ جس سے ہر سال لاکھوں ہندوستانی لقمۂ اجل بنتے ہیں۔ تو ہندوستان کی چپہ چپہ زمین پر "لیمن گراس" لگا دیں۔ جہاں یہ آپ کی مچھروں سے حفاظت کریگا۔ وہاں اِس کا تیل کشید کر کے ہر سال اِس سے لاکھوں روپیہ بھی کما سکتے ہیں۔ اِس کو صرف ایک دفعہ لگا دینے کی ضرورت ہے۔ پھر یہ اپنی حفاظت آپ کریگا۔ میں کئی سالوں سے سوچ رہا تھا۔ کہ اِس گھاس پر پوری پوری روشنی ڈالوں۔ لیکن موقع نہیں ملتا تھا۔ اب جبکہ موسم گرما اپنے جوبن پر ہے۔ اور رات بھر مچھروں کے جھنڈ للکار للکار کر حملہ آور ہو رہے ہیں۔ اِن سے تنگ آ کر آج رات کے ایک بجے یہ مضمون حوالہ قلم کر رہا ہوں۔ تاکہ یہ ہندوستانیوں کی میٹھی نیند حرام نہ کر سکیں۔ علاج میں نے بتا دیا ہے۔ اِس پر عمل کرنا آپ کا فرض ہے۔ مُلک کے نوجوانوں کے لئے روزی کا ایک اور میدان کھول دیا ہے۔ وُہ اِس گھاس کی کاشت سے روپیہ بھی کما سکتے ہیں۔ اور مُلک کی دولت کو غیر مُلکوں میں جانے سے بھی بچا سکتے ہیں۔ یورپ کی کمپنیاں لنکا سے یہ تیل منگا کر اور بوتلوں میں بھر کر اور اپنا لیبل لگا کر اور بھی بھاری قیمت پر فروخت کر رہی ہیں۔ اور بھولے ہندوستانی سمجھ رہے ہیں۔ کہ یورپ والے سنگتروں کے چھلکوں کا تیل کشید کر کے یورپ سے بھیج رہے ہیں۔ حالانکہ یورپ میں یہ گھاس ہوتا ہی نہیں۔ بلکہ اِس غریب کا بھی وطن ہندوستان۔ برما اور لنکا ہی ہے۔ کہ جہاں یہ خود رَو پیدا ہوتا ہے۔ وہاں اِس کی کچھ قدر نہیں۔ یورپ پہونچکر یہ سونا بن جاتا ہے۔

سیٹرونیلا آئل (CITRONELLA) انگریزی صابن میں سنگترہ کی خوشبو پیدا کرنے کے لئے انگریزی صابن بنانے والے کارخانے بکثرت اِستعمال کرتے ہیں۔ اِس لئے صابن کے کارخانوں میں بھی اِس کی خُوب کھپت ہوتی ہے۔ اور مُلک پولینڈ کا خوشبُویات کا کارخانہ "پولک" (POLAK) اِس کو سیلون سے منگا کر دو روپیہ فی پونڈ کے حساب سے فروخت کر رہا ہے۔

نوٹ:- ملیریا بُخار کا موسم شروع ہے۔ کیا کوئی کونسل یا اسمبلی کا ممبر گورنمنٹ کو اِس مُفید مضمون کی طرف متوجہ کر کے عملی قدم اُٹھانے کی ترغیب دیگا؟ گورنمنٹ اگر اِس مُفید مشورہ [illegible]

تمباکو نوشی کی داستان

تمباکو نوشی کا رواج بہت قدیمی ہے۔ اس کا آغاز جزائر غرب الہند اور امریکہ میں ہوا۔ ۱۴۹۲ء میں جب "کرسٹوفر کولمبس" ان جزائر میں پہونچا۔ تو کیوبا میں اس نے دیکھا۔ کہ سرخ جلد کے انسان تمباکو کے منہ میں لگائے دھوئیں کے بھبکے اُڑا رہے ہیں۔ وہ جس چیز کو پی رہے تھے۔ اُسے موجودہ زمانہ میں سگار کہتے ہیں۔ انگلستان میں تمباکو سولھویں صدی کے اواخر میں پہونچا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے۔ کہ انگلستان میں سب سے پہلے تمباکو پینے کا سہرا "سرجان ہاکنس" کے سر ہے۔ لیکن بعض لوگ کہتے ہیں۔ کہ انہیں پہلی بار "سر والٹر ریلے" نے ۱۵۸۵ء میں انگریزوں کو تمباکو سے روشناس کیا + فرانس و جرمنی کی سی سالہ جنگ نے اس کا رواج یورپ میں عام کر دیا۔ اور نپولینی جنگوں کے دوران میں تو برطانی لوگ سگار بالعموم پیتے تھے۔ دوسری یورپی لڑائی نے سگریٹوں کے استعمال کو بالکل عام کر دیا + ایک اخبار کے قول کے مطابق سب سے زیادہ سگریٹ نوش ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ہیں۔ وہاں ہر سال فی کس ۱۰۴۵ سگریٹوں کا اوسط ہے۔ دوسرے درجہ پر برطانیہ ہے۔ تیسرے درجہ پر میکسیکو۔ چوتھے درجہ پر بلجیم اور پانچویں درجہ پر فرانس ہے +

ہندوستان میں تمباکو۔ ہندوستان بھی تمباکو نوشی میں کسی سے پیچھے نہیں۔ یہاں خوشبودار سگار سترھویں صدی عیسوی میں پہونچ چکے تھے۔ نئی قسم کا تمباکو ہندوستان کے مغربی ساحل پر انگریزوں کی وجہ سے پہونچا۔ اور ۱۷۶۰ء تک ہندوستان میں تمباکو کا رواج عام ہو چکا تھا۔ اور آج یہاں ہر سال ۷۰۶ ارب سگریٹ سالانہ پیئے جاتے ہیں۔ سب سے زیادہ سگریٹ پینے والا صوبہ سندھ ہے۔ سگریٹوں کے علاوہ یہاں بیڑی اور حقہ کا بھی رواج ہے۔ اگر بیڑیوں کا سالانہ خرچ تمام آبادی پر پھیلایا جائے۔ تو فی کس ۱۹۰ بیڑیاں اوسطاً آتی ہیں۔ بیڑیوں اور سگریٹوں کے علاوہ زردہ اور قوام وغیرہ بھی ہندوستان میں کافی استعمال ہوتا ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے۔ کہ ہندوستان میں دس کروڑ پونڈ تمباکو کی کھپت ہوتی ہے۔ باوجودیکہ ہندوستان میں تمباکو کی کاشت ہوتی ہے۔ تاہم سگریٹ غیر ممالک سے بھی کافی درآمد کئے جاتے ہیں۔ بیڑیاں زیادہ تر سندھ۔ بڑودہ۔ میسور اور حیدرآباد میں استعمال کی جاتی ہیں +

دنیا کے مشہور تمباکو نوش۔ دنیا کے بعض مصنفین بہت زیادہ سگریٹ نوش ہیں۔ اور خاص طور پر لکھتے وقت اس کا استعمال کرتے ہیں۔ "سر جیمز بری" لکھتے وقت اپنا پائپ سلگا لیتا تھا۔ "ایڈگر ویلس" بھی بلا کا تمباکو نوش تھا۔ ہمیشہ ایک لمبا ہولڈر اُسکے منہ سے لگا ہی رہتا تھا۔ "چارلس لیمب" لکھنے سے قبل سگریٹ ضرور پیتا ... [illegible] ... ہی نہیں

کیا جاسکتا۔ "بالڈون" تو اپنا پائپ ہر وقت مُنہ یا ہاتھ میں رکھتا ہے + نپولین بھی تمباکو کا بہُت عادی تھا۔ جبتک بیدار رہتا۔ سگریٹ مُنہ میں رکھتا تھا + البانیہ کا بادشاہ احمد زوغو بھی بے پناہ سگریٹ پیتا ہے۔ یعنی ایک گھنٹہ میں چھ سات سگریٹ ختم کر ڈالتا ہے۔ پریذیڈنٹ روزویلٹ بھی سگریٹ بکثرت پیتا ہے اسکے لبوں سے سگریٹ ہر وقت چمٹا رہتا ہے + اسٹالین اکثر پائپ پیتا ہے + شاہ انگلستان اور اُس کے تینوں بھائی پائپ استعمال کرتے ہیں + ہندوستان میں مسٹر محمد علی جناح اور سر تیج بہادر سپرو تمباکو نوشی کے بہُت عادی ہیں۔ مسٹر جناح صرف سگریٹ پسند کرتے ہیں۔ لیکن سر سپرو تمباکو کی تمام قسمیں استعمال کرتے ہیں آپ کو جب کبھی الہ آباد میں اقامت گزین ہونے کا موقعہ ملتا ہے۔ تو آپ تمباکو نوشی کا ایک غیر مختتم سلسلہ شروع کر دیتے ہیں۔ پہلے پائپ۔ پھر سگار۔ اسکے بعد سگریٹ۔ اور پھر حقّہ اور آخر میں پھر پائپ اُٹھا لیا۔ درمیان میں بار بار زردے والے پان بھی کھاتے جاتے ہیں + اعلیحضرت حضور نظام بھی سگریٹ استعمال فرماتے ہیں + اعلیحضرت فرمانروائے بھوپال بھی تمباکو نوشی کے بہُت عادی ہیں۔ لیکن زیادہ تر حقّہ استعمال فرماتے ہیں +

تمباکو سے متنفر۔ جارج برنارڈ شا تمباکو نہیں پیتا۔ اسی طرح "ہنری فورڈ" کو بھی اِس سے سخت نفرت تھی۔ اس کا قول ہے۔ کہ "اگر انسان چائے یا کافی۔ تمباکو اور دیگر منشیات سے پرہیز کرے۔ تو سوا سو برس تک زندہ رہ سکتا ہے + سائینور مسولینی اور ہر ہٹلر بھی کوئی نشہ آور چیز استعمال نہیں کرتے۔ اور نہ تمباکو پیتے ہیں۔ مسولینی کہتا ہے کہ "میں الکحل کو انسانی صحت کے لئے بیحد ضرر رساں سمجھتا ہوں۔ میں کبھی شراب کے ذائقہ سے لذت اندوز نہیں ہوُا۔ اور جنگ عظیم کے بعد سے میں نے سگریٹ نوشی بھی ترک کر دی ہے" + "ہر اسٹیچر" کا قول ہے کہ "تمباکو کا زہر ہماری قوم کے لئے بدترین زہر ہے۔ یہودی چاہتے ہیں۔ کہ جرمن تمباکو پینے لگیں۔ تاکہ جرمن قوم کو تباہ کر کے پیسہ کمایا جائے" + بہر کیف آجکل تمباکو نوشی کی عادت عالم گیر ہے۔ اور بالخصوص نئی پود اِس کی بہُت عادی ہوتی چلی جارہی ہے +

سگار اور سگریٹ کے تمباکو بونے کیلئے کیاریاں بنانیکا طریقہ

صُوبہ متحدہ آگرہ و اودھ میں جو اقسام تمباکو کی عموماً کاشت کی جاتی ہیں وُہ یہ ہیں :-

نمبر ۱۔ "نکوشیانہ رسٹیکا" یعنی "کلکتیا تمباکو" اِسکی کاشت خاصکر حقّہ پینے کی تمباکو کیلئے کیجاتی ہے +

نمبر ۲۔ "نکوشیانہ ٹیبیکم" یعنی "دیسی تمباکو" اِس کی کاشت خوردنی و کشیدنی دونو طرح کی تمباکو کے لئے کی جاتی ہے۔ چونکہ یہ قسمیں تمباکو کی سگریٹ و سگار بنانے کے لئے موزوں نہیں ہیں۔ اسلئے اِن سے زیادہ فائدہ نہیں ہو سکتا ہے۔ سگریٹ و سگار والی اقسام تمباکو کی مانگ دن بدن بڑھتی جاتی ہے۔ اور تجربہ

سے ظاہر ہے۔ کہ اِن اِقسام کی تمباکو سب سے زیادہ منافع دینے والی فصلوں میں ہو گئی ہے۔ لہذا ہم کو چاہئے۔ کہ سگریٹ و سگار کے لئے جو اِقسام بہترین ہیں۔ اُن کو بھی کاشت کریں۔ اُن میں سے بہت سی اِقسام خوردنی و پلاس وغیرہ کے لئے بھی نہایت موزوں ہیں۔ سب سے اچھی تمباکو گرم مُلکوں میں پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ اِس کو گرم اور مرطوب آب و ہوا زیادہ مُوافق آتی ہے۔ تمباکو کی فصل مُوافق کھاد۔ اور مُناسب طریقہ کاشت۔ عمدہ الاضیات میں استعمال کرنے سے وُہ منافع دیتی ہے۔ جو کسی دُوسری فصل سے دستیاب نہیں ہو سکتا۔ سب سے زیادہ قیمت بازار میں ایسی اِقسام تمباکو کی ملتی ہیں۔ جن کی پتیاں بڑی چکنی۔ پتلی۔ لوچدار عُمدہ سُنہرے رنگ اور اچھے ذائقہ کی ہوتی ہیں اور جن کی رگیں اور نسیں ایک دُوسرے سے بہت دُور ہوتی ہیں۔ اور جن کی راکھ بہت دیر تک جلنے کے بعد خوش نما سفید رنگ کی ہو جاتی ہے +

۲۔ تمباکو کی قسمیں :۔ یُوں تو تمباکو کی قسمیں بے شمار ہیں۔ لیکن ان میں سے چند سب سے عُمدہ قسمیں درج ذیل کی جاتی ہیں :۔

نمبر ۱۔ "کینکٹیک سیڈ لیف"۔ جو سگار کے لپیٹ میں کام آتی ہے +

نمبر ۲۔ "کیوبا" یہ سگار لپیٹنے اور بھرنے دونو کے لئے موزوں ہے +

نمبر ۳۔ "میری لینڈ" کھانے اور پینے کے لئے اچھی ہے +

نمبر ۴۔ "اوہیو"۔ کینکٹیکٹ نمبر ۱ کے بالکل مُشابہ ہے +

نمبر ۵۔ "برٹل اسٹیم"۔ کسی قدر جلدی پکتی ہے +

نمبر ۶۔ "اورونوکو"۔ یہ اوروں سے زیادہ وزن دار ہوتی ہے۔ اِس لئے اِسکی کاشت زیادہ کیجاتی ہے +

نمبر ۷۔ "یلو پرایر" + نمبر ۸۔ "ایڈکاک" یہ ورجینا کی ایک قسم ہے + نمبر ۹۔ "وہائٹ برلے" نمبر ۱۰۔ "پوسہ ٹائپ نمبر ۲۸" + نمبر ۱۱۔ "ٹرکس" + نمبر ۱۲۔ "ویلٹا ڈی ایجو"۔ بنا بر سگار لیف اِقسام ورجینا۔ میری لینڈ۔ اور کینکٹیکٹ کی سب سے زیادہ پیداوار ہوتی ہے اور قسم کیوبا کی سب سے کم لیکن عمدہ +

۳۔ نرسری یعنی پودھ یا بیرن ڈالنے کے لئے زمین کا موقعہ بیرن چھوڑنے کے لئے ایسی زمین ہونی چاہئے۔ جو اُونچی اور ڈھلوان ہو۔ اور جو سُورج کی تپش اور زور کے برساتی پانی کے بہاؤ سے محفوظ ہو سکتی ہو۔ اُسکے نزدیک آبپاشی کا ذریعہ بھی ہونا ضروری ہے +

۴۔ قسم زمین۔ بُڑھیا زرخیز زمین وزن دار اور تیز کڑوی تمباکو کے لئے موزُوں ہے۔ لیکن عُمدہ بہتر قسم کی گراں فروخت ہونیوالی ہلکی۔ بھربھری تمباکو کی کاشت کیلئے زمین ہونی چاہئے۔ تمباکو کی بیرن کی کیاریوں کی زمین میں ہیومس یعنی گلا سڑا ہوا نباتاتی مادہ زیادہ مقدار میں موجود رہنا

نہایت ضروری ہے۔ تاکہ کیاریوں کی سطح سخت نہ ہو جایا کرے۔ اور پودا اُکھاڑنے اور لگانے کے وقت آسانی ہو ٭

۵۔ بیرن تیار کرنے کے لئے یہ کام موسم گرما میں کم از کم تخم ریزی کرنے سے دو ماہ پیشتر شروع کرنا چاہئے۔ اوّل زمین کو ڈیڑھ فٹ تک گہرا کھود کر تین یا چار ہفتہ تک ایسے ہی رہنے دیں۔ بعد اسکے پھر کھود ا جائے۔ یا گہرا جوتا جائے۔ اور تب خوب گوڑائی و جوتائی کر کے مٹی کو نہایت باریک اور پولا کر دیا جاوے تمام جڑیں اور کھر پتوار اس زمین سے نکال کر اُسی پر جما ئے جاویں۔ اگر زمین پہلے سے کافی زرخیز نہ ہو۔ تو اُس میں خوب دبا ہُوا اور سڑا ہُوا گوبر کا کھاد بحساب دس ٹن یعنی قریب (۲۷۰) من فی ایکڑ پہلی گہری جوتائی کے بعد ڈال دیا جائے ٭

نالی ۹۔ اِنچ گہری ڈیڑھ فٹ چوڑی

۱		۷
۲		۸
۳		۹
۴		۱۰
۵		۱۱
۶		۱۲

نالی ۹۔ اِنچ گہری ڈیڑھ فٹ چوڑی

نالی ۹۔ اِنچ گہری ڈیڑھ فٹ چوڑی

۱-۱ اِنچ گہری ڈیڑھ فٹ چوڑی

نالی ۹۔ اِنچ گہری ڈیڑھ فٹ چوڑی

نالی ۹۔ اِنچ گہری ڈیڑھ فٹ چوڑی

۶۔ "بیرن کی کیاریاں"۔ جب بیج بونے کا وقت آتا ہے۔ تب بیرن کی زمین میں کیاریاں معمولی سطح زمین سے ۹ اِنچ اُونچا کر کے بنائی جاتی ہیں ہر ایک کیاری ناپ میں ۵ فٹ × ۱۰ فٹ یا ۴ فٹ × ۱۲ فٹ کی جس میں آسانی ہو۔ بنائی جاویں۔ کیونکہ قریب ۵۰ مربع فٹ میں نصف ایکڑ اراضی کے لئے کافی پودے تیار ہو سکتے ہیں ٭ جب بہت سی کیاریاں بنانا درکار ہوں۔ تب اِس نقشہ پر لکھے ہوئے طریقہ کو استعمال کرنیسے بہت آسانی ہو جاتی ہے ٭ اِس طریقہ پر ہر دو کیاریوں کے درمیان میں ایک مینڈ بارہ اِنچ سے اٹھارہ اِنچ تک چھوڑی گئی ہے جس سے کہ کھر پتوار نکالنے اور کرنے میں مدد ملتی ہے۔ اور نالیوں سے بارش کا زائد پانی نکلجاتا ہے

۷۔ کیاریوں میں کھاد ڈالنا۔ عام طور سے ایک من خوب سڑا ہُوا یا دبا یا ہُوا گوبر کا کھاد اور چار پونڈ یعنی دو سیر لکڑی کی راکھ ہر ایک [illegible] جہاں

"پوٹاش سُلفیٹ" آسانی سے دستیاب ہو سکے تو وہ ایک پونڈ یعنی آدھ سیر بجائے چار پونڈ لکڑی کی راکھ کے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اور ہر تیار شدہ کیاری کی سطح پر کھاد مذکورہ یکسان پھیلا کر اور اُوپر کی مٹی میں دو انچ گہرائی تک کسی پنجانگرے وغیرہ سے ملا کر بذریعہ کسی سیدھی لکڑی کے ٹکڑے یا ہاتھوں سے زمین کو ہموار کر دینا چاہئے۔ نیز ½ پونڈ یعنی نصف پونڈ "نائٹریٹ آف سوڈا" پانی میں حل کیا ہوا (NITRATE OF SODA) ہر ایک کیاری میں بطور "ٹاپ ڈریسنگ" یعنی چھڑکاؤ کے طریقہ پر ڈالنا چاہئے۔ بمقدار ½ نائٹریٹ آف سوڈا فی ایک گیلن پانی میں حل کیا ہوا کسی فوارہ سے ہر ما پچیں دن پودوں میں لگانا چاہئے۔ تاکہ پتیاں تندرست پیدا ہوں۔ اور اُن میں جلنے کی خاصیت عمدہ بڑھ جاوے۔ اگر "نائٹریٹ آف سوڈا" نہ دستیاب ہو سکے۔ تو دو من خوب سڑا ہوا گوبر کا کھاد ہر ایک کیاری میں زیادہ تعداد میں ڈالنا چاہئے جیسا کہ پیشتر بیان کیا گیا ہے۔

۸ بیج کا انتخاب۔ تمباکو کا بیج بالکل نمی لئے ہوئے نہ ہو۔ اور صاف اور سوکھا یا ہوا۔ اگر ممکن ہو۔ تو ایک سال سے پُرانا بیج نہ ہو۔ بیج کی قسم کا انتخاب اپنی قسم زمین اور تمباکو کی اُس قسم پر منحصر ہوتا ہے۔ جس کی کہ بازار میں بہت مانگ ہوتی ہے۔

۹۔ بونے کا موسم۔ کیاریوں میں بیج بونے کا کوئی خاص وقت مقرر نہیں ہے۔ کیونکہ بونے کا وقت زیادہ تر موسم زمین اور اُس قسم تمباکو پر منحصر ہوتا ہے۔ جس کو کہ پیدا کرنا لازم ہے۔ مگر عام طور پر بیج بونے کے مناسب وقت مندرجہ ذیل ہیں:- (الف) برساتی اگیتی فصلوں کے لئے ماہ مئی کے چوتھے ہفتہ سے جون کے دوسرے ہفتہ تک۔ (ب) پچھیتی برساتی فصلوں کے لئے ماہ جون کا آخیر یا ماہ جولائی کا شروع ہفتہ۔ (ج) موسم سرما کی تمباکو کی فصلوں کے لئے ماہ ستمبر کے ہفتہ سے ماہ اکتوبر کے دوسرے ہفتہ تک۔

۱۰۔ طریقہ بوائی۔ صرف ½ اونس یعنی سوا تولہ بیج ایسی ہر ایک کیاری کے لئے کافی ہوتا ہے۔ جو ناپ میں ۵×۱۰ فٹ یا ۴×۳ فٹ کی ہو۔ ۱۰ اس رقبہ کی پود نصف ایکڑ زمین میں لگانے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ تخم ریزی کرنے سے پہلے بیج کو اُس سے چوگنی لکڑی وغیرہ کی سوکھی راکھ میں خوب ملا لینا چاہئے۔ تاکہ بیج برابر سب جگہ کیاری میں پڑے۔ اس میں سے نصف مقدار کیاریوں میں لمبی لمبی بونا چاہئے۔ اور باقیماندہ نصف چوڑائی میں بوتے وقت ہاتھ اس طرح سطح زمین کے نزدیک رکھنا چاہئے۔ کہ بیج ہوا سے نہ اُڑ سکے۔ بونے کے بعد موٹی بالو اور کھاد دو مساوی حصوں میں ملی ہوئی کیاری پر یکسان پھیلا دینا چاہئے۔ اور کیاری کو پھر ہلکے پیروں سے دبا دینا چاہئے۔ یا کسی رولر (ROLLERS) سے زمین کو ہموار کر دینا چاہئے۔ یہ بتلا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے [illegible]

دیا جائے۔ کیونکہ یہ واضح رہے۔ کہ تمباکو اُکھاڑ کر ایک تھوڑے سے رقبہ میں ہی لگانے میں بہت دن لگجاتے ہیں۔

۱۱۔ کیاریوں کی آبپاشی۔ کیاریوں میں بیج بونے کے بعد فوراً ہی ہزارہ یا قرابہ سے پانی دینا چاہیئے۔ اور بعد میں ہر روز شام کو اور کبھی کبھی دن میں دو مرتبہ یعنی صُبح اور شام حسب موقعہ اور موسم کے پانی دیا جاوے۔ جس روز پانی برسے۔ اُس روز آبپاشی کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ زمین متواتر نم رکھی جاتی ہے۔ لیکن زیادہ گیلی نہیں رکھتے۔ جب پودے ۲ دو سے تین انچہ کے ہوجائیں۔ تو بجائے فوارہ کے قرابہ سے پانی دیا جاسکتا ہے۔ جب پودے ۲ دو ہفتہ کے ہوجاتے ہیں۔ تو پانی جلد جلد دینے کی ضرورت نہیں رہتی ہے۔ تیسرے ہفتہ کے بعد کیاریوں میں کٹواں پانی بہت ہوشیاری سے لگاسکتے ہیں +

۱۲۔ کیاریوں پر سایہ کرنا۔ ہلکی سرپت کی ٹٹیاں پود کو سخت دھوپ اور زور کی بارش سے محفوظ رکھنے کے لئے حسب ضرورت روزانہ کیاریوں پر صبح ۹ بجے سے شام کے ۵ بجے تک رکھی جاسکتی ہیں۔ یہہ ٹٹیاں اسطرح سے رکھنا چاہیئے۔ کہ وہ پودوں سے دو فیٹ اونچی رہیں۔ تاکہ ہوا پورے طور سے اُن کے نیچے سے گزرتی رہے۔ یہ کام بذریعہ کچھ کھونٹیوں اور بانسوں کے آسانی سے ہوسکتا ہے۔ جب بیج جم کر نکل آتا ہے تب ٹٹیاں لگائی جاتی ہیں +

۱۳۔ نکائی یا نرائی۔ گھر پتوار ہاتھوں سے نکالے جاتے ہیں اس امر کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ کہ چھوٹے چھوٹے تمباکو کے پودے نہ اُکھڑ جاویں۔ نکائی حسب ضرورت بہت ہوشیاری سے کی جاتی ہے۔ جو ہر دو کیاریوں کے درمیان مینڈ پر و نالیوں میں بیٹھ کر کرنا چاہیئے۔ کیاریوں میں ہرگز نہ بیٹھنا چاہیئے +

۱۴۔ پود کا جماو۔ سب سے عمدہ تخم قریب نوے فیصدی کے جمے گا۔ پودے بونے کے قریب ایک ہفتہ کے بعد نکل آتے ہیں۔ اگر وے گھنے جمتے ہیں۔ تو اُن میں سے کچھ اس طریقہ پر نکال دیئے جاتے ہیں۔ تاکہ ہر ایک پودے کے لئے ایک مُربع انچہ جگہ اُسوقت رہ جاوے۔ جبکہ وہ دو ہفتہ کے ہوجاویں۔ جو خالی حصے کیاری کے جمنے کے بغیر رہ گئے ہوں۔ اُن کو اوپر کے طریقہ سے اُکھڑے ہوئے پودے سے بھر دینا چاہیئے۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے سخت دھوپ اور زور کی بارش وغیرہ سے پودوں کی حفاظت کرنا ضروری ہے۔ اسطرح پودے کھیت میں لگانے کے قابل چھ ۶ سے ۸ ہفتہ تک کے عرصہ میں تیار ہوجاوینگے۔ جبکہ وہ قریب چھ ۶ سے آٹھ انچہ تک کے اونچے ہوجاتے ہیں۔ اور اُن میں ۴ یا ۵ پتیاں آجاتی ہیں +

دودھ کی تجارت سے ہندوستان کسطرح کروڑوں روپیہ کما سکتا ہے؟

لندن میں عام طور پر سب اشیاء گراں ہیں۔ مگر ایک چیز اس سے مستثنےٰ بھی ہے۔ وہ دودھ ہے

جس ہندوستان کی نسبت مشہور تھا۔ کہ وہاں دُودھ کی نہریں بہتی ہیں۔ وہاں کی نسبت لندن میں دُودھ
ارزاں تھا۔ اُسوقت بمبئی۔ کلکتہ میں آٹھ دس آنہ سیر دُودھ ملتا تھا۔ اور وُہ بھی ناقص پانی ملا ہُوا۔
مگر لندن میں خالص دُودھ تقریباً پانچ آنہ فی سیر گھر بیٹھے مِل جاتا تھا۔ بلحاظ صحت وصفائی یورپ کے
. . . . دُودھ کا مُقابلہ ہندوستان کا دُودھ کبھی نہیں سکتا۔ یورپ کی گائیں بڑی بڑی قدآور اور طاقت
ور ہوتی ہیں۔ اُن کا دُودھ بھی طاقت ور ہونا قدرتی ہے۔ گایوں کے لئے مُصفّا گھاس کی بہت سی چراگاہیں
موجُود ہیں۔ جہاں وُہ کھُلی ہوا میں آزادانہ پھرتی ہیں۔ مُصفّا خوراک اور مُصفّا پانی پینے کو ملتا ہے۔ ہر روز
ڈاکٹر جانوروں کا بھی اور دُودھ کا بھی معائنہ کرتے ہیں۔ دُودھ میں ایک قطرہ پانی نکل آئے۔ تو کروڑوں
روپیہ کی ملکیت کی کمپنی بدنام ہو کر فیل ہو جائے ＊ ڈیریاں شہر سے میلوں دُور میدانوں میں ہیں۔ دو وقت
دُودھ موٹروں کے ذریعہ شہر کی ایجنسیوں میں آجاتا ہے۔ اور وہاں سے موٹروں پر بائیسکلوں پہ گھر گھر
تین وقت پر تقسیم ہو جاتا ہے۔ ایسا اعلیٰ اِنتظام ہے۔ کہ ایک آدمی اُسے دیکھ کر عش عش کر اُٹھتا ہے ＊
ہندُو بلحاظ مذہب تو کٹر گئے بھگت ہیں۔ مگر ہندوستان کی گایوں کو دیکھئے۔ تو بہُت مریل
کمزور۔ بیمار اور دُبلی پتلی ہیں۔ اُن کی غذا سُوکھی توڑی۔ سڑا بسا اناج پینے کو گندا سڑا ہُوا پانی۔ دن رات کا
بہُت سا حصّہ۔ بند مکانوں میں جہاں ہَوا کا نام نہیں۔ گوبر کوڑے کی سڑاند میں بندھی رہتی ہیں۔ گوالے
میلے گندے ہاتھوں سے دُودھ دوہتے ہیں۔ جو پانی وُہ لوگ دُودھ میں ملاتے ہیں۔ وُہ بھی عموماً صاف
نہیں ہوتا۔ بھلا ایسا دُودھ صحت کے لئے مُفید ہو سکتا ہے یا مُضر؟

ہندوستان گوشت خور مُلک نہیں ہے۔ اِسکے لئے اصلی غذا صرف دُودھ ہے۔ اگر دُودھ بھی
اچھا نہ ملے۔ تو پھر اہل ہند میں جسمانی اور دماغی طاقت کہاں سے آئے۔ اِس لئے اہل ہند کا فرض ہے۔ کہ وُہ
اچھے دُودھ کا اِنتظام ضرور کریں ＊ ڈیری کا اِنتظام کمپنیاں بنا کر اُن کے ہاتھوں میں دیں۔ مگر ایسی کمپنیاں
محض منافع کی غرض سے ہی نہ بنائی جائیں۔ کمپنی کا سرمایہ کافی ہو۔ قیمت فی حصّہ بہُت ہی کم ہو۔ جس کو ہر
ایک شخص خرید سکے۔ مینجنگ ڈائرکٹر و ڈائرکٹر جو بنیں۔ اُن کو گؤماتا کا حلف دیا جائے۔ کہ وُہ قومی
خدمت اور گؤ ماتا کی سیوا کو مدنظر رکھکر اُس میں ایمانداری سے کام کرینگے۔ نیز دیگر مُلازموں میں عُہدیدار
اور کام کرنیوالے اگر ریٹائرڈ مُلازمان مِل سکیں۔ جو قومی سیوا کے خیال سے یہ صنعت لیں۔ تو بہُت اچھا ہو
شہروں سے کچھ فاصلہ پر کھُلی فراخ زمین خریدی جائے۔ جہاں پانی کا اِنتظام بھی ہو سکے۔ گھاس بھی کاشت
پیدا کی جا سکے۔ نگرانی کے لئے ایک ڈیری کے کام کا پاس شُدہ مُلازم رکھا جائے۔ دُودھ موٹروں وغیرہ کے
ذریعہ شہر میں لا کر ایجنسیوں کو دیا جائے۔ اور خالص بغیر ملاوٹ کے فروخت کا اِنتظام ہو۔ اگر اِنتظام

کام کی باتیں

مُربہ بناتے وقت جبکہ چاشنی اور اُس چیز کے ٹکڑے جس کا مُربہ بنانا ہو۔ آگ پر چڑھے ہوں۔ تو برتن میں ایک پتھر کا ٹکڑا ڈال دینے سے اُسے ہلاتے یا چلاتے رہنے کی ضرورت نہیں رہتی ÷

بُوٹ پالش والی ڈبیہ کو ٹھیک دوگنے بڑے ایک ٹین کے بکس میں رکھکر اُسے سرکہ سے بھر دیں۔ سرکہ اور پالش کو ایک لکڑی سے ہلا ہلا کر ایک جان کر دیں۔ اور پھر بوٹ پر اِس پالش کو لگائیں۔ بُوٹ مُلائم۔ پائدار اور چمکیلا بنا رہیگا۔

ایک چھوٹے سے کپڑے کے ٹکڑے کو مٹی کے تیل میں بھگو کر گھڑی۔ خاصکر بڑے کلاک کے دروازے کو کھول کر اسکی سطح پر رکھدو۔ اور پھر دروازہ بند کر دو۔ دو تین منٹ بعد دروازہ کھولنے پر کپڑے کا ٹکڑا مٹی کے ذرّوں سے بھرا ملیگا۔ اور گھڑی صاف ہو جائے گی ÷

لکڑی کے سفید کام کو دھونے کے لیئے پانی میں تھوڑا سا تارپین ڈالنا بہت مُفید رہتا ہے ÷

نوشادر کے پانی میں سونے چاندی کے گہنے ہاتھ کی گھڑی کے چین وغیرہ تیس منٹ تک ڈال کر بعد کو شراب سے صاف کرو۔ اور پھر بغیر مٹی ملے لکڑی کے بُرادہ میں اچھی طرح ہلانا چاہئے۔ اِس سے چیزیں صاف ہو جاتی ہیں ÷

لکڑی پر سے دُھوئیں یا کالکھ کے داغ دُور کرنیکے لئے نوشادر ملا مٹی کا تیل بہت اچھا رہتا ہے ÷

اُن برتنوں کو جن میں گھی۔ تیل وغیرہ کی کوئی چکناہٹ آگئی ہو۔ دو چار بُوند سرکہ پانی میں ملا کر دھونیسے وُہ بہت جلد صاف ہو جاتے ہیں۔ اور چکناہٹ جاتی رہتی ہے ÷

ایک مُلائم کپڑے کو کافور کے گھول (SOLUTION OF CAMPHOR) میں تر کر کے تاش پر پھیرنے سے استعمال کرنیسے میلے ہو چکے ہُوئے تاش صاف ہو جاتے ہیں ÷

نوشادر ملا ہُوا پانی برش میں لگا کر اُس سے اگر میلی چھتری جھاڑی جائے۔ تو وُہ بہت جلد صاف ہو جاتی ہے۔ اور نئی جیسی نظر آنے لگتی ہے ÷

اُونی کپڑے اور موزے۔ گلوبند اور ایسے کپڑے جو ہاتھ سے بُنے گئے ہوں۔ اُن کو صاف کرنیکے لئے پانی میں تھوڑا نوشادر ملا دینا چاہئے۔ ایسا کرنے سے پانی کچھ زیادہ چکنا ہو جاتا ہے۔ اور اُس پانی سے دُھلے کپڑے کچھ زیادہ مُلائم اور مضبُوط ہو جاتے ہیں ÷

جب دھونے کے بعد کپڑوں میں نیل دینا ہو۔ تو بالٹی پیچھے ایک چھٹانک بھر دُودھ پانی میں ملا کر تب اُس میں نیل گھولے اور کام میں لائے۔ ایسا کرنیسے کپڑوں پر نیل کے داغ دھبے نہ پڑینگے۔ اور رنگ سا چڑھے گا ÷

کانچ کو کاغذ کی طرح کسی شکل میں کاٹنا ہو۔ تو ایک تیز قینچی کو اور کانچ کو پانی کے اندر لے جائیں اور وہاں قینچی سے کانچ کو کاٹیں۔ کانچ اور قینچی کا کوئی بھی حصّہ پانی کے اُوپر ہوا میں نہ رہے +

گھر میں کام آنے والی سلائی کی مشین کی سوئی کام لیتے لیتے اگر کچھ موٹی ہوگئی ہو۔ یا اُسکی دھار بگڑ گئی ہو۔ تو تھوڑی دیر تک سریس کاغذ کے ٹکڑے کو سی کر بعد کو ایک دیا سلائی جلا کر سوئی کی نوک پر آنچ دکھائیں سوئی کی نوک پہلے سے بہت باریک اور تیز ہو جائیگی +

موسم ختم ہونے پر کپڑوں کو جب رکھا جائے۔ تو بجائے فینائل کی گولیوں کے اُن کے اندر نیم کی سوکھی پتیاں رکھنا کہیں زیادہ مفید اور کفائت کی بات ہوگی +

موتیوں کو چوتھائی گھنٹے تک گائے کے دُودھ میں جس میں کچھ پانی (HEESE) یا صابن ملایا گیا ہو! ڈالو اور نکال کر تازہ پانی سے دھو ڈالو۔ بعد کو صاف سفید کپڑے سے سکھالو +

نئے رنگ کئے ہوئے گھر میں رنگ کی خوب بد بو رہتی ہے۔ چند پیاز لے کر اُن کو چیر کر چند گھنٹے رکھنے سے بدبو چلی جاتی ہے +

کھڑکیوں کے شیشوں کو دھونے کے لئے تھوڑے سے پانی میں ذرا سا نشاستہ گھول کر ان پر لگا دو۔ سوکھنے پر اُسے جھٹ پٹ ملائم کپڑے سے رگڑ کر پونچھ دو۔ اِس سے یہ خوب صاف ہو جائینگے +

تصویروں کے سُنہری چوکھٹے مکھیوں اور گرد و غبار وغیرہ سے کالے پڑ جاتے ہیں۔ اُنہیں صاف کرنے کے لئے (۱) "شراب دو حصّہ۔ پانی ایک حصّہ۔ امونیا (AMMAONIA)" پانچ بُوند ملا کر ایک بُرش سے آہستہ آہستہ صاف کریں۔ اور بعد کو صاف پانی سے دھوپ میں سکھائیں (۲) لہسن کے ٹکڑے کر کے چوکھٹے پر ملیں (۳) "لکوئر پوٹاش، (LIQUOR POTASSAE) ایک حصّہ۔ پانی پانچ حصّہ" ملا کر صاف کرنے سے میل اُتر جاتی ہے +

شیشے اور چینی کے برتنوں کو دھونا آسان نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ذرا سی بے احتیاطی سے ٹوٹ جاتے ہیں۔ اور انہیں خریدنے میں دوبارہ زیادہ روپیہ صرف کرنا پڑتا ہے۔ ایسے برتنوں کو صاف کرنے کا ایک بہت اچھا طریقہ ہے۔ وُہ یہ کہ ایک ملائم اُونی کپڑا "متھیلیٹڈ سپرٹ" میں تر کر کے ہر برتن کو اِس سے پونچھ دیں۔ برتن بغیر کسی زور آزمائی کے بالکل صاف ہو جائیگا۔ گوشے صاف کرنے کے لئے اُونی کپڑے کے بجائے رنگ بھرنے کے برش سے کام لیا جا سکتا ہے۔ مندرجہ بالا عُمدہ طریقہ ہے۔ برتن نہائت آسانی سے صاف ہو جاتے ہیں۔ اور چونکہ معمُولی طریقہ کے مطابق اُنہیں رگڑنے اور مانجھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اِس لئے انکے ٹوٹنے کا احتمال نہیں ہوتا +

اگر کمرے میں لینولیم یا لکڑی کا پالش دار فرش ہو۔ تو کرسیوں کے رکھنے اور ہٹانے سے اسپر خراشیں آ

اوم

رسالہ

مستانہ جوگی

لاہور

جلد ۲۹	نومبر سنہ ۱۹۴۱ء	نمبر ۱۱

گیان ترازو ہاتھ میں لیکر تول سکے تو تول

جسم پر خیالات و جذبات کا اثر

وہم و خیال یا دوسرے دماغی مؤثرات کی صداقت کسی ثبوت کی محتاج نہیں۔ ہر ذی عقل جانتا اور سمجھتا ہے۔ کہ اس نوع کے اثرات جسم پر اپنا رنگ جمائے بغیر نہیں رہتے۔ اُن ڈاکٹروں کا قصہ مشہور ہے جنہوں نے تجربے ہی تجربے میں ایک بھلے چنگے اور تندرست شخص کو بیمار ظاہر کر کے قبر کے آغوش تک پہونچا دیا تھا۔ بوجہ شہرت کی وجہ سے اسکی تفصیلات کا اعادہ تحصیل لا حاصل معلوم ہوتا ہے۔ اسلئے بحث کے دوسرے پہلوؤں پر روشنی ڈالی جاتی ہے ✱ تبسم اور قہقہہ بھی خیال ہی کا ایک مظہر یا آلہ ہے۔ جو جسم و طبیعت پر نہایت خوشگوار اثر کرتا ہے۔ تبسم ہو یا ہنسی۔ جب چہرے پر نمودار ہوتی ہے۔ تو دل کی گہرائیوں تک خوشی کا ایک لطیف اور پُر کیف احساس پیدا کر دیتی ہے ایک ڈاکٹر کے کامیاب مطب کا راز ہی فقط یہ تھا۔ کہ وہ بغیر کسی دوا کے علاج کر دیا کرتا تھا۔ بیشتر حالات میں اس کا کام اتنا ہی تھا۔ کہ وہ اپنے مریضوں سے حتی الامکان نہایت پُر لطف اور مسرت انگیز باتیں کرتا۔ اور جس طرح ہو سکتا انہیں مزے دار کہانیاں۔ دلچسپ لطیفے اور قہقہے اور قصے سُنا کر جیسے تیسے ہنسا دیتا۔ کتنا ہی رونی صورت کا منہ بسورتا ہوا مریض آتا۔ ڈاکٹر اسے امکانی سعی سے ایک بار ضرور ہنسنے اور کم از کم مسکرانے پر مجبور کر دیتا۔ اس

اس کوشش کا نتیجہ عموماً بہت اچھا نکلتا۔ اور روتا ہوا مریض مطب سے ہنستا نکلتا۔ پھر بتدریج اس کی طبیعت کو ایک سہارا مل جاتا۔ اور کچھ دنوں میں مرض کی حالت کچھ سے کچھ ہو کر صحت شروع ہو جاتی + مشہور فلاسفر ایمرسن اپنے آخری زمانے میں بہت زیادہ غمگین رہنے لگا تھا۔ اُن دنوں اُس پر رنج و غم اس قدر طاری رہتا۔ کہ مہینوں اُسکے چہرے پر تبسم کے آثار نظر نہ آتے۔ عقیدت مند اشخاص اور احباب ہر طرح کوشش کر کے تھک گئے۔ اور اس کی کبیدگی دور نہ ہوئی۔ آخر میں اُس کے ایک دوست نے یہ قصہ سنا کر اُسے مسکرانے پر مجبور کر ہی دیا + ایک دن صبح صبح ایک نوجوان شخص نے دو خط لکھے۔ ایک اپنی نوجوان محبوبہ کو۔ اور دوسرا اپنی دھوبن کو۔ مگر جب پتہ لکھ کر انہیں لفافوں میں بند کرنے لگا۔ تو بے خیالی اور غلطی سے لفافے بدل گئے۔ نوجوان خاتون کا لفافہ دھوبن کو پہنچ گیا۔ اُس نے چاک کر کے پڑھا۔ تو یہ مضمون تھا۔ "گذشتہ موقعہ پر آپ کو دیکھ کر بہت محظوظ ہوا۔ توقع ہے۔ کہ جلد ہی پھر ملاقات کی مسرت حاصل ہو گی"۔ خاتون نے جو خط کھول کر پڑھا۔ تو اُس میں لکھا تھا۔ "جسطرح تم نے پہلے میری ویسٹ کوٹ میں شکن ڈال دی۔ اگر اب بھی اسیطرح ڈالوگی تو میں تم سے کوئی سروکار نہ رکھوں گا" + یہ قصہ سن کر ایمرسن کے چہرہ پر تبسم دوڑ گیا۔ اور اس کی حالت تھوڑی دیر کے لئے بہتر ہو گئی +

جذبات کا اثر قوت ہاضمہ پر۔ تبسم کی طرح کوئی چیز قوت ہاضمہ کو مدد دینے والی نہیں اس موقعہ پر برسوں کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ ایک صبح کو ایک عورت کھانے کے کمرہ میں بیٹھی ہوئی تھی۔ کہ اُسے اُسکے گھر سے آیا ہوا ایک خط دیا گیا۔ جو اُسی وقت کی ڈاک سے آیا تھا۔ اُس نے خط کھولا۔ تو اُس میں لکھا تھا۔ "بچہ کو ڈپھیریا (مرض خناق) ہو گیا ہے۔ جلد گھر آؤ"۔ خط پڑھنے سے پہلے وہ آدھا ناشتہ کھا چکی تھی۔ اس خط نے اُس پر اتنا دق اثر کیا۔ کہ باقی ناشتہ پورا کرنا تو درکنار۔ جتنا کھا چکی تھی۔ اُسی کو محفوظ رکھنا دشوار ہو گیا۔ وہ عجلت کے ساتھ میز سے اٹھی۔ ابھی کھانے کے کمرہ سے نکلنے بھی نہ پائی تھی۔ کہ سب کھایا پیا برابر ہو گیا۔ اس پریشان کن خبر سے تمام قوائے ہاضمہ درہم برہم ہو گئے +

بلی کی بدولت تاثیر جذبات کا ثبوت۔ سب سے پہلے اس نظریہ کا عملی ثبوت ڈاکٹر کینن نے بہم پہنچایا۔ کہ "جذبات جسم کے اہم وظائف پر خصوصاً ہاضمہ پر حیرت انگیز اثر رکھتے ہیں"۔ ڈاکٹر کینن نے اپنے معمل کے کام کاج میں مدد دینے کے لئے ایک بلی کو سدھایا تھا۔ اس بلی کی وجہ سے بڑے بڑے اہم انکشافات ہوئے اور اعضائے ہاضمہ کی حرکات کا صحیح صحیح علم بہم پہنچا۔ آخر کو اسی بلی سے حاصل کئے ہوئے تجربات و نتائج کی بنا پر ڈاکٹر نے "ہاضمہ کی میکانیکی" نامی کتاب لکھی۔ جو بہت قدر سے دیکھی گئی + ڈاکٹر بلی کو بسمتہ خوراک میں ملا کر دیتا تھا۔ جس کے اثر سے بلی لاشعاعی تجربات میں مزاحمت نہ کرتی۔ اور ڈاکٹر کی تربیت کی وجہ سے شیشے کی میز پر خاموش پڑی خرخر کرتی رہتی۔ اس دوران میں لاشعاعیں نفوذ کرتی رہیں۔ اور ڈاکٹر بلی کے اعضائے ہضم

کا معائنہ کرتا رہتا۔ معدہ کا سکڑنا اور کام کرنا صاف طور پر معلوم ہوتا۔ شعاعیں معدہ سے نیچے تک کی تمام آنتوں پر گزرتی رہتیں۔ اور اُن اعضاء کے سب کام باقاعدہ طور پر سرانجام پاتے نظر آتے۔ غرض بلّی کے خوش اور مطمئن حالت میں پڑے رہنے کی وجہ سے تو اُسے ہاضمہ کے کاموں میں کوئی فتور واقع نہ ہوتا۔ اب تجربہ کی دوسری منزل یہ تھی۔ کہ ڈاکٹر نے انہیں تجربات کے دوران میں بلّی کی دم مروڑنا شروع کی۔ جب ڈاکٹر سے اس حرکت کا وقوع ہُوا۔ تو بلّی بہت برانگیختہ ہوتی۔ اور ڈاکٹر کی طرف پھنکارنے لگتی۔ بلّی کے جھنجلانے کا نتیجہ یہ ہوتا۔ کہ ہضم کا فعل ایک دم رُک جاتا۔ جو شعاعیں پہلے ایسے خوشگوار طریقہ پر معدہ پر گزر رہی تھیں۔ جتنے وظائف ہاضمہ سرانجام پا رہے تھے۔ یہ سب کام اور رطوبات کا اخراج اور حرکت دودیہ کا عمل یکبارگی ملتوی ہو گئے۔ اور اسوقت تک رُکے ہی رہے۔ جبتک پھر بلّی نے طمانیت کی حالت میں خرخرانا شروع نہ کیا*

خوف سے رُوحانی سمیّت پیدا ہو جاتی ہے۔ مذکورہ بالا امور جسطرح قوت ہاضمہ پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جگر۔ دماغ کے تمام افعال پر کارفرما ہوتے ہیں جسم کے تمام مختلف کام جذبات کے زیر اثر ہیں۔ بعض خاص جذبات تو حقیقتاً جسم میں زہر پیدا کر دیتے ہیں۔ نفرت۔ عداوت۔ حسد اور خوف سے واقعی سمیت پیدا ہو جاتی ہے۔ نفسیاتی سمیت نہیں۔ بلکہ حقیقی و مادی سمیت۔ ان سے خون جیسا سرچشمہ حیات مسموم ہو جاتا ہے۔ پھر ایسی صدمات انگیز جذبات کی بدولت جسم کمزور ہو کر بگڑنے لگتا ہے۔ اور تمام زندگی میں ابتری رونما ہو جاتی ہے* آپ نے ایسے لوگ دیکھے ہی ہونگے۔ جو دہشت اور خوف یا اسی قسم کے اور تباہ کن محرکات جذبات کے زیر اثر زندگی بسر کرتے کرتے گھلتے رہے۔ اُن کی صحت پر نہایت ناگوار اثر پڑا۔ بیماری کی سی حالت پیدا ہوئی۔ اور نتیجہ میں جینے سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ یا کم از کم یہ تو بارہا دیکھا گیا۔ کہ ان پر قبل از وقت بڑھاپا مسلط ہو گیا*

ایسے واقعات بھی اکثر پیش آتے رہتے ہیں۔ کہ بعض لوگ کسی انتہائی خوفناک واقعہ یا ایسی انگیز خبر کے اثر سے ایک دم بال سفید ہو کر رہ گئے۔ چہرہ کی تازگی کے ساتھ بالوں کی سیاہی بھی دفعتہً جواب دے بیٹھی۔ یہ بالکل حقیقت ہے کہ جب کوئی شخص خوف زدہ۔ متوحش یا پریشان ہو جاتا ہے۔ یا اس پر حسد اور غصہ وغیرہ کا تسلط ہوتا ہے تو مادہ "ایڈری نلین" (ADRE NALIN) بکثرت پیدا ہوتا ہے۔ اور دوسری سمیتیں بھی گھر کر لیتی ہیں ان حالات میں نتیجہ ظاہر ہے۔ کہ بقائے جسم کی اہم مشین خراب ہو کر نکمی ہو جاتی ہے*

خوش مزاج بنو۔ جو لوگ غم و فکر میں مبتلا رہنے کے عادی ہیں۔ یا اپنے اوپر ایک نوع کی مایوسانہ کیفیت طاری کئے رہتے ہیں۔ انہیں مخلصانہ مشورہ دیا جاتا ہے۔ کہ وہ ذرا خوش مزاج بننے کی سعی کریں اور پھر دیکھیں۔ کہ اس کوشش کا ثمرہ کتنا اچھا ملتا ہے۔ اور کسی سے نہیں۔ تو ڈاکٹر درگین "کی بلّی ہی سے سبق حاصل کریں۔ اور دیکھیں۔ کہ جب تک اس کا مزاج بحال رہا۔ اُسکے قوائے ہضم کیسی خوشگواری سے کام کرتے رہے

اور جب صُورت حال اِسکے برعکس ہوئی۔ تو کیتی جلدی نیتجہ برخلاف نِکلا۔

ظاہر ہے کہ ایسی صُورت میں جو کچھ کرتا ہے۔ وُہ یہی مُسکرانا اور ہنسنا ہنسانا ہے۔ اور یہ کوشش کرنا ہے۔ کہ اگر غمگین یا رنجیدہ ہونے کا موقعہ بھی آجائے۔ تب بھی اِس کی اثر پذیری سے اِنکار ہی کیا جائے۔ آپ اگر خدانخواستہ کسی ایسی ہی ناگزیر اور الم انگیز صُورت حال سے دوچار ہوں تو بھی ہمّت کو ہاتھ سے نہ دیجیئے۔ اور کم از کم اِس پر سوچ بچار سے تو ضرور ہی پرہیز کیجئے۔ اور جس حد تک ممکن ہو۔ اُسے بھُول جانے کی کوشش کیجئے۔ آپ کہیں گے۔ جب تابڑ توڑ مُصیبتیں پڑیں۔ تو اُن سے کہاں تک صدمہ نہ ہوگا؟ اِس کا واحد جواب یہ ہے۔ کہ صدمہ ضرور ہوگا۔ لیکن جتی الامکان اُسپر کڑھنے اور اسے سوچ سوچ کے اپنے آپ کو گھُلنے سے بچانا چاہئے۔ ایسے مواقع پر سب سے اچھا اور مؤثر چارہ کار یہی ہے۔ کہ اپنے خیال کو اور اُمور کی جانب پھیر دیا جائے۔ اور پُورے عزم و اِرادہ کیساتھ دُوسرے معاملات پر غور و تدبّر شروع کر دیا جائے۔ اِس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ طبیعت پر جو بوجھ ایک دم آپڑا ہے آہستہ آہستہ دُور ہو جائے گا۔

لاحقہ غم کے دُور ہونے کا سبب یہ نہیں ہوتا۔ کہ مُسرّت خوش مزاجی اور طبعی بشاشت ایک ثبت قوت کی طرح آپ کو خوشی کیطرف اُبھارتی اور مزاج کو بحال کرتی ہے۔ بلکہ دراصل اِس کا اصل باعث یہ ہوتا ہے۔ کہ وُہ آپ کو ایک ایسی حالت سے نِکال لاتی ہے۔ جو آپ کی طبیعت کو رنج و غم کے دریا میں ڈبوئے دیتی تھی۔ جب صدمات سے اِفاقہ ہوتا ہے۔ تو نشوونما کی فطری قوت اور صحت افزا خاصہ طبیعت اپنا کام کرتا ہے جس کا وجود مُسلّم ہے۔ طبیعت کا مُدبّر بدن ہونا ہر ایک کو معلوم ہے۔ یہ طبیعت ہی کی تدبیر ہے۔ جو بچپن سے لیکر بڑھاپے تک اپنے کرشمے دِکھاتی رہتی ہے۔ جہات ثلاثہ میں جسم کو بڑھاتی۔ رات کو آرام پہونچاتی۔ غذا کا اِستحالہ اور قلب کے افعال کی تنظیم کرتی ہے اور مُختلف قوا سے کام لیکر جسم کی عام قوت کو بحال رکھتی ہے۔ خون بھی بجائے خود ایک صحت بخش طاقت ہے۔ ایک ماہر "فعلیات" کا قول ہے۔ کہ خون ہی دراصل شفا بخشنے والی طاقت ہے۔ اور "خون ہی زندگی ہے"۔ خلاصہ یہ کہ اگر ہم اپنے آپ کو خوش گوار حالت میں رکھیں۔ تو جسم کی شفا بخش قوتیں ہمارے مداوا کا موقع پاتی اور ہمیں جلد تندرست بنا دیتی ہیں۔ اب تجربہ کے لئے کسی اپنے سے زیادہ مُلول شخص کو لیجئے۔ اور کوشش کر کے خود بھی ہنسئے اور اُسے بھی ہنسائیے۔

تبسم نتیجہ مسرّت ہے یا مسرّت نتیجہ تبسم - کچھ مُدت ہُوئی۔ میں ایک نہائت مُلول متفکر رہنے والے شخص سے ملا۔ میں اُس سے خُوب واقف تھا۔ اُسکے چہرہ سے اِنقباض کے آثار بہت زیادہ نمایاں تھے اور کم و بیش ہمیشہ اسی قسم کی کیفیت سے متاثر نظر آتا تھا۔ میں نے اُس سے کہا۔ "میں آج تمہیں ایک سبق دینا چاہتا ہُوں۔ میری خواہش ہے۔ کہ تمہیں مُسکرانے کا طریقہ معلوم ہو جائے۔ تو اب ذرا آئینہ کی طرف بڑھو اور مُسکراؤ"۔ اُس نے ناخواستہ طریقہ پر میرے کہنے پر عمل کیا۔ مگر یہ عجیب غم آگین تبسم تھا۔ میں نے ایسا الم انگیز تبسم کبھی نہ دیکھا تھا۔

مجبوراً مجھے اِس مضحکہ خیز مسکراہٹ پر اسے توجہ دلانی پڑی۔ میں برابر اصرار کئے گیا۔ بالآخر وہ حقیقی طور پر مسکرایا اور دل سے متبسم ہونے کی سعی میں کامیاب ہوُا ۔ کوئی مضائقہ نہ ہوگا۔ اگر آپ بھی آئینہ کے سامنے کھڑے ہوکر یہ دلچسپ تجربہ کریں! اگر آپ خدانخواستہ متفکر رہتے ہیں۔ تو اِس نسخہ پر عمل کیجئے۔ آئینہ دیکھتے جائیے اور مسکرانے کی مشق کیجئے اِس عمل سے بڑا فائدہ ہوگا۔ آپ سچ مچ مسکراتے مسکراتے ہنسنے لگیں گے۔ آپ کہیں گے ''یہ تو کچھ بھی نہ ہوُا۔ یہ تو محض میرے چہرہ کا عکس ہے'' ۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ بھی کوئی چیز ہے۔ آج فلاسفہ کی ایک بڑی جماعت اِس خیال پر مُصر ہے کہ ''ہم خوش ہونے کی وجہ سے نہیں مسکراتے۔ بلکہ مسکرانے کی وجہ سے خوش ہوتے ہیں'' ۔ کم وبیش اِس حقیقت سے سبھی واقف ہیں۔ کہ دماغ اور چہرہ میں بڑا قریبی لگاؤ ہے۔ اِتنا قریبی کہ جب کبھی چہرہ سے کسی جذبہ کا اظہار ہوتا ہے یعنیہٖ وہی جذبہ دماغ میں موجود ہوتا ہے۔ یا جب دماغ کسی جذبہ سے متاثر ہوتا ہے۔ تو چہرہ پر بھی اِس کا عکس ضرور نمایاں ہوتا ہے ۔ دراصل چہرہ کی جلد کے نیچے عضلات کا ایک بڑا جال بچھا ہوا ہے۔ مثلاً عضلات کا ایک مجموعہ نچلے جبڑے پر قابو رکھتا ہے۔ یا زیرِ جلد ایسے عضلات ہیں۔ جو دماغ کی مختلف حالتوں کے مطابق چہرہ کی کھال کو پھیلاتے اور سمیٹتے رہتے ہیں۔ جن سے دماغی جذبات کا مناسبت سے حلیہ اور بشرہ میں تغیرات نمایاں ہوتے ہیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے عضلے منہ کے کناروں کو اندر کی جانب کھینچتے ہیں۔ اور ان کی اِس حرکت سے ہونٹ اور ناک کی جلد میں کھنچاؤ پیدا ہوتا ہے جس سے تبسم کی صورت نمایاں ہوتی ہے ۔ آخر میں اب ہم اِس کے سوائے اور کچھ کہنا نہیں چاہتے۔ کہ زندگی یا کم از کم زندگی کا لطف ع ''خوش باش دمے کہ زندگانی این است'' میں پنہاں ہے ۔

خدائی حکومت

آپکا ایک ہم نوالہ وہم پیالہ دوست اگر آپ کو مشورہ دے۔ کہ چوری کرو۔ تو آپ اسکی نادانی پر مسکرائیں گے۔ اور اگر وہ کہے کہ ڈاکہ زنی از بس مفید کاروبار ہے۔ تو آپ اُسے احمق کہیں گے۔ وہ کہے کہ قتل وخون قابلِ ستائش فعل ہے۔ تو آپکو شبہ ہوگا۔ کہ کہیں وہ پاگل تو نہیں ہوگیا۔ اور اگر وہ کہے کہ حکومت کے خلاف سازش کرو۔ تو آپ کانپ اُٹھیں گے۔ اور آپ کو یقین ہو جائیگا۔ کہ وہ مخبوط الحواس ہے۔ چونکہ آپ قانون سے نابلد نہیں ہیں۔ اسلئے چوری۔ ڈاکہ زنی۔ قتل وخون۔ اور حکومت کے خلاف سازش کا جو نتیجہ ہوتا ہے۔ آپ اُس سے بخوبی واقف ہیں۔ آپکو یہ بھی علم ہے۔ کہ کسی حکومت کے خلاف کاروائی کرنے کی کیا سزا ہوتی ہے۔ لیکن کسقدر حیرت وتعجب کا مقام ہے۔ کہ اِس درجہ ہوشمند وذی شعور ہونیکے باوجود آپ کا ایک دوسرا دوست جسے نفس کہتے ہیں۔ جب وہ آپکو بہکاتا ہے۔ انواع واقسام کے سبز باغ دکھلاتا ہے۔ تو آپ اسکے احکامات کی تکمیل کے لیئے گردن جھکا دیتے ہیں۔ اور ایک ایسی حکومت کے خلاف کاروائی کرتے ہیں۔ جس کی قوت وطاقت بے پناہ ولامحدود ہے دنیاوی حکومت کا خوف تو آپ کو ارتکاب جرم سے روکتا ہے۔ لیکن خدائی حکومت کا خوف آپکے دل میں ذرا بھی نہیں۔ جسکے ماتحت تمام دنیاوی حکومتیں وقانون ہیں ۔

کرشن مُراری

ایک ہی روگ کے دونوں روگی　　میں پریمی تُو پریم بھکاری
پھر اِس بھید کا کارن کیا ہے　　تُو ٹھاکر ہے میں ہُوں پُجاری
آہل گائیں گیت پریت کے　　پریت کی ریتیں کر دیں جاری
تیرے کارن دُنیا چھوڑی　　چھوڑے مِتر پِتا مہتاری
رُوپ کے ایشور یہ تو بتلا　　اِس میں شوبھا کیا ہے بھاری
سُنتے ہو؟ پیتامبر دھاری

نینوں کی جمنا جوبن پر ہے　　تجھ کو سوگندھ ہے جوبن کی
مَن کے باسی! مَن میں آجا　　سُونی پڑی ہے نگری مَن کی
تجھ بن نِشپھل جیون میرا　　تجھ بن آیو۔ کلی ہے بن کی
تیرے برہ میں تڑپ رہا ہُوں　　سُدھ بُدھ مجھ کو نہیں ہے تن کی
جس درپن میں چتر ہے تیرا　　دشا وچتر ہے اِس درپن کی
چھبی دکھا دے! پیاری پیاری

بانسری والے! چھیل چھبیلے　　مدھر رسیلے گیت سُنا دے
پاپی مَن کو پیاس لگی ہے　　گیتا کا امرت برسا دے
ویاکل۔ ویاکل آشائیں ہیں　　روتے مَن کی دھیر بندھا دے
پریم کی نیّا بھنور میں آئی　　کھیون ہارے پار لگا دے
کملی والے کرشن کنہائی　　پریت کی ریت کے بھید بتا دے
تیری پریت ہے جگ سے نیاری

انسانی جسم محض چند کیمیاوی اشیا کا مجموعہ نہیں ہے

مہربان قدرت نے اسے ایک بے بہا قوت ودیعت کی ہے

یہ خیال کہ (HUMAN LIFE) ایک مشین ہے۔ اور گیان یا علم محض ذرات کی نقل و حرکت کا نتیجہ ہے۔ متروک ہو چکا ہے۔ گذشتہ دس سال میں انسان کا دماغ مناظر کے پس پشت ایک قوت کو تسلیم کرنے کی جانب جا رہا ہے۔ جیسے ہوئٹرکس نے بجا طور پر "وہ غیبی قوت جو ہمارے اندر ہی ہے" بیان کیا ہے۔ اپنی تصنیف موسومہ "(MAN AND SUPERMAN)" "انسان و اعلیٰ نسل کے انسان" کے دیباچہ میں مسٹر جارج برناڈ شا نے "اس پر اسرار چیز" کو یوں بیان کیا ہے۔ کہ اس کی بدولت جاندار اشیاء اپنے مخصوص طریقوں میں بطور قوت حیات پیش آتی ہیں"۔ "بیالوجی" (علم موجودات) کے متعلق ڈارون کی معلومات سے تقویت اور حوصلہ افزائی پاکر گذشتہ صدی کے مادی اور مشینری سے متعلق نظریات ایسے خیالات کو جگہ دے رہے ہیں۔ جن کا تصوف کے غار عمیق میں گرنے کا احتمال ہے۔ مثلاً جس طریقہ سے شکتی ذرہ سے چھوٹتی ہے۔ لیکن یہ کہ وہ شکتی وہاں کیسے جا پہنچی۔ ہنوز ایک راز ہے۔ اور سائنسدان کی پریشانی کا موجب ہے۔ "سر ای۔ اے۔ ریے لنکسٹیر" فرماتے ہیں۔ "نہ ہم جان سکتے ہیں۔ نہ ہی تصور کر سکتے ہیں۔ کہ یہ نظام قدرت کس طرح معرض وجود میں آیا؟ یہ وہاں سے کہاں ہے؟ کس طرف جا رہا ہے؟ اور اسکے پرے یا اسکے علاوہ کیا ہو سکتا ہے؟ جیسے ہمارے حواس خمسہ نہیں کر سکتے جس کو سائنس نے بیان نہیں کیں۔ اور نہ ہی کبھی کر سکتا ہے"۔ اس "پر اسرار و مخفی چیز" کو جو ہمارے حواس کے احاطہ میں نہیں آتی لیکن جس کے زیر اثر جاندار اشیاء اپنے مخصوص انداز میں کام کرتی ہیں۔ فرنچ اکیڈمی کے سرکردہ پروفیسر "ہنری برگوسن" اور "مسٹر جارج برناڈ شاہ" نے تسلیم کیا ہے۔ اول الذکر نے اسے اپنی معرکۃ الآرا تصنیف "CREATIVE EVOLUTION" ELAN VITAL یعنی ایک اہم تحریک بیان کیا ہے۔ اور موخر الذکر نے اپنی تصنیف "MAN AND SUPERMAN" کے دیباچہ میں جیون شکتی یا قوت حیات بیان کیا ہے۔ جدید سائنسدان کے لئے جو اپنے تئیں مادی حقائق کی حدود میں محدود رکھتا ہے۔ زندگی کے بے تعداد ذرات کوئی کشش نہیں رکھتے۔ جہاں تک "پروٹو پلازم" (PROTOPLASM) حیوانات کی زندگی کے اجزاء کا تعلق ہے۔ کیا ہم یہ دریافت نہیں کر سکتے۔ کہ وہ کیا چیز ہے جو مختلف حیوانات میں امتیاز کرتی ہے؟ کس نے "پروٹو پلازم" کے ایک ذرہ کو نیوٹن کا کتا یا ہیرا وغیرہ بنا دیا۔ اور بالکل وہی ذرہ خود نیوٹن بن گیا۔ صریحاً کوئی مخفی چیز ہے۔ جو پروٹو پلازم میں داخل ہو گئی ہے [illegible]

سائنس اس کی تعریف نہیں کر سکتی۔ سائنس نے محض یہ دریافت کیا ہے۔ کہ پروٹوپلزم زندگی کا ایک لازمی جزو ہے
ڈاکٹر جولین ہکسلے فرماتے ہیں۔ کہ "پروٹوپلزم خواہ سادہ ہو یا پیچیدہ۔ زندگی کی قدرتی بُنیاد ہے۔ یہ گیہار کی
مٹی ہے"۔ جب ہم اس مسالہ کی جس سے کہ زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ چھان بین کرتے ہیں۔ ہم لُعاب کی سی صاف
و بے سہارا چیز دیکھتے ہیں۔ جو انڈے کی سفیدی کے مُشابہ ہے۔ سائنسدان بتلاتے ہیں۔ کہ یہ محض کاربن۔ ہائیڈروجن
آکسیجن اور نائٹروجن کا مجموعہ ہے۔ وُہ اس سے آگے نہیں گئے۔

یہ کہ انسان کا جسم ہی سب کچھ نہیں ہے۔ بآسانی ثابت ہو جاتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ انسان کو لقوہ ہو جائے
یا اس کا کوئی عضو کاٹ دیا جائے۔ یا مُسلسل علالت کے باعث اُس کا جسم نحیف و کمزور ہو جائے۔ تو اُسکے آہنگ
میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ وہ بدستور کام کرتا رہتا ہے۔ اس قسم کی تمثیلات بھی موجود ہیں۔ جو ثابت کرتی ہیں۔ کہ انسان
کے دماغ کا بیشتر حصہ ہٹا لینے سے بھی اسکے آہنگ میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ وُہ بدستور کام کرتا رہتا ہے۔ اس قسم
کی تمثیلات بھی موجود ہیں۔ جو ثابت کرتی ہیں۔ کہ انسان کے دماغ کا بیشتر حصہ ہٹا لینے سے بھی اُسکے آہنگ میں کوئی
فرق نہ آیا۔ جس میں بیان کیا گیا ہے کہ "POPLAR SCIENCE" ماہ مئی کی اشاعت
مندرج ہے۔ کہ دس سال بیشتر "CLEVELAND, O, CLINIC" میں ڈاکٹر "ڈبلیو جیمز
گارڈنر" نے ایک عورت کا دایاں نصف کلیتہً ہٹا لیا اور مریضہ کو صحت حاصل ہو گئی۔ ۱۹۳۴ء میں پروفیسر
ہارٹ مِن وسکمک نے اعلان کیا۔ کہ "دماغ کو ایک آزاد و خود مختار عضو نہ تصور کرنا چاہیئے۔ بلکہ محض ایک بُنیاد سمجھنا
چاہیئے جسکے سہارے کوئی ہستی کام کرتی ہے۔ جو مادہ سے قطعی جُداگانہ و مختلف ہے۔

۱۹۳۶ء میں سویڈن کا "دماغی سرجن" "پروفیسر" اولوکرونا" نے بیان کیا۔ کہ "دیگر سائنس کی مانند طب
کو بھی فہم و ادراک کے اصلی مرکز کا علم نہیں ہے۔ پروفیسر صاحب کی رائے میں فہم و ادراک کا مرکز دماغ میں نہیں ہے۔ علاوہ
ازیں ایسے شخص کی مثال لیں جو چند دقیق مسائل کے حل میں غلطان و پیچاں ہے۔ اگر اس سے پُوچھا جائے۔ کہ اس
اپنے قریب کھڑے ہوئے شخص یا سامنے رکھی ہوئی کسی چیز کو دیکھا؟ تو وُہ فوراً کہے گا۔ کہ مطلقاً نہیں۔ کیونکہ اس کی
کسی دوسری جانب مصروف تھی۔ یا آپ کسی ایسے شخص سے سوال کریں۔ جو اسوقت کسی زیادہ دلچسپ معاملہ پر غور و خوض
کر رہا ہے۔ وُہ کوئی جواب نہ دیگا۔ ان تمثیلات سے یہ بات کافی ثابت ہو جاتی ہے۔ کہ جب ہمارا "SELF" (آپا یا آتما)
کسی اور خیال میں محو ہو جاتا ہے۔ تو ہماری آنکھیں۔ کان اور جسم کے تمام دیگر اعضا اپنا کام کرنا بند کر دیتے ہیں۔ حالانکہ
کرنے کی شکتی ان کے اندر بدستور موجود رہتی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے۔ کہ جسمانی اعضا و حواس کے مجموعہ سے
پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ جسم سے جُدا و علیحدہ چیز ہے۔ "SELF CONSCIOUNESS" یعنی آہنگ

محض چند کیمیائی اشیاء کا مجموعہ ہے۔ اور پھر ان سے چیتن آہنگ پیدا ہوتا ہے۔ فرض کیجئے ایک شخص جو دن بھر کی سرگرمیوں میں چیتن آہنگ کے گن پرگٹ کرتا ہے۔ ایک قطعی مختلف حالت میں پڑ جاتا ہے۔ یہ سو جاتا ہے۔ جبکہ کارکن حواس ساکت ہوجاتے ہیں۔ اور خود جسم مردہ پڑ جاتا ہے۔ ہم سوال پوچھتے ہیں۔ اور وہ کوئی جواب نہیں دیتا۔ اس کا چیتن آہنگ نیند کی دنیا میں غائب ہوجاتا ہے۔ جبکہ اس کا جسم وہی رہتا ہے۔ جو حالت بیداری میں تھا۔ اور اسکے جسمانی اعضاء مثلاً دل اور پھیپھڑے بدستور کام کرتے رہتے ہیں۔ جن عناصر سے جسم بنتا ہے۔ وہ بھی وہاں موجود ہیں۔ مشین کے اعضاء تتر بتر نہیں ہوجاتے۔ اگرچہ چیتن آہنگ اور رضاکارانہ سرگرمیوں یا افعال کے اوصاف کلیتہً غائب ہوجاتے ہیں۔ کیا وجہ ہے۔ کہ حالتِ بیداری میں انسان اپنی ہستی و فطرت کے متعلق تحقیقات کرتا ہے۔ بحث و تحمیص کرتا ہے۔ گہری نیند کی حالت میں یہ شکتی کہاں غائب ہوجاتی ہے۔ اس کا مدلل جواب یہی ہے۔ کہ انسان مادہ پرستوں کے خیال کے برعکس محض کیمیائی اشیاء کا مجموعہ نہیں ہے۔ بلکہ اسے ایک قوتِ استدلال بھی حاصل ہے۔ جو گہری نیند کی حالت میں جسم سے جدا ہوجاتی ہے۔ اسکی خوابات کے مناظر کی امداد سے مزید تصدیق ہوسکتی ہے ؎

مادی جسم میں فہم و ادراک۔ علم۔ احساس و رضامندی کے مجموعہ کو ہی انسانی من کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں من گہری نیند میں غائب ہوجاتا ہے۔ تاہم خواب کی حالت میں ہم آہنگی کا عمل جاری رہتا ہے۔ اور اپنے آہنگ کا احساس رہتا ہے۔ اور تاثرات۔ یادداشت۔ احساسات۔ خوف اور امیدوں کا فلم حالتِ بیداری کی طرح حرکت کرتا رہتا ہے۔ اور انسان کا آہنگ اسی جوش و خروش سے کارروائی کرتا ہے۔ جیسا کہ حالتِ بیداری میں۔ وہ دیکھتا ہے سنتا ہے۔ سونگھتا ہے چکھتا ہے اور چھوتا ہے۔ وہ جب دوست یا دشمن سے ملتا ہے۔ تو اسکے اندر ویسے ہی جذبات بھڑک اٹھتے ہیں۔ بالفاظ دیگر اگرچہ اس کا پنڈی من ظاہرا طور پر مردہ ہوجاتا ہے۔ اس کا ج من اپنے وجود میں دوسری قسم کی حالتِ بیداری میں کارکن رہتا ہے۔ جسے خواب کی اوستھا کہتے ہیں۔ اسے یہ محسوس نہیں ہوتا۔ کہ اسے خواب آرہا ہے۔ جو کہ حالتِ بیداری کے تجربہ کے مقابلہ خیالی ہوتا ہے۔ اسوقت اسکے لئے خواب کی دنیا ہی حقیقی دنیا ہوتی ہے۔ ایک سوتے ہوئے شخص کے لئے اس کا مادی جسم نہیں رہتا۔ کیونکہ اس کا آہنگ وہاں سے نکل چکا ہے۔ اور خواب کی اوستھا میں چلا گیا ہے۔ پس ظاہر ہے۔ کہ انسان کا یہ جسم نہیں ہے۔ بلکہ بیدار ہستی ہے جو جسم کے ساتھ یکجا ہوجاتی ہے۔ جب وہ اسمیں داخل ہوتی ہے ؎ یہ بنیادی آہنگ یا من ذرات یا کیمیائی اشیاء کا مجموعہ نہیں ہے۔ بلکہ پنڈی من کے مقابلہ کوئی لطیف و سوکشم چیز ہے۔ اور آہنگ سے منور و روشن ہے ؎ مذکورہ بالا وسائل سے ظاہر ہے کہ انسان محض مشین یا کیمیائی اشیاء کا مجموعہ نہیں ہے۔ جیسا کہ مادہ پرست بیان کرتے ہیں۔ وہ یقیناً ایک بیدار آہنگ بھی رکھتا ہے۔ جو مادی جسم سے مختلف ہے۔ اور اپنی کارروائی کے لئے اسکے تابع نہیں ہے ؎ علاوہ ازیں زندگی کا مادی نظریہ اس مزید دلیل کے سامنے نہیں ٹھہر سکتا۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ کہ قدرت نے انسان

کو ایک شکتی یا قوت ودیعت کی ہے۔ جسے محبت کہتے ہیں۔ یہ قوت یا شکتی جذبۂ عشق و محبت میں اہم پارٹ ادا کرتی ہے۔ جب کسی مرد یا عورت کے دل میں محبت کا شعلہ بھڑک اُٹھتا ہے۔ عاشق و محبوبہ میں ہم آہنگی اسقدر مکمل ہو جاتی ہے۔ کہ چند ہی گھنٹوں میں دونو ایک ہو جاتے ہیں۔ اور لطف و سرور میں ہر دو سرشار ہو جاتے ہیں نہ

کیا مادہ پرست سائنسدان جو کہتا ہے کہ زندگی ذرات کے رقص کا نتیجہ ہے۔ یا کیمیائی اشیاء کا مجموعہ ہے بیان کرنے کی تکلیف گوارا کریگا۔ کہ کب اور کیسے یہ محبت کا جذبہ انسان کے جسم میں داخل ہو جاتا ہے۔ اگر وہ مختلف کیمیاوی اشیاء جن سے انسانی جسم بنتا ہے۔ سائنسدان کو مہیا کی جائیں۔ کیا وہ ان سب کو جمع کر کے ایک اپنے جیسا ہم جنس انسان بنا دے گا۔ جو زندہ رہ سکے۔ حرکت کرے۔ بات چیت کرے۔ اور ایک عقلمند انسان کیطرح پیش آئے۔ مادہ پرست کا یہ دعوےٰ کہ وہ انسان کی سو کشم اور پُر اسرار روح کو بنا سکتا ہے محض دیوانہ کی بڑ ہے جبکہ وہ ابھی تک انسانی انگلی کا ناخن تک بھی نہیں بنا سکا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ انسان یہ جذبۂ محبت وروح پرماتما۔ خدا یا مالک کل سے حاصل کرتا ہے۔ بلا شبہ یہ انسانی جذبہ جسکی کیفیت اوپر بیان کی جا چکی ہیں عشق حقیقی نہیں ہے لیکن مہربان قدرت نے انسان کو عشق حقیقی کا جذبہ بھی مرحمت فرمایا ہے۔ جو دیگر انسانی شکتیوں کی مانند بیدار کیا جا سکتا ہے۔ جب یہ جذبۂ محبت بیدار ہو جاتا ہے۔ تو محبت کے سرچشمہ مالک کل کی رحمت کے دروازے کھلے

حقیقت ایک ہے لفظوں کا جھگڑا پال رکھا ہے

جہالت نے تکبر نے خودی نے خود پسندی نے
کدورت خانہ جنگی نے عداوت فرقہ بندی نے
گلے میں ہند کے طوق غلامی ڈال رکھا ہے

کبھی مسجد پہ ہے حملہ۔ کبھی مندر پہ ہے یورش
یہاں شورش وہاں شورش ادھر شورش ادھر شورش
اسی شورش نے ہندی کو بھنور میں ڈال رکھا ہے

پکارا سنکھ نے اسکو۔ اذاں نے دی صدا جسکو
وہی ہے رام ہندو کا۔ کہے مسلم خدا جسکو
حقیقت ایک ہے لفظوں کا جھگڑا پال رکھا ہے

برادر ہو اگر آپس میں پھر اتنی عداوت کیوں
محبت کی جگہ باہم دلوں میں یہ شرارت کیوں
انہی خرمستیوں نے ہند کو پامال رکھا ہے

اگر ہونا ہے تجھ کو ایک ہو جا ہند کے باسی
محبت میں وطن کی آپ کھو جا ہند کے باسی
کہ فرقہ داریوں نے آفتوں میں ڈال رکھا ہے

نیک و پاکیزہ خیالات پیدا کرو

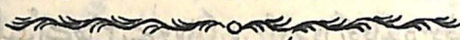
انسان کی زندگی اس کی عادات کا مجموعہ ہے۔ اور عادات کا نیک و بد ہونا کُلّی طور پر اسکے خیالات پر منحصر ہے۔ خیالات کا انسان پر جسقدر اثر ہوتا ہے۔ اُتنا اور کسی چیز کا نہیں ہوتا۔ لہذا ہمارا فرض ہے۔ کہ نیک و پاکیزہ خیالات کو ہی اپنے من میں جگہ دیں۔ عقلمند اور نادان میں یہی فرق ہے۔ کہ اوّل الذکر اپنے خیالات کو اپنے بس میں رکھتا ہے۔ اور مؤخر الذکر یعنی بیوقوف شخص خیالات کا غلام ہوجاتا ہے عقلمند اپنے خیالات کو کسی مقصد کی تکمیل میں لگاتا ہے۔ اور بیرونی روکاوٹوں و اشیاء کی مداخلت کے باوجود اپنی توجہ کو اِدھر سے نہیں ہٹنے دیتا۔ بر عکس اسکے بیوقوف شخص بیرونی اشیاء کے تعلق میں آنے سے جو خیالات اسکے اندر پیدا ہوتے ہیں۔ کٹ پتلی کی طرح اُنہیں کے تابع ہوجاتا ہے۔ اور کام۔ کرودھ۔ لوبھ۔ موہ۔ اہنکار وغیرہ جذبات کا غلام ہوکر اپنی زندگی۔ اپنا مستقبل غرض اپنا تمام اثاث البیت لُٹا بیٹھتا ہے۔ بنا بنایا کام بگڑ جاتا ہے۔ انواع و اقسام کے مصائب آلام کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کس قدر زحمت اُٹھانی پڑتی ہے۔ بُرے خیالات کو اپنے دل میں جگہ دیکر؟ ہمیں یہ صداقت ذہن نشین کرلینی چاہئے۔ کہ صرف اُسی شخص کی زندگی کامیاب و فتحمند ہوسکتی ہے جس کا دل و دماغ اعلیٰ خیالات کی جانب راغب ہوگا بس انسان کو اپنے خیالات کو کسی اصول پر قائم کرنا چاہئے۔ سب سے بہتر و کارگر نسخہ یہ ہے۔ کہ ہم اپنی زندگی کا نصب العین وصل حق یا ایشور پراپتی بنائیں۔ اور اس مقصد کے حصول کے پیش نظر اپنے دل کو ایشور پریم سے بھر دو بس یہی شاہراہ ہے۔ یہی پریم کا مارگ ہے جسپر چل کر نہ محض یہ کہ ہم اپنے اندر نیک و پاکیزہ خیالات پیدا کرسکتے ہیں۔ اپنا ہردیہ شُدھ و پوتر بنا سکتے ہیں۔ بلکہ دائمی و حقیقی خوشی و مسرت سے ہم آغوش ہوسکتے ہیں۔ مالک کے پریم کی شاہراہ پر گامزن ہونے والے انسان کو زندگی کی اصلیت کا علم ہونے لگتا ہے۔ وہ دُنیا کی چیزوں کو غلط قیمتیں نہیں دیتا۔ بلکہ اُنہیں اُنکی حقیقی شکل میں دیکھنے لگتا ہے۔ وہ زندگی کے روزانہ واقعات کو نہیں بھولتا۔ بلکہ اُنہیں قانونِ قدرت کے مطابق دیکھتا ہے۔ اسے ہر شے میں اپنے پریتم اپنے محبوب کا جلوہ نظر آتا ہے۔ وہ دُنیا میں رہتا ہے۔ لیکن اس سے بے نیاز ہوکر۔ وہ روزمرہ لوگوں کو ایک دوسرے سے دست و گریبان ہوتا دیکھتا ہے۔ مگر اسے لڑائی جھگڑے سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ تو اپنے پریتم کے پریم میں شرابور رہتا ہے۔ وہ کشمکشوں سے مُبرا ہوتا ہے۔ ہر کہ و مِہ کے ساتھ یکساں خلوص و محبت سے پیش آتا ہے۔ وہ ہمیشہ سعتیہ کا ساتھ دیتا ہے۔ اور یا آخر ستیہ کی وجہ ہوتی ہے۔ اس کا دل پاک و پوتر ہے۔ حسد۔ بغض۔ کینہ۔ رقابت۔ غرور و تکبر سے خالی ہے۔ اسکے خیالات پختہ و مستقل ہوتے ہیں۔ اور دُنیا خواہ اس کی تعریف کرے یا مذمت۔ وہ اپنے پریتم کی خوشنودی کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمیشہ نیکی و بھلائی سے

پیش آتا ہے۔ خواہ سونا چاندی کے انبار ہاتھ لگ جائیں۔ اور خواہ کنگال ہو جائے۔ وُہ نیکی و پاکیزگی کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ اپنے خیالات کو ہمیشہ بُلند نیک و پاکیزہ رکھتا ہے۔ اور جانتا ہے۔ کہ یہ دُنیا کی تعریف و مذمت ترحم روزہ ہے۔ اصل چیز تو ایشور پراپتی ہے۔ مالکِ کُل سے وصل ہونا ہے۔ لہذا ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے اس حقیقی منتہائے مقصود سے توجہ نہیں ہٹنے دیتا +

اِنسان بھوکے مرتے ہیں

آپ مذکورہ بالا عنوان پڑھ کر دم بخود رہ جائینگے۔ کہ کیا فی الحقیقت اِنسان بھوکے مرتے ہیں؟ ہمارا جواب اثبات میں ہے۔ بلاشبہ ہر شخص بلا امتیاز مذہب و ملت بھوکا مرجاتا ہے۔ شہنشاہ۔ بادشاہ۔ راجے مہاراجے۔ افسر حکام۔ سیٹھ۔ ساہوکار بے پناہ دولت و ثروت رکھتے ہوئے بھی بھوکے مرتے ہیں + یہی سوال اکبر نے بیربل سے کیا۔ اکبر نے کہا بیربل! میرے باپ دادا ہندوستان کے شہنشاہ تھے۔ کروڑ ہا بندگانِ خدا اُن کے تابع تھے۔ اور احکام کی تعمیل کے منتظر رہتے تھے۔ جاہ و حشمت۔ مال و متاع۔ سامانِ عیش و طرب۔ رقص و سرود چھتیں قسم کے کھانے۔ غرض دُنیا کی کونسی شئے ہے جو انہیں میسر نہ تھی۔ بیربل! مجھے بڑی حیرت ہوتی ہے۔ کہ جب یہ سب کچھ اُن کے پاس تھا۔ تو پھر وُہ کیوں مر گئے بیربل نے بلا پس و پیش عرض کیا۔ "حضور! وُہ بھوکے مر گئے" + "بھوکے مر گئے۔ میرے باپ دادا۔ ہندوستان کے شہنشاہ" اکبر غصہ سے تلملا اُٹھا۔ آنکھیں لال پیلی ہو گئیں۔ تمام دربار میں سناٹا چھا گیا۔ کہ بیربل نے ایسے گستاخانہ کلمات اپنی زبان سے کہکر شہنشاہ ہند کی شدید ترین توہین و بےعزتی کی ہے۔ اکبر نے ضبط و تحمل سے کام لیتے ہوئے فرمایا۔ "بیربل تمہیں تین دن کی مُہلت دی جاتی ہے۔ تم نے جو کہا ہے۔ ثابت کرو۔ ورنہ تمہارا سر قلم کر دیا جائیگا" + بیربل نے کہا۔ "جو حکم حضور" + بیربل گھر پہنچا۔ تو چہرہ سے ملال و پریشانی ٹپکتے تھے بے حد اداس و مغموم تھا۔ دختر نیک اختر بھانپ گئی۔ کہ کچھ دال میں کالا ہے۔ اصرار پر بیربل نے تمام واقعہ بیان کر دیا۔ لڑکی بلا کی ذہین و فہیم تھی۔ کہنے لگی۔ آپ مطمئن رہیں۔ آپ کا سر قلم ہونے کے بجائے فخر سے بُلند ہوگا۔ آپ کل صبح دربار میں حاضر ہو کر بادشاہ سلامت کو کل شام کے لئے مدعو کر آئیں" اگلے دن بیربل نے شام کے کھانے کی دعوت قبول فرمانے کی اِستدعا کی۔ جو منظور ہوئی + شام کا وقت تھا۔ دربار آراستہ و پیراستہ تھا۔ سات بج گئے۔ آٹھ بج گئے۔ نو بج گئے۔ لیکن بیربل کے ہاں سے کوئی بلانے نہ آیا۔ بالآخر بادشاہ سلامت اُٹھے اور محل میں جا کر کھانا کھا لیا۔ جب خوب پیٹ بھر کر کھا چکے۔ تو بیربل فوراً دوڑا دوڑا آیا۔ اور عرض کی۔ کہ "حضور چلیئے۔ تشریف لے چلئے۔ کھانا تیار ہے" + اکبر نے کہا۔ "اب کیسے چل سکتا ہوں۔ انتظار کر کے میں نے کھانا کھا لیا۔ اور اب تو ایک لُقمہ کی بھی گنجائش نہیں" بیربل نے بیحد اِصرار کیا۔

کہ "خواہ نہ ہی نوش فرمائیں۔ لیکن ایک مرتبہ تشریف لے چلیں" ٭ مجبوراً بادشاہ سلامت تشریف لے گئے۔ دیکھا کہ بیربل کی بیٹی نے دو صد قسم کی طشتریاں تیار کر رکھی ہیں۔ اور بیحد تکلف سے کام لیا ہے۔ لڑکی نے عرض کیا۔ کہ "حضور نوش فرمائیں" ٭ شہنشاہ اکبر نے کہا۔ کہ "اب تو ایک لقمہ کی بھی گنجائش نہیں ہے" ٭ عرض کیا۔ کہ "اچھا تو حضور ذائقہ ہی چکھ لیں" ٭ مجبوراً بادشاہ سلامت نے ہر چیز کا ذائقہ چکھا۔ اور بے حد تعریف کی۔ کہ دو صد کھانے اور ایک سے ایک بڑھکر۔ خیر ہاتھ دھوئے۔ اور محل میں واپس تشریف لے آئے ٭ اگلے دن بادشاہ نے بیربل سے کہا "ہاں! بیربل آج تیسرا دن ہے۔ بتلاؤ۔ میرے ماں باپ کیسے بھوکے مر گئے"؟ بیربل نے عرض کیا۔ "اس سوال کا جواب تو حضور کو کل شام کو ہی مل گیا تھا" فرمایا۔ "کیسے"؟ عرض کیا۔ "حضور غور فرمائیں اگرچہ حضور پیٹ بھر کر کھانا تناول فرما چکے تھے۔ اور ایک لقمہ کی بھی گنجائش نہ تھی۔ لیکن اسکے باوجود دو صد کٹوریوں میں سے ہی آپ نے کچھ کھا لیا۔ تو اگر حضور ایک دن کھا کر اتنی بھوک باقی رکھ سکتے تھے۔ تو حضور کے باپ دادا تو ۶۰-۷۰ برس کی عمر میں مرے۔ وہ اتنی عمر میں کسقدر بھوکے رہے ہونگے؟ اسی لئے میں نے عرض کیا۔ کہ وہ بھوکے مر گئے" ٭ بادشاہ سلامت بیربل کی ذہانت و فراست دیکھ اچھل پڑے۔ اور انعام و اکرام بخشا غرض ہر انسان کی یہ حالت ہے۔ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی بھوکا مر جاتا ہے۔ خواہشات کے بعد خواہشات سامنے آ کھڑی ہوتی ہیں۔ ایک بھوک مٹتی نہیں کہ دوسری شروع ہو جاتی ہے۔ اور اسی رد و کد میں انسان بھوکا مر جاتا ہے ٭



بچہ

پتہ نہیں۔ میں تجھے کیوں پیار کرتا ہوں؟ میں بھی نہیں جانتا ٭ لیکن جب میرے دل کو غم کے بادل گھیر لیتے ہیں۔ اور وہاں تاریکیاں چھا جاتی ہیں۔ خاموشیوں کا تسلط ہو جاتا ہے۔ تجھے اپنی گود میں اٹھا لیتا ہوں۔ اور تب مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے کوئی دنیا بھر کی بہاریں میرے اجڑے چمن میں کھینچ لایا ہے۔ میٹھے اور لمبے گیتوں کی حسین دنیا میں مجھے بٹھا دیا۔ لیکن پھر بھی اے مسکراہٹ کے دیوتا! . . . . مجھے پتہ نہیں . . . . میں تجھے . . . . . کیوں پیار کرتا ہوں؟ . . . . یہ ابھی تک میں بھی نہیں جانتا ٭



(۲)

اے خوبصورت جادوگر۔ تمہاری آنکھوں میں پھول ہیں . . . . تمہارے لمبے لمبے بالوں میں دنیا بھر کا . . . . . حسن لپٹا ہے۔ تمہارے ہونٹوں پر . . . . . . لا انتہا چاندنی راتیں ہیں۔ . . . . تمہارا جسم گیتوں سے بنایا گیا ہے . . . . میں تمہاری تصویر کن لفظوں میں کھینچوں؟ دنیا میں ان لفظوں کا موجد ابھی پیدا نہیں ہوا۔ جب تم پیدا ہوئے۔ تم اے خوبصورت جادوگر ٭

(۳)

وُہ دُنیا کتنی خوبصُورت ہوگی۔ کتنی! جہاں سے تُم آگئے ہو۔ اور جہاں سے جانے والوں کو دو ہی چیزیں ملتی ہیں۔ ایک گیت دُوسری گراہٹ۔ جن میں خواب کی سی مٹھاس ہوتی ہے۔ اور تاروں کی سی خوبصُورتی شاید اِنہی دو چیزوں سے تُم اِتنے خوبصُورت دِکھائی دیتے ہو۔ اِتنے پیارے لگتے ہو۔ کہ دُنیا کو پاگل بنا رہے ہو۔ دُنیا کو مدہوش کر رہے ہو لیکن دیکھو۔ اِن چیزوں کو اِس معصُوم بہن کی بڑی قدر کرو۔ یہ بُہت جلدی چلی جائیگی۔ اِسی طرح جسطرح باغ سے دِھیرے دِھیرے چلی جاتی ہے *

مشاہیرِ مذاہب کے اقوال

۱۔ اپنی رُوح کو نیک خیالات۔ نیک الفاظ اور نیک اعمال سے پاک کر لو * ... (حضرت زرتشت)

۲۔ جو کچھ اپنے لئے قابلِ نفرت معلُوم دے وُہ کسی اور اِنسان کے ساتھ روا نہ رکھو * ... (ربّی خلیل)

۳۔ گُناہ کا آغاز مکڑی کے تار کی مانند اور نازک ہوتا ہے۔ مگر انجام جہاز کے رسّے کی مانند مضبُوط اور ناقابلِ شکست ہوتا ہے * ... ... (عقبہ بن یُوسف)

۴۔ سب سے بڑی عظمت اُسے حاصل ہے جو پانی کی طرح دُوسروں کو فائدہ پہونچاتا ہے۔ اور بغیر کسی پس و پیش کے اُس ادنٰے سے ادنٰے جگہ کو بھی پُر کر دیتا ہے۔ جسے کہ اور سب ناپسند کرتے ہیں * ... (مہاتما لاؤتزی)

۵۔ اپنے دُشمنوں سے بھی مہربانی سے پیش آؤ۔ کیونکہ درخت اُس شخص پر سے بھی اپنا سایہ نہیں ہٹاتا۔ جو کلہاڑا لیکر اُسے کاٹنے آتا ہے * ... ... (ہندُو دھرم)

۶۔ (۱) قتل و خُونریزی (۲) چوری (۳) بے عصمتی (۴) جھُوٹ۔ اِن چار بڑے گُناہوں سے بچو۔ اور دُنیاوی ساز و سامان کے موہ (جھُوٹی محبّت) میں نہ پھنسو * ... (مہاویر سوامی)

۷۔ اپنے گُورُو۔ والدین۔ بیوی بچّوں۔ دوستوں۔ ساتھیوں۔ نوکروں اور رُوحانی رہنماؤں کے لئے اپنے فرائض کو پایہ تکمیل تک پہنچاؤ * ... ... (بُدھ دھرم)

۸۔ اعتماد زندگی کی اِبتدا ہے اور محبّت اس کی اِنتہا * ... (سینٹ اگناسی اس)

۹۔ نیک اِنسان کی تین علامات ہیں:۔ (۱) سمُندر کی مانند فیاض ہو۔ سُورج کی مانند مہربان۔ اور زمین کی مانند مُنکسر المزاج * ... ... (بایزید بسطامی)

۱۰۔ ہمیشہ اکلِ حلال (قوّتِ بازو سے پیدا کی ہُوئی روزی) کھایا کرو۔ اِس سے اخلاق وسیع ہوتا ہے۔ گُناہ کرنے کی طرف طبیعت راغب ہوتی ہے۔ نہ وقت ملتا ہے۔ نیک ذات خصلتیں بن جاتی ہیں۔ دِین دُنیا دونوں سنورتے ہیں * (حضرت محمّد صلعم)

سکوتِ شوق

یہ سکوتِ عالمِ آرزو ہی نمو و جذب تمام ہے
نہیں جس کو وسوسۂ سحر یہ وہ بزمِ شوق کی شام ہے
یہ وہ ہے ترانۂ آفریں کہ مرادِ بیاں کہیں جسے
یہ وہ ہے سلامِ دلِ حزیں ابدی نماز کہیں جسے
یہ وہ کیف ہے کہ جو بار بار خرابِ ہوش نہ ہو سکے
یہ وہ سوز ہے جو خموش ہو تو کبھی خموش نہ ہو سکے
جو پرے ہے سرحدِ شوق سے وہ سکوتِ شوق نہاں ہے یہ
نہیں جس کے بعد کوئی خزاں وہ چمن فروزِ خزاں ہے یہ
ہے طلوعِ نغمۂ جاوداں یہ نہیں شکست صدائے عشق
کہ بہ ہر نفس کوئی بے خبر یہ سنا کرے گا کہ ہائے عشق
یہ فراق وہ ہے کہ جس کو بار ملا کنارِ وصال میں
یہ وہ داغ ہے جو ابھر رہا ہے ردائے نازِ جمال میں
یہ وہ حالِ سوزِ دوام ہے جو بیاں بھی ہو تو بیاں نہ ہو
یہ وہ رازِ شوقِ مدام ہے جو عیاں بھی ہو تو عیاں نہ ہو
یہی اجتناب تو غازۂ رخِ اشتیاق تمام ہے
یہ گریز وہ ہے کہ جس کے بعد ہر اک گریز حرام ہے
جو ہنوز پردۂ ہوش میں ہے چھپا ہوا وہ جنون ہے یہ
دلِ دوست جس سے تڑپ اٹھے گا وہ دلگداز سکوں ہے یہ
یہ وہی ہے بھول کہ جس کی یاد کسی کے دل کو ستائے گی
یہ وہ خواب ہے کہ اثر سے جس کے کسی کو نیند نہ آئے گی
ہے یہ وہ رنگِ غرورِ حسن ہے وہ نقشِ بے خبری ہے یہ
ہے اسیرِ شوخیٔ نازِ حسن یہیں وہ دامِ بے اثری ہے یہ
یہی اک خلاصۂ مختصر ہے حدیثِ راز و نیاز کا
کہ سکوتِ شوق جواب ہے کششِ تغافلِ ناز کا

دُنیا میں چند دِن کا مہمان

ٹینی گھسیٹا دمہ کا پُرانا مریض تھا۔ جب وُہ کھانستا تھا۔ تو ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ اُس کی پسلیاں ٹوٹ جائینگی۔ کلیجہ مُنہ سے نکل پڑے گا۔ اور سُننے والے اظہارِ افسوس کرتے ہُوئے کہتے تھے ”یہ غریب چند دِن کا مہمان ہے“۔ یہ واقعہ ہے کہ غریب ”ٹینی گھسیٹا“ سالہا سال سے دُنیا میں چند دِن کا مہمان تھا۔ گاؤں کے مکانوں پر رنگ اور سفیدی پھیرنا۔ یہی اُس کا ذریعہ معاش تھا۔ وُہ روزانہ صُبح چُونے کی ہانڈی۔ رنگ کی کوچی اور سیڑھی لیکر کام کی تلاش میں نکل جاتا تھا۔ اُسے گلیوں میں صدا لگانے کی ضرورت نہیں تھی۔ اُس کی خوفناک کھانسی ہی سے لوگوں کو اُس کے آنے کی اطلاع ہو جاتی تھی۔ اور گاؤں کی عورتیں اپنے گھروں کے اندر کہتی تھیں ”غریب کو اپنا پیٹ پالنے کے لئے کس قدر سخت کام کرنا پڑتا ہے۔ چُونا ”ٹینی گھسیٹا“ کے پھیپھڑے کھائے جا رہا ہے۔ رنگ پھیرنے کا کام تو اور بھی مُضر ہے۔ آہ! غریب دُنیا میں چند دِن کا مہمان ہے“۔ ”ٹینی گھسیٹا“ کسی مکان کی دیوار پر سفیدی پھیرنے کے لئے کھانستا ہُوا سیڑھی پر چڑھتا تھا۔ وُہ اپنا کام کرتا تھا۔ اور کھانسی اپنا کام جاری رکھتی تھی۔ اُس کا چہرہ کمر دِن میں لپٹے ہُوئے میلے انگوچھے کی طرح زرد تھا۔ گاؤں والوں کو اُس سے بہت ہمدردی تھی۔ ہر جگہ اُسی کو بُلایا جاتا تھا۔ اور مزدوری کے علاوہ لوگ ازراہِ ہمدردی اُسے جوار کی ایک روٹی یا مُٹھی بھر ستّو بھی کھانے کے لئے دیتے تھے۔ لوگ اُس سے ہمدردی کیوں نہ کرتے۔ غریب دُنیا میں چند دِن کا مہمان تھا۔ گاؤں کے ویدجی اُس کے عِلاج سے مایُوس ہو چُکے تھے۔ لوگ روزانہ اُس کے مرنے کی خبر سُننے کے لئے تیار رہتے تھے۔ لیکن ”ٹینی گھسیٹا“ کو اپنے مرنے کی زیادہ پروا نہ تھی۔ وُہ بہت ہنس مُکھ اور خوش مزاج تھا۔ وہ کہتا تھا کہ ”جب وُہ دُنیا میں چند دِن کا مہمان ہے۔ تو کیوں نہ اپنی زندگی ہنس بول کر گزار دے“۔ شام کو ٹھاکر جی کی بغیا میں دِن بھر کے تھکے ماندے کسان جمع ہوتے۔ سب مِل کر آلہا گاتے۔ ٹینی گھسیٹا ڈھولک بجاتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ اُس کی کھانسی نہیں رُکتی تھی۔ لیکن ڈھولک پر اُس کا ہاتھ بھی نہیں رُکتا تھا۔ کبھی کبھی وُہ سب کے ساتھ مِل کر گانا بھی شروع کر دیتا تھا۔ اُس کی آواز بہت سُریلی تھی۔ ایک تان لگاتا۔ تھوڑی دیر کھانستا رہتا۔ پھر دُوسری تان لگاتا۔ اُسے جب کوئی رحم دِل کسان تھوڑی سی دیسی شراب پینے کے لئے دے دیتا۔ تو اُسکی گرمی سے وُہ ناچتا بھی خُوب تھا۔ اُسے ناچ کے لئے ڈھولک کی تھاپ کی ضرورت نہیں تھی۔ وُہ یہ کام اپنی کھانسی سے لیتا تھا۔ گانا بجانا ختم ہوتا۔ کِسان سُلفے کے آخری کش لگا کر اپنے اپنے گھروں کو آپس میں باتیں کرتے ہُوئے رُخصت ہوتے ”ٹینی گھسیٹا بڑا اچھا آدمی ہے ...... کیسا ہنس مُکھ ہے ...... ڈھولک کتنی اچھی بجاتا ہے

گاتا خوب ہے مگر ...... آہ! یہ غریب دُنیا میں چند دن کا مہمان ہے ......" +

گاؤں میں جب کسی کے گھر بچہ پیدا ہوتا - کوئی مر جاتا - کسی کی شادی ہوتی - تو ٹیٹی گھسیٹا کی بن آتی - وہ ایسے موقعوں پر ضرور پہونچتا - لوگ اُس سے ہمدردی کا برتاؤ کرتے تھے - اور اُسے کھانے پینے کو خوب مِل جاتا تھا وُہ اپنی خطرناک بیماری کے باوجود سب کچھ کھاتا تھا - اور گاؤں والے بھی یہ سمجھتے تھے - کہ "ٹیٹی گھسیٹا" کے لئے کسی پرہیز کی ضرورت نہیں ہے - کیونکہ "وُہ دُنیا میں چند دن کا مہمان ہے" +

بیمار - کمزور - دمہ کا مریض ٹیٹی گھسیٹا جو دُنیا میں چند دن کا مہمان تھا - اب تک اپنی دو بیویوں کو یکے بعد دیگرے سپردِ آتش کر چکا تھا - پہلی بیوی نے محض گھسیٹا کی بے کسی پر ترس کھا کر اُسکے ساتھ شادی کر لی تھی - وُہ کہتی تھی "میرا اور اُس کا ساتھ ہی کتنے دن کا رہے گا - یہ غریب دُنیا میں چند دن کا مہمان ہے" لیکن چند دن کا مہمان "ٹیٹی گھسیٹا" تو بدستور دُنیا میں چند دن کا مہمان بنا رہا - اور اُس کی بیوی نمونیا کا شکار ہو گئی + دُوسری بیوی نے ٹیٹی گھسیٹا کے گھر میں دو چار برتن - اور تھوڑی سی پونجی دیکھ کر شادی کی تھی - وُہ سمجھتی تھی - کہ ٹیٹی گھسیٹا تو چند دن میں سفرِ آخرت اختیار کرے گا - اور اُس کی رقم اُسکے ہاتھ آ جائیگی - اِس کے بعد وُہ جس کے ساتھ چاہے گی دوبارہ شادی کر لے گی لیکن یہ بیوی بھی "چند دن کے مہمان ٹیٹی گھسیٹا" کا ترکہ حاصل کرنے کی تمنا دِل میں لئے ہوئے چل بسی +

اب گاؤں میں خبر گرم تھی - کہ ٹیٹی گھسیٹا اپنی تیسری شادی کرنا چاہتا ہے - اور بیس اکیس سال کی ایک نوجوان عورت اُسکے ساتھ شادی کرنے کے لئے تیار بھی ہے - لوگ کہتے تھے - کہ گھسیٹا کو تو آخر اپنا گھر بسانے کی فکر کرنی ہی چاہئے - بیوی اُسے دو روٹیاں تو پکا کر کھلاویگی - مگر یہ عورت کس قدر سنگ دل ہے کہ محض گھسیٹا کے گھر بار پر قبضہ کرنیکے لئے اسکے ساتھ شادی پر تیار ہے - کیونکہ وُہ دُنیا میں چند دن کا مہمان ہے + ٹیٹی گھسیٹا کی ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی اور کھیت سے ملا ہوا گاؤں کے چودھری پانڈے بھائیوں کا عالیشان مکان تھا - یہ تین بھائی تھے - اور تینوں بااثر - ایک ڈسٹرکٹ بورڈ کا چیئرمین تھا - دُوسرا مُعزز زمیندار ...... اور تیسرا سیوا آشرم کے مشہور خیراتی ادارے کا خزانچی - تینوں بھائی بہت قوی ہیکل اور تنومند تھے - اور اُن کی شادیاں نہیں ہوئی تھیں + گاؤں میں اُن کا مکان بہت وسیع اور شاندار تھا - اور اُنہوں نے اُسے کافی [illegible] خرچ کر کے بہت محنت سے تعمیر کرایا تھا - کسی کسان کی چھوٹی سی بنجر زمین خریدی - اور کسی کی ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی ایک کا کھیت لیا - دُوسرے کا ملبہ - کھنڈر گرائے - اُونچی نیچی زمین برابر کرائی - تب کہیں جا کر سالہا سال میں یہ عالی شان عمارت تیار ہوئی - اور اب بھی اُس کی تکمیل کے لئے اُنہیں ٹیٹی گھسیٹا کی جھونپڑی اور کھیت کی ضرورت تھی + تینوں بھائی آپس میں کہتے تھے - "ٹیٹی گھسیٹا تو دُنیا میں چند دن کا مہمان ہے - ہمیں اس کی زمین مفت

ہی مل جائیگی "۔

لیکن جب ٹینی گھسیٹا عرصے تک دُنیا میں چند دن کا مہمان بنا رہا۔ تو انہیں فکر ہوئی۔ کہ کوٹھی کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے یہ زمین کسی نہ کسی طرح خریدی لینی چاہئے۔ پتہ نہیں۔ ٹینی گھسیٹا کے بعد کون شخص اِس کا وارث بن بیٹھے۔ اور وُہ زمین کی قیمت کیا طلب کرے؟ پانڈے بھائیوں نے ہر طریقے سے "ٹینی گھسیٹا" کو سمجھانا بجھانا اور اُس پر زور ڈالنا شروع کیا۔ لیکن وُہ کسی طرح اپنی زمین فروخت کرنیکے لئے تیار نہیں ہوتا تھا۔ وُہ ہر مرتبہ اپنا سر ہلا کر کھانستے ہوئے کہتا تھا۔

"حضور! میں آپ کا ہر حکم پورا کرنے کے لئے تیار ہوں۔ لیکن اپنے باپ دادا کی زمین نہیں بیچ سکتا۔ آپ جانتے ہیں۔ کہ مَیں بیمار آدمی ہوں۔ میری کے دن کی زندگی ہے۔ ذرا صبر کیجئے۔ چند دن کے لئے میرا گھر مجھ سے نہ چھڑایئے۔ مَیں اِسی جگہ مرنا چاہتا ہوں۔ جہاں میری ماں مری تھی۔ باپ دادا مرے تھے۔ تھوڑے دِنوں کی بات اور ہے۔ مَیں مر جاؤں۔ پھر آپ خوشی سے اِس زمین پر قبضہ کر لیجئے گا۔ میرا کون وارث بیٹھا ہے "؟

پانڈے بھائیوں نے "ٹینی گھسیٹا" کو اب دھمکیاں دینی شروع کیں۔ لیکن وُہ بھی بے اثر رہیں۔ اُنہوں نے اِس سے کام لینا بند کر دیا۔ گاؤں کے لئے دُوسرے ڈھولک بجانے والے کا اِنتظام کر دیا گیا۔ کسانوں کو حکم دیا گیا۔ کہ وُہ ٹینی گھسیٹا کو اپنی محفلوں میں نہ بلائیں۔ اور اُس کا حُقہ پانی بند کر دیں۔ ٹینی گھسیٹا کو اِس بات کا بہت صدمہ ہوا۔ اُسے بخار آنے لگا۔ کھانسی بڑھ گئی۔ وُہ اب اِس قدر زور شور سے کھانستا تھا۔ کہ راتوں کو لوگوں کی نیند حرام ہو جاتی تھی۔ اُس کی بیماری کے ساتھ ہی گاؤں والوں کی ہمدردی بھی بڑھ گئی۔ وُہ کہنے لگے۔ کہ یہ تینوں بھائی کس قدر بے رحم ہیں۔ ایسے شخص کو ستا رہے ہیں جو دُنیا میں چند دن کا مہمان ہے "۔

اُنہوں نے پانڈے بھائیوں کے مقرر کئے ہوئے ڈھولک بجانے والے کا بائیکاٹ کر دیا۔ اور "ٹینی گھسیٹا" کی مزدوری بڑھا دی۔ صرف یہی نہیں۔ ڈسٹرکٹ بورڈ کے الیکشن کا زمانہ قریب آیا۔ گاؤں والوں نے فیصلہ کر لیا۔ کہ وُہ مینڈا کو بورڈ میں بھیجنے کے بجائے ٹینی گھسیٹا کو اپنا نمائندہ منتخب کرینگے۔ سیاسی تحریکات کا زمانہ۔ کسانوں میں دوڑی ہوئی بیداری کی لہر۔ تینوں بھائی بہت گھبرائے۔ اور ٹینی گھسیٹا سے صُلح کر لینے ہی میں انہیں خیر نظر آئی۔ اُنہوں نے ٹینی گھسیٹا کو بلا کر کہا۔ "میاں گھسیٹا! ہمارا تمہارا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ہماری اور تمہاری کئی پشتیں اِس گاؤں میں گزریں۔ اور تمہارے بزرگوں نے ہمیشہ ہمارے بزرگوں کی خدمت کی۔ اب تم ہمارے خلاف کیوں ہوتے ہو"؟ ٹینی گھسیٹا نے کھانستے ہوئے جواب دیا۔ "حضور! مَیں تو اب بھی آپ کا غلام ہوں۔ آدھی رات کو حکم دیجئے۔ تو آپ کے لئے کنوئیں سے پانی کھینچ لاؤں۔ میرے باپ دادا نے آپ لوگوں کی خدمت کی۔ اور مَیں بھی یہ چاہتا ہوں۔ کہ میری جو چند دن کی زندگی ہے۔ وُہ آپ کی خدمت کرتے ہوئے گزر جائے۔ لیکن .... "۔ چیئرمین نے کہا "نہیں نہیں۔ ہم تمہیں ناراض کرنا نہیں چاہتے۔ تم جانتے ہو۔ کہ تمہاری زمین سو روپے سے زیادہ قیمت کی نہیں۔ ہم تمہیں ڈیڑھ سو روپیہ

دے رہے تھے۔ چلو۔ دس بیس روپے اور سہی۔ تم خوش رہو"۔

ٹینی گھسیٹا نے کچھ بولنا چاہا۔ مگر کھانسی نے گلا پکڑ لیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ کھانسی کی شدت سے اُس کا سینہ پھٹا جا رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد جب سکون ہوا۔ تو بولا "حضور! میں آپ کا۔ اور یہ زمین بھی آپ کی۔ لیکن مجھے دُنیا میں اب جینا کتنے دن ہے۔ میں اپنے باپ دادا کے گھر میں مرنا چاہتا ہوں"۔

تینوں بھائیوں نے سوچا۔ واقعی ٹینی گھسیٹا ٹھیک کہتا ہے۔ اِس کا مرض بڑھ چکا ہے۔ یہ زیادہ دن زندہ نہیں رہ سکتا۔ اگر بہت جیئے گا۔ تو سال چھ مہینے۔ لہذا چند دن کے لئے اِسے ستا کر کیوں سارے گاؤں کی ناراضگی مول لیجائے جو بھائی سیوا آشرم کا خزانچی تھا۔ اُس نے کہا "میاں گھسیٹا! تم جانتے ہو۔ کہ میں بہت رحم دل آدمی ہوں۔ اور تم غریبوں ہی کی امداد کے لئے میں نے "سیوا آشرم" قائم کر رکھا ہے۔ میں تمہارے سامنے ایک تجویز پیش کرتا ہوں۔ کہ جس میں صرف تمہارا ہی فائدہ ہے۔ تم زمین کا پٹہ ہم تینوں بھائیوں کے نام کر دو"۔

ٹینی گھسیٹا چونک کر کھانستے ہوئے بولا "پٹہ آپ کے نام کر دوں.........."۔

زمیندار نے کہا "پہلے پوری بات تو سُن لو"۔ خزانچی نے اپنی گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا "تم زمین کا پٹہ ہمارے نام کر دو۔ اور جب تک زندہ ہو۔ اپنے مکان پر قابض رہو۔ زمین کا لگان بھی ہم تمہیں معاف کرتے ہیں۔ اور تمہاری زندگی بھر تم کو سو روپے سالانہ ادا کرتے رہینگے۔ یہ لو پہلے سال کے سو روپے"۔ ٹینی گھسیٹا کی کھانسی کے شور میں روپوں کی جھنکار دب گئی۔ اُس نے کہا "لیکن حضور! میں تو دُنیا میں دو چار دن کا مہمان ہوں"! خزانچی نے کہا "تم ہماری بات اچھی طرح سمجھے۔ زمین کی قیمت چلو ہم دو سو روپے قرار دیتے ہیں۔ تمکو پہلے سال کے سو روپے بھی مل گئے۔ یہ تم خرچ کرو۔ اگر تم خدانخواستہ چند دنوں میں مر گئے۔ تو ہم باقی سو روپے تمہارے آخری مراسم اور تمہارے نام پر خیرات میں صرف کر دینگے۔ لیکن اگر چار برس زندہ رہے۔ تو تم کو دو سو کے بجائے چار سو۔ اور اگر پانچ برس زندہ رہے تو پانچ سو روپے مل جائینگے۔ کہو بھئی۔ یہ سودا کیسا رہا؟" ٹینی گھسیٹا خوش ہو گیا۔ کھانستے ہوئے بولا "حضور مجھے تو یہ سال بھی خیریت سے کٹتا نظر نہیں آتا"۔ اُس پر کھانسی کا حملہ ہوا۔ اور وہ کھانستے کھانستے نیم مردہ ہو گیا۔ ٹینی گھسیٹا نے سو روپے اپنی جیب میں رکھے۔ زمین کا پٹہ مندرجہ بالا شرائط کے ساتھ تینوں بھائیوں کے نام کر دیا گیا۔ ٹینی گھسیٹا بہت خوش تھا۔ کہ وہ اب اپنے باپ دادا کے مکان میں مر سکے گا۔ لیکن گاؤں والوں کو افسوس تھا۔ وہ کہتے تھے۔ کہ تینوں بھائی کس قدر چالاک ہیں۔ اُنہوں نے صرف سو روپے میں ایک غریب آدمی کی جھونپڑی اور زمین ہتھیا لی۔ بھلا "ٹینی گھسیٹا" دوسرے سال کی رقم لینے کے لئے کیا زندہ رہیگا۔ اور مرنے کے بعد کون کس کے نام پر خیرات کرتا ہے؟

کئی سال گذر گئے۔ اور بڑا بھائی جو ڈسٹرکٹ بورڈ کا چیرمین تھا "چند روز کے مہمان" ٹینی گھسیٹا کی زمین کو اپنی کوٹھی میں شامل کرنے کی تمنا دل میں لئے ہوئے اِس دُنیا سے رخصت ہو گیا۔ ٹینی گھسیٹا ہر سال اپنے سو روپے

وصول کرنے کے لئے دونوں بھائیوں کے پاس پہونچتا تھا۔ وہ ناک بھوں چڑھا کر اُسے شرط کے مطابق رقم دیتے تھے۔ اور ہر مرتبہ دُعا کرتے تھے۔ کہ یہ قسط آخری قسط ہو + لیکن اُن کی یہ دُعا بارگاہِ خداوندی میں قبول نہ ہوئی۔ اور دُوسرا بھائی بھی جو زمیندار تھا۔ مرگیا + ٹینی گھسیٹا اب زمین کی مُعینہ قیمت سے کئی گُنا زیادہ روپیہ وصول کر چُکا تھا۔ لیکن گاؤں والے یہی کہتے تھے۔ کہ خزانچی بہت خوش نصیب ہے۔ اُسنے ٹینی گھسیٹا کی زمین کوڑیوں کے مول حاصل کر لی کیونکہ وہ غریب دُنیا میں چند دِن کا مہمان ہے +

نیا سال شروع ہوا۔ ٹینی گھسیٹا اپنی سالانہ قسط وصول کرنیکے لئے تیسرے "بقیۃ المرگ" بھائی کے پاس پہونچا اُسکی صُورت دیکھ کر خزانچی کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ جی چاہا۔ کہ ٹینی گھسیٹا کا گلا پکڑ کر گھونٹ دے۔ بولا "ارے تُو ابتک زندہ ہے؟ کیا تو کبھی نہیں مریگا؟" ٹینی گھسیٹا کھانستے ہوئے بولا "حضور! آپ مجھے کیوں کہتے ہیں؟ میں تو آپ ہی مر رہا ہوں۔ دمہ کا پُرانا مریض اِس دُنیا میں اور چند دِن کا مہمان ہوں" + خزانچی نے بادلِ ناخواستہ اُسے روپے کی سالانہ قسط ادا کردی۔ ایک ہی قسط نہیں نہ جانے کتنی قسطیں! "وہ چند دن کا مہمان" اور دمہ کا پُرانا مریض ٹینی گھسیٹا کی قسطیں ہی ادا کرتے کرتے مرگیا + تیسرے بھائی کے مرنے کے کئی سال بعد ٹینی گھسیٹا نے بھی سو برس کی عُمر میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ کیونکہ وہ دمہ کا مریض پچھتّر سال سے دُنیا میں چند دِن کا مہمان تھا" +

بھارت ورش کا فنِ تصویر

قدیم ہندوستان نے جیسے دیگر صنعت گری کے شعبوں میں کمال حاصل کیا تھا۔ اسی طرح بُت سازی اور فنِ تصویر میں بھی خوب نام پایا تھا۔ اِس بدنصیب مُلک کی اگرچہ ہزاروں لاثانی اور بیش قیمت مُورتیوں کا متعصّب ہاتھوں نے قلع قمع کیا۔ تلواروں اور ہتھوڑوں کی متواتر چوٹوں نے اُن کو مٹّی میں مِلا دیا۔ تاہم اب بھی بودھوں کے زمانہ کی عمارات میں اُن کے جو نمونے پائے جاتے ہیں۔ وہ نہایت ہی قابلِ قدر اور قابلِ تعریف ہیں۔ اِسکے علاوہ ہندوستان کے کاریگر ہاتھوں نے جو گلکاریاں تبت۔ نیپال۔ لنکا اور جاوا وغیرہ میں کی ہیں + اُنہیں دیکھ کر لوگ دنگ رہ جاتے ہیں۔ اور بلاشُبہ دل کھول کر ہندوستانی کاریگروں کے کمال کی داد دینی پڑتی ہے + مغربی عُلماء میں یہ بہت نقص ہے کہ وہ دیگر ممالک کے علوم اور صنعت گری کو تنگدل نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ اور اِس وجہ سے ولائت کے بُت ساز اِس مُلک کی مُورتیوں پر کبھی یہ نقص عاید کرتے ہیں۔ کہ وہ آرٹ کے اصُولوں کے مُطابق نہیں۔ کبھی یہ کہتے ہیں کہ وہ دیکھنے میں قُدرتی خوبصُورتی کے لحاظ سے بالکل ہی گری ہوئی ہیں۔ بسا اوقات کہتے ہیں۔ کہ قدیم ہندوستان کے کاریگروں نے مُورتیوں کے بنانے میں گریس دیش کے کاریگروں کا چربہ اُتارا ہے۔ اِسی قسم کے مین میکھ نکالا کرتے ہیں۔ اور اِسکے

غیر انہیں چین نہیں آتا ۔ حیرت کی بات ہے کہ جہاں اس قدر باریک بین اور بلند خیال نقاد ہیں۔ وہاں کچھ نقص نکالنے والے بھی ہیں۔ اُن کی آنکھیں ایسی ہیں۔ کہ وُہ نقص کو ہی دیکھتی ہیں۔ خوبیوں پر اُن کی نظر نہیں پڑتی مگر بعض غیر متعصب بھی ہیں۔ جن میں تنگدلی اور تعصب کا نام نہیں۔ انہیں میں سے ایک صاحب "ای۔ بی۔ ہیول" ہیں۔ وُہ کلکتہ میں سکول آف آرٹس کے پرنسپل تھے۔ بعد میں پنشن لیکر ولائت چلے گئے۔ آپ نے بُت سازی اور فن تصویر کے متعلق ایک نہائت ہی قابل قدر باتصویر کتاب شائع کی ہے۔ یہ آپ ہی کی تصنیف ہے۔ اس میں آپ نے ہندوستان کے فن تصویر اور بُت سازی کی بہت تعریف کی ہے۔ انہوں نے اس بات کو دلائل سے ثابت کیا ہے۔ کہ اس فن کے حصول میں کسی دیگر ملک کے نام کے لئے قرضدار نہیں۔ یہ تمام حالات ہم آپ کی کتاب سے ہی لیکر لکھ رہے ہیں۔

"ہندوستان کی قدیم مورتیوں کے عجیب و غریب نمونے تو لنکا۔ نیپال اور تبت وغیرہ میں ملتے بھی ہیں۔ مگر بہت پُرانی تصاویر کے نمونے کہیں نہیں ملتے۔ مورتیاں دھات اور پتھر کی بنتی ہیں۔ اگر توڑی پھوڑی نہ جائیں۔ تو ہزاروں برس تک رہ سکتی ہیں۔ مگر تصویریں کاغذ۔ کپڑے۔ چمڑے یا دیوار وغیرہ پر بنائی جاتی ہیں۔ اسلئے اگر بہت احتیاط اور حفاظت سے کام نہ لیا جائے۔ تو وُہ جلد ضائع ہو جاتی ہیں۔ اسپر بھی اس ملک میں کتنی ہی رنگین تصویریں بہت پُرانی پائی جاتی ہیں۔ اُن سے یہ صاف ظاہر ہے۔ کہ ہندوستان نے بُت سازی کی طرح فن تصویر میں بھی بڑی ترقی کی تھی۔ دکن کے اجنٹا نامی مقام میں جو گپھا مندر ہیں۔ وُہ عیسوی صدی کے کوئی دو سو برس پہلے کے ہیں۔ یعنی اُن کو بنے ہوئے کوئی دو ہزار برس سے بھی زیادہ ہوئے۔ ان مندروں کی دیواروں اور چھتوں پر جو تصویریں بنائی گئی ہیں۔ اُس کے بعض بعض حصے ابتک موجود ہیں۔ اور اچھی حالت میں ہیں۔ وُہ فن تصویر کے بہترین اور قابل قدر نمونے ہیں۔ انہیں دیکھ کر آجکل کے بھی مغربی مصور انگشت بدندان رہ جاتے ہیں۔ اجنٹا کی ایک مصوری کا تذکرہ ایک ولائتی عالم نے کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔ اس میں انہوں نے تصاویر کے مختلف رنگین اور سادہ نمونے بھی دیئے ہیں۔ ان تصاویر میں سے کئی تصویریں ہندوستان کے معزز اور مشہور و معروف رسالوں میں نکل چکی ہیں۔ اُنکو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ آج سے دو ہزار برس پہلے فن تصویر کی ہندوستان میں بہت ہی قدر و منزلت تھی۔ مگر ہندوستان کی یہی سب سے پہلی تصاویر نہیں۔ رامائن۔ مہابھارت اور پرانوں وغیرہ میں مختلف مقامات پر تصاویر کا جو ذکر ہے۔ اُس سے صاف ظاہر ہے۔ کہ بودھوں کے زمانہ سے بہت پہلے بھی یہاں فن تصویر کمال کو پہونچ گیا تھا۔ راجاؤں اور دولتمندوں کے مکانوں کی دیواروں پر دھارمک اور تواریخی تصاویر کے نظارے نہائت خوبی سے کھینچے گئے ہیں۔ یہی نہیں۔ بلکہ لکڑی اور کپڑے وغیرہ پر بھی تصویریں بنائی جاتی تھیں۔ ملک الشعرا کالیداس نے اپنے ناٹکوں میں تصاویر کی بابت جو ذکر کیا ہے۔ وُہ تصویریں ایسی ہی تھیں۔ کالیداس کے عیسوی کی چھٹی صدی میں بھوبھوتی نے "اُتر رام چرت" میں جن تصاویر پر تنقید کی ہے۔ اُن کے متعلق زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ جنہوں نے "اُتر رام چرت" دیکھا ہے۔ وُہ ضرور

ہی رام چندر کی چتر شالا سے واقف ہونگے "ناگانند" وغیرہ چھٹی صدی کے بعد کے ناٹکوں میں بھی ایسی ہی تصو
کا ذکر ہے ٭ "تکش شلا" - "نالندا" اور "شری دھنیہ کٹک" میں جو "وشو ودیالے" تھے۔ اُن میں دیگر علوم کے
علاوہ فنِ تصویر اور بُت سازی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ سنگلدیپ اور چین تک کے طالب علم اِس فن کے سیکھنے کے
لئے یہاں آتے تھے۔ اُنہیں طالب علموں نے اپنے مُلک میں واپس جاکر ہندوستان کے اِس فن کا پرچار اپنے اپنے
میں کیا۔ اِس کا نتیجہ یہ ہُوا۔ کہ چین ہی نہیں۔ کوریا اور جاپان تک میں ہندوستان کا فنِ تصویر پہونچ گیا۔ ڈاکٹر
اور وان لکاک وغیرہ نے ترکستان میں ریت کے نیچے دبے ہُوئے بودھوں کے ستھوپ اور وہار وغیرہ کھود کر نکالے
اُن کی دیواروں اور چھتوں پر جو گُلکاریاں کی گئی ہیں۔ وُہ قدیم ہندوستان کے "وشو ودیالوں" کی ہی برکت ہے
سنگلدیپ یعنی لنکا کی قدیم عمارتوں میں بھی ہندوستان کے فنِ تصویر کے بنے ہوئے نمونے دیواروں پر ملتے ہیں۔ لنکا
کی ایک جگہ کا نام "سیگریہ" ہے۔ اُس میں اِس قسم کے بہت سے قابلِ قدر کچھ نمونے ابتک موجود ہیں۔ یہ نمونے روم اور
گریس کی پُرانی تصاویر سے نہیں۔ یہاں کی تصویروں کا نقشہ ہندوستان کی تصاویر سے بالکل ملتا جلتا ہے۔ اور
دُوسرے مُلکوں کی تصاویر میں نظر نہیں آتی۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں۔ کہ ہندوستان کی تصویروں میں روم اور گریس کی
تصاویر کا رنگ پایا جاتا ہے۔ وُہ سخت غلطی پر ہیں۔ افسوس ہے۔ اُنہیں اِس مُلک کے کمال سے واقفیت ہی نہیں
وُہ سودیشی اور غیر مُلک کی تصاویر کے عیب و ہُنر میں تمیز ہی نہیں کر سکتے۔ بہت میں کہیں کہیں پُرانی تصاویر کی گُل
ابتک نظر آتی ہیں۔ اُن کا تمام کام ہندوستانی ڈھنگ کا ہے۔ اُس کے کتنے ہی نمونے کلکتہ کے عجائب خانہ میں محفوظ
ہیں۔ اُن تصاویر کا تعلق زیادہ تر بودھوں کے عہد سے ہے۔ بُدھ کی کئی تصویروں کے سوا "اشوک" کی بھی ایک
تصویر وہاں ہے۔ وُہ نہایت خوبصورت اور دلکش ہے۔ اُس میں اشوک ایک بُدھ بھکشو کے لباس میں دکھلائے گئے
بودھوں کے عہد میں فنِ تصویر کی بھی خوب ترقی ہُوئی۔ اور اُسکے کچھ عرصہ بعد بھی اُس کی ترقی کی رفتار نہایت
قابلِ اطمینان رہی۔ ہندو راجاؤں کے محلوں کی دیواروں پر مختلف نظاروں کے نقشے ہمیشہ ہی دکھائے جاتے
رہے۔ مندروں میں بھی اِس کی کمی نہیں رہی۔ کاغذ اور کپڑوں وغیرہ پر بھی تصویریں دکھائی جاتی رہیں۔ اُس زمانہ
کے مندروں کی چترکاری کے نمونے تو ایک آدھ کہیں کہیں ملتے بھی ہیں۔ مگر اُسکے بعد کے نمونے عام طور پر نہیں ملتے
یہ بڑے افسوس کی بات ہے ٭ یہانتک تو ہندوؤں اور بودھوں کے عہد کی بات ہُوئی مسلمانوں کے آنے سے یہاں
کے فنِ تصویر نے ایک نیا رنگ اختیار کیا۔ تیرھویں صدی میں مُغل بادشاہوں نے فارس سے مصوروں کو بُلا کر اپنے
یہاں رکھا۔ اور اُن سے فارس والوں کے ڈھنگ کی تصویریں بنوانی شروع کیں۔ مُسلمانی مذہب میں زندوں کی تصویر
بنانے کی سخت ممانعت ہے۔ جب تک مذہبی تعلیم پر بغداد کے خلیفہ کا اثر رہا۔ تب تک صرف جانوروں۔ پرندوں اور
آدمیوں کی تصویریں نہیں بنیں۔ مگر اُس اثر کے کم ہوتے ہی مسلمان مصور بھی آدمیوں وغیرہ کی تصویریں

ہی یہاں ایک بات اور کہنی ضروری ہے۔ وہ یہ ہے کہ فارس سے ہندوستان آئے ہوئے مصوروں کی گلکاریوں
میں بھی ہندوستانی مصوروں کا عکس موجود رہا۔ بودھوں کے عہد میں ہندوستان کی مصوری ترکستان اور چین
کے ملکوں تک پہونچی۔ جب ترکستان کے منگول وغیرہ موجودہ ٹرکی اور فارس میں گئے۔ تو ہندوستان سے حاصل
کی ہوئی مصوری کا وہاں انہوں نے اچھی طرح رواج دیا۔ اِن ملکوں کی تہذیب اور رسوم کے زیر اثر آکر ہندوستانی
مصوری کچھ کی کچھ بن گئی۔ خدا کی قدرت دیکھئے۔ اتنے الٹ پھیر کے بعد تبدیل شدہ ہندوستانی مصوری کے زیر
پھر انہیں آنا پڑا۔ فارس کے مصور مغلوں کے دربار میں ہندوستان آگئے۔

ہندوستان میں عیسوی کی تیرھویں صدی میں فارس کے ڈھنگ کی تصویروں کی ابتدا ہوئی۔ یہاں اُسوقت
جو اچھے اچھے مصور تھے۔ وہ بھی شاہی دربار میں پہونچے۔ اُن کی موجودگی میں فارس کی مصوری نے بہت کچھ اپنا
رنگ تبدیل کیا۔ گو یہ سب ہوا۔ تاہم مسجدوں اور مقبروں میں لوگوں کی تصاویر بنانے کی ممانعت ہی رہی۔ ہاں
چھتوں اور دیواروں پر بیل بوٹوں اور پھول پتوں کے سوا مختلف مجلسی اور تاریخی نظارے بنائے گئے۔ اور
اِدھر بھی اس قسم کی عجیب و غریب عمدہ ترین تصویریں بنائی گئیں۔ فارسی اور عربی کتابوں میں قابل ذکر واقعات
والے تصویروں میں دکھائے جانے لگے۔ سینکڑوں باتصویر کتابیں بھی تیار کی گئیں۔ انہیں سے بعض کتابیں
اسوقت بھی موجود ہیں۔ جنکی قیمت کا اندازہ ہزاروں نہیں۔ بلکہ لاکھوں تک کیا جاتا ہے۔

تیرھویں سے لیکر عیسوی کی سولھویں صدی تک اِس قسم کی تصویریں بنیں۔ وہ عام طور پر بہت اچھی نہیں
تاہم اُن میں بعض بعض اچھی بھی ہیں۔ کلکتہ کے عجائب خانہ میں اُسوقت کی تصاویر میں سے ایک تصویر بہت عمدہ ہے
اس تصویر میں سلطان محمد تغلق کے دربار میں ناچ کا ایک نظارہ دکھایا گیا ہے۔

اکبر۔ جہانگیر اور شاہجہان مصوری کے بہت قدرشناس بادشاہ ہوئے ہیں۔ اُن کے دربار میں
ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کے مختلف اور قابل مصور ملازم تھے۔ انہیں تنخواہ بھی نہایت معقول ملتی تھی۔ اور ان کی
بنائی ہوئی تصویریں بادشاہوں کے پسند آجانے پر انہیں ہزاروں روپے اور جاگیریں بطور انعام ملتی تھیں۔
ان بادشاہوں کے لئے ”چنگیز نامہ۔ ظفر نامہ۔ امیر حمزہ۔ عیار دانش۔ اکبر نامہ۔ نل دمن اور رامائن
وغیرہ“ باتصویر کتابیں لکھی گئی ہیں۔ انہیں دیکھ کر اس زمانہ کے شاہی مصوروں کی قابلیت دیکھکر انگشت بدندان
ہو جانا پڑتا ہے۔ ”بساون۔ مادھو۔ مہیش۔ جگن۔ بھیم کرن۔ فرخ۔ خواجہ عبد الصمد وغیرہ“ ایسے مشہور
مصوروں میں سے تھے۔ اس زمانہ کی باتصویر کتابوں کے کئی ایک نمونے ولایت کے ”البرٹ میوزیم“ اور کلکتہ کے
عجائب خانہ میں موجود ہیں۔ جے پور اور الور میں بھی اس قسم کی بیش قیمت کتابیں ہیں۔ مہاراجہ جے پور کے دربار میں
”رزم نامہ“ ہے۔ کہتے ہیں۔ اس کے لکھنے میں ”شہنشاہ اکبر“ کے چھ لاکھ خرچ ہوئے تھے۔ پچھلے مغل

بادشاہوں کے زمانہ کی بنی ہوئی بہت سی بے مثل تصاویر راجاؤں۔ جہاراجاؤں کے درباروں میں ابتک محفوظ ہیں۔
بہت عمدہ تصاویر کلکتہ کے عجائب خانہ میں بھی ہیں۔ امر سنگھ کے بیٹے سورج مل کی تصویر بھی انہیں میں ہے۔
اور تصویر بھی بہت اچھی ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے۔ کہ مشعل کی روشنی میں ایک راجکمار اور راجکماری رات کے وقت
ایک دلکش پہاڑی گھاٹی سے گذر رہے ہیں۔ راجکماری ہاتھ اٹھا کر کہہ رہی ہے۔ کہ جہاں ہم کو جانا ہے وہ جگہ سامنے
دکھائی دے رہی ہے جس تصویر میں رات کے وقت لالٹین کی روشنی میں دھنش بان سے ہرنوں کے شکار کا نظارہ
دکھایا گیا ہے۔ وہ تصویر بھی نہایت دلکش ولاثانی ہے۔ محفل رقص وسرود اور زنانہ باغ کے مناظر جن تصاویر میں دکھائے
گئے ہیں۔ وہ بھی بہت ہی دلاویز ہیں۔ یہ تمام تصاویر کلکتہ کے عجائب خانہ میں ہیں۔ ان کا عکس لیکر "ہیول" صاحب
نے اپنی کتاب میں دیا ہے۔ انکی خوبیاں اور دلآویزیاں کچھ اصل تصاویر دیکھنے ہی سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کا دور
تصاویر بنی ہیں۔ ان میں کوئی خاص خوبی نہیں جو مغل بادشاہوں کے خاتمہ ہونے پر "ایسٹ انڈیا کمپنی" کے زمانہ
میں بھی ہندوستانی مصوروں کی کچھ قدر ہوتی رہی۔ کمپنی کے افسر ان سے اپنے اور اپنی میموں کی تصویریں بنواتے
رہے۔ مگر ہندوستان میں فوٹوگراف کا رواج ہوتے ہی ان مصوروں کی روزی ماری گئی۔ اب تو تلاش کرنے سے کہیں کسی
ریاست میں شاید کوئی مصور مل جائے۔ ہاں دکھن کے "راجہ راوی ورما" اور کلکتہ کے "بابو اوتیندر ناتھ ٹیگور" نے
ہندوستانی مصوری کی تھوڑی بہت لاج رکھ لی ہے۔ ان دونو مصوروں کی بہت سی تصویروں نے ملک میں بہت مقبولیت
حاصل کی ہے۔ "ہیول" صاحب کی رائے ہے۔ کہ ہندوستانی مصوروں کو ولایتی رنگ ڈھنگ اور جذبات تخیلات
کی نقل نہ کرنی چاہئے۔ انہیں اپنے ملک۔ دھرم اور سماج کیمطابق بنی ہوئی تصاویر کی قدر کرنی چاہئے۔ قدیم گریس
کی پیروی کرنی مناسب ہے۔ قدیم گریس کا آج پتہ نہیں۔ مگر دنیا اب بھی اسکی بزرگی کے گیت گا رہی ہے۔ قدیم
گریس میں بہت سی خوبیاں تھیں لیکن اگر اس میں فن تصویر کے سوا اور کوئی خوبی نہ ہوتی۔ تو بھی آج اسکے عروج کے
گیت ضرور ہی پہلے ہوتا۔ اگر ہندوستان کی قدیم تہذیب کے دوسرے نشانات نہ ملتے۔ تو بھی زمانہ قدیم میں بنے ہوئے
اسکے اجنتا کے پہاڑوں کی تصویریں اور سانچی کے ستھوپ کی مورتیاں اہل فن کے دلوں۔ قابل مصوروں کو اپنی
زبان حال سے بلاشبہ گرویدہ کر لیتیں۔ اسوقت ہندوستان کی مصوری پر مضحکہ اڑایا جاتا ہے۔ لوگ نقل میں ہی
عقل لڑانے لگے ہیں۔ رنگ۔ ڈھنگ۔ جذبات اور تخیلات سب کی ہی نقل کیجاتی ہے۔ یہ بات اچھی نہیں۔ نقل کرنا
انسانی کمزوری ہے۔ مگر فن مصوری جیسے اعلیٰ اور نازک فن جسکے ذریعہ آنیوالی اولاد اپنے پرانے بزرگوں کے رہنے
سہنے۔ آچار۔ بچار وغیرہ کی جانچ پڑتال کریگی۔ نقل کرنا غیر ملکوں کی۔ جذبہ نکمی تصویروں کا چربہ اتارنا نہایت خراب
اور بالکل لغو حرکت ہے۔ یہ عقل کی غلامی ہی نہیں۔ بلکہ اپنی اولاد کو دھوکہ دینا۔ یا انہیں اپنی تواریخ اور اپنی تہذیب
وغیرہ سے محروم رکھنا ہے۔ اپنی سرسبز اور شاداب جڑ پر آپ ہی کلہاڑا مارنا ہے +

نور و ظلمت

گو نہیں کچھ شبہ کہ ہے جوشِ نمو حیات میں
آٹھ پہر اجل بھی ہے روحِ بشر کی گھات میں

بیم و رجا کے ہیں بہیں کشمکشِ حیات میں
قطعِ مراحلِ صعب عین اندھیری رات میں

رہ نہ سکیگا ذوقِ عشق قیدِ تعینات میں
پڑ نہ سکینگی بیڑیاں رسمِ تکلفات میں

بڑھ چلیں ہم صفات سے محو ہوں حسنِ ذات میں
آؤ لگادیں چار چاند حسنِ تعلقات میں

غفلتوں کی ہیں بدلیاں ظلمتِ کائنات میں
آنکھ جھپک کے رہ گئی چھائی گھٹا جو رات میں

عیش پرستیاں نہیں چھوٹ پڑی ہیں غفلتیں
جو کہ تھیں موجزن مگر قیدِ خمِ حیات میں

چونک کے دیکھ لُٹ نہ یوں رہروِ منزلِ حیات
لوٹ رہے ہیں تجھکو چور گھور اندھیری رات میں

دورِ حیات بھی عذاب اب بعد ممات پھر عذاب
چھوٹ مصائبات سے پڑ نہ مصائبات میں

خون ہے اپنے ہی تو ہے رونقِ رنگِ کائنات
لذتِ زندگی کہاں قیدِ غمِ حیات میں

عیشِ جہاں کی ہڈیاں خون کی اپنی چسکیاں
چھوڑ بھی دے سگِ جہاں تو ہے کس التفات میں

ذوقِ لطیف تر جگا۔ درد میں ڈوب لطف اٹھا
لطف ہے زندگی کا کیا لذتِ بے ثبات میں

ظلمتِ کائنات کی عمر ہے کتنی؟ ایک رات
قافلے کتنے لٹ گئے پر یہاں رات رات میں

پردے اٹھا۔ حجاب اٹھا ظلمتِ غم جو ہے مٹا
آبِ حیات پی پلا نغمۂ خمریات میں

سہل پسندیاں کہاں ہونگی حریفِ مشکلات
مشکلیں اور رکاوٹیں ہیں یہاں بات بات میں

چوّنی

اُس پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ جب بیٹے نے رونی صُورت بنا کر کہا "امّاں۔۔۔ چوّنی (چار آنہ) کھو گئی"

یہ پہلا واقعہ تھا۔ جب امّاں نے اپنی عُمر میں ایسی منحوس خبر سُنی! ورنہ وہ بھی اُس وقت جب اُس کا خاوند پچھلے سال ہی تین بچّے چھوڑ کر مر گیا تھا۔ اور اُس کے گھر میں شب و روز خاک اُڑتی تھی۔

اُس نے چھاتی پیٹ کر پُوچھا۔۔۔ "کہاں"؟

چھوٹے جوّاد نے اور رونی صُورت بنا کر جواب دیا۔ "وہاں قبرستان کے پاس"

امّاں کے مُنہ سے بے اختیار نکل گیا "میرے اللہ۔ اب تو انتہا ہو گئی" جوّاد کے دو بھائی ماں کی بیقراری کو بھانپ کر سہم گئے۔ اُن کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ اور ماں نے کہا۔ "مجھے دِکھا دو وہ جگہ"

جوّاد نے کہا۔ "میں نے بہت تلاش کی۔ نہ ملی۔ وہاں محلّے کے کئی لڑکے کھیلتے تھے۔ جانے اُٹھا کر کون لے گیا۔ ماں کی ممتا غریبی اور افلاس کے پردوں میں چھُپ گئی۔ اُس نے اِس زور کا طمانچہ جوّاد کے مُنہ پر مارا۔ کہ اُس کی نکسیر آ گئی۔ ننّھے کا میلا کُرتہ خُون سے بھر گیا۔ اور روتے روتے اُسکی ہچکی بندھ گئی۔ پیچھے سہمی ہُوئی دو ننّھی جانیں دبک گئیں۔ اور جوّاد کے ساتھ وہ بھی رونے لگیں۔ آج کئی دِنوں کے بعد امّاں کی شبانہ محنت سپھل ہو گئی تھی۔ اور ابھی تک اُسکی اُنگلیوں میں چرخے کے دستے کا نشان تھا۔ چوّنی کے ساتھ اُس کی کتنی ہی اُمیدیں لپٹی ہُوئی تھیں۔ ستو۔ سرسوں کا تیل۔ بمبئی کی چائے۔ نمک اور کچّا نیم۔ یہ سارا سامان چوّنی کے سولہ پیسوں کے عِوض لانا تھا۔ اُسنے پھر گرج کر لیکن نا اُمیدی کے لہجہ میں کہا۔ "مجھے دِکھا دو وہ جگہ۔ میں وہاں ڈھونڈونگی"

روتا ہُوا جوّاد آگے آگے چلا۔ اور نا اُمید ماں پیچھے پیچھے۔ کتنی ہی دیر اُس نے اُجڑے قبرستان کی خاک چھانی۔ لیکن چوّنی نہ ملنی تھی نہ ملی۔ اُسکی آنکھوں کی ساری بصارت قبرستان کے ذرّوں پر خرچ ہو گئی۔ اور داغدار اُنگلیاں خاک کے ڈھیروں کو اُلٹنے پلٹنے پر۔ اندھیرا چھا جانے تک وہ تلاش کرتی رہی جب مایُوس ہو گئی۔ تو اپنی قسمت کو روتی ہُوئی۔ اور جوّاد کو دھکّا دیتی ہُوئی وہ گھر لوٹی۔ راستے میں ایک بُڑھی عورت نے پُوچھا "خیر ہے امّاں؟ چھوکرا کیوں رو رہا ہے"

امّاں آگے ہی آگ بگولا ہو گئی تھی۔ بُڑھیا کی مزاج پُرسی نے اُس کو زیادہ جلا دیا۔ بے پروائی سے بولی "خیر ہے"

لیکن بوڑھوں کے دِل میں جو شفقت اور محبّت کی تری ہوتی ہے۔ وہ جوان دِلوں میں کہاں۔ بُڑھیا نے پھر پوچھا۔ "خیر ہے۔۔۔۔ تو یہ روتا کیوں ہے"؟

امّاں نے دو پٹّے سے آنسو پونچھتے ہُوئے کہا "سَودا خریدنے گیا تھا۔ راستہ میں چوّنی کھو دی"

بُڑھیا نے حیرت سے پُوچھا "تو اسی بات پر اسے مارا ہے۔ لعنت ہے تم پر۔ خدا سے تندرستی مانگو۔ چونی کیا۔ اشرفیوں سے مالا مال کر دیگا" ۔

انّا اپنی قسمت سے واقف تھی جل بُھن کر بولی۔ "مالا مال کریگا۔ اب دُوسری دُنیا میں" ۔

انّا کی اس مایوس حالت سے بُڑھیا کا دِل موم بن کر پگھل گیا۔ اُس نے پیرہن کی جیب سے چونی نکالی۔ اور اسے دیتے ہوئے بولی۔ "...... یہ لو۔ لیکن لڑکے کو مارو مت۔ بے چارہ سردی سے ٹھٹھر رہا ہے" ۔

انّا کی خُودداری جوش میں آ گئی۔ اُسنے تیوریاں چڑھا کر کہا "میں بھکارن نہیں ہوں مزدوری کا ساگ بھتہ کھاتی ہوں" ۔

بُڑھیا نے کہا "اوہ! تم نے مجھے نہیں سمجھا جب چونی ملے تو لوٹا دینا" ۔

چونی دیکھ کر جواد کے سینے کے اندر ننھا سا دِل مینڈک کی طرح اُچھلنے لگا۔ اور انّا نے آہستہ سے ہاتھ بڑھا کر چونی لی لیکن اُسے محسوس ہوا۔ اس چونی اور کھوئی ہوئی چونی میں فرق ہے۔ ورنہ چونی مِل کر جو تسکین اُسے ہونی چاہئے تھی۔ وُہ نہ ہوئی۔ سوچتی رہی۔ وُہ چونی کتنی خوبصورت تھی۔ خالص چاندی کی۔ گول۔ اُبھرے ہوئے ہند سے والی۔ اور بڑھیا کی چونی۔ ہلکی۔ میلی سی۔ بدصُورت ۔ رات کو نہ اُس نے خود کچھ کھایا۔ نہ بچوں کو کچھ کھلا یا۔ ہاں بتا ہی کیا ۔ چھوٹے بچّوں کو روتے روتے ہی نیند آ گئی تھی۔ اور وُہ ایک دوسرے کی گود میں سو گئے تھے۔ جواد کی ناک سے اب تک خُون آ رہا تھا۔ سردی سے ٹھٹھر کر اُس کا دانت سے دانت بجتا تھا ۔

(۲)

دُوسرے دِن پو پھٹتے ہی انّا پھر قبرستان پر پہونچ گئی۔ کافی دیر تلاش کرنے کے باوجود بھی جب چونی نہ مِلی۔ تو لوٹ آئی۔ گھر میں جواد بخار سے کراہ رہا تھا۔ اُس کا چہرہ انگارے کی طرح دہک رہا تھا۔ آہستہ سے اُس نے کہا "انّا" ! انّا اُسکے پاس گئی۔ پھٹی ہوئی چادر اُٹھا کر اُس نے دیکھا۔ جواد تپ رہا ہے۔ پسلیوں پر ہاتھ پھیرا تو جیسے اندر تنور جل رہا ہو۔ انّا نے پوچھا "کیا درد ہے" ؟ جواد نے کہا "ہاں اندر سے جل رہا ہوں۔ اور پسلیوں میں کانٹے چبھ رہے ہیں" ۔ انّا نے کہا "کوئی پرواہ نہیں۔ ابھی گرم پانی کی ایک پیالی سے ٹھیک ہو جاؤ گے۔ چونی نہ کھوٹی ہوتی۔ سردی بھی نہ لگتی۔ میں نہ کہتی تھی۔ راہ چلتے اِدھر اُدھر مت دیکھا کرو۔ لیکن تم میری مانتے ہی کب تھے" ؟

جواد نے ناک کے سِرے سے منجمد خون کو اپنی اُنگلی سے اُٹھاتے ہوئے پوچھا۔ "چونی مِل گئی" ؟

انّا نے کہا "نہیں۔ جائیگی کہیں نہیں۔ مجھے پُورا بھروسہ ہے" ۔

گرم پانی پلا پلا کر نہ جواد کا بخار اُترا۔ اور نہ اُسکے اضطراب میں کمی ہُوئی۔ انّا اُس کی حالت دیکھ کر انگاروں پر لوٹنے لگی۔ لیکن خالی ہاتھوں کیا کرتی۔ محلے میں پُرانی وضع کا ایک حکیم تھا۔ وُہ بیمار کو دیکھتا۔ تو انّا اُسے گھر میں بلا کر کیا دیتی دوا دارُو کہاں سے ... [illegible] ... ایسے

بیمار کو تم یہاں لائی کیسے؟ نہیں دیکھتی دو سو سے اوپر بخار ہوگا۔ اگر راستے میں سردی لگ جائے۔ تو ...... ؟"
انا نے کوئی جواب نہ دیا۔ حکیم نے اس کی نبض دیکھی۔ زبان کا ملاحظہ کیا۔ اور پھر کاغذ پر نسخہ لکھا۔ اور کہا "اسے ڈھک کر لے جاؤ۔ اور گرم کمرے میں رکھو۔ خبردار! سردی نہ لگنے پائے" +

انا بیمار کو لے کر گھر آئی۔ تو اسے نسخہ کی فکر ہوئی۔ پنساری اتنا بدمزاج تھا۔ کہ اس سے ادھار مانگنے کی اسمیں ہمت نہ ہوئی۔ ناچار اسے خاوند کے تعویذ کا خیال آیا۔ جو اسکے خاوند نے اپنے شباب میں ہتھی پور کی چاندی کا بنوایا تھا۔ اس پر ایسے نقش و نگار تھے۔ کہ آج کے تمام سنار دیکھ کر واہ واہ کہہ اٹھتے تھے۔ مٹی کی ہانڈی سے جب اس نے تعویذ نکالا۔ تو اسے گزرا زمانہ یاد آگیا۔ وہ شام یاد آگئی۔ جب اس کے خاوند نے اسے پہن کر مسجد میں نماز پڑھی تھی۔ اور گھر میں انا نے ساری رات پیر صاحب کے کہنے کے مطابق چراغ جلا رکھا تھا + روتی روتی نظروں سے اس نے کئی بار خاوند کی آخری نشانی کو دیکھا اور پھر بازار چلی گئی + تعویذ بیچ کر اور جوشاندہ پلا کر بھی جواد کا بخار نہ گیا۔ اور اس کی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی حتےٰ کہ چھٹے دن اسے سدھ بدھ نہ رہی۔ وہ بہکی بہکی باتیں کہنے لگا۔" انا مل گئی جوتی"؟ اس وقت انا کے دل پر آرے چلتے۔ اور دل کے کسی چھپے کونے میں افلاس اور ماں مامتا کی جنگ چھڑ جاتی۔ کبھی افلاس مامتا پر غالب آتا۔ اور کبھی مامتا افلاس پر چھا جاتی۔ وہ رات جواد نے بہت اضطراب میں بسر کی۔ ہر بار آنکھیں کھول کر اور انا کے چہرے پر نظریں گاڑ کر پوچھتا " انا مل گئی جوتی"؟

اور انا آنسوؤں پر پورے زور سے قابو پا کر کہتی "مل گئی میرے لال!"۔ اور اسی دن صبح جب مسجد سے موذن نے بانگ دی۔ جواد نے زور سے کہا " انا"۔ اور پھر ابدی نیند سو گیا + موذن کی بانگ نے ننھے جواد کی روح کو خدا کی دعوت دی + انا دیوانی سی ہوگئی۔ مامتا کے سمندر میں طوفان آگیا۔ جیسے اسے دنیا کی دولت شہرت اور عزت گھاس کے تنکوں کی طرح بہتی دکھائی دی + خاوند کی دو نشانیاں ہمیشہ کے لئے ہاتھ سے نکل گئیں۔ انگلیوں کے داغ ابھر گئے۔ اور دل میں ایک ناقابل بیان درد نے چھپکے جگہ لی۔ اس کا گھر اب تاریک سے تاریک تر ہوگیا۔ آنکھوں کی بصارت قبرستان کی خاک کیساتھ مل گئی۔ اور ناامیدی کا کاجل ان سے ٹپکنے لگا +

(۳)

ہر جمعہ کو پچھلے پہر انا قبرستان پر جاتی۔ خاوند اور بیٹے کی قبروں کے درمیان بیٹھ کر روتی۔ ان قبروں کی خاک آنکھوں اور گلے پر ملتی۔ اسے اب بھی محسوس ہوتا۔ جیسے چھوٹی قبر کے سبزے سے جواد زور زور سے پوچھ رہا ہے۔" انا! مل گئی جوتی؟ اور آس پاس کے ذرے اسکی قسمت پر ہنستے ہوئے ادھر سے ادھر اڑتے ہوئے اسے پوچھتے۔" مل گئی جوتی"؟ انا آنسو پونچھ کر فوراً اٹھ کھڑی ہوتی۔ چلتے چلتے اس کی نظریں اسی جگہ جہاں جوتی کھو گئی تھی

[illegible] - اور

ایک جمعہ کو صبح صبح اُسے قبرستان پر جُوتی ملی - جو مٹی سے میلی ہوگئی تھی - وُہ اُسے پاکر دیوانی ہوگئی - یہ وُہی جُوتی تھی - جو کچھ عرصہ پہلے جواد سے کھو گئی تھی - وُہ دوڑ کر جواد کی قبر پر گئی - اور اپنا مُنہ قبر سے لگا کر بولی " جواد - جُوتی مل گئی - میرے لال اب نکلو باہر " لیکن وہاں کون تھا - جو آواز دیتا - البتہ اُسے محسوس ہُوا جیسے کسی نے اندر سے لمبی سانس لی - اور لیٹ گیا ۔

(۴)

کئی سال بیت گئے - انّا کے گھر کی حالت دِگرگوں ہوگئی - اُسکے دو نو لڑکے جوان ہوگئے تھے - ایک کی شادی بھی ہو چکی تھی - گھر میں فارغ البالی اور آسودہ حالی کے دن آگئے تھے - دو نو لڑکوں نے گھر ہی میں قالین بافی کا کارخانہ کھولا تھا جس میں ایک درجن کے قریب محلے کے لڑکے کام کرتے تھے - انّا بصارت کھو چکی تھی - ایک صاف اور پاک کمرے کے کونے میں وُہ مُندے پر بیٹھی رہتی - بہو گھر کا کام کاج چلاتی - شام کو کارخانہ بند ہوتا - تو دو نو لڑکے ماں کے قدموں میں آکر بیٹھتے - رسُول کریم کی صفات اُن کے کارنامے اور اسلام کی برکتوں کے قصے سُناتے - تازہ چھڑی ہوئی جنگ کے حالات بیان کرتے - مُلک کی خبریں سُناتے ۔ انّا راج رانی کی طرح گاؤ تکیہ کے سہارے بیٹھی سُنتی ۔ ایک دن شام کو دو نو لڑکے ماں کے پاس بیٹھے تھے - کارخانے کا ایک شاگرد روتا روتا آیا - انّا کے کنوارے بیٹے نے پُوچھا " کیا ہے سُلطانا - روکیوں رہے ہو ؟ " شاگرد کچھ نہ بول سکا - روتے روتے اُسکی ہچکی بندھ گئی - اُس نے پھر پُوچھا " ارے کیا ہُوا - کہو بھی " شاگرد نے روتے روتے کہا " جو جُوتی آپ نے بھانجے کے لئے دی تھی وُہ کھو گئی " دو نو لڑکوں نے زور سے ہنس دیا - دُوسرے کمرے میں بڑے لڑکے کی بیوی یہ سُن رہی تھی - وُہ بھی اپنی ہنسی کو نہ روک سکی - تب چھوٹے بھائی نے کہا " تو کیا ہُوا کھو گئی تمہاری بلا سے - روتے کیوں ہو ؟ " یہ کہکر اُس نے جیب سے دُوسری جُوتی نکالی - اور اُسکی طرف پھینکتے ہوئے کہا " جاؤ - اب سنبھال کر لے جانا " پھر بڑے بھائی سے کہا " بچوں کی فطرت بھی کیا عجب چیز ہے معمولی چیز کے لئے کس قدر رو دیتے ہیں " ۔ سامنے انّا مُنہ کھول کر یہ سُن رہی تھی - اُس کی نابینا آنکھوں سے آنسو پھوٹ گئے تھے ۔ جانے اُسے آج سے کتنے سال پہلے کا دلگداز واقعہ یاد آگیا تھا ۔

محبت آجکل اک شغل ہے بے روزگاروں کا ۱ نہیں لگتی ہے جن کی نوکری وُہ دل لگاتے ہیں

پہناتے وقت کُرتہ یہ دُعا تھی قیس کی ماں کی ۲ الٰہی خیر کرنا میرے بچے کے گریباں کی

ارض و سما کو ساغر و پیمانہ کر دیا ۳ رندوں نے کائنات کو میخانہ کر دیا

حرم ہو - مدرسہ ہو - دَیر ہو - مسجد کہ میخانہ ۴ یہاں تو صرف جلوے کی تمنا ہے کہیں آجا

سرحدی قبائلیوں کے طریقہ علاج کے دلچسپ حالات

ہندوستان کا علاقہ سرحدی اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک عجیب و غریب علاقہ ہے۔ دُنیا کے کسی مُتمدن ملک کی سرحد غالباً ہندوستان کی شمال مغربی سرحد سے زیادہ خونریز نہ ہو گی۔ جسطرح دُوسرے ممالک کے باشندوں کے لئے مُختلف ذرائع تفریح ہوتے ہیں۔ اسی طرح یہاں والوں کے لئے قتل و غارت گری دلچسپ ترین مشغلہ ہے *

افغانی قبائل میں رشک حسد کا مادہ بہت زیادہ ہے۔ اُنہیں باہم ایک دُوسرے پر اعتماد نہیں۔ اور آپس میں ایک دُوسرے کے تشنۂ خون رہتے ہیں۔ صرف یہی نہیں۔ کہ کوئی قبیلہ اپنے ہمسایہ قبیلہ سے برسرِ پیکار ہو۔ بلکہ اِن لوگوں کا شوق جنگ و جدال اِسقدر بڑھا ہوا ہے۔ کہ بسا اوقات ایک ہی خاندان، اور ایک ہی گھر کے اندر نوبت کُشت و خون ہو جاتی ہے۔ کوئی شخص اپنی زندگی کو محفوظ نہیں سمجھتا۔ اُسکو ہر وقت اپنی حفاظت کے لئے تیار رہنا پڑتا ہے۔ جسوقت کسان زمین جوتنے کے لئے نکلتا ہے۔ تو اُسکے کاندھے پر رائفل ہوتی ہے۔ اور کمر میں پستول۔ اپنے کام میں مصروف ہونے کے وقت وُہ ایک شخص کو مُتعین کر دیتا ہے۔ وُہ کسی بُلند مقام سے چار جانب نظر دوڑاتا رہے۔ اور کسی نووارد کے قریب آنے پر اُس کو مطلع کر دے *

سرحدی قبائل کی صحت عام طور پر نہایت عُمدہ ہے۔ اُنہیں دوا علاج کی ضرورت بہت کم ہوتی ہے۔ سرکاری شفاخانوں میں زیادہ تر بندوق یا چھری کے زخمی آتے ہیں۔ اور وُہ بھی اِس تعداد میں کہ زمانہ جنگ کے سوائے ہندوستان یا یورپ کے کسی ہسپتال میں اِس کی نظیر نہیں مِل سکتی۔ سرحدی قبائل کے کان سعدی کے اِس قول سے ناآشنا ہیں ؎

مرا بمرگِ عدو جائے شادمانی نیست	کہ زندگانیٔ ما نیز جاودانی نیست

باہمی جنگ و جدال کے بعد اگر مُتخاصم جماعتوں کے زخمی ایک ہی ہسپتال میں داخل ہوں۔ تو ہر ایک یہی چاہتا ہے کہ مدِ مُقابل کا مجروح جانبر نہ ہو سکے ہسپتال کے ایک انگریز افسر سے ایک پٹھان پُوچھے گا "کیوں ڈاکٹر صاحب افضل خان کبتک بچیگا" اگر ڈاکٹر نے کہدیا۔ کہ "وُہ بچ نہیں سکتا۔ چند روز کا مہمان ہے" تو فرطِ مسرت سے حریف افغان کی باچھیں کھِل جاتی ہیں۔ لیکن ڈاکٹر نے کہیں اسکے برعکس اُس کی صحتیاب ہونیکی اُمید ظاہر کی۔ تو مُستفسر کے رنج و غم کی کوئی اِنتہا نہیں رہتی۔ اور وُہ بصد حسرت کہے گا "افسوس! کچھ بھی نہ ہوا۔ میں نے تو نشانہ باندھ کر اُسکے کلیجہ پر گولی ماری تھی" * کسی جان بلب زخمی افغان کو یہ معلوم ہو جائے۔ کہ اُس کا زخمی حریف مر گیا۔ تو وُہ اپنی زندگی کی باقی ماندہ چند ساعتوں کو نہایت کامیاب و رباعثِ شادمانی سمجھے گا * یہ لوگ اپنے بیماروں کو پر [illegible] علاقہ کے بزرگ

کو ہسپتال تک پہونچنے کے لئے ہفتوں اور بعض اوقات مہینوں کی مسافت طے کرنا ہوتی ہے۔ اتنے عرصہ تک بغیر علاج رہنے کی وجہ سے اکثر مرض اور بڑھ جاتا ہے۔ مگر صابر و شاکر افغان اِن تمام امور کو "مشیت الہٰی" پر محمول کرتے ہیں +

افغانی مریض نشتر سے بہت گھبراتے ہیں۔ کیونکہ یہ لوگ بہت شکی ہوتے ہیں۔ اسلئے اُنہیں یہ وہم رہتا ہے کہ ڈاکٹر کہیں کسی دشمن سے مل کر اُن کے گلے میں نشتر نہ بھونک دے۔ یہ لوگ پہلے انتہائی کوشش کرینگے۔ کہ ڈاکٹر نشتر استعمال کرنے کی بجائے کسی اور ذریعہ سے آپریشن کر دے لیکن اگر اُن کو اس میں ناکامیابی ہو۔ تو آپریشن کے وقت اپنے ایک معتمد خاص کو ڈاکٹر کے بالکل قریب کھڑا رکھتے ہیں +

سرحدی ہسپتال بنوں کے ایک انگریز ڈاکٹر کا بیان ہے۔ کہ ایک دفعہ ایک افغان اپنے ۹ سالہ بیٹے کو لیکر آیا۔ لڑکے کے پتھری پڑ گئی تھی۔ اُسکے باپ نے ڈاکٹر سے پتھری توڑنے کی فرمائش کی معائنہ سے معلوم ہوا کہ پتھری بہت بڑھ گئی ہے۔ اور بغیر اپریشن اس کا نکلنا غیر ممکن ہے۔ پہلے تو افغان کسی طرح رضامند نہ ہوا۔ لیکن جب اُس سے کہا گیا۔ کہ مزید غفلت میں لڑکے کا بچنا دشوار ہو جائیگا۔ تو وہ دقت تمام اس شرط پر راضی ہوا۔ کہ وہ اپریشن کے وقت اپنے بچے کے پاس موجود رہے۔ سرحدی علاقہ میں ڈاکٹروں کو اپنے مریضوں کی بہت باتیں ماننی پڑتی ہیں چنانچہ انگریز ڈاکٹر نے اُسے قبول کر لیا۔ جسوقت ڈاکٹر نے لڑکے کو اپریشن کے کمرے میں لیجا کر لٹایا۔ تو اُسکے باپ نے فوراً آگے بڑھکر کہا۔ کہ "ڈاکٹر صاحب! اگر میرا لڑکا مر گیا۔ تو تم کو جان سے مار ڈالونگا" + کسی دوسرے ملک میں ان الفاظ کا اعادہ سنسنی پیدا کر دیتا۔ لیکن سرحدی ڈاکٹر اس قسم کے کلمے آئے دن سنتے رہتے ہیں۔ اس لئے وہ ان کی زیادہ پروا نہیں کرتے۔ اپریشن شروع ہوا۔ لڑکے کا باپ دانت پیس پیس کر ڈاکٹر سے بار بار یہی کہتا تھا۔ کہ "اگر میرا لڑکا مر گیا۔ تو میں تم کو جان سے مار ڈالونگا" + لڑکے کا مرض بہت بڑھ گیا تھا۔ اپریشن کامیابی کے ساتھ ختم ہوا۔ لیکن وہ مہینوں تک ہسپتال میں صاحب فراش رہا۔ اور اپریشن کے بعد کئی روز تک تو بچے کے جان بر ہونے کی کوئی امید نہ تھی۔ مریض کا باپ اس دوران میں برابر اپنے لڑکے کے پاس رہا ہسپتال میں جب کبھی اُس کا اور آپریشن کرنے والے انگریز ڈاکٹر کا سامنا ہو جاتا۔ تو وہ بگڑ کر کہتا۔ "ڈاکٹر صاحب اپنی خیر مناؤ۔ اگر میرا لڑکا مر گیا۔ تو تم کو بھی جان سے مار ڈالونگا" + اتنے عرصہ تک رہنے کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب کو بھی اس افغان بچہ سے محبت ہو گئی تھی۔ جب وہ بالکل صحت یاب ہو کر اپنے مکان واپس جانے لگا۔ تو ڈاکٹر نے اپنے خرچ پر اُسکے باپ کے لئے ایک اونٹ کا انتظام کر دیا۔ اور بچے کو بہت سے گرم کپڑے کھلونے اور مٹھائیاں دیں۔ چلتے وقت ڈاکٹر نے اُس کے باپ سے پوچھا "اب ایک بات تو بتاؤ۔ اگر تمہارا بچہ اچھا نہ ہوتا۔ تو تم مجھ کو واقعی مار ڈالتے۔ یا محض دھمکی ہی دیا کرتے تھے" پٹھان نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔ کہ "ڈاکٹر صاحب! لڑکے کا اپریشن ... [illegible]

مر جاتا۔ تو اسکے خون کا قصاص میرے اوپر فرض ہو جاتا۔ اور میں تم کو دراصل مار ڈالتا"۔

سرحدی ہسپتالوں میں بے انتہا بردبار خلیق اور قابل ڈاکٹروں کی ضرورت ہے۔ اگر ہسپتال میں کسی افغا
کوئی عضو جسم کاٹا جائے۔ تو وہ فوراً مُلا کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ کیونکہ اُن کا خیال ہے۔ کہ قیامت کے دن فرشتے مُر
کا کٹا ہوا عضو تلاش کرنے کے لئے کافروں کے ہسپتال میں نہیں داخل ہونگے۔ مُلا اُس عضو کو اسلامی قبرستان میں د
کر دیتا ہے۔ سرحدی قبائل کی باہم خانہ جنگیوں کے وقت عورتیں میدان میں منتظر کھڑی رہتی ہیں۔ جہاں ان کا کو
عزیز زخمی ہو کر گرا۔ وہ لمبی لمبی سوئیاں لیکر اُسکے زخم سینے کو دوڑتی ہیں۔ اگر وقت پر دھاگا دستیاب ہو۔ یا کم
تو وہ اپنے سر کے بالوں سے یہ کام لیتی ہیں۔ ٹانکے دینے کے بعد ایک تازہ ذبح کی ہوئی بھیڑ کی گرم گرم کھال ز
کے اوپر خوب کس کر لپیٹ دی جاتی ہے ۔

پہلے کچھ عرصہ تک مجروح کا علاج گھر ہی میں ہوتا ہے۔ لیکن اگر زخموں کی حالت زیادہ خراب ہو جا
اور مریض کی جان کے لالے پڑ جائیں۔ تو اُس کو بدرجہ مجبوری ہسپتال میں داخل کیا جاتا ہے۔ اکثر صورت میں
تیمارداری مریض کے ساتھ اُس کے خاندان کی عورتیں بھی ہوتی ہیں۔ جس وقت ڈاکٹر زخموں پر سے بھیڑ کی کھا
کی خوفناک جمی ہوئی پٹی دور کرتا ہے۔ تو ان عورتوں کے چہروں پر بل تک نہیں آتا۔ زخموں کی بدبو سے ڈاکٹر اور د
لوگ پریشان ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ عورتیں اس خیال سے ذرا بھی منہ نہیں بناتیں۔ کہ مریض کا دل نہ میلا ہو۔ ہسپتالو
میں علاج کے لئے عورتیں شاذونادر آتی ہیں۔ کھُلی ہوا میں رہنے اور آزاد زندگی بسر کرنیکے باعث سرحدی عورتوں ک
عام صحت کا یہ حال ہے۔ کہ انہیں وضع حمل تک کی تکلیف محسوس نہیں ہوتی۔ اگر راستہ میں وضع حمل کے آثار رو
ہوں۔ تو عورت اپنے شوہر یا کسی دوسرے رفیق سفر سے کہہ کر تھوڑی دیر کے لئے قافلہ کی روانگی ملتوی کرا دیتی ہے
اور خود کسی جھاڑی کی آڑ میں چلی جاتی ہے۔ چند منٹ کے بعد وہ اپنے نوزائیدہ بچے کو کمبل میں لپیٹے ہوئے آتی ہے۔
اور قافلہ منزل مقصود کی جانب اُسی وقت روانہ ہو جاتا ہے ۔

ہندوستان کے اس جنگلی علاقہ میں "نیم حکیموں" کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ سرحدی مریض کسی سرکاری ہسپتا
میں دو چار ہفتہ رہنے کے بعد اپنے آپ کو اس مرض کا ماہر سمجھنے لگتا ہے جسمیں کہ وہ خود مبتلا ہو کر بغرض علاج آیا تھ
اور اپنے علاقہ میں واپس جا کر تجربہ کار ڈاکٹر بن جاتا ہے ۔ بنوں کے ایک انگریزی شفاخانہ میں ایک افغان اپنی آنکھ
کا علاج کرانے کے لئے داخل ہوا صحت یابی کے بعد چلتے وقت وہ ہسپتال سے ایک دوا کا ڈبہ چرا کر لے گیا۔ اور کسی
گاؤں میں مقیم ہو کر "آنکھوں کی دوا" فروخت کرنے لگا۔ بعد میں ایسے متعدد اشخاص ہسپتالوں میں داخل کئے گئے
کی آنکھیں اس دوا سے خراب ہو گئی تھیں ۔ اسی طرح ایک سرحدی مُلا اپنی ٹوٹی ٹانگ لیکر ہسپتال میں آیا۔ چھ ہفتہ

شروع کر دی۔ اُس کا نتیجہ یہ ہُوا۔ کہ ان "فاضل سرجن" کی بدولت بیسیوں غریب باشندے اپنے اعضا سے ہمیشہ کے واسطے ہاتھ دھو بیٹھے ۔

ایک مرتبہ ایک انگریز ڈاکٹر اندرونی حصّہ ملک کا دورہ کر رہا تھا۔ راستہ میں اونٹ پر سے دوائیوں کا ایک بکس کھل کر نیچے گر پڑا۔ اور دو بوتلوں کے ٹوٹ جانے سے گولیاں زمین میں بکھر گئیں۔ اس دور افتادہ علاقہ میں دوائیاں کہاں ؟ ڈاکٹر نے گولیوں کی تلاش کی۔ رنگین گولیاں تو بآسانی چن لی گئیں۔ لیکن ریگستان میں سفید گولیوں کا تلاش کرنا وقت طلب تھا۔ اسلئے ڈاکٹر ان سے ہاتھ دھو کر آگے روانہ ہوا۔ انگریز ڈاکٹر کچھ دور بڑھا ہوگا۔ کہ ایک افغانی نوجوان نے آگے بڑھ کر کہا۔ "ڈاکٹر صاحب! یہ گولیاں میں تلاش کر کے لے لوں ؟" انگریز ڈاکٹر نے کہا۔ "مجھے کیا۔ کوئی تلاش کرلے۔ لیکن تم کہیں ان گولیوں کو کھا نہ جانا۔ ان میں زہر ملا ہوا ہے" ۔ چند ماہ کے بعد ڈاکٹر مذکور کا گذر پھر اُسی علاقہ میں ہوا۔ اُس کو دیکھ کر ایک خوشحال دوکاندار دوڑا۔ اور سلام کر کے کہنے لگا۔ "ڈاکٹر صاحب! مجھ کو پہچانا؟" ۔ ڈاکٹر نے بغور اُس کی جانب دیکھ کر کہا۔ "میں نے تمہیں کہیں دیکھا تو ضرور ہے۔ لیکن کچھ خیال نہیں"۔ نووارد نے جواب دیا۔ "آپ کو یاد ہوگا۔ کہ ایک مرتبہ اونٹ پر سے آپ کی گولیاں گر پڑی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب! میں جب تک زندہ ہوں۔ آپکے احسان سے سر نہیں اُٹھا سکتا۔ آج میرے پاس جو کچھ ہے۔ وہ سب آپ ہی کا طفیل ہے"۔ ڈاکٹر نے متحیر ہو کر پوچھا "آخر یہ کیا معاملہ ہے" ؟ نوجوان دوکاندار نے ڈاکٹر کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور اُس کو باصرار تمام اپنی دوکان میں لے گیا۔ جو کہ قصبہ میں سب سے زیادہ شاندار اور نمایاں حیثیت رکھتی تھی۔ دوکان میں چاروں طرف الماریاں تھیں۔ ایک خوشنما بڑی بوتل پر "محبوب چیدہ" کا لیبل لگا ہوا تھا۔ دوکاندار نے وہ بوتل اٹھا کر ڈاکٹر کے ہاتھ میں دی۔ اور کہا۔ "ڈاکٹر صاحب یہ وہی آپ کی سفید رنگ کی گولیاں ہیں۔ جن کو میں نے زمین سے چنا تھا۔ میں ان کو بہت قیمت پر فروخت کرتا ہوں اور لوگ دور دور سے اس کو خریدنے آتے ہیں" ۔ ڈاکٹر کی حیرت انتہائے کمال کو پہنچ گئی۔ اور اُس مالدار دوکاندار سے پوچھا۔ کہ تم کو اس دوا کی خاصیت تو معلوم نہیں۔ پھر اس کو لوگوں کے امراض میں کس طرح تجویز کرتے ہو ؟ دوکاندار نے نہایت سادگی کے ساتھ جواب دیا۔ "مجھے مرض پہچاننے سے کیا واسطہ۔ میں تو مرض کی دوا بیچتا ہوں۔ خواہ کوئی بھی مریض آئے۔ میں اس کو یہ گولیاں دے دیتا ہوں"۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ کہ اس دیوانہ مگر "بکار خویش ہشیار" سرحدی نے ہر مرض میں یہ زہریلی دوا دیکر کتنے خون ناحق اپنی گردن پر لئے ہونگے ۔ اس قسم کے طریقہ علاج کے علاوہ ان پٹھانوں کو دعا تعویذ پر بہت زبردست اعتقاد ہے۔ یہ اکثر خوفناک مرضوں میں بھی صرف تعویذ پانی میں گھول کر پیتے ہیں۔ یا کسی ملا کے پاس جا کر کوئی دعا دم کرا لیتے ہیں ۔

باہم سلوک تھا تو اٹھاتے تھے نرم گرم — کاہے کو میر کوئی دبے جب بگڑ گئی

نغمہ

۱ مرحبا اے مطرب سرمایہ دار بے خودی — تیری چشم مست ہے ظرف خمار بیخودی
زمزمے کی ہر لچک ہے چشمک برق جمال — لحن کی انگڑائیاں ہیں زندگی کے خد و خال
مستیاں اُمڈی ہوئی ہیں دیدۂ بیدار میں — وجد ساماں ہے کوئی ہر تار کی جھنکار میں
ہر رگ بیتاب میں اک سیل سی آئی ہوئی — مطلع دل پر ہے نکہت کی گھٹا چھائی ہوئی
عارض فطرت پہ ہے ہلکی صباحت کی نقاب — گونج کا پردہ اُٹھا دے کاش لیلائے رباب

۲ تھاپ سے دھڑکن کی جب تُتے ہیں نغمے بے قرار — کروٹیں لیتا ہے سینہ میں سرود جوئبار
رفتہ رفتہ کھلنے لگتے ہیں رموز کائنات — راگنی مشعل دکھاتی ہے سر قصر حیات
تیرتی ہے بحر مستی میں نگاہ بے قرار — گونجتے ہیں دل کی وادی میں سُریلے آبشار
نغمے جب تانوں کے طیاروں میں ہوتے ہیں بلند — پھینکتی ہے روح بام عشق پر زریں کمند

۳ چوٹ کھاتا ہے جونہی مضراب سے بربط کا تار — چونک چونک اُٹھتے ہیں رِلکے ولولے بے اختیار
آسمانوں کی بلندی سے یہ آتی ہے صدا — دیکھ اب چلمن اُٹھاتا ہے کوئی آتش نوا
زلف موسیقی بکھرتی ہے ہوا کے دوش پر — خواب کی بدلی مچلتی ہے بساط ہوش پر
زمزمے ہر تار سے اُٹھتے ہیں تھراتے ہوئے — دل میں آ کر جذب ہو جاتے ہیں بل کھاتے ہوئے
گلشن احساس میں رنگینیاں پاتا ہوں میں — حسن کی گلپوش وادی میں اُتر جاتا ہوں میں
تان کو لیکر جو سپتم میں پہونچ جاتا ہے تو — روح میں بالیدگی کی لہر دوڑاتا ہے تو
ہر طرف ہوتا ہے برپا محشر تقریر دوست — جھلملاتی ہے نظر کے سامنے تصویر دوست
دل پہ چھا جاتا ہے متوالی بہاروں کا سماں — جھومتا ہے سامنے ابر شراب ارغواں
پھرتی ہے باد صبا مستی میں سر دھنتی ہوئی — رونے والے عاشقوں کی ہچکیاں سُنتی ہوئی
موجزن ہوتا ہے کیف بیخودی نزدیک دور — ذرے ذرے سے اُبل پڑتا ہے دریائے سرور
دل یہ کہتا ہے اسی جنت میں گم ہو جائیے — برشگال نغمۂ پر کیف میں کھو جائیے
مست و متوالی فضا میں جھومتا پھرتا ہے حسن — اشکبار آنکھوں کے آنسو چومتا پھرتا ہے حسن

قوم اسیرین کے عادات و اطوار

عراق عرب کے مشہور شہر بابل کے قدیمی باشندے آسیرین نسل کے تھے۔ جو بہلیوں یا رتھوں پر سوار ہو کر یا گھوڑوں پر چڑھ کر لڑائی کیا کرتے تھے۔ پا پیادہ بہت کم جاتے۔ علاوہ ازیں اور بہت سی قدیمی قوم یعنی مصری۔ یونانی۔ کنعانی اقوام اسرائیل۔ یہودی۔ فارسی۔ گال کی طرح رتھوں کو زیادہ معزز اور محفوظ سمجھتے تھے۔ اور لڑائی کے وقت اُن میں بیٹھ کر لڑا کرتے تھے۔ بادشاہ تو خصوصاً اپنی سواری کو کام میں لاتا تھا۔ شہروں کا محاصرہ کرتے وقت پیادہ تیر اندازی بھی کرتے تھے۔ یہ لوگ جنگی رتھ لکڑی سے بناتے تھے۔ اور اُن پر یونانیوں کی طرح پیچھے سے سوار ہوتے تھے۔ گھوڑوں پر زرین پوشاک اور گاڑیوں پر بیل بوٹے عجیب فرحت افزا نظارہ ہُوا کرتا تھا۔ یہ جنگی گاڑیاں دو پہیہ ہُوا کرتی تھیں۔ رسالہ جنگی بہلیوں سے دُوسرے درجہ پر گنا جاتا تھا معلوم ہوتا ہے۔ کہ ابتدا میں رسالہ شاذ و نادر ہی استعمال ہُوا کرتا تھا۔ مگر سارگوں کے وقت میں رتھیں کم ہو گئیں اور رسالہ پر زور دیا گیا تھا۔ تیر اندازی اور نیزہ بازی کی مشق ہر انسان پر لازمی تھی۔ پیادہ فوج میں ایک تیر انداز اور ایک ڈھالچی ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ تیر چلاتے وقت ڈھال والا تیر انداز کو محفوظ رکھتا تھا۔ تاکہ مخالف فریق کے تیر کارگر نہ ہوں۔ سر پر خود بھی لگائے جاتے تھے۔ اہل روما کی طرح اسیرین لوگ گرمیوں میں اپنی ہمسایہ ریاستوں پر حملہ آور ہُوا کرتے تھے۔ اور جب تک دُشمن خراج گزار یا فرمان بردار نہ ہو جاتا۔ ہر سال حملہ آور ہُوا کرتے تھے۔ بادشاہ خلعت پہنے رتھ پر سوار ہو کر لشکر میں نکلا کرتا تھا۔ بہت سے تیر انداز اُس کے ہمراہ ہُوا کرتے تھے۔ بادشاہ اور اُمراء کے سوائے باقی سب لشکر تیر مارا کرتا تھا۔ میدانِ جنگ میں بادشاہ اور اُمراء کے لئے خیمے لگ جاتے تھے۔ مگر باقی سپاہ یُونہی رات بسر کرتی تھی۔ کھانے کے لئے بیل۔ بکریاں اور بھیڑیں ساتھ لیجایا کرتے تھے۔ چونکہ یہ قوم اوروں کی نسبت بہت عمدہ مسلح ہُوا کرتی تھی۔ اسی لئے اکثر فتحیاب ہُوا کرتی تھی۔ ہر سپاہی مقتول آدمیوں کے سر کاٹ کر بادشاہ کو دکھانے لاتا تھا۔ اس رسم کی بدولت غنیم کی سپاہ فنا ہو جایا کرتی تھی۔ اور سخت نقصان اُٹھاتی تھی۔

جو سپاہی مقتولوں کے سر نہیں پاتے تھے۔ وہ دشمنوں کے ہتھیار لُوٹ کر لاتے تھے۔ اور تمام لوٹ مار کے اسباب کو فہرست میں درج کر لیا جاتا تھا۔ اگر اسیرین اپنے دشمن کو قلعہ میں بند پاتے تھے ....

.... تو اوّل تیر اندازوں کو زینہ کے ذریعہ قلعہ پر چڑھا دیتے تھے۔ اور اگر اس طریق سے کامیاب نہ ہوتے۔ تو ایک قسم کے انجن کو جو محفوظ کمرے کی طرح بنا ہوتا تھا۔ قلعے کے پاس پہنچ کر فصیل کو توڑ ڈالتے۔

یا ایک اور قسم کی کل کے ذریعہ کہ جس کو عرب منجنیق کہتے ہیں۔ قلعہ میں بھاری بھاری پتھر پھینکتے۔ مگر اِن کا
بہت کم تھا۔ کیونکہ فوج مخالف کے لوگ اُس پر فقط آگ کی ہانڈیاں پھینک کر جلا دیتے۔ آسیرین یوں بھی تو مخالفو
کی سرزنش بخوبی کیا کرتے تھے۔ مگر باغیوں پر بڑی جور جفا روا رکھتے تھے۔ قیدیوں کے ہونٹوں میں سوراخ کر کے
ڈالتے تھے۔ اور یکے بعد دیگرے بادشاہ کے پاس لاتے تھے۔ کسی پر تجبر سے بادشاہ ٹانگ دھر دیتا تھا۔ کوئی معاف او
کوئی قتل کیا جاتا تھا۔ بعض کو ہمیشہ کے لئے غلام بھی بنا لیتے تھے۔ قالدین یا قلدانی جہاز رانی میں قابل ہونے
سے بحری جنگ بھی کیا کرتے تھے۔ مگر آسیرین سے جو لوگ بھاگ کر کسی جزیرہ کو چلے جاتے تھے۔ وہ ان کا لیوں
بچ جایا کرتے تھے۔ صرف بادشاہ "سلماسر" کے عہد میں قوم آسیرین نے جزیرہ طائر پر حملہ کیا تھا۔ مگر اُس بحری
لڑائی میں بھی جہاز اُن کے اپنے نہ تھے۔ بلکہ قوم فینشین سے مانگ کر لئے تھے ۔ اسیریا میں بھی دیگر مہذب ملکوں کی
طرح بادشاہ شائستگی اور اخلاق کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ بادشاہوں کا لباس عرب کی وضع قطع کا تھا۔ اسیرین
عورتوں کو پردہ میں رکھتے تھے۔ اِس لئے شاذ و نادر ہی کتبوں میں عورات کا ذکر مل سکتا ہے۔ صرف ایک تصویر اِس
قسم کی ملی ہے جس میں بادشاہ مسہری پر بیٹھا ہوا ہے۔ اور اُس کی ملکہ پاس کرسی پر بیٹھی ہے۔ خواجہ سرا اور دیگر
کھڑے ہیں۔ ملکہ نے کانوں میں بالے اور ہاتھوں میں چوڑیاں پہنی ہیں۔ بادشاہ کے خواصوں میں سب سے بڑا وزیر اعظم
ہوا کرتا تھا جس کا لباس بادشاہ سے دوم درجہ پر ہوا کرتا تھا۔ چند قسم کے لباس صرف بادشاہ اور وزیر ہی
پہن سکتے تھے۔ اور کسی کو اجازت نہ تھی۔ ہر ایک افسر کے لباس میں امتیاز کے لئے کچھ نہ کچھ فرق رکھا جاتا تھا۔
آسیرین گو صرف ایک عورت سے شادی کیا کرتے تھے۔ مگر اُن میں کنیزیں رکھنے کی عادت بہت تھی۔ یہ لوگ علم موسیقی
تجارت اور زراعت کی نہایت قدر کرتے تھے۔ بابلونی گانے بجانے پر جان دیتے تھے۔ حضرت دانیال کا بار بار قسم کے
سازوں کا ذکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ حضرت مسیح سے چھ سو سال پہلے بابل والوں میں طرح طرح کے آلاتِ موسیقی
موجود تھے ۔ کتبوں سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہودی بھی بہت قسم کے ساز گانے بجانے میں استعمال کرتے تھے۔ مصر میں چودہ
قسم کے ساز پائے گئے ہیں۔ گو آسیرین مصریوں کی طرح گانے پر فدا نہ تھے۔ مگر اُن کے پاس بھی ۹ قسم کے ساز موجود
تھے۔ آسیرین نے گو پہلے جہاز رانی میں شوق ظاہر نہیں کیا۔ مگر شاہ "تغلات پسر" ۱۱۲۰ سال قبل از مسیح کے
زمانہ میں اِس علم میں بہت سی ترقیاں ہونے لگیں۔ اور تجارت کی رونق بھی روز بروز بڑھنے لگی ۔ نعمان شہر نینوا کی
طرف خطاب کر کے کہتے ہیں۔ کہ تو نے اسے تجاروں کو آسمان کے ستاروں سے بھی زیادہ بڑھایا ہے ۔ توریت میں لکھا
ہے۔ کہ آسیریا کا محل وقوع اُس کی تجارتی ترقی کا باعث تھا۔ ہندوستان کی عجیب و غریب پیداوار اقوام مغرب کے
پاس بھیجنے اور ہندوستان و فارس کو مغربی عجائبات کے پہونچانے کے لئے اُنہیں اعلیٰ درجہ کا موقعہ حاصل تھا۔ آسیریا
کا ہندوستان سے تعلق چند کتبوں سے ظاہر ہوتا تھا۔ جن پر ہاتھی اور ہندوستانی خاص قسم کے اونٹ کی تصاویر

ہیں۔ چونکہ ہاتھی اور ایک خاص قسم کا اونٹ اُس زمانہ میں سوائے ہند کے اور کہیں نہ تھا۔ اس لئے ضروری ہے کہ اُن کی آمد و رفت ہند میں ضرور ہوگی۔ جو اُن کو جانوروں کی تصاویر سوجھیں * یونانی لکھتے ہیں۔ کہ آسیرین زمانہ قدیم میں طرح طرح کے مصالحے فروخت کیا کرتے تھے۔ چونکہ قسم قسم کے مصالحے ہندوستان ہی میں پیدا ہوتے تھے۔ اس لئے ضرور ہے۔ کہ وہ ہندوستان سے خرید کر دوسرے ملکوں میں فروخت کیا کرتے ہونگے۔ زراعت میں بھی آسیرین بڑے ہوشیار تھے۔ نہروں کے بنانے میں بھی انہوں نے کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا۔ عرب کے موجودہ پل انہیں کی ایجاد ہیں۔ بہت سے آلات زراعت جو روم اور ایران میں آجکل رائج ہیں۔ وہ ہزارہا سال ہوئے۔ کہ انہوں نے ہی ایجاد کئے تھے۔ آسیرین کی ایک قسم کی ٹوپیاں افغانی کلاہوں سے مشابہ ہیں۔ مگر طوالت میں وہ کلاہ سے زیادہ لمبی اور نوکیلی ہیں * آسیرین طرح طرح کے خوبصورت زیور بناتے تھے۔ شانہ بھی اسوقت بکثرت استعمال ہوتا تھا۔ اور آئینہ بھی دھات کا بنایا جاتا تھا۔ غرضیکہ عورتوں کے لئے ہر طرح کے عیش و عشرت کے سامان موجود تھے۔ گوشت کا استعمال کم تھا۔ صرف میدان جنگ میں فتح کے بعد گوشت کی ہانڈیاں چڑھا کرتی تھیں۔ مچھلی کا گوشت اکثر کھایا کرتے تھے۔ بادشاہ "سناخرب" میں اپنے ملک کو شراب اور انگور کا گھر کہا کرتا تھا۔ نیز وہاں کے زیتون اور شہد کا بھی ذکر کرتا ہے۔ شہر نینوا کے ارد گرد انگور بکثرت ہوا کرتے تھے۔ اور شراب خوری بھی بکثرت تھی۔ چنانچہ حضرت نعمان علیہ السلام شہر نینوا کے باشندوں کو بھی شراب خواری کا الزام دیتے تھے *

۱۹۴۱ء کی مردم شماری کیمطابق صوبہ سرحد کی آبادی

صوبہ سرحد کی نئی مردم شماری کے مطابق بالتفصیل ذیل ضلع وار اعداد و شمار دیئے جاتے ہیں:-

نام ضلع	سکھ	ہندو	مسلمان
پشاور	۲۴۰۲۰	۵۱۴۵۲	۴۲۲۳۳۲
ہزارہ	۹۲۲۰	۱۹۳۸۹	۴۰۲۸۵۵
مردان	۱۱۸۳۸	۶۵۱۳	۲۵۶۲۶۱
کوہاٹ	۴۳۴۹	۱۱۹۵۳	۱۴۱۲۰۱
بنوں	۶۱۱۲	۱۶۸۴۴	۱۳۷۶۷۹
ڈیرہ اسمٰعیلخان	۲۳۹۰	۲۱۳۳۲	۱۳۹۳۷۷
ایجنسیاں	۶۴۷۲	۱۶۶۶۱	۲۰۷۶۶
میزان	۶۲۴۱۱	۱۹۷۶۳۱	۲۸۱۰۸۶۵

جوانی کی پکار

سکون و امن کے برباد کن ساحل پہ لے آیا — جنونِ بے رہنما! تو مجھ کو کس منزل پہ لے آیا

تری تدبیر کی ہرگز میں قائل ہو نہیں سکتی — جہاں لایا ہے تو یہ میری منزل ہو نہیں سکتی

یہ پیچیدہ تمدن اور یہ تہذیبِ ریاکاری — یہ ارمانوں کے الجھاؤ تمنا کی دل آزاری

یہ تجویزیں یہ ترکیبیں یہ مکر و زور لعنت ہے — یہ تہذیب و تمدن کا چمکتا نور لعنت ہے

یہ مکتب بزدلی کا درس دیتے ہیں جوانوں کو — سُلا دیتے ہیں تھپکی سے وطن کے پاسبانوں کو

غلامی کے لئے تیار کرتے ہیں جوانی کو — مٹاتے ہیں شرافت اور عظمت کی نشانی کو

یہ اونچ اور نیچ کے جھگڑے یہ قصئے کفر و ایماں کے — تمیزِ من و مائی اور یہ قصے عہد و پیماں کے

یہ زرگیری یہ زرپاشی تن آسانی کے یہ پھندے — نظر آتے ہیں اب ہر طرف ہی پیٹ کے بندے

فریبِ عقل دیتے ہیں۔ فریبِ عقل کھاتے ہیں — خدائی میں خدا کے نام پر فتنے اٹھاتے ہیں

مذاہب اور معابد ٹھیکرے انکی گدائی کے — یہ پیکر نامرادی کے یہ پتلے بے حیائی کے

یہ سیلابِ خودی کا آہ بڑھتے بڑھتے رک جانا — یہ انسانوں کا انسانوں کے دروازوں پہ جھک جانا

حصارِ عافیت ہے۔ اسمیں جینے کا نشاں کیا ہے؟ — جوانی کیلئے اے رہنما آخر یہاں کیا ہے

ایران کے قدیم جشن

۱۔ جشن سدہ۔ یہ جشن فارسی مہینہ بہمن کی دسویں تاریخ کو ہوتا تھا۔ اس میں ایجادات کی نمائش کی جاتی تھی۔ دور دور سے لوگ آتے اور اپنی ایجادیں ساتھ لاتے تھے۔ مقابلے ہوتے تھے۔ اور جس کی ایجاد سب سے زیادہ مفید ہوتی تھی۔ اسے انعام و اکرام سے سرفراز کیا جاتا تھا۔ جسوقت ایجاد کا معائنہ ہو چکتا تھا۔ تو پھر اس کی عوام میں نمائش کی جاتی تھی۔ تاکہ لوگ اس کو سمجھیں۔ اور اس سے فائدہ اٹھائیں۔ یہ جشن تین روز تک جاری رہتا۔

۲۔ جشن قبادی۔ یہ آتش پرستوں کا جشن تھا۔ اس کے لئے کوئی خاص تاریخ مقرر نہ تھی لیکن آتش پرستوں کے بڑے مذہبی پیشوا کے مشورے سے منعقد ہوتا تھا۔ یہ جشن پانچ روز تک لگتا تھا۔ پہلے دن سب سے پرانے آتش کدے میں جاکر عبادت کی جاتی تھی۔ دوسرے دن ایک نئے آتش کدے کا افتتاح کیا جاتا تھا۔ تیسرے دن سورج کی پرستش کی جاتی تھی۔ اور باقی دو دن میلہ لگتا تھا۔ جس میں انواع و اقسام کی چیزوں کا بیوپار ہوتا تھا۔ یہ جشن عموماً پانچسال کے بعد ہوتا تھا۔ لیکن خاص حالتوں میں قبل از وقت بھی ہو سکتا تھا۔ جیسے نئے آتش پرست بادشاہ کی تخت نشینی کے موقعہ پر۔ یا دمدار ستارے کے طلوع ہونے پر۔

۳۔ جشن فریدوں۔ یہ جشن فریدوں بادشاہ کی تخت نشینی سے شروع ہوا تھا۔ پھر اسکی سالگرہ پر منعقد ہوتا تھا۔ فریدوں کی موت کے بعد یہ جشن بند ہو گیا۔ بہار کے مہینہ اردی بہشت کی کسی تاریخ کو تین دن کے لئے ہوتا تھا۔

۴۔ جشن زرتشت۔ زرتشت آتش پرست مذہب کا بانی تھا۔ یہ جشن اس کی یوم ولادت پر لگتا تھا۔ جسطرح مسلمانوں میں عید میلاد النبیؐ منائی جاتی ہے۔ ویسے ہی یہ جشن آتش پرستوں میں منایا جاتا ہے۔

۵۔ جشن بہمنی۔ جب جنگ میں بہمن کے سب ساتھی اسے چھوڑ کر چلے گئے۔ تو دشمن اسکے تعاقب میں روانہ ہوئے۔ راستے میں ایک جگہ آگ کا الاؤ جل رہا تھا۔ بہمن آتش پرست تھا۔ وہ گھوڑے سمیت آگ میں کود گیا۔ خوش اعتقادی کی وجہ سے وہ بچ گیا۔ اور بعد ازاں اس نے فوج اکٹھی کر کے دشمن پر فتح پائی۔ اس دن کی یادگار میں یہ جشن منایا جاتا تھا۔ فوج کی نمائش کی جاتی تھی۔ جنگی پریڈ دکھلائی جاتی تھی۔ اور تمام آلات حرب آگ کے الاؤ میں ڈال کر پاک کئے جاتے تھے۔

۶۔ جشن نسیم۔ [illegible] جشن [illegible] آتا

تھا۔ تمام ایران کے پہلوان جمع ہوتے تھے۔ اور پہلوانی کرتبوں کی نمائش کی جاتی تھی۔ یہ سب جشن اب خواب و خیال ہو گئے۔ صرف اُن کی یاد رہ گئی ہے۔ اور وُہ بھی روز بروز حافظے سے محو ہوتی جا رہی ہے۔ آجکل صرف ایک جشن لگتا ہے۔ جسے "جشنِ نوروز" کہتے ہیں ؎

۷۔ جشنِ نوروز۔ یہ فارسی سال کے پہلے دن کو لگتا ہے۔ تمام ایران کے باشندے اُس دن سب کام وغیرہ چھوڑ دیتے ہیں۔ اور خوشیاں مناتے ہیں۔ پُرانے زمانہ میں "جشنِ نوروز" سے ایک دن پہلے گھر کی سب سے عمر رسیدہ عورت مُرغی کے انڈوں پر رنگ پھیر دیتی تھی۔ اور "جشنِ نوروز" کے موقعہ پر بچے اُن انڈوں کو ایک دُوسرے پر مار کر توڑتے تھے۔ اُسے تخم ریزی کہا جاتا تھا۔ اور اُسے نیک شگون خیال کیا جاتا تھا۔ آجکل یہ تمام پُرانے جشنوں کا نچوڑ ہو کر رہ گیا ہے۔ طرح طرح کی چیزوں کا بیوپار جسمانی کرتب کھیل تماشے ہوتے ہیں۔ دوست اور رشتہ دار آپس میں ایک دُوسرے کو تحفے دیتے ہیں۔ بڑی خوشیاں منائی جاتی ہیں ؎

یہُودیوں کے مہینوں کے نام

۱۔ نسان	——————	مارچ	اور	اپریل
۲۔ جیار	——————	اپریل	"	مئی
۳۔ سِوان	——————	مئی	"	جُون
۴۔ ممنوز	——————	جُون	"	جولائی
۵۔ آب	——————	جولائی	"	اگست
۶۔ علول	——————	اگست	"	ستمبر
۷۔ تسری	——————	ستمبر	"	اکتُوبر
۸۔ مارحیسون	——————	اکتُوبر	"	نومبر
۹۔ کسلیو	——————	نومبر	"	دسمبر
۱۰۔ تلتھ	——————	دسمبر	"	جنوری
۱۱۔ مثبت	——————	جنوری	"	فروری
۱۲۔ ادار	——————	فروری	"	مارچ

نوٹ۔ یہُودیوں کے ہر ایک مہینہ کے بالمقابل انگریزی دو دو مہینے لکھے ہُوئے ہیں۔ اِس کا مطلب یہ ہے۔ کہ آدھا ایک انگریزی مہینہ اور آدھا دُوسرا مہینہ واقع ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً یہُودیوں کا پہلا مہینہ نسان ۱۵ مارچ کو شروع ہوتا ہے اور ۱۵ اپریل کو ختم ہو جاتا ہے پس ۱۶ اپریل سے جیار دُوسرا مہینہ شرُوع ہوتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس ؎

ہوائی لڑائی کے جدید ترین طریقے

"ہوائی لڑائی" کا تصور عام طور پر یوں کیا جاتا ہے۔ کہ ایک جیل گاڑی" اُڑکر دُشمن کے علاقے پر پہونچتی ہے۔ اور منٹ دو منٹ لا کر تھوڑی دیر تک آگ اُگلتی رہتی ہے۔ اور پھر اپنے اڈے پر واپس آجاتی ہے۔ بلاشبہ زیادہ تر یہی طریقہ استعمال بھی ہوتا ہے۔ اور یہ لڑائی ایک حد تک سمجھ میں بھی آسکتی ہے۔ مگر حیرت تو اس پر ہوتی ہے۔ کہ پُوری فوجیں مکمل طور پر مسلح اور رسد اور سامانِ جنگ سے لیس ان ہلکی پھلکی تیاتی ہوئی گاڑیوں کے ذریعہ دُشمن کے علاقہ میں پہونچ جاتی ہیں۔ اِس بات پر بھی تعجب ہوتا ہے۔ کہ اچانک پہونچ کیسے جاتی ہے؟ حفاظتی دستے ہوائی میں اِن کا خاتمہ کیوں نہیں کر دیتے۔ پولینڈ۔ ہالینڈ۔ بلجیم اور ناروے میں جرمنی اِس ترکیب کو کامیابی کے ساتھ عمل میں لاچکا ہے۔ اور سُنا جاتا ہے۔ کہ اب اس کی دیکھا دیکھی برطانیہ اور متحدہ امریکہ بھی ایسے دستے تیار کر رہے ہیں۔

"ہوائی جہازوں" سے ایک ہزار فوج اور اُس کا سامان لے جانے کے لئے تقریباً سوا سو ہوائی جہاز درکار ہوتے ہیں۔ آگے آگے کوئی تیس غوطہ خور بمبار ہوتے ہیں۔ ان کے پیچھے دس بار بردار ہوائی جہاز ہوتے ہیں۔ جن میں چھتریوں سے اُترنے والے آدمی ہوتے ہیں۔ جن کے بعد ۵۰ بار بردار ہوائی جہاز ہوتے ہیں۔ اُن میں ہر جہاز پر بیس پیدل سپاہی ہوتے ہیں۔ اُن کا سامان جس میں ڈیڑھ لاکھ فائر کا گولہ بارود۔ ۷۰ ریڈیو سٹ۔ ۳۰ موٹر سائیکلیں ۷۰ مشین گنیں اور چھ ٹینک شکن توپیں ہوتی ہیں۔ ۵ ہوائی جہازوں پر رہتا ہے۔ جب ضرورت ۳۰ یا اس سے زیادہ ہوائی لڑنے والے بمبار اِس ہوائی قافلے کے محافظ ہوتے ہیں۔ اور اگر دُشمن کے ہوائی جہاز اِس قافلہ پر دھاوا کریں۔ تو یہ اُن سے ٹکر لینے کو مستعد رہتے ہیں۔ ہوائی لڑائی میں دونوں طرف کے ہوائی جہاز ایک دُوسرے پر مشین گن سے گولے برساتے ہیں۔ اور برابر ایک دُوسرے کو جھکائی دیتے رہتے ہیں۔ چوٹ کھانے کے بعد ہوا باز بڑے بڑے چھاتے لیکر پھاندنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن مشین گن کی تباہی یقینی ہو جاتی ہے۔ منزلِ مقصود کے اُوپر پہنچ کر غوطہ خور چاروں طرف بموں اور مشین گن کے گولوں کی بے پناہ بارش کرتے ہیں۔ تاکہ دُشمن مُقابلے کے قابل نہ رہ جائے۔ اور اس بوچھاڑ کے بعد دو تین سو چھتری باز تین تین سکنڈ کے وقفے سے پھاندتے ہیں۔ ہر تیسرے آدمی کے ساتھ ایک چھوٹی مشین گن ہوتی ہے۔ اور باقی کے پاس پستول ہوتے ہیں۔ شروع میں ان کے ساتھ رائفل اور مشین گن بھی ہوتی تھی۔ مگر تجربہ سے پتہ چلا۔ کہ اِس طرح اُترتے وقت ہاتھ پیر ٹوٹنے کا امکان رہتا ہے۔ اسلئے اب یہ ہتھیار اُوپر ہی سے الگ چھتریوں کے ذریعہ پھینکے جاتے ہیں۔ ان کے اُوپر ایسے

خول چڑھے ہوتے ہیں۔ کہ زمین پر گرنے سے اُن کو کوئی نقصان نہیں پہونچتا۔ یہ چھتری باز سپاہی زمین پر آتے ہی ناکہ بندی کر لیتے ہیں۔ اور قرب و جوار میں دُشمن کے ذرائع رسل و رسائل کو برباد کر دیتے ہیں۔ اوّل تو یہ کرتے ہی ایسی جگہ پر ہیں۔ جہاں دُشمن کی فوج نہ موجود ہو۔ اور اگر ٹکر ہو ہی گئی۔ تو اپنے ساتھ لائے ہوئے ہتھیار سے دُشمن کو جو پہلے ہی سے اِس بلائے آسمانی کو دیکھ کر ہکا بکا ہو جاتا ہے۔ مار بھگاتے ہیں۔ ان ہوا بازوں کو ہوائی جہاز اُتارنے کے لئے موزوں جگہ تلاش کرنے۔ اپنے ساتھیوں کو اشاروں اور خفیہ الفاظ سے پیغامات پہونچانے اور ہاتھ کے بم پھینکنے کی کافی مشق کرائی جاتی ہے۔ اُن کا کام بہت تیزی اور احتیاط سے ہوتا ہے۔ اور وُہ تھوڑی دیر میں پیادہ فوج لانے والے ہوائی جہازوں کو سگنل دیکر بُلا لیتے ہیں۔ ایک گھنٹہ میں یہ پوری سپاہ آگے بڑھنے کے لئے پھر صف آرا ہو جاتی ہے ؛

ہوائی جہازوں کا یہ استعمال ہر جگہ اور ہر وقت نہیں ہوتا۔ جہاں جہاں فوج آسانی کیساتھ موٹروں ریلوں اور سمندری جہازوں کے ذریعہ پہونچائی جا سکتی ہے۔ وہاں ہوائی جہازوں سے بمباری کا کام لیا جاتا ہے۔ پہلے ہوائی بمبار آتش گیر اور پھٹنے والے بم گرا کر دُشمن کے مُقابلہ کی طاقت کمزور کر دیتے ہیں۔ اور ان کے بعد ٹینک مشینی توپیں اور پیادہ فوجیں آگے بڑھتی ہیں۔ جرمنی فرانس میں اپنے بمباروں کے بل پر جیت گیا۔ ہوائی جہاز سے پھینکے جانے والے توپ کے گولوں اور مشین گن کی گولیوں سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ اور اب تو برابر ہی نئے نئے قسم کے بم بنتے رہتے ہیں ؛

معمولی سو پونڈ وزنی بم اِس طرح بنا ہوتا ہے۔ کہ اُس کے ٹکڑے ۵۰ گز پھیل جاتے ہیں۔ یہ بم تباہی میں بہت کارگر ہوتے ہیں۔ مگر اُن سے آسانی کے ساتھ بچاؤ کیا جا سکتا ہے۔ ہوائی حملہ سے پناہ دینے والی خندقوں کے اندر ان کا اثر نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی مضبوط عمارت کو کوئی بھاری نقصان پہونچتا ہے۔ خندقوں کے پناہ گزینوں کو ہلاک کرنے کے لئے چھتری والے بم استعمال کئے جاتے ہیں۔ اور اِس بم کی یہ صفت ہے۔ کہ آہستہ آہستہ زمین پر آتا ہے۔ اور زمین پر پہونچنے سے پہلے ہی مقررہ وقت پر پھٹ سکتا ہے۔ اِسطرح اِسکے ٹکڑے خندقوں تک پہونچ جاتے ہیں۔ اور زمین دوز پناہ گاہیں بھی ہوائی حملے میں محفوظ نہیں رہ پاتیں۔ عمارتوں پر بھی ایک خاص طرح کے بم گرائے جاتے ہیں۔ اور ان بموں کا خول نسبتاً ہلکا ہوتا ہے۔ اور اس میں ایسے مسالے (T. N. T) ہوتے ہیں۔ جن کی وجہ سے بم پھٹنے پر بڑے زور کا دھماکا ہوتا ہے۔ اور ہوا کا دباؤ اِسقدر ہوتا ہے۔ کہ اُسی دھماکے میں عمارتیں لرز لرز کر گرنے لگتی ہیں ؛ کچھ ایسے بم ہوتے ہیں۔ جن کو آگ لگانے کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔ آتش گیر بموں کے سلسلہ میں رُوس کی تحقیق یہ ہے۔ کہ اگر یہ عمارت منہدم کرنیکے بعد گرائے جائیں تو زیادہ [illegible] پھٹنے والا بم

ہوتا ہے۔ مگر اس کے خول کے اندر تقریباً تیس پینسل کی شکل کے آگ لگانے والے بم رکھے ہوتے ہیں۔ ہوائی جہاز سے گرنے پر تھوڑی دور تک تو یہ بم یونہی آتا ہے۔ مگر ایک معین بلندی پر خول نکل جاتا ہے۔ اور پینسل تمام پھٹنے والے بم کے چاروں طرف گر پڑتے ہیں۔ اور منہدم شدہ عمارت کو فی الفور آگ لگا دیتے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ حیرت انگیز اور خطرناک بم وہ ہے۔ جو زمین پر گرنے کے بعد ایک مقررہ وقفہ کے بعد پھٹتا ہے۔ یاد ہوگا۔ کہ کئی مہینے پہلے برطانیہ کے راج محل میں اسی طرح کا ایک بم پھٹنے کی اطلاع آئی تھی۔ یہ بم پہلے زمین میں دھنس جاتا ہے۔ اس کے اندر شیشے کی ایک نلکی میں تیزاب بھرا ہوتا ہے۔ زمین پر گرنے سے یہ نلکی ٹوٹ جاتی ہے۔ اور تیزاب آہستہ آہستہ خول کو کھاتا رہتا ہے۔ جب خول بالکل ختم ہونے لگتا ہے۔ تو بم ایک دم سے پھٹ جاتا ہے۔ جتنی دیر کے بعد بم سے کام لینا ہوتا ہے۔ اس حساب سے خول بنایا جاتا ہے۔ اس کی دھات جتنی موٹی ہوگی۔ اتنی ہی دیر میں بم پھٹے گا۔ اور جتنی پتلی ہوگی۔ اتنی ہی جلدی پھٹے گا۔ یہ وقفہ چند گھنٹے سے لیکر کئی دن تک کا ہو سکتا ہے ہوائی حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے کی دو ترکیبیں ہیں۔ ایک ہوائی جہاز شکن توپ۔ اور دوسرے ہوائی چھیٹے یا جنگی ہوائی جہاز ۔

ہوائی چھیٹے یا جنگی ہوائی جہاز مشین گن سے مسلح ہوتے ہیں۔ ان سے بچاؤ کرنے کے لئے اکثر بمباروں میں بھی مشین گنیں لگی ہوتی ہیں۔ ہوائی لڑائی میں ابھی تک برطانیہ کی جیت زیادہ تر مدافعت کرنے والے کی رہی ہے اسی لئے اس کے ہوابازوں نے بمباروں کا مقابلہ کرنے میں اچھی خاصی مہارت بھی حاصل کر لی ہے۔ برطانی ہوا باز اپنا جہاز دشمن کے جہاز کے سامنے لاکر ایک بٹن دبا دیتا ہے۔ جس سے ہوائی جہاز کے بازوؤں میں لگی ہوئی آٹھ مشین گنیں چلنے لگتی ہیں۔ ان کا دہانہ ۳۰۳۔ انچ کا ہوتا ہے۔ اور رفتار ۱۲۰۰ فائر فی منٹ ہوتی ہے۔ اگر اتنی تیز چلنے والی مشین گنیں نہ ہوں۔ تو حملہ کی کامیابی کی کوئی امید نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ دشمن ایک یا دو سیکنڈ سے زیادہ ایک ہی نشانہ پر نہیں رہتا۔ دشمن کے بمباروں کو آگ لگانے سے روکنے کا دوسرا ذریعہ ہوائی جہاز شکن توپیں ہیں۔ مگر ان کا نشانہ بھی سو فیصدی کامیاب نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ اول تو ایک ہوائی جہاز کو گرانے کے لئے کئی کئی اور بعض لوگوں کا تو کہنا ہے۔ کہ کوئی دو سو توپیں بیکار ہوتی ہیں۔ جو خود زاویوں پر نصب ہوں۔ اور ایک ساتھ گولے پھینک سکیں۔ تاکہ ہوائی جہاز ان کی زد سے نکل نہ سکے۔ دوسری دقت یہ ہے۔ کہ خراب موسم اور کہر آلود فضا میں یہ پتہ چلانا بھی دشوار ہوتا ہے۔ کہ دشمن اوپر منڈلا رہا ہے۔ ہوائی جہاز کا پتہ دینے والی اونچے سے اونچی مشین اس وقت پتہ دیتی ہے۔ جب ہوائی جہاز کوئی آٹھ میل دور رہ جاتا ہے۔ اسطرح مقابلہ کی تیاری کے لئے وقت بہت کم رہ جاتا ہے۔ اور پھر یہ بھی ضروری نہیں ہے۔ کہ وہ ہوائی جہاز شکن توپ کی زد میں آہی جائے گا بہر حال ان ہتھیاروں کو ایک ساتھ ہوائی جہاز شکن توپ کا کام کسی قدر آسان کر دیا ہے۔ ایک ایسی

مشین ایجاد ہوئی ہے۔ جو پچاس میل دور ہی سے ہوائی جہاز کی بھنک پا جاتی ہے۔ اس کا اصول یہ ہے۔ کہ مشین سے بہت تیز احساس ریڈیائی لہریں نکل کر فضا میں پھیلتی رہتی ہیں۔ جب یہ کسی چیز سے ٹکراتی ہیں۔ تو سیدھی جہاں سے نکلی تھیں وہیں واپس آجاتی ہیں۔ ان لہروں کے آنے جانے میں جتنا وقت لگتا ہے۔ اور جس سمت سے وہ واپس آتی ہیں۔ اس کا حساب لگا کر معلوم کیا جا سکتا ہے۔ کہ جس چیز سے وہ ٹکراتی ہیں۔ وہ کس طرف اور کتنے فاصلہ پر ہے۔ یہ سب کام بھی مشین ہی کرتی ہے ✦

ان مفصل معلومات کے بعد ہوائی جھپٹے ریڈیائی لہروں کی رہنمائی میں اوپر جا کر اپنے دشمن سے ٹکر لے سکتے ہیں۔ اور ہوائی جہاز شکن توپیں بھی صحیح سمت میں اپنے گولے پھینک سکتی ہیں۔ ہوائی جہاز شکن توپیں کئی طرح کی ہوتی ہیں۔ عام طور پر سب بھاری ہوائی جہاز شکن توپ کا دہانہ ۳ر۷ انچ ہوتا ہے۔ یہ توپ مستقل طور پر نصب کر دی جاتی ہے۔ اور تیس ہزار فٹ کی بلندی پر ۲۸ پونڈ وزنی گولے ۲۵ گولے فی منٹ کے حساب سے پھینک سکتی ہے۔ اس سے چھوٹی توپ جو آسانی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جائی جا سکتی ہے بیس ہزار فیٹ تک اوپر گولے پھینکتی ہے۔ اس کا دہانہ ۳۔ انچ اور گولہ کا وزن ۱۰ پونڈ ہوتا ہے۔ نیچے اڑنے والے ہوائی جہازوں کے لئے ۵ر۱ انچ دہانہ کی چھوٹی توپ استعمال ہوتی ہے۔ جو ۱۲۰ گولے فی منٹ پھینکتی ہے۔ ان توپوں کے ساتھ ایک آلہ ہوتا ہے۔ جو ہوائی جہاز کا پتہ بتاتا رہتا ہے۔ یہ آلہ دو ٹکڑوں میں ہوتا ہے۔ ایک تو تقریباً چھ فٹ لمبی اور فٹ موٹی نلکی ہوتی ہے۔ جو ایک چول پر گھومتی رہتی ہے۔ اس سے بلندی کا پتہ چلایا جاتا ہے۔ اس پر تین آدمی کام کرتے ہیں۔ ہوائی جہاز کی بھنک پاتے ہی دو آدمی دوربینوں کو اس کی طرف پھیرتے ہیں۔ اور دونوں دوربینوں کے ذریعہ ہوائی جہاز کا عکس ایک تیسرے آدمی کے سامنے آتا ہے۔ یہ تیسرا آدمی ایک پہیہ گھماتا ہے جس سے دونوں عکس ایک دوسرے کے اوپر آجاتے ہیں۔ ٹھیک اسی لمحہ ہوائی جہاز کی بلندی مشین میں چھپ جاتی ہے۔ اور یہ اطلاع خود مشین کے دوسرے حصہ میں پہنچ جاتی ہے۔ یہاں بھی دو دوربینیں ہوتی ہیں۔ یہ ہوائی جہاز کا سیدھا اور ٹیڑھا فاصلہ لیتی رہتی ہیں۔ اندر کی طرف ایک حساب لگانے والی مشین ہوتی ہے۔ یہ ان فاصلوں کو زاویوں کی شکل میں چھاپ دیتی ہے۔ اور یہیں پر گولہ میں فلیتہ لگایا جاتا ہے۔ فلیتہ اس حساب سے لگایا جاتا ہے۔ کہ گولہ ہوائی جہاز سے ڈھائی سو فٹ یا اس سے کم فاصلے پر پھٹے۔ ہوائی جہاز شکن توپوں کے سلسلہ میں ایک جرمن ایجاد کا بیان دلچسپی کا باعث ہوگا۔ جرمنی کے پاس جیسا کہ اسپین کی لڑائی میں ظاہر ہو چکا ہے۔ بھاری توپوں میں ۸۸ ملی میٹر کے دہانے کی توپ ہے۔ جو ایک ہی وقت میں ہوائی جہاز شکن۔ ٹینک شکن اور میدانی توپ کا کام کرتی ہے۔ یہ توپ صرف یہ کہ دنیا کے اور ملکوں کی توپوں سے بہت لمبی اور مار والی ہے۔ بلکہ تین کاموں میں استعمال ہونے کی وجہ سے [illegible] کام کے لئے ایک خاص طرح کی توپ ہے۔

شاید اس کا سبب یہ ہو۔ کہ جرمنی میں صنعت و حرفت اور خاصکر جنگی آلات کے کارخانے براہ راست حکومت کے قبضہ میں ہیں۔ اور نجی منافع کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ برخلاف اسکے برطانیہ میں صنعت پر سرمایہ داروں کا قبضہ ہے۔ تین توپوں میں اُنہیں جتنا منافع ملتا ہے۔ اُتنا ایک توپ میں نہیں مل سکتا۔ اسی لئے وہاں جرمنی کی اس ترکیب کا توڑ نہیں نکالا گیا ہے *

مُلک کا مستقبل

اگر تدبیر کی قوت مقدر سے اُلجھ جائے — تو ذرہ جوش میں آ کے کہساروں سے ٹکرائے

یہ نکتہ بتاتا ہوں وطن کے نوجوانوں کو — عمل کا نور وہ شے ہے کہ جگنو چاند بن جائے

یہ ممکن ہے کہ ہو شیخ و برہمن میں وفا پیدا — یہ ممکن ہے محبت پھوٹ کر دل سے نکل آئے

فسادوں سے فضا مسموم ہے آباد شہروں کی — یہ ممکن ہے انہی شہروں پہ اُلفت کا فسوں چھا جائے

ہو گر شوقِ عمل پیدا وطن کے نوجوانوں میں — زمیں کیا ہے، آسماں بھی لرزہ براندام ہو جائے

مری آنکھوں میں یہ نقشہ جو پھرتا ہے تو کہتا ہوں — عجب کیا ہے یہ بیڑا غرق ہو کر پھر اُبھر آئے

بچپن انسانی زندگی میں ایک ہی بار آتا ہے۔ جوانی۔ ادھیڑپن اور بڑھاپا بھی بار بار نہیں آتے۔ اسی طرح ترقی کے موقعوں کا بھی یہی حال ہے جس نے انہیں کھو دیا۔ وہ مفت میں مارا گیا جس نے ان سے فائدہ اُٹھا لیا۔ وہ دین و دنیا میں سرخرو اور کامیاب ہو گیا *

ذروں میں ہے صلاحیتِ اوج و ارتقا — ان کو سمیٹ اور نئے آسماں بنا

ہستی کو منتشر یہ تقدم ضرور ہے — کچھ بھی نہ تھا یہاں تو یہ عالم کہاں بنا

نہایت اہم اعداد و شمار

ہندوستان آجکل صحت و تندرستی کے اعتبار سے کس خطرناک دور سے گذر رہا ہے اس کا تذکرہ غالباً ہماری آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی ہوگا:- بدنصیب ہندوستان میں شرح اموات ۲۳ر۶ فی ہزار یعنی سالانہ تقریباً پچاس لاکھ ہے۔ جبکہ انگلستان میں شرح اموات فی ہزار ۱۲ر۰۔ امریکہ میں ۱۰ر۹۔ جاپان میں ۱۶ر۸ - ہالینڈ میں ۱۸ر۲۷ آسٹریلیا میں ۹ر۵ ہے۔ گویا جب ہندوستان میں تین آدمی مرتے ہیں تو ہالینڈ میں ایک- اور جب انگلستان میں ایک مرتا ہے۔ تو ہندوستان میں دو آدمی موت کا شکار ہوتے ہیں۔ یعنی جزیرۂ برطانیہ میں صحتِ عامہ ہندوستان سے دوگنی بہتر ہے۔ ہندوستان میں ۲۳ فیصدی بچے ۵ سال کی ہی عمر میں مرجاتے ہیں۔ یعنی سال بھر میں ایک ہزار بچوں میں سے ۱۶۴۔ اموات کا شکار ہو جاتے ہیں جبکہ انگلستان میں ۶۰ فی ہزار۔ امریکہ میں ۵۶۔ نیوزی لینڈ میں ۳۲۔ اور جاپان میں ۱۱ فی ہزار موت کی بھینٹ چڑھتے ہیں * ہندوستان میں اوسط پیدائش برطانیہ کے مقابلے میں دوگنا اور ہالینڈ کے مقابل ۷۰ فیصدی زیادہ ہے * ہندوستان میں ہر سال ۵۰ ہزار زچائیں وبائی امراض کی بھینٹ چڑھتی ہیں۔ کمشنر حفظانِ صحت کی رپورٹ کی بنا پر ۴۴ فی صدی اموات ملیریا سے ہوتی ہیں۔ اور ہر سال ⅓ آبادی پر ملیریا کے اثرات پڑتے ہیں۔ یعنی ہندوستان میں سالانہ ۱۳ کروڑ آدمی ملیریا سے کسی نہ کسی طرح متاثر ہوتے ہیں۔ اگرچہ ملک میں ملیریا سے تحفظ کے لئے دو لاکھ پونڈ کونین استعمال کی جاتی ہے۔ مگر پھر بھی ڈیڑھ لاکھ پونڈ کونین کی مزید ضرورت ہے۔ اگر موجودہ مقدار میں ۵۰ فیصدی کا اضافہ اور کر دیا جائے۔ تب کہیں ہر شخص کی ضرورت پوری ہو سکتی ہے۔ محکمۂ حفظانِ صحت کا بیان ہے۔ کہ ہندوستان میں تقریباً چالیس فیصدی آبادی آنکھوں کے مرض میں مبتلا ہے۔ کم و بیش اندھوں کی تعداد ایک کروڑ ہے * ہمارے ملک میں ۴۰۱۸۵ آدمیوں کے لئے ایک شفاخانہ ہے۔ یعنی کل شفاخانے ۶۵۰۰ ہیں۔ صحت و تندرستی پر حکومت کی طرف سے ۵ کروڑ ۵۰ لاکھ روپیہ خرچ ہوتا ہے۔ جبکہ انگلستان کی چار کروڑ آبادی پر ۲۹ کروڑ روپیہ خرچ میں آتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں۔ کہ ہماری حکومت ہر سال تین آنے [illegible] فی کس صحت تندرستی پر خرچ کرتی ہے * کیا یہ اعداد و شمار ہی خواہانِ ملک کی آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی نہیں؟ اور دوسرے ممالک کو نظر انداز کرتے ہوئے خود برطانیہ عظمیٰ کے اعداد و شمار ملاحظہ فرمائیے *

مُدت ہوئی کہ چشمِ تحیر کو ہے سکوت — اب جنسِ نظر میں کوئی داستاں نہیں

معلومات

ایک درخت والا باغیچہ

:- "میجر فرینک رے گڈ" امریکہ کے زرعی صوبہ واری نارمل اسکول کے ایک معلم نے تیرہ سال قبل سیب پیدا کرنے والے صنعتی ادارہ کے لئے ایک زندہ یادگار کے طور پر "ایک درخت والا باغیچہ" پیدا کرنے کی کوشش شروع کی۔ انہوں نے اس امر کا تہیہ کر لیا تھا۔ کہ "نیو برنسوک" میں جسقدر اقسام کے سیب پیدا ہوتے ہیں۔ ان سب کی قلمیں ایک ہی درخت کی مختلف شاخوں میں لگائی جائیں۔ چنانچہ اس کام کے لئے انہوں نے ایک جنگلی مضبوط قسم کے سیب کا درخت منتخب کیا۔ جو کہ بیج سے پیدا ہوا تھا۔ پہلی فصل میں انہوں نے اس درخت پر ستر مختلف قسم کے سیبوں کی قلمیں باندھیں سنہ ۱۹۳۰ء کے ختم پر یہ درخت ۲۵ قسم کے مختلف سیبوں سے بار آور ہو گیا۔ تین سال بعد اس نے ۵۰ قسم کے سیب پیدا کئے۔ اس کے بعد ہر سال "میجر گڈ" اس درخت پر قلموں کا اضافہ کرتے رہے۔ چنانچہ آج ان کے اس مشہور و معروف درخت پر ۲۲۷ قسم کی قلمیں نصب ہیں۔ گویا اس ایک درخت سے وہ تمام قسم کے سیب جو "نیو برنسوک" میں پائے جاتے ہیں۔ پیدا ہوتے ہیں۔ یہ درخت بجائے خود ایک گلدستہ معلوم ہوتا ہے۔ اور موسم خزاں میں اس ایک درخت پر رنگ برنگ کے مختلف سیب لٹکتے ہوئے بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ اس میں سے مشہور اقسام "بن ڈیوس" "ڈیلو ٹرانسپیرنٹ" "ناردرن اسپائی" اور "روم بیوٹی" ہیں ؛

عجائب خانہ میں ایک خوفناک ڈھانچہ

۔ حال ہی میں بوسٹن (امریکہ) کے "ہارورڈ عجائب خانہ" میں ایک نہایت درجہ خوفناک ڈھانچہ ایک ساٹھ فٹی آبی دیو (PLESIOSAUR) کا رکھا گیا ہے جس کے متعلق خیال کیا جاتا ہے۔ کہ یہ سمندروں میں بارہ کروڑ برس قبل پایا جاتا تھا۔ اس آبی دیو کے منہ میں ۹۲ تیز اور نکیلے دانت اس طرح نصب ہیں۔ کہ منہ بند کرتے وقت اوپر اور نیچے کے دانت باہم مقفل ہو جاتے ہیں ؛

سانپ کے زہر سے آنکھ کے امراض کا علاج

۔ کوبرا اور دیگر زہریلے سانپوں کے زہر کو آنکھ کے امراض میں درد دور کرنے کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس کو آنکھ کے اپریشن میں خون بند کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ مرض ٹریکوما اور آنکھ کے پھوڑوں کے لئے اس کو بہت مفید پایا گیا ہے ؛

زنگ دور کرنے کی آسان اور مؤثر ترکیب

۔ "امونیم سائٹریٹ" (AMMONIUM CITRATE) کا محلول "زنگ دور" کرنے کے لئے بہترین ثابت ہوا ہے۔ اگر یہ محلول گرم استعمال کیا جائے ...

زنگ آلود شئے کو بالکل صاف کر دیتا ہے۔ اگر کسی چیز کو محلول میں ڈالنے میں سہولت نہ ہو۔ مثلاً لمبی تلوار یا دوسری کوئی بڑی زنگ آلود شئے۔ تو اس کے لئے مناسب یہ ہے کہ ایسی چیز پر کپڑا لپیٹ دیا جائے۔ اور اس کپڑے پر گرم محلول ڈالدیا جائے جس سے زنگ آلود شئے بالکل صاف ہو جائیگی ؛

طوفان گریز مکان ۔ شدید طوفانوں اور تیز آندھیوں سے محفوظ رہنے کے لئے نیویارک کے میر تعمیر (ARCHITECT) مسٹر "ایڈون اے۔ کوچ" نے ایک گردش کرنے والا گھر تیار کیا ہے۔ جو اُن مقامات کے لئے نہایت موزوں ہے۔ جہاں شدید قسم کے طوفان آتے رہتے ہیں۔ جن سے مکان کی چھتیں اُڑ جاتی ہیں۔ درخت منہدم ہو جاتے ہیں۔ اور دیہات اُجڑ جاتے ہیں۔ یہ مکان سامنے سے تکونا بنا ہوا ہے۔ اور طوفان کے وقت یہ ہوا سے اسطرح مقابلہ کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے ہوائی جہاز ہوا کو چیرتا ہوا پرواز کرتا ہے۔ ہوا آگے جھکڑ اُس کے بازوؤں پر سے ہو کر گذر جاتے ہیں۔ اور مکان بالکل محفوظ رہتا ہے۔ اس مکان کی بنیاد پہیوں پر ہے۔ جو پٹڑیوں پر بوقت ضرورت گول دائرہ میں گھوم سکتا ہے۔ یہ مکان یوں بھی آرام دہ ہے۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ گرد و پیش کے مناظر کی تفریح ایک ہی مقام پر بیٹھے بیٹھے کی جا سکتی ہے۔ ذرا سی کل دبانے سے مکان کا رُخ بدلجاتا ہے۔ اور مناظر کا وہ حصہ آپکے سامنے آجاتا ہے جس سے کسی خاص وقت میں آپ لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں ؛

آبدوز کشتی اور اُسکی قیمت :۔ معمولی آبدوز کشتی کی قیمت پانچ لاکھ پونڈ تقریباً ستر لاکھ روپیہ) ہوتی ہے۔ جاپان نے ایک "جیبی آب دوز" تیار کی ہے۔ جسکی قیمت صرف گیارہ سو پونڈ تقریباً پندرہ ہزار روپیہ ہے۔ اس کی دوڑ ۶۰۰ میل ہے۔ اور دعویٰ کیا جاتا ہے۔ کہ یہ اٹھارہ سو فیٹ کی گہرائی تک نیچے جا سکتی ہے ؛

چائے کی پتی سے بنی ہوئی پیالی :۔ جائے بیرا میں چائے کی ایسی پیالیاں استعمال کی جاتی ہیں۔ جو خود چائے کی پتی کو خوب دبا کر تیار کی گئی ہیں۔ اُس میں گرم پانی ڈالنے سے پیالی سے صرف اس مقدار میں چائے تحلیل ہو جاتی ہے جتنی ایک پیالی کے لئے ضرورت ہوتی ہے۔ اس طرح چائے کی پتی سے ... بنی ہوئی پیالی چھ ماہ تک کام دیتی ہے ؛

رنگ سے عورتوں کی مزاجی حالت کا اندازہ :۔ کسی عورت کی مزاجی حالت کا اندازہ کرنے کے لئے اُس کے پسندیدہ رنگوں اور ملبوسات پر تجربہ سے یہ معلوم ہوا۔ کہ خاص ذہنیت کی عورتیں خاص قسم کے رنگ پسند اور زیب تن کرتی ہیں۔ چنانچہ عموماً دیکھا گیا ہے کہ گہرا سرخ رنگ پسند کرنے والی عورتیں میں شوخی ... "سے گلابی رنگ پسند کرنے والی الفت محبت والی ہوتی ہیں۔ گہرا سبز

رنگ پسند کرنیوالی عورتوں میں رشک کا مادہ ہوتا ہے۔ نیلے رنگ کی طرف میلان رکھنے والی عورتیں عبادت گزار اور محبت کرنیوالی ہوتی ہیں۔ ارغوانی رنگ کی شائق عورتیں خود دار اور شریف ہوتی ہیں۔ لیکن بعض اوقات اُن میں جذباتِ عاشقی بھی پائے جاتے ہیں۔ ہلکے کاسنی۔ نارنجی اور زرد رنگ کی دلدادہ ذہین۔ ہوشیار اور علم دوست ہوتی ہیں۔ سیاہ یا گہرے بھورے رنگ سے مکر و فریب ظاہر ہوتا ہے۔ سبز رنگ پسند کرنیوالی عورتوں میں جذبۂ محبت پایا جاتا ہے ۔

"وادی جہنم" سے حصول قوت :۔ اطالیہ کے شمالی حصہ میں ایک وادی ہے۔ جو "وادی جہنم" کے نام سے مشہور ہے۔ اسکے اس نام کی وجہ تسمیہ یہ بتلائی جاتی ہے۔ کہ یہ مقام زیر زمین دوز بھاپ کا مخزن ہے! اطالوی انجنیروں نے اب اس قدرتی ذریعہ سے کام لینا شروع کر دیا ہے۔ یہ بھاپ ۲۲۰ درجہ فارن ہیٹ پر زمین سے دستیاب ہوتی ہے۔ اس کے حصول کے لئے تقریباً تین سو کنوئیں کھودے جا چکے ہیں۔ اور اُن سے جو بھاپ برآمد ہوتی ہے اس سے روزانہ بارہ لاکھ کلوواٹ بجلی کی طاقت حاصل کی جاتی ہے۔ چونکہ وہ بھاپ جو کنوؤں سے براہِ راست حاصل کیجاتی ہے۔ صاف نہیں ہوتی۔ اور اُس میں مختلف کیمیاوی اجزا بھی شامل ہوتے ہیں۔ اس لئے اس بھاپ سے خالص پانی گرم کر کے جو بھاپ پیدا کی جاتی ہے۔ اُس کو مشینری وغیرہ کے چلانے میں کام میں لایا جارہا ہے۔ کنوؤں سے جو بھاپ نکلتی ہے۔ اُس کو صحیح طریقہ پر صاف اور منجمد کر کے کیمیاوی اجزائے علیحدہ کر لئے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس وقت تک اسی لاکھ ٹن سے زیادہ کیمیاوی مفردات مثلاً "کاربونک ایسڈ"۔ "امونیا"۔ "بورک ایسڈ" وغیرہ اسی طریقہ سے برآمد کئے جا چکے ہیں ۔

سوتے ہوئے انسان کی حالت کا اندازہ :۔ امریکہ میں اس امر پر متعدد تجربات ہو رہے ہیں کہ سوتے وقت انسان کی کیا حالت ہوتی ہے؟ اس مقصد کو ریکارڈ کرنے کے لئے متعدد آلے تیار کئے گئے ہیں۔ ایک آلہ سے اس امر کا پتہ چلتا ہے۔ کہ نیند کے دوران میں انسان کتنی مرتبہ کروٹ لیتا ہے؟ دوسرے سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ سانس کی رفتار میں کیا تغیرات ہوئے؟ اور تیسرے سے سوتے وقت انسان کے جسم اور چہرہ کی مختلف کیفیات کا علم ہوتا ہے۔ جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کہ کسی خاص وقت میں وہ کس نوعیت کا خواب دیکھ رہا تھا؟

دنیا کا سب سے بڑا درخت :۔ دنیا کا سب سے بڑا درخت کیلیفورنیا کی وادی میں موجود ہے۔ اس درخت کا نام امریکن سیول وار کے مرد میدان کے نام پر "جنرل شیرمان" رکھا گیا ہے ۔ یہ ۲۷۵ فیٹ بلند ہے۔ اور اس کی جڑ کا دائرہ ۱۰۲ فیٹ ہے۔ اس کی سب سے بڑی شاخ کی لمبائی ۱۳۰ فیٹ ہے۔ اور اس کے وزن کا مجموعی اندازہ ۴٫۳ ملین پونڈ کیا جاتا ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ یہ درخت سن ۱۲۰۰ ق۔م میں پیدا ہوا تھا جبکہ مصر میں فرعون کی حکومت تھی۔ خیال کیا جاتا ہے۔ کہ اگر درخت کی کافی حفاظت اور نگہداشت کا انتظام کر

دیا جائے۔ تو وہ دس ہزار سال تک زندہ و قائم رہ سکتا ہے ⁘

بجلی سے داغنے والی مشین ۔ حال ہی میں "نیوزی لینڈ" میں بجلی سے داغنے کی ایک مشین ایجاد ہوئی ہے۔ جس سے جانوروں پر آسانی اور عجلت کے ساتھ نمبر ڈالے جا سکتے ہیں۔ یہ طریقہ مروّجہ بہیمانہ طریق سے زیادہ بہتر اور مبنی بہ انسانیت کہا جاتا ہے ⁘

زبان کی ذائقہ پذیری :- انسان کی زبان سب سے پہلے میٹھی چیز کے اثر کو قبول کرتی ہے۔ اس کے بعد نمکین چیز کے اثر کو محسوس کرتی ہے۔ نمکین چیز کے بعد کھٹی چیز کا احساس ہوتا ہے۔ اور سب سے آخر میں کڑوی کا احساس ہوتا ہے ⁘

دُنیا کی مختلف زبانیں ۔ باور کیا جاتا ہے۔ کہ ساری دُنیا میں پانچ ہزار زبانیں بولی اور سمجھی جاتی ہیں ⁘

ہندوستانی غربت کی انتہا ۔ امریکہ کے ایک اخبار نے ہندوستان میں ننگے پاؤں پھرنے والے لوگوں کے اعداد فراہم کئے ہیں۔ اور بتلایا ہے۔ کہ ہندوستان کی ۳۵ کروڑ آبادی میں سے ۲۹ کروڑ ننگے پاؤں پھرتی ہے ⁘

سمندر میں سونے کی افراط :- اندازہ لگایا گیا ہے۔ کہ اگر سمندر کا سارا سونا دستیاب ہو جائے تو دُنیا میں ہر شخص نصف ملین ڈالر قیمتی سونے کا مالک ہو جائے ⁘

جنگ میں مکڑیوں کا مصرف :- جنگ کے سلسلے میں مکڑیوں کے جالے کو بڑی اہمیت ہو گئی ہے۔ دوربین بنانے والے مکڑیوں کو اس غرض سے پالتے ہیں۔ کہ ان کا باریک اور ہموار جالا دوربین کے شیشوں نیز آبدوزوں اور دیگر قسم کے مختلف آلوں پر نشان لگانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے ⁘ (س-ا-ح)

مخفی زبان اور جنگ :- مخفی خط و کتابت کو جدید فنونِ جنگ میں بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ایسے خطوط کی ارسال و ترسیل ایک مستقل فن کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس کے سکھانے کے لئے بڑے بڑے ماہروں کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔ درحقیقت یہ کام ہے بھی اتنی ہی توجہ کے لائق۔ اسی کے بننے بگڑنے پر بڑی سے بڑی سلطنتیں بنتی اور بگڑتی ہیں۔ اس کام میں ذراسی فروگذاشت ہو جائے۔ تو اس کے نتائج حد سے زیادہ خطرناک ثابت ہوتے ہیں ⁘ یُوں تو کم و بیش تمام معرکہ آرائیوں کے دوران میں ایسی پُر اسرار مراسلت کارفرما رہی مگر ۱۹۱۴-۱۸ء والی عالمگیر جنگ میں اس طرز کو ایک مستقل درجہ حاصل ہو گیا۔ اس کے بعد سے اس فن میں روز بروز ترقی ہی ہوتی رہی۔ اب یہ امر بالکل یقینی ہے۔ کہ موجودہ جنگ میں بھی مراسلت کے اس پُر اسرار طریقہ کو بڑی اہمیت دی جا رہی ہے۔ اور عجب نہیں کہ اس کا جنون اتنا بڑھ جائے۔ کہ ہر زبان ایک راز کی زبان

ان کرہ جائے۔ پھر تو جو عبارت یا جو زبان بھی اس خاص زمانے میں چھپی یا لکھی ہوئی نظر آئے۔ اِس پُر اسرار زبان کا
شبہ ہوگا۔ اور یہ شُبہ بے جا نہ ہوگا۔ جو لوگ اِس زبان کے حل سے واقف ہونگے۔ وُہی اِس سے لُطف اندوز ہو سکیں گے
اور اُسے حل کر کے مطلب برآری کرینگے۔ باقی سب کے لئے یہ زبان ایک چیستان بنی رہے گی ۔

دورِ جہالت میں معمولی خط و کتابت کی وُہی حیثیت تھی۔ جو آج راز کی زبان میں لکھی ہوئی مخفی خط و کتابت کی
ہے۔ چونکہ لوگ لکھنا پڑھنا بہت کم جانتے تھے۔ اِس لئے اگر اندھوں میں کسی کانے راجہ کا لکھا پڑھا عوام کے سامنے آ
جاتا۔ تو سب لوگ معمولی سے معمولی تحریر کو بھی معمہ سمجھتے۔ اور اُس کے حل کرانے کے لئے "لال بجھکڑ" کی جستجو پر
مجبور ہو جاتے۔ آج بھی جن علاقوں میں جہالت کی تاریکی بہت چھائی ہوئی ہے۔ یہی تماشا دیکھنے میں آتا ہے ۔

اُس دور کے گزرنے کے بعد جب علم کو بہت عروج ہوا۔ اور لکھنا پڑھنا عام ہوا۔ تو ضرورت محسوس ہوئی
کہ رموز اور راز کی زبانیں ایجاد کر کے اہم مقاصد پورے کئے جائیں۔ تاکہ متعلق اشخاص کے سوائے دُوسرے
ان مطالب کو بالکل نہ سمجھ سکیں ۔ "جنگِ بوئر" کے دنوں میں انگریز افسرانِ فوج اِس غرض کو پورا کرنے کے لئے
لاطینی زبان سے کام لیتے تھے۔ وُہ بیشتر مراسلت اسی زبان میں کرتے تھے۔ اور جب اُن کا کوئی خط بوئر قوم کے
لوگوں کے ہاتھ پڑ جاتا۔ تو وُہ لاطینی سے ناواقف محض ہونے کی وجہ سے اُسے طلسمی نقوش کا ایک مجموعہ قرار دیتے۔
اور اس کا ایک حرف بھی اُن کی سمجھ میں نہ آتا ۔

اِس کے بعد جب زمانے کے تغیرات نے سمجھایا۔ کہ اب ان معمولی اور ایسی ویسی چالوں سے کام نہ چلے گا۔ اور
اہم اور خطرناک مہموں میں خصوصیت کے ساتھ کسی زیادہ محفوظ و مستحکم طریقہ کو اختیار کرنا ہوگا۔ تو لوگ ایک خاص
قسم کی مخفی زبان ترقی یافتہ شکل میں وضع کرنے پر مجبور ہوئے۔ یہ زبان تاریخِ ایجاد کے بعد سے خوب پروان چڑھی
اور ۱۹۰۰ء سے ۱۹۱۴ء تک کا زمانہ ترقی کے مراحل طے کرنے کے لئے کافی ثابت ہوا۔ عالمگیر جنگ چھڑی۔ تو
یہ مخفی زبان تکمیل یافتہ شکل میں موجود تھی۔ پھر کیا تھا۔ تلوار کے جوہر کے ساتھ ساتھ اس زبان کے جوہر بھی خوب دکھائے
گئے۔ اور بڑی بڑی اہم کارروائیاں جن میں جان کی بازی لگی ہوئی تھی۔ اِسی زبان کی بدولت کامیابی سے طے
ہوئیں ۔ مخفی زبان کے وضع کرنے میں شرائطِ ذیل ملحوظ رہتی ہیں :-

۱۔ جس نوعیت کے ساتھ بھی ہو۔ سادہ ہو۔ سیکھنے والے کے لئے آسان ہو۔ اِس کے سکھانے میں کوئی
دشواری پیش نہ آئے ۔ ۲۔ اُلجھی ہوئی یا دشوار وضع کی نہ ہو۔ تاکہ تحریر کا مفہوم معلوم کرنے میں کوئی شُبہ
واقع نہ ہو۔ اور پڑھنے میں بھی غلطی کا امکان نہ رہے ۔ ۳۔ اِس قسم کی نہ ہو۔ کہ اس کے حل کرنے کے لئے کسی خاص
آلہ یا یادداشت کی محتاجی رہے۔ کیونکہ اگر ایسا کوئی آلہ یا یادداشت دُشمن کے ہاتھ پڑ جائے۔ تو سارا کھیل بگڑ جائے
گا۔ اور تمام بھید کھل جائیں گے ۔ ۴۔ نہ جاننے والے کے لئے بڑی حد تک دشوار ہو۔ اور کم سے کم یہ مقصد

ضرور پورا کر سکے۔ کہ جب تک دشمن اسے جانے۔ اس وقت تک اس کے ذریعہ سے جو احکام دیئے گئے ہیں۔ اُن کی تعمیل ہو چکے ۔

حقیقت میں اِن تمام شرطوں کا پورا کرنا آسان نہیں۔ ان میں کسی نہ کسی کی تکمیل رہ جاتی ہے۔ اور اس زبان کی وضع کا مقصد خاطر خواہ طور پر پورا نہیں ہوتا ۔ سلطنتوں کا رویہ اس خصوص میں مختلف رہا ہے۔ جرمنوں نے دوسری اور تیسری شرط کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا۔ اپنی اختیار کردہ زبان کے لئے فرہنگ یا دوسرے اور آلات ایجاد کئے تھے۔ جن سے خطوط و احکام کی زبان حل کی جاتی تھی ۔ اس زبان کی اہمیت محسوس کر کے ہر سلطنت نے پوری توجہ کے ساتھ اس فن کے باکمال اشخاص بہم پہونچائے۔ جن کا کام ہی یہ تھا۔ کہ وہ انتہائی مہارت کیساتھ ایسی پُر اسرار خط و کتابت کا حل معلوم کریں۔ اس سلسلے میں بہت سے لوگوں نے بڑی مہارت پیدا کی۔ اور چیز اس نوبت کو پہونچ گئی۔ کہ جو مخفی زبان بھی ایجاد ہوئی۔ اس کا حل کرنے والا معمولی تلاش سے میسر آ گیا۔ گذشتہ جنگ کے تجربات سے واضح ہے۔ کہ ہر معرکہ یا ہر خطرناک مہم کے رونما ہونے سے پہلے اس معرکہ یا مہم کے لئے ایک زبان ایجاد ہو چکی تھی ۔

جنگ عظیم کا پہلا پیغام راز :- راز کا پہلا پیغام جو جرمنی کے تمام برقی مرکزوں سے نشر کیا گیا اُس کا مضمون یہ تھا:- (ASON iS BORN) جس کا ترجمہ یہ ہے "ایک لڑکا پیدا ہوا ہے" یہ جرمنی کا اعلان جنگ تھا۔ اور اس کا مفہوم یہ تھا۔ کہ "جنگ چھڑ گئی ہے" ۔ جرمنی کی مخفی زبان ابتدائے جنگ میں بڑی پیچیدہ تھی۔ جرمن قائد جب اس زبان میں جب کوئی لاسلکی پیام دیتے۔ تو اس پیام کو پانچ مرتبہ دہرانے پر مجبور ہوتے۔ تاکہ سننے والے اسے سن کر سمجھ سکیں ۔

۲ ستمبر ۱۹۱۴ء کا اہم واقعہ :- جس زمانے میں جرمنی عساکر فرانس کو زیر و زبر کرنے میں مصروف تھے۔ ۲ ستمبر ۱۹۱۴ء کو ان افواج کے مابین لاسلکی پیاموں کا تبادلہ بڑے شد و مد سے جاری تھا۔ فضا اس نوع کے اشارات سے معمور تھی۔ اس موقع پر "جنرل فان کلوک" کی فوج کو حکم دیا گیا۔ کہ سامنے والی فرانسیسی فوج پر حملہ بول دے۔ اور اسے پیرس سے دور جنوب مشرقی سمت میں پسپا کر دے ۔ اتفاق سے جرمنی قائد اس مخفی حکم کو سمجھنے اور پوشیدہ اشارات کو حل کرنے سے قاصر رہا۔ فرانسیسی ان کی تہ کو پہونچ گئے۔ انہوں نے جرمن خط جنگ کا صحیح اندازہ لگا لیا۔ فوراً فرانسیسی جنرل "جوفر" نے اپنی لائن بدل دی۔ اور پیرس کے متعینہ لشکر کو حملہ کرنے کا حکم دیا۔ نتیجہ فرانسیسیوں کے موافق مرام نکلا۔ اور صرف اسی موقعہ نے جنگ کی کایا پلٹ دی۔ یہ پہلی فتح تھی۔ جو اتحادیوں کو نصیب ہوئی۔ اور اسی کی بدولت جرمنی کی اس فوج کی پیش قدمی رک گئی جو پیرس کے لئے ایک زبردست خطرہ بن گئی تھی ۔ ٹھیک اسی وقت جب فرانسیسی جرمنوں کی دکھتی رگ دبانے پر کامیاب ہوئے۔ اور جرمنی کا مخفی

لاسلکی پیام سمجھ کر نقشۂ جنگ بدل دیا۔ بالکل ایسا ہی واقعہ مشرقی محاذ پر روسیوں اور جرمنوں کے مابین رونما ہوا جہاں جرمن روسی پیام اڑانے میں فائز ہوئے۔ اور انہیں روسیوں پر اسی طرح فتح حاصل ہوئی جس طرح ان پر فرانسیسیوں کو مغربی سمت میں ہوئی تھی۔

غلطی کا نتیجہ خودکشی:۔ لڑائی سے پہلے روسی قائدوں کو پتہ لگ گیا۔ کہ جرمنوں نے مخفی روسی زبان معلوم کر لی ہے۔ اس لئے انہوں نے فیصلہ کیا۔ کہ نئی مخفی زبان وضع کریں۔ اور اسے جنگ شروع ہونیکے بعد کام میں لائیں۔ تاکہ جرمنوں کو خوب بھٹکائیں۔ مگر اجرائے کار میں سقم واقع ہونے کی وجہ سے یہ ماہرانہ تجویز ردبراہ نہ ہوئی۔ صورت حال کچھ سے کچھ ہوگئی۔ جنگ شروع ہوئی۔ اور دو روسی لشکر میدان میں جا اترے۔ جن میں ایک نئی مخفی زبان کو اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔ اور سابق کی قرارداد زبان کو کالعدم قرار دے چکا تھا۔ مگر دوسرا اس سے نابلد رہ گیا تھا۔ بد اس صورت حال کی وجہ ۲۰۔ اگست ۱۹۱۴ء کو جرمنوں کو جیسی حیرت ہوئی تھی۔ بیان میں نہیں آسکتی۔ جب روسیوں کے لشکروں کے درمیان معمولی زبان میں پیاموں کا تبادلہ ہوا۔ اور بغیر کسی تحفظ کے ہوا۔ تو جرمن بہت گھبرائے۔ اور پہلے یہ خیال کیا۔ کہ اس میں روسیوں کی کوئی چال ہے۔ اس لئے جنرل "ہنڈن برگ" نے بعض ہوائی جہازوں اور سواروں کو حکم دیا۔ کہ روسی پیاموں سے جو بات معلوم ہوئی ہے۔ اس کے سچ جھوٹ کی تحقیق کریں۔ ان لوگوں نے جانچ کے بعد پہلی معلومات کی تائید کی نتیجہ یہ ہوا۔ کہ "ہنڈن برگ" نے جیسے دشمنوں کی لاٹھوں سے پوری واقفیت تھی۔ ایمانداری درست کر لیا۔ اور روسیوں کے پہلے لشکر کو بیس کر رکھدیا جس میں ان کے ایک لاکھ آدمی قتل اور قید ہوئے۔ اس غلطی کے خمیازہ کے طور پر روسی قائد نے خودکشی کر لی۔

جرمنی مخفی زبان کا انکشاف:۔ تھوڑے دن کے بعد بحر بالٹک میں روسی بیڑے نے جرمن آبدوز کشتی "میگڈی برگ" کو گھیر لیا۔ جو جرمن قائد لاسلکی پیاموں کے حل کرنے پر مامور تھا۔ وہ یادداشت اور رموز کی کلید وغیرہ لئے ہوئے سمندر میں کود پڑا۔ مگر ڈوبنے نہ پایا تھا۔ کہ روسیوں نے اسے گرفتار کر لیا۔ اور جرمن مخفی زبان کا راز معلوم کر کے انگریزوں کو بھی اس سے مطلع کر دیا۔ جنہوں نے سمندر کے جٹلینڈ والے معرکے میں اس سے بڑا فائدہ اٹھایا۔ جب جرمنوں نے یہ خبر پائی۔ تو انہوں نے نئے رموز وضع کئے۔ مگر اتفاق ہے کہ اسکے بعد بھی ایک انگریزی آبدوز کشتی جرمنوں کی ایک غوطہ زن کشتی کو ڈبونے میں کامیاب ہوگئی۔ اس کے بعد انگریز غوّاص متوجہ ہوئے۔ کہ اس کشتی کے طریق ساخت سے فائدہ اٹھائیں۔ دوران تفتیش میں ایک روزن پر نظر پڑی۔ جو کپتان کی نشست کے قریب تھا۔ اس میں نئی مخفی زبان کی کلید رکھی ہوئی تھی۔ اسے نکال کر پڑھا۔ تو اس سے بہت سے ایسے احکام کا پتہ مل گیا۔ جو جرمنی بحریہ کے نام صادر ہوئے تھے۔ اس کے بعد اس کلید سے بہت سی ٹوٹی ہوئی کشتیوں کے فوٹو ہاتھ آئے۔ جو جرمنوں نے بڑے انتظام اور ترتیب کے ساتھ غرق کی تھیں۔ اس سے اندازہ ہوا۔ کہ اس معاملہ میں جرمنوں

میں کس درجہ باضابطگی موجود تھی۔ جرمن مخفی زبان کی کلید انگریزوں کو تمام غوطہ زن کشتیوں کے خزانوں میں دستیاب ہوئی۔ جرمن اپنی جگہ بڑے عجیب نظام کے ساتھ کارفرما تھے۔ اتحادیوں کے جتنے خطوط و مراسلات ان کے ہاتھ آتے۔ ان سب کو اپنی سعی و ذہانت سے حل کر ڈالا۔ فرانسیسی و روسی زبان رمز کے معلوم کرنے میں بڑی مہارت دکھائی انگریزوں کی مشہور مخفی زبان "بلیویر" کو بھی نہایت کامیابی سے حل کیا ✤

جرمن جنگی جہازرانوں کی چال۔ اس سلسلے میں جرمن جنگی جہازوں کے دو کپتانوں کو جو واقعہ بحر اسود میں پیش آیا۔ نہایت عجیب و غریب ہے۔ یہ دونو بحر اسود کے مغربی جانب قسطنطنیہ میں لنگر انداز تھے اس سمندر میں روسی بیڑا اپنی کثیر التعداد فوج کی وجہ سے اُن جرمن جہازوں سے بہت بڑھا ہوا تھا۔ اور سمندر کے اطراف پر چھایا ہوا تھا۔ دونو کپتان روسی بیڑے کے خلاف پیش قدمی پر تُلے ہوئے تھے۔ مگر یہ بھی خوب سمجھتے تھے کہ ایسے وقت میں روسیوں سے مقابلہ خود کشی کے مترادف ہے ✤ جب روسی بیڑا اپنی جگہ سے حرکت کر کے سمندر میں چلا۔ تو اُن میں سے ایک جرمن جہاز چپکے سے اس مقام پر آگیا۔ جو اس کے متعینہ مقام اور روسی بیڑے کے مرکز کے درمیان سمندر میں واقع تھا۔ چونکہ اس جہاز کا کپتان روسیوں کی بحری زبان سے واقف تھا۔ اس لئے اُس نے فوراً ریڈیو سے ایک حکم روسی بیڑے کے نام اُن کی مقررہ زبان میں نشر کیا۔ کہ فوراً طرابزون کی بندرگاہ کی طرف بحر اسود کے دوسرے کنارے پر چلا جائے ✤ اس کے بعد جس وقت روسی بیڑا چند روز بعد اپنے اصل مرکز کی طرف واپس ہوا۔ تو اسے اس حال کا علم ہوا۔ جو اس پر بلا نازل کر چکی تھی۔ اور اُن غارت گریوں کا بھی پتہ چلا۔ جو اُن کی غیبت میں جرمن جنگی جہازوں نے روسی بندرگاہ پر کی تھیں ✤

جرمنی کا نیا طریقہ۔ جنگ کے دوسرے سال جرمن خبریں اور پیام بھیجنے کا ایک نہایت اچھا طریقہ ایجاد کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اتحادیوں کو اس طریقہ سے جب سابقہ پڑا۔ اُس وقت وہ جرمنی کے بڑے لاسلکی اسٹیشن کی نشریات پر کان لگائے ہوئے تھے۔ شام کو معمولی نشریات کے بعد انہوں نے بہت سی عجیب و غریب آوازیں سنیں۔ جو آدمیوں کی معلوم ہوتی تھیں۔ لیکن یہ آوازیں اسقدر جلد جلد آرہی تھیں۔ کہ کسی انسان کی زبان سے ان کا تلفظ ممکن نہ معلوم ہوتا تھا۔ اسی طرح ان آوازوں کا لکھنا اور سمجھنا بھی سخت دشوار تھا۔ خواہ کوئی کتنی ہی کوشش کرے۔ اس کا ایک لفظ سمجھ میں نہ آتا۔ اُن دنوں یہ واقعہ روز شام کے بعد پیش آتا تھا۔ اب اتحادیوں نے رائے قائم کی کہ معلوم ہوتا ہے۔ ریڈیو میں کوئی بھید ہے۔ اُنہوں نے ان آوازوں کو کئی مرتبہ کئی ریکارڈوں میں بھرا۔ اور اُن کے باخبر لوگوں نے یکے بعد دیگرے پورے انہماک کے ساتھ سنا۔ کہ شاید کچھ پتہ لگا سکیں مگر کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ اسی حالت میں ایک مدت گذر گئی۔ آخر اتفاق سے اس راز کا حل خود بخود حاصل ہوگیا۔ اس کی صورت یہ ہوئی۔ کہ برطانیہ کا ایک چھوٹا جنگی جہاز قبرص میں اپنی بندرگاہ پر لنگر انداز

تھا۔ اِس جہاز کے لئے کوئی خط مُعیّن نہ تھا۔ نہ عنقریب اُس کے . . سفر کا کوئی پروگرام تھا۔ انگریز افسران جہاز میں بیٹھے ہوئے وِسکی پی پی کر وقت گزار رہے تھے۔ ایک چھوٹا گراموفون بج رہا تھا۔ اُس پر وُہ اپنے پاس کے رکارڈ کئی کئی بار بجا چُکے تھے۔ اور اُن کے گانوں سے اُن کی طبیعت سیر ہو گئی تھی۔ اِس لئے اُن میں سے ایک نے کہا۔ کہ اب تو جرمن نشر گاہ والے رکارڈ کے سوائے کوئی رکارڈ باقی نہیں رہا ہے۔ دُوسرے نے کہا۔ کہ کسی چیز کے نہ سُننے سے تو اسی کا سُن لینا بہتر ہے۔ یہ کہکر انہیں رکارڈوں میں سے جو رازجوئی کی کوشش میں بھرے گئے تھے۔ ایک رکارڈ گراموفون پر لگایا۔ گراموفون اُس وقت اچھی طرح بھرا نہ تھا۔ اِس لئے رکارڈ کے دَوران کی سُرعت کم ہوتے ہوتے گردش بہت سُست ہو گئی۔ اُسوقت یک بیک محسُوس ہُوا۔ کہ وُہ عجیب آوازیں آہستہ آہستہ واضح ہو رہی ہیں۔ اور بالکل معمُولی گفتگو پر مشتمل ہیں۔ مخفی زبان کا نگران افسر دوستوں کے ساتھ قریب ہی بیٹھا تھا۔ وُہ اِس غیر متوقع انکشاف سے ششدر رہ گیا۔ اُس کی حالت خُوشی سے دیوانوں کی سی ہو گئی۔ غور کیا۔ تو معلوم ہُوا کہ یہ آوازیں سابقہ مخفی جرمن زبان میں ایک پیغام ہیں۔ جو لڑائی سے پہلے مستعمل تھی۔ اور اب جرمن اسے ترک کر چکے تھے۔ یہ افسر اِس متروکہ زبان سے واقف تھا۔ اسے خُوب سمجھ گیا۔ اب اِس کے تجربے کے لئے ایک شخص نے اِس پیغام کو اپنی زبان سے دوہرایا۔ اور اسے رکارڈ میں بھرا گیا۔ پھر گراموفون کے ذریعہ سے اسے لاسلکی اسٹیشن سے نشر کیا۔ فونوگراف کی رفتار سُرعت معمُول سے پانچ یا چھ گُنے زیادہ کر دی گئی۔ نتیجہ وُہی ہُوا۔ کہ وُہ آوازیں ناقابلِ فہم بن گئیں۔ اِس کے بعد پھر رکارڈ کو آہستہ آہستہ گراموفون پر گھمایا گیا۔ تو بات حسبِ معمُول سمجھ میں آنے لگی۔ یہ طریقہ اِس قسم کے تمام جنگی رمُوز میں سب سے زیادہ ماہرانہ اور کامیاب ثابت ہُوا تھا۔ اِن چند معلومات سے زمانہ جنگ میں مخفی زبان کی اہمیت واضح ہو سکتی ہے جو فنونِ حرب میں یقیناً بہت بڑا درجہ رکھتی ہے حقیقتاً اِس کے لئے ذکاوت کی بھی سخت ضرورت ہے۔ ورنہ ذرا سی چُوک میں نہایت پُرخطر نتائج سے سابقہ پڑتا ہے۔ خشکی۔ تری اور فضا سب مواقع پر اِس کی ذرا سی غلطی اہم سے اہم معرکوں کو اُلٹ پُلٹ کر سکتی ہے +

سانپ کھانیوالی مکڑی . . مکڑیوں میں ایک قسم کی مکڑی ہوتی ہے۔ جو "گراماسٹولا" کے نام سے مشہور ہے۔ اِس مکڑی کی غذا صرف سانپ ہے۔ اور یہ صرف سانپ کو ہی کھا کر زندہ رہ سکتی ہے + عجیب بات یہ ہے کہ مکڑی اپنے زہر سے پہلے سانپ کو ہلاک کر دیتی ہے۔ یہ مکڑی سانپ پر جس طرح حملہ کرتی ہے۔ وُہ بھی عجیب و غریب طریقہ ہے۔ جب اُس کو سانپ نظر آتا ہے۔ تو یہ اُچک کر سانپ کے سر پر ہو جاتی ہے۔ اور ایک قسم کا لُعاب اپنے دہن سے اُگلنا شروع کر دیتی ہے۔ اِس زہریلے لُعاب کا یہ اثر ہوتا ہے۔ کہ سانپ کا جبڑا بالکل جکڑ کر بند ہو جاتا ہے۔ وُہ کسی طرح اُس کو چلا نہیں سکتا۔ اسکے بعد سانپ کا پُورا سر بالکل مفلوج ہو جاتا ہے اور سانپ کی آمد وشُد نفس باقی نہیں رہتی۔ سانپ تھوڑی دیر تڑپ کر ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ اور مکڑی اطمینان سے اُس کو

کھانا شروع کر دیتی ہے۔ ایک سانپ مکڑی کی کئی دن کی غذا کے لئے کافی ہوتا ہے۔ سانپ اور مکڑی کی دشمنی بھی عجیب بات ہے۔ کیونکہ سانپ میں بھی زہر ہوتا ہے۔ اور زہریلے کیڑے بہت کم ایک دوسرے سے دشمنی کرتے ہیں۔

اشاروں میں گفتگو کرنے کا نیا طریقہ:۔ ایک انگریز سیاح لڑکی کا بیان ہے۔ کہ یونان میں دہقان اور گڈریئے اپنے دور کے بسنے والے ہم پیشہ قبائل سے "دخانی زبان" (دھوئیں کے اشارات) میں ایک دوسرے سے گفتگو کرتے ہیں۔ ہر قریہ کے یعنی گاؤں کے افراد کو ابتدا سے ہر دخانی اشارہ اور اسکا مفہوم یاد کرایا جاتا ہے۔ جب کبھی کوئی گڈریہ دور سے کسی گاؤں میں خاص ترکیب سے دھواں اٹھتا ہوا دیکھے گا۔ تو فوراً اس کا مقصد سمجھ کر اس کو پورا کرنے کی کوشش کرے گا۔ تھوڑی سی لکڑی جمع کر کے پہلے اس کو روشن کیا جاتا ہے۔ اور جب آگ اچھی طرح روشن ہو جاتی ہے۔ تو اس پر گھاس اور پتیاں اس ترکیب سے رکھی جاتی ہیں۔ کہ دھوئیں کا ایک کثیف اور طویل ستون فضا میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ آگ کو بھیگے ہوئے کمبل یا بوریئے سے خاص ترکیب سے ڈھکنے سے دھوئیں کے اخراج میں ایک مخصوص توازن اور نظم پیدا ہو جاتا ہے۔ اور تھوڑی تھوڑی دیر کے وقفہ سے دھواں بند ہو ہو کر اٹھتا ہے۔ اس سیاح لڑکی کا بیان ہے۔ کہ ایک موقعہ پر مجھکو اس دخانی اشارات میں ایک دور دراز مقام میں پیغام پہونچانے کا تجربہ ہوا۔ اتفاق سے میرے پاؤں میں موچ آ گئی۔ میں شدت درد سے تڑپ رہی تھی۔ چند گھروں کا گاؤں تھا۔ اسمیں متعدد گڈریئے اپنے اہل وعیال کے ساتھ آباد تھے۔ ایسی جگہ ڈاکٹر کا ملنا امر محال تھا۔ میں نے ایک گڈریئے کی عورت سے التجا کی۔ کہ وہ قریب کے کسی گاؤں سے کسی ڈاکٹر کو بلائے۔ تاکہ میرا کوئی علاج ہو سکے۔ چند لمحوں کے بعد دھوئیں کے ستون تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد بلند ہونے لگے۔ اگرچہ اسوقت میری سمجھ میں خاک بھی نہ آ رہا تھا۔ کہ کیا باتیں ان اشاروں میں ہو رہی ہیں۔ پانچ منٹ کے بعد وہ عورت واپس آئی اور میرے قریب بیٹھ کر کہنے لگی۔ کہ طبی مدد آ رہی ہے لیکن تیز سے تیز خچر بھی اس مسافت کو کم سے کم ایک گھنٹہ میں طے کر سکتا ہے۔ اسی اثنا میں وہ ایک چشمہ کے پانی سے میرا پاؤں بھی دھوتی رہی۔ اس نے مجھے کھانے کی بھی دعوت دی جو اگرچہ غریبانہ تھا لیکن بہت لذیذ تھا۔ میری گھڑی کے وقت کے مطابق ٹھیک ایک گھنٹہ کے بعد گاؤں کے قریب کسی کے آنے کی اطلاع ہوئی۔ یہ طبی امداد تھی۔ جو دہقانی عورت کے بلانے پر دور سے آئی تھی۔ ایک یونانی ڈاکٹر اپنے تمام اوزار اور سامان کے ساتھ میرے پاس موجود ہو گیا۔ ڈاکٹر کو اس کا بھی علم تھا۔ کہ میں انگریزی نسل کی لڑکی ہوں۔ اور میرا رنگ دبا ہوا سفید ہے۔ قد میانہ ہے۔ میرا کیا نام ہے۔ میں کہاں سے آئی ہوں۔ اور کہاں جاؤں گی؟ یہ تمام باتیں ڈاکٹر کو صرف دخانی اشارات سے معلوم ہو گئی تھیں۔

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاج تنگیٔ داماں بھی تھا

دلچسپ سائنٹفک نوٹ

برف۔ بارش اور اولے

گرمی کے موسم میں جب آفتاب کی حرارت تیز ہو جاتی ہے۔ تو سمندر۔ تالابوں اور دریاؤں کا پانی بخارات کی شکل میں اوپر اُٹھتا ہے۔ اور ہوا میں مل جاتا ہے۔ چونکہ یہ بخارات ہوا سے ہلکے ہوتے ہیں۔ اسواسطے وہ فضا میں اُوپر اُٹھتے چلے جاتے ہیں۔ یہ آپ شاید جانتے ہونگے۔ کہ آپ جیسے جیسے بلند ہوتے جائینگے۔ ویسے ویسے ہوا کی حرارت کم ہوتی جائیگی۔ اسی سبب سے گرمیوں میں بسنے والے لوگ میدانوں کو چھوڑ کر پہاڑوں پر چلے جاتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اُونچے اُونچے پہاڑوں پر برف ہمیشہ جمی رہتی ہے۔ وہاں اتنی حرارت کبھی ہوتی ہی نہیں۔ کہ برف کو مکمل طور پر پگھلا دے۔ اِس سے آپ کو یہ اندازہ ہوگا۔ کہ بہت بلندی پر جاکر فضا میں شدت کی سردی ہوتی ہے۔ پانی کے بخارات اُوپر اُٹھتے اُٹھتے ایسی جگہ پر پہونچتے ہیں۔ جہاں پر گرمی اسقدر کم ہوتی ہے۔ کہ پانی بخارات کی شکل میں رہ نہیں سکتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بخارات پھر پانی بن جاتے ہیں۔ اور نہایت چھوٹے چھوٹے قطروں کی شکل میں ہوا میں اُڑتے رہتے ہیں۔ اور بادل کہلاتے ہیں۔ بادل جب اور کچھ بلند ہوتا ہے۔ تو زیادہ سردی کے سبب اِس کے چھوٹے چھوٹے قطرے مل کر بڑے ہو جاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ ہوا اِن کا بوجھ نہیں سنبھال سکتی۔ اور وہ بارش کی شکل میں نیچے گر جاتے ہیں۔ سرد ملکوں میں جب فضا نیچے سے اُوپر تک بالکل سرد رہتی ہے۔ تو بخارات پہلے ٹھنڈے ہو کر پانی بنتے ہیں۔ پھر فوراً برف بن جاتے ہیں۔ اور روئی کے گالوں کی شکل میں زمین پر گرتے ہیں۔ اِس کو برف گرنا کہتے ہیں۔ اِس کا تماشہ کشمیر اور دوسرے ملکوں میں دیکھنے میں آتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ گرمی کے زمانے میں ہوا کے بڑے زبردست جھکڑ چلا کرتے ہیں۔ اور ہوا بڑی قوت کے ساتھ زمین سے اُوپر کی طرف اُٹھتی ہے۔ عام قاعدہ تو یہ ہے۔ جب پانی کے بخارات ٹھنڈے ہو کر پانی کے بڑے بڑے قطروں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ تو اپنے وزن کے سبب نیچے گر جاتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی اِن قطرات سے نیچے سے آنے والی ہوا کی مڈبھیڑ ہو جاتی ہے۔ اور وہ نہایت تیزی سے اُن کو فضا میں اُوپر کیطرف لیجاتی ہے۔ جب یہ قطرے شدت کی سردی کے علاقے میں پہونچتے ہیں۔ تو فوراً جم کر برف بن جاتے ہیں اور اولے کی شکل میں نیچے زمین پر گرتے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ اِن گرتے ہوئے اولوں کو نیچے کی ہوا پھر اُوپر اُٹھا لے جاتی ہے۔ اور سرد علاقے میں پہونچکر اُن پر برف کی ایک اور تہ چڑھ جاتی ہے۔ اور اولہ بڑا ہو جاتا ہے۔ اور جب گرتا ہے تو فصل اور مکانوں کو بہت نقصان پہونچاتا ہے۔ کسی بڑے اولے کو بیچ سے کاٹا جائے۔ تو اُس میں پانی کی تہیں صاف نظر آتی ہیں۔ امید ہے۔ کہ آپ سمجھ گئے ہونگے۔ کہ جب بارش کے قطرے بجائے جم کر گرنے

کے ہوا کے زور کے سبب فضا میں اُوپر اُڑ جاتے ہیں۔ تو پھر ٹھنڈے ہو کر برف بن جاتے ہیں۔ اور نیچے اولے کی شکل میں گرتے ہیں ٭

گرم اور سرد پانی

کئی سوال کرتے ہیں۔ اس کا کیا سبب ہے۔ کہ بعض اوقات جب گرم ہوا چلتی ہے۔ تو پانی کی صراحیاں ٹھنڈی ہو جاتی ہیں لیکن کبھی کبھی ٹھنڈی ہوا چلتی ہے۔ پھر بھی پانی کی صراحیاں گرم ہی رہتی ہیں"؟ اس کا جواب یہ ہے کہ "جب کسی مائع (یعنی سیال چیز جیسے پانی، تیل وغیرہ) کو گرم کیا جاتا ہے۔ تو پہلے وہ حرارت کو جذب کرتا ہے اُس کا درجہ حرارت بڑھتا جاتا ہے۔ اس کے بعد ایک خاص حد پر پہونچکر مائع اُبال کھانے لگتا ہے۔ اور بخارات میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ مثلاً پانی کو گرم کیا جائے۔ تو ۱۰۰ درجہ سینٹی گریڈ پر پہونچکر اُبلنے لگتا ہے۔ اور بھاپ بن اُڑ جاتا ہے۔ مختلف مائع مختلف درجہ حرارت پر اُبلتے ہیں۔ بعض کو بہت زیادہ حرارت کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور بعض معمولی گرمی ہی سے بخارات میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ یہ حرارت کبھی تو ان کو مصنوعی طریقوں مثلاً آگ وغیرہ سے پہونچتی ہے۔ اور کبھی آفتاب کی گرمی سے وہ بخارات بن کر اُڑتے رہتے ہیں۔ قاعدہ یہ ہے کہ جب مائع بخارات بننے لگتا ہے تو حرارت کو جذب کرتا ہے۔ جس برتن میں وہ ہوتا ہے۔ اُس کی حرارت کو بھی اپنے جسم میں جذب کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ مائع خود تو گرم ہو جاتا ہے۔ لیکن برتن ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ اس کو آپ آسانی سے یُوں سمجھیں گے۔ کہ اپنے ہاتھ پر تھوڑا پٹرول یا اسپرٹ ڈالئے۔ پھر اس کو پھونکنا شروع کیجئے۔ آپ کا ہاتھ فوراً سرد ہو جائے گا۔ اس کا کیا سبب ہے؟ بات یہ ہے کہ پٹرول یا اسپرٹ ایسی چیز ہے۔ کہ تھوڑی حرارت ہی سے بخارات میں تبدیل ہو جاتی ہے ہتھیلی پر ڈال کر جب آپ نے اس کو پھونکنا شروع کیا۔ تو اس ہوا کی گرمی سے پٹرول بخارات بن کر اُڑنے کے لئے تیار ہو گیا۔ لیکن یہ گرمی کافی نہیں تھی۔ اس لئے آپ کے ہاتھ سے اُسنے تھوڑی سی گرمی لے لی۔ اسطرح پھونکتے جانے سے تھوڑی دیر میں پٹرول تو اُڑ جائیگا۔ لیکن آپ کا ہاتھ کافی سرد ہو جائے گا۔ اس سے ثابت ہو گیا۔ کہ مائعات (یعنی سیال چیزوں) کی جب تبخیر ہوتی ہے۔ تو اس عمل کے دوران میں وہ اپنے برتن اور اطراف کی چیزوں سے حرارت جذب کرتے ہیں۔ یہ تو ایک بات ہوئی۔ دوسری بات یہ یاد رکھئے۔ کہ جب ہوا خشک ہو جاتی ہے۔ تو مائع کو بخارات بن کر اُڑنے میں آسانی ہوتی ہے۔ ظاہر ہے۔ کہ جب ہوا خشک ہو گی۔ یعنی اُس میں پانی کے بخارات بالکل نہیں ہونگے۔ تو زمین پر جو پانی ہوتا ہے۔ اس کو بھاپ بننے میں آسانی ہو گی۔ کیونکہ بھاپ جو بنے گا۔ وہ ہوا میں آسانی کے ساتھ جذب ہو سکتا ہے۔ لیکن ہوا اگر پہلے ہی سے مرطوب اور بخارات سے لدی ہوئی رہی۔ تو اب مزید بخارات کے داخل ہونے کی اس میں کہاں گنجائش ہو گی؟ نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ جب

اِس قسم کی ہوا چلتی رہتی ہے۔ تو مائعات کی تبخیر بہت کم ہوتی ہے۔ اِتنی بات سمجھ لینے کے بعد اب آپ کو صُراحی کا مُعمّہ سمجھنے میں کوئی دِقت نہیں ہوگی۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے۔ کہ ہوا زمین کے گرم اور خُشک عِلاقوں سے گذرتی ہوئی آپ تک پہونچتی ہے۔ اور اِسطرح یہ خود بھی گرم اور خُشک ہوجاتی ہے۔ مٹی کے برتنوں میں خاص بات یہ ہوتی ہے۔ کہ اُن میں مسام یعنی چھین چھین سُوراخ بہت ہوتے ہیں۔ جب آپ صُراحی میں پانی بھرتے ہیں۔ تو اُن سُوراخوں میں پانی بھرجاتا ہے۔ اور اِس طرح باہر کا حِصّہ بھی تر ہوجاتا ہے۔ جب گرم اور خُشک ہوا ان برتنوں کو لگتی ہے۔ تو اُس کے باہر کے حِصّے کا پانی بُخارات میں تبدیل ہونے لگتا ہے۔ اور اندر کے پانی کی گرمی کو جذب کرنے لگتا ہے۔ جب باہر کا پانی بُخارات بن کر اُڑ جاتا ہے۔ تو مساموں کے ذریعہ اندر کا پانی پھر باہر آجاتا ہے۔ اور تبخیر سے اندر کے پانی کی کچھ اور حرارت جذب کرنے لگتا ہے۔ جب باہر کا پانی بُخارات بن کر اُڑ جاتا ہے۔ تو مساموں کے ذریعہ اندر کا پانی پھر باہر آجاتا ہے۔ اور تبخیر سے اندر کے پانی کی کچھ اور حرارت جذب کرتا ہے۔ یہ عمل کچھ دیر جاری رہتا ہے۔ تو صُراحی کا پانی بہت ٹھنڈا ہوجاتا ہے۔ کیونکہ صُراحی سے جو پانی بُخارات بن کر اُڑ رہا ہے۔ تو وُہ اِس کام کے لئے حرارت یا ہوا سے لے گا۔ یا پھر صُراحی کے پانی سے۔ ہوا کی حرارت چُونکہ کافی نہیں ہوتی۔ اِسلئے لازمی ہے۔ کہ باقی حرارت وُہ پانی ہی سے لے گا۔ اور یہ عمل کچھ دیر تک جاری رہیگا۔ تو صُراحی کے پانی کی بہت سی حرارت نکل جائیگی۔ اور وُہ بالکل ٹھنڈا ہو جائیگا۔ اِس سے آپ یہ تو سمجھ گئے ہونگے۔ کہ اگر صُراحی میں مسام نہ ہوتے مثلاً یہ صُراحی لوہے کی ہوتی۔ تو پانی ٹھنڈا نہیں ہوتا۔ پانی کے باہر نکلنے اور بُخارات بننے کا سوائے مُنہ کے اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ اور یہ جگہ اِتنی کافی نہیں ہوتی جس سے تبخیر کا عمل آسانی سے ہوسکے۔ یہی وجہ ہے کہ صُراحی جب پُرانی ہوجاتی ہے۔ اور اُس کے مسام میل کے سبب بند ہوجاتے ہیں۔ تو پانی اس میں ٹھنڈا نہیں ہوتا۔ اِسلئے اگر آپ پانی کا لُطف حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ تو گھڑوں اور صُراحیوں کو جلد جلد بدلنا ضرُوری ہے۔ مصر میں ایک اور ترکیب کی جاتی ہے۔ مٹی کے برتنوں میں پانی بھر کر اُس کے مُنہ کو کپڑے سے بند کرکے اُس کو کھُلی ہوا میں کسی درخت کے سائے میں اُلٹا لٹکا دیتے ہیں۔ اِس سے فائدہ یہ ہوتا ہے۔ کہ مُنہ کا کپڑا ہمیشہ تر رہتا ہے۔ اسپر جو گرم ہوا لگتی ہے۔ تو پانی کی تبخیر تیزی سے ہوتی ہے اور اتنی ہی تیزی سے اندر کا پانی ٹھنڈا ہوتا ہے۔ لوگوں کا بیان ہے۔ کہ اِسطرح پانی بہت سرد ہوجاتا ہے۔ کبھی آپ خود بھی اِس تجربے کو کرکے دیکھیئے۔ یہانتک تو گرم ہوا کا قِصّہ ہُوا۔ اب ٹھنڈی ہوا کا حال سُنئے۔ جس ہوا کو آپ ٹھنڈی ہوا کہتے ہیں۔ وُہ دراصل مرطوب ہوا ہوتی ہے۔ اور کسی سمُندری عِلاقے سے آپ تک پہونچتی ہے۔ اِس میں پانی کے بُخارات اِسقدر رہتے ہیں۔ کہ صُراحی کے پانی کو تبخیر کا موقعہ ہی نہیں ملتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ پانی ویسے کا ویسا ہی رہتا ہے۔ ایک پانی ہی کے گرم رہنے پر کیا مُنحصر ہے۔ مرطوب ہوا لوگوں کو یُوں بھی دِق کرتی ہے۔ کہ اسکے سبب پسینہ بہت آتا ہے۔ دراصل یہ اِس غریب پر مُفت کا اِلزام ہے۔ پسینہ تو آپ کے جسم سے ہر وقت

خارج ہوتا رہتا ہے۔ صرف فرق یہ ہے۔ کہ جب خشک ہوا چلتی رہتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ خشک ہوتا رہتا ہے۔
اور آپ کو پتہ نہیں چلتا۔ لیکن جب مرطوب ہوا چلتی ہے۔ تو پسینہ خشک ہونے نہیں پاتا۔ آپ کا سارا بدن بھیگ جاتا ہے

وراثت

ایک بچہ اپنے والدین سے فقط جسمانی تعلق ہی نہیں رکھتا۔ بلکہ اسی قدر ذہنی اور اخلاقی رشتہ بھی رکھتا
ہے۔ بچے اپنے والدین اور خاندانی بزرگوں سے مشابہت رکھتے ہیں۔ یعنی اُن کی صفات کو حاصل کرتے ہیں۔
حیاتیات کی اصطلاح میں اس اکتساب صفات وخصائص کو توارث یا باوراثت کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ فطری
قانون کے مطابق ایک بچہ اپنی پیدائش کے وقت جو حرکات ظاہر کرنا شروع کرتا ہے۔ وہ خود بخود پیدا نہیں ہوتیں
بلکہ ایک وراثتی جبلت (HEREDITARY INSTINCT) کے زیر اثر ظہور پذیر ہوتی ہیں جسے
وہ اپنی پیدائش سے ساتھ لیکر آتا ہے۔ زندگی کا کام اس خوابیدہ تخیل (یا طاقت) کو جگانا اور کام میں لانا ہے
زندگی کا خاکہ تیار کرنا اور اُسکو مخصوص ذاتی اخلاق صفات یا نقائص عطا کرنا وراثت کا کام ہے۔ اور وراثت
ماحول کی مدد سے سرانجام دیتی ہے۔ وہی ماحول جو ہماری روزمرہ زندگی کی پیداوار ہے۔ نر اور مادہ کے صنفی
تعلق سے نر کا مادہ تولید مادہ کے مادہ تولید میں مدغم ہو جاتا ہے۔ نر کے مادہ تولید کا ایک خلیہ جو منوی حوین
(SPERMATOZOON) کہلاتا ہے۔ مادہ کے بیضہ کی جالی میں داخل ہو جاتا ہے۔ اولاً منوی حوین
کی دُم ضائع ہو جاتی ہے۔ اس کا سر ابیضہ کے نواۃ (NUCLEUS) سے براہ راست تعلق حاصل کرتا ہے
بعد ازاں منوی حوین کے نواۃ اور بیضہ کے نواۃ کے ایک ہو جانے سے ایک نیا نواۃ تیار ہوتا ہے۔ اسطرح سے تیار
شدہ خلیہ جو نر و مادہ کے تولیدی خلیوں کے ملاپ کا حاصل ہے۔ جگتہ (ZYGOTE) کہلاتا ہے۔ یہی
جگتہ جنین (EMBRYO) کی ابتدا ہے۔ اس کی تقسیم عمل میں آتی ہے۔ پہلے دو دختر خلئے
(DAUGHTERCELLS) تیار ہوتے ہیں۔ اب یہ دو پھر چار۔ پھر آٹھ۔ اس کے بعد سولہ میں
تقسیم ہوتے ہیں۔ اور اسی طرح تقسیم کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ حتےٰ کہ کثیر التعداد خلیات باہم مل کر جنین
کے مختلف اعضا کے بنانے میں کام آتے ہیں۔ بارور بیضہ کا نواۃ لونی اجسام (CHROMOSOMES)
پر مشتمل ہوتا ہے۔ لونی اجسام ڈورے نما اجسام ہوتے ہیں۔ جو منظم ترتیب میں منقسم ہوتے ہیں۔ اس تقسیم سے
اُن کی تعداد دوگنی ہو جاتی ہے۔ اس تعداد ہی سے نصف ایک دختر خلئے میں اور باقی نصف دوسرے دختر
خلئے میں ہو جاکر اُسکے نواتوں کی تعمیر کرتی ہے۔ اس اصول کے تحت خلیات تقسیم ہوتے رہتے ہیں۔ اس لئے جسم
کے ہر خلیہ کے نواۃ میں لونی اجسام کی تعداد مساوی ہوتی ہے۔ اس مقام پر دو باتیں خاص طور پر ذہن نشین

ہونی چاہئیں:۔ اوّل یہ کہ جسم کے ہر خلیہ کے نواۃ میں لونی اجسام کی تعداد مُساوی ہوتی ہے۔ اور یہ کہ کسی نوع کے تمام افراد میں بھی ان کی تعداد مُساوی ہوتی ہے۔ دوم یہ کہ کسی خلیہ میں یہ خود بخود پیدا نہیں ہو سکتے۔ بلکہ ہر خلیہ میں یہ کسی ماسبق خلیہ کی نواۃ کی تقسیم سے پہونچتے ہیں۔ اس میں شک نہیں۔ کہ خلیہ کا "مخزمایہ" (PROTOPLASM) ایک زندہ شئے ہے۔ لیکن اس میں یہ قابلیت نہیں ہوتی۔ کہ لونی اجسام کی ابتدا کر سکے۔ البتہ "مخزمایہ" کی وجہ سے لونی اجسام کی جسامت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اب چونکہ لونی اجسام خود بخود وجود میں نہیں آسکتے۔ اسلئے بقائے نوع کے لئے ضروری ہے کہ یہ ایک نسل میں منتقل کئے جائیں۔ چنانچہ یہ والدین سے اولاد میں منوی جین اور بیضہ کے ذریعہ پہونچتے ہیں۔ یہ بات پایۂ تحقیق کو پہونچ گئی ہے۔ کہ لونی اجسام وراثت کے حامل ہوتے ہیں ؎

ایک نوع کی خصوصیات کا انتقال اس کی اولاد میں انہیں لونی اجسام کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ان جانداروں میں جن میں اولاد تناسلی تولید کے ذریعہ پیدا ہوتی ہے۔ اولاد میں نصف لونی اجسام باپ سے اور نصف ماں سے حاصل ہوتے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ ہر فرد کو اس کا توارثی حصہ ماں اور باپ دونوں کی طرف سے یکساں حاصل ہوتا ہے۔ دوسرے اسکی تمام وراثت اسکے جسم کے ہر خلیئے میں موجود رہتی ہے۔ کیونکہ جسم کا ہر خلیہ جگتہ ہی کی تقسیم در تقسیم سے حاصل ہوتا ہے۔ لونی اجسام کوئی سادہ چیز نہیں ہیں۔ بلکہ لونی جسم مختلف حصوں سے مرکب ہوتا ہے۔ اور ہر حصے کو "جین" (GENE) کہتے ہیں۔ یہ جین اسقدر چھوٹے ہوتے ہیں۔ کہ خوردبین سے بھی دکھائی نہیں دیتے۔ لونی اجسام میں ان کی موجودگی دوسرے طریقوں سے معلوم کی گئی ہے۔ ہر جین ایک توارثی نقش رکھتا ہے۔ ایک فرد کی وراثت بہت سے ابتدائی جینوں (GENES) کا مجموعہ ہوتی ہے۔ وراثت کے اجزاء نقوش لونی اجسام میں جینوں کی شکل میں رکھدئیے گئے ہیں ؎

وراثت سے مُراد والدین سے مُشابہ صفات کا بچوں میں منتقل ہونا ہے۔ جس میں عمومی طور پر مُشابہت پائی جاتی ہو۔ خواہ تفصیلات میں فرق ہو۔ اس لئے **وراثت** سے متعلق جو بھی نظریہ ہوگا اُسے نہ صرف والدین کی مُشابہت ہی کو واضح کرنا چاہئے۔ بلکہ ان سے اختلاف کو بھی نمایاں کرنا چاہئے۔ اس کا کسی فرد کی نسلی مُشابہت کو واضح کرنا ضروری اور لابدی امر ہے۔ جو اکثر اوقات رجعت جدّی کے نام سے تعبیر کی جاتی ہے۔ اور اس کا کام نئی صفات کے اچانک ظہور کی توضیح کرنا بھی ہے۔ (خواہ وُہ صفات پرانی ہی کیوں نہ ہوں) اس سلسلے میں بہت سے مشاہدات ابھی تک توضیح طلب ہیں۔ پیچیدہ ہونے کے باعث اس علم نے ابھی تک کم ترقی کی ہے۔ فرق کا آغاز پدری اور مادری لونی اجسام کے ملاپ سے ہوتا ہے۔ وراثت کوئی طاقت۔ اصول یا ہستی نہیں۔ بلکہ نسلوں میں گوشت اور خون کا مُسلسل رشتہ ہے۔ گو بد قسمتی سے **وراثت** اس کا موزوں نام نہیں ہے ؎

وراثت کا تمام قانون مینڈل (MENDEL'S LAW) کے انکشاف سے بدل گیا ہے۔
وراثتی عوامل (جین) صفات کو متعین کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے۔ وُہ دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن وُہ نشانات نہیں ہوتے
وُہ بدائیت کے زندہ محرک ہیں۔ ازاں بعد کسی ذات میں جو امتیازات پیدا ہوتے ہیں۔ وُہ دیگر وراثتی صفات کی تعمیر کرتے
ہیں۔ بہت سے جین فقط ایک ہی صفت کے پیدا کرنے میں عامل ہو سکتے ہیں۔ بلکہ بال کا رنگ تعین کرنے میں۔ برخلاف
اسکے ایک ہی جین بہت سی صفات کی ترقی پر اثر پذیر ہو سکتا ہے +

دُوسری بات یہ ہے۔ کہ دیگر ایک ہی جین یا بہت سے جینوں کی ملاوٹ ایک صفت کے بنانے میں صرف ہو سکتی
ہے۔ مثلاً کسی جسمانی خصوصیت کے بنانے میں۔ یا بدلا لینے میں تیزی یا کسی بیماری کی طرف قدرتی رغبت پیدا کرنے پر
ایسی ہی صفات کسی ادنے یا معمولی چیز کی جین میں بھی ہو سکتی ہیں۔ مثلاً بقیلے جیسے شکل والے پھول کو مضحکہ خیز بنا
ہیں۔ یا کسی چھوٹے سے جانور کی آنکھ کے رنگ میں ذرا تبدیلی پیدا کرنے میں (جیسے فروٹ فلائی (FRUIT FLY)
کی آنکھ کے رنگ میں ہوتا ہے) یہ ابتدائی صفات جن کی ابتداء بہت اچھی طرح مطالعہ کی گئی ہے۔ تجرباتی شرائط پر
واقع ہوتی ہیں۔ اور ناگہانی تبدّل (MUTATIONS) کہلاتی ہیں۔ وُہ صفات جو وراثتی ہوتی ہیں۔ یعنے
جن کے حامل لونی اجسام ہوتے ہیں۔ خواہ بڑی ہوں یا چھوٹی۔ مینڈل کے اصُول پر عمل کرتی ہیں۔ مٹروں کی بڑائی
یا چھوٹائی۔ ان کا ہرا ہونا یا پیلا ہونا۔ خرگوش میں چھوٹے بال یا گھنگریالے بال۔ مرغوں میں کلغی کی موجودگی
یا مفقودگی۔ آدمیوں میں رتوندھا ہونا یا نہ ہونا۔ عام معیاری نظر کی موجودگی یا فقدان۔ مویشیوں میں سینگ
کا ہونا یا نہ ہونا۔ خاردار پتوں کی سطح کا دندانے دار یا صاف ہونا۔ ان مثالوں کو مینڈل کے اصُولوں سے واضح
کرنے کے لئے بہتر ہے۔ کہ خود مینڈل کے تجربات و مشاہدات کا جائزہ لیا جائے۔ جو اُس نے مٹروں پر کئے ہیں +
مینڈل نے دو اصُول وضع کئے ہیں:۔ "اصُول غالبیت (DOMINANCE)" اور "اصُول
علیحدگی (RECESSION) +

۱۔ اصُول غالبیت۔ جب متضاد صفات والے نر و مادہ سے نسل حاصل کی جائے۔ تو ایک صفت
اولاد میں غالب ہوتی ہے۔ اور ایک خوابیدہ مینڈل نے تجربہ سے معلوم کیا۔ کہ وُہ بچے جو بڑے اور چھوٹے مٹروں
کے اتحاد سے پیدا کئے جاتے ہیں۔ بغیر کسی استثنا کے لمبے ہوتے ہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ لمبائی کی صفت غالب
ہے۔ اور چھوٹائی کی صفت خوابیدہ۔ اگر بڑائی کی صفت کو 'ب' سے ظاہر کریں۔ اور چھوٹائی کی صفت کو
'چھ' سے۔ تو ریاضیاتی طور پر:۔ ب × چھ = ب (چھ) +

۲۔ علیحدگی کا اصُول۔ مندرجہ بالا قسم کے دو اناجوں (لانبے مٹر کے پودوں) کے آپس
کے ملاپ سے نسل حاصل کیگئی۔ تو اولاد تین قسم کے مٹروں پر مشتمل تھی:۔ (۱) خالص نسل کے بڑے مٹر

(خالص نسل کے اسلئے کہ اگر ان کے آپس کے ملاپ سے نسل حاصل کی جائے۔ تو بڑے مٹر ہی حاصل ہوتے ہیں)۔
(۲) خالص نسل کے چھوٹے مٹر (کیونکہ ان کے آپس کے ملاپ سے چھوٹے مٹر حاصل ہوتے ہیں)۔ (۳) دو ایسے مٹر جن میں لانبائی کی صفت غالب اور چھوٹائی کی صفت مغلوب۔ اگر ان کے آپس کے اتحاد سے نسل حاصل کی جائے۔ تو پھر نمبر (۱)، (۲)، (۳) کی طرح مٹر حاصل ہونگے۔

ذیل کے نقشہ سے اس بیان کی وضاحت ہو سکتی ہے:۔

ن (۱) خالص نسل — ب × چھ

ن (۲) دوغلی نسل — ب / چھ

ن (۳) تیسری نسل ۱-۲-۳ یعنی اول، دوم، سوم

مینڈل کے ان نتائج کی توجیہ یہ ہے۔ کہ دو انا جل کے جسم کے ہر خلیہ میں جو لونی اجسام ہوتے ہیں۔ وہ چونکہ نصف باپ سے آتے ہیں اور نصف ماں سے پہونچتے ہیں۔ اسلئے ماں اور باپ دونو کی متضاد خصوصیات دوغلے کے نواۃ میں موجود ہیں۔ جب اس دوغلے کے تولیدی خلئے تیار ہوتے ہیں۔ تو تیاری کے دوران میں ہر خلیہ میں لونی اجسام کی نصف تعداد پہنچتی ہے۔ اور باقی نصف ان تک نہیں پہونچتی۔ تو گویا تولیدی خلئے میں صرف ایک ہی خصوصیات کے جین پہنچتے ہیں۔ اور یہ جین یا تو غالب خصوصیت کے ہو سکتے ہیں۔ یا مغلوب کے۔ جب اسطرح تیار شدہ تولیدی خلیوں کا آپس

یں ملاپ ہوتا ہے۔ تو لونی اجسام کی تعداد اصلی حالت پر آجاتی ہے۔ اور وراثتی خصوصیات کے حامل جین
بھی یک جا ہو جاتے ہیں۔ لیکن اولاد جینوں کی نوعیت کے لحاظ سے مختلف ہوگی۔ اگر غالب خصوصیات کے حا
جین آپس میں ملتے ہیں۔ تو غالب خصوصیات والی خالص نسل حاصل ہوگی۔ اگر دو نو تولیدی خلیوں کے جین
مغلوب خصوصیات کے حامل ہوں۔ تو مغلوب خصوصیات والی خالص نسل حاصل ہوگی۔ اور اگر ایک تولیدی
خلیہ کے لونی اجسام غالب خصوصیات کے حامل ہوں۔ اور دُوسرے کے مغلوب خصوصیات کے حامل۔ تو
نسل دوغلی حاصل ہوگی۔ یعنی اس کے خلیات میں دونو خصوصیات والے لونی اجسام موجود ہونگے۔ لیکن ایک قسم
کی خصوصیت جسم میں نمایاں ہوگی۔ اس لئے وُہ غالب کہلائیگی۔ اور دُوسری خصوصیت کے لونی اجسام اگرچہ
کہ ذات میں موجود تو ہونگے۔ لیکن چونکہ اس خصوصیت کا اظہار جسم میں نہیں ہوگا۔ اس لئے اس کو مغلوب یا مخفی خصوصیت
کہیں گے۔ یہ نتیجہ تجربہ سے صحیح ثابت ہوا۔ یہی طرح مینڈل کے اصولوں کو ناچنے والی چھپیا کے تجربات سے بھی
اچھی طرح ثابت کیا جاسکتا ہے ÷

اسی سلسلے میں وراثت سے متعلق گالٹن (GALTON) کے دو اصولوں یعنی نسلی وراثت اور
فرزندانہ رجعت کا تذکرہ کرنا بیجا نہ ہوگا:- ۱- **نسلی وراثت** (GENERIC HEREDITY)
اس اصول کے مطابق ہر ذات کو والدین اپنے وراثتی خصوصیات میں سے ½ حصہ عطا کرتے ہیں۔ دادا ¼ ۔ پردادا
⅛ وغیرہ وغیرہ ÷ ۲- **فرزندانہ رجعت** (FILIAL REGRESSION)۔ اگر
والدین ایسے ہوں۔ کہ اُن میں نوع کے عام معیار سے مُتجاوز غیر معمولی تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔ تو بچے نوع کی معیاری
حالت کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ نہ کہ والدین کی غیر معمولی حدود کی طرف۔ معیاری والدین کے بچے معیاری ہوتے
ہیں۔ معیار کے نیچے یا اوپر والے والدین کے بچے معیار کی طرف رجوع کرتے ہیں ÷

کسی نوع کی عام صفات میں جو تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ وُہ توارث کے عمل سے برقرار رکھی جاتی ہیں۔ جینوں
میں تبدیلی کا پیدا ہونا ارتقا کی طرف پہلا قدم ہے۔ ارتقا اصل میں زیادہ تر جسم کا کام ہے۔ افراد کے وراثتی عوامل
میں خفیف سا تغیر ہو سکتا ہے۔ خواہ خود بخود یا ماحول کی تبدیلی کے اثرات سے۔ ماحول کا کام یہ فیصلہ کرنا ہے۔ کہ جسم
کے کون سے تجربات ناکام ہیں۔ اور کون سے کامیاب۔ ارتقاء کا ہر نظریہ اپنے طور پر خصوصیات کی ابتدا کی وضاحت
کرتا ہے۔ ان کی زندگی کے ایسے اطوار جو مطابقت پذیر ہوں۔ اور ان کے ماحول میں موجود ہوں۔ نئی خصوصیات کی
پیدائش سے ارتقا کی رفتار کو تیز کر سکتے ہیں۔ اس لئے وراثت علمی اور عملی لحاظ سے بہت مفید علم ہے۔ والدین یا
نسل سے وراثتی رشتہ قائم کرنے میں جو بھی تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ وُہ نسل در نسل ورثہ میں جاتی ہے۔ بشرطیکہ
لونی اجسام ... ارتقا کی ایک شرط ہے

اسی ضمن میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ جسپر کافی بحث ہوتی آئی ہے۔ آیا ذاتی تبدیلیاں جنہیں بدقسمتی سے اکتسابی خصوصیات کہا جاتا ہے۔ بعینہ اسی حالت میں یا کسی خاص حد تک فاعلی ہیں یا نہیں۔ ایسی تبدیلیاں جو براہ راست کسی عملی خصوصیت سے وابستہ ہوں (مثلاً خوراک یا ماحول سے) ایسی پیدا کرنے والے وجوہات کی مفقودگی پر بھی برقرار رہتی ہیں۔ کیونکہ وہ کیمیائی لچک کی حد سے مافوق ہوتی ہیں۔ مشق ایک پٹھے کو مضبوط کر دیتی ہے۔ آرام طلبی چربی بڑھا دیتی ہے۔ ایک بکری سرد ملک میں جاکر اپنی اُون کو موٹا کر سکتی ہے۔ لیکن یہ تبدیلیاں وراثت میں حصہ نہیں لیتیں۔ ان کے حصہ لینے کے لئے کوئی شہادت نہیں۔ مگر اس سے تربیت کی اہمیت کو کم نہیں کیا جا سکتا۔ یہی تبدیلیاں کسی وقت وراثت کے کام میں بھی آسکتی ہیں۔ بعض گہرے اثر پذیر نقوش جو تمام جسم پر اثر ڈالتے ہوں۔ تولیدی خلیات کے لونی اجسام پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ اور نتیجتاً آئندہ نسلوں میں نمودار ہوتے ہیں۔ جیسے کہ "وایزمان" (WEISMAN.) "لیمارک" (LAMARCK) کے نظریہ پر تنقید کرتا ہوا زور دیتا ہے۔ تجربہ ارتقاء کا جزو نہیں ہو سکتا۔ اور اس کو رد کرنے سے اسکی اہمیت بھی کم نہیں ہو سکتی۔ تجربہ کارفرما ہوتا ہے۔ تجربات اور ان کے نئے مطالبات اور ضرورتوں کا اظہار یہ سب تبدیلیاں پیدا کر دیتے ہیں۔ اور جیسا کہ پہلے تذکرہ کیا گیا ہے۔ تجربات سے انحرافی امتحانات لئے جاتے ہیں۔ وراثت میں اتنی ہی تبدیلی ہوتی ہے۔ جتنی کہ لونی اجسام میں ہو۔ اس کی موزوں مثال لمبی گردن والے زرافہ کی ہے۔ اُسکی گردن پہلے لمبی نہ تھی۔ زمین پر خوراک کی عدم موجودگی نے اُسے پتوں اور اونچی شاخوں تک پہونچنے کے لئے مجبور کیا۔ اور اُس کی متعدد کوششوں نے چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں پیدا کر دیں۔ یہ چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں ایک بڑی تبدیلی کے مجموعہ کا باعث ہو کر نسل در نسل وراثت میں ظاہر ہوتی رہیں۔ حتےٰ کہ آج ہم لمبی گردن والے زرافہ دیکھتے ہیں۔ بچہ دینے والے حیوانات اور بیج رکھنے والے پودوں میں والدین اور بچوں میں کچھ عرصے تک براہ راست جسمانی تعلق رہتا ہے۔ بیج ایک ننھا سا پودا ہوتا ہے۔ جو بکھر جانے سے پہلے کافی عرصہ تک اپنے والدین سے قریبی الحاق رکھتا ہے۔ اور ناپیدا شدہ بچہ ماں کے رحم میں مشیمہ سے ملحق رہتا ہے۔ گویا وضع حمل تک بچہ ماں کے جسم میں ایک طفیلی زندگی بسر کرتا ہے۔ ان دونو حالتوں میں ننھا جاندار اپنے والدین سے کیمیائی تسلسل رکھنے کے باعث بہت گہرے طور پر اثر پذیر ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ اثر منفی ہو یا مثبت۔ وراثت کا حصہ ہو یا نہ ہو۔ لیکن اُس کا اثر ذات کے لئے کافی اثر رکھتا ہے۔ بس یہاں بچے میں عام مضبوطی یا کمزوری پیدا ہوتی ہے۔ ماں کی صحت اچھی یا بُری ہونیکے لحاظ سے۔ لیکن اس سے ہرگز یہ مُراد نہیں۔ جو لیمارک کے حاصل کردہ صفات کی وراثت کے نظریہ سے ہے۔ آئندہ نسلوں پر اثر انداز ہونے کا فیصلہ لونی اجسام کے دائرہ عمل میں ہے۔ وراثت کا فرق ماحول کے مادی فرق سے درست کیا جا سکتا ہے۔ علم نفسیات میں یہ چیز بہت اہمیت رکھتی ہے۔ ہماری دماغی حالت ماحول یعنی تعلیم و تربیت سے بدل سکتی ہے۔ دو بچے جو ایک ہی گھر میں پیدا ہوں [illegible] ہوتی

ہے۔ لیکن یہ اس بات کی دلیل نہیں۔ کہ ایک ادنےٰ توارث کا انسان ماحول کے ذریعہ بہت ہی اچھا ہو سکتا ہے۔
اُس کی آئندہ نسلوں میں تربیت کے اثر سے بہتری کی توقع ہو سکتی ہے۔ عام چیزوں میں یا جانداروں کے
میں جو فرق ہوتا ہے۔ اُس میں وراثت کا بہت سا حصہ ہوتا ہے۔ مثلاً عورتوں اور مردوں کے پیشہ میں جو فرق ہے
وراثت پر مبنی ہیں۔ عورتیں گھر میں کام کاج کرتی ہیں۔ مرد باہر جا کر کماتے ہیں۔ گویہ رسمی چیز ہے۔ لیکن حیاتیاتی اصول
تحت ہے۔ بعض خاص کاموں میں لڑکیاں زیادہ مہارت حاصل کرتی ہیں۔ اور بعض خاص چیزوں میں لڑکے۔
لڑکیاں ذہانت میں اور زبان کی مہارت میں زیادہ تیز ہوتی ہیں۔ اور لڑکے دستی کام میں۔ سائنس۔ جغرافیہ وغیرہ
یہ تمام چیزیں وراثتی حقائق پر مبنی ہیں۔ مگر یہ ایک مشکل سوال ہے۔ کہ بڑے بڑے پیغمبر۔ مجدد۔ رشی منی۔
فلسفی۔ شاعر۔ غنڈے۔ بدکار اور گنہگار مرد ہی کیوں ہوتے ہیں۔ عورتیں کیوں نہیں ہوتیں؟ توارث کی رُو سے
دو وجوہ بتائے گئے ہیں۔ اوّل یہ کہ مرد کے اعضا عام معیاری چیزوں سے جلد انحراف کرتے ہیں۔ دوم یہ کہ مرد میں زیادہ
توانائی ہوتی ہے۔ اُس کے خون میں سُرخ رنگ کے اجزا زیادہ ہوتے ہیں۔ ایسے اختلافات فروعی یا تفصیلاتی ہوتے
ہیں۔ ورنہ عام معیار کے مطابق دونو کے رویہ میں یکسانیت ہی پائی جاتی ہے۔ وراثت کا کام متشابہ صفات کی منتقلی
کا حل پیش کرتا ہے۔ ان میں اصولی طور پر مشابہت کا ہونا ضروری اور لابدی امر ہے تفصیلات میں فرق ایک فطری چیز ہے

کیا تبدیل تقدیروں کو تدبیروں کے بندوں نے

سُنا ہے مستقل عزمی بدل دیتی ہے قسمت کو — ہزیمت کر نہیں سکتی ہراساں جوش ہمت کو
جو استقلال سے ہر کام کا آغاز کرتے ہیں — وہی اپنی تمناؤں کو سرافراز کرتے ہیں
جوانمردوں کی خوش اسلوب مضبوط تدبیریں — وہ تدبیریں قدم جنکے لیا کرتی ہیں تقدیریں
مصائب پر حریفانہ روش سے مسکراتی ہیں — قیامت خانۂ آلام کا در کھٹکھٹاتی ہیں
انہیں روکیں گے کیا آلام ہیبت ناک کے پردے — پڑے ہوں جنکے دلپر جرأت بیباک کے پردے
شکستوں سے کبھی ذوقِ عمل گھائل نہیں ہوتا — جوانمردوں کا دلِ عورت کا نازک دل نہیں ہوتا
کبھی خفت کا منہ دیکھا نہیں کلفت پسندوں نے — کیا تبدیل تقدیروں کو تدبیروں کے بندوں نے

صنعت و حرفت

رُوسا گھاس

اِس گھاس کا بوٹینکل یعنی نباتاتی نام" اینڈروپوگان سکھوئینن تھس" (ANDROPOGAN SCHOENANTHUS) ہے سنسکرت میں" روہش" ہندی میں" رُوسا گھاس" کہتے ہیں۔ نرسل یعنی کانا کاہی اور گنّا یعنی اُکھ اور" رُوسا گھاس" ایک ہی خاندان کے پودے ہیں۔" رُوسا گھاس" کے پودے جھنڈ کی شکل میں چار پانچ فٹ بُلند۔ پتّے نرسل جیسے ایک اُنگل یعنی نصف اِنچ سے کم چوڑے اور دو تین فُٹ کے لگ بھگ لمبے دُور سے یہ نرسل یا کاہی کا جھنڈ ہی معلوم دیتے ہیں۔ یہ خودرَو اور خُوشبُودار گھاس پنجاب۔ سی۔ پی۔ راجپوتانہ اور جنوبی ہند کے جنگلوں میں بکثرت پیدا ہوتا ہے۔ گائے بھینس جب اِس گھاس کو کھاتی ہیں۔ تب اِن کا دُودھ بھی خوشبودار ہو جاتا ہے۔ اِس گھاس کے پتّوں کو ہاتھ میں مَل کر سُونگھنے سے سنگترہ یا لیموں کے چھلکا جیسی خوشبو آتی ہے۔ اِس کی خوشبو سے مچھّر کو خاص طور پر نفرت ہے۔ اِس لئے اِس گھاس کا تیل اگر جسم پر مَل لیا جائے۔ تو مچھر قریب نہیں آتا۔ ہندوستان گرم ملک ہے۔ اِسلئے یہاں مچھّروں کے ذریعہ ملیریا یعنی موسمی بخار بہت تباہی مچاتا ہے۔ لاکھوں اِنسان ہر سال ملیریا بُخار سے مرتے ہیں۔ قدرت نے اِس خرابی کے اِنسداد کے لئے ہندوستان کے میدانوں اور دلدلی زمینوں پر یہ گھاس بکثرت پیدا کر دیا ہے ✤ بظاہر دیکھنے پر یہ عام گھاس معلوم دیتا ہے۔ لیکن جب اِسکے پتّے مَل کر سُونگھا جاتا ہے۔ تب معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ اعلٰی اوصاف والی نباتات ہے۔ یہ پودا نہایت سخت جان ہے۔ جہاں ایک دفعہ یہ اُگ آتا ہے۔ وہاں اِس کی جڑیں زمین پر پھیل کر نئے پودے پیدا کرتی رہتی ہیں۔ اِس کی جڑیں مستقل ہوتی ہیں۔ اِس لئے اِس کو اگر ایک دفعہ بو دیا جائے۔ تو صدیوں تک یہ سرسبز رہتا ہے۔ اِس کی جڑ کی گانٹھ زمین میں بو دینے سے یہ پیدا ہوتا ہے۔ ضلع امراوتی میں کھیتوں میں گنّا یعنی اُکھ کی طرح اِس کو بویا جاتا ہے اور مشین کے ذریعہ اِسکے پتّوں کو کشید کر کے تیل نکالا جاتا ہے۔ کہ جس کو انگریزی زبان میں" سینٹ جیری نی ایم" (SCENT OF GERANIUM) کہتے ہیں۔ یہ نہایت قیمتی خوشبو ہے اِس کی فروخت سے اِس کو تیّار کرنے والا کارخانہ ہر سال لاکھوں روپیہ کماتا ہے۔ یورپ میں یہ تیل بھاری مقدار میں جاتا ہے۔ اور وہاں سے ڈبّوں میں بند ہو کر ہندوستان اور دیگر مُلکوں میں سونے کے مُول فروخت ہوتا ہے۔ لاہور کے" لارنس باغ" میں بھی یہ گھاس لگا رکھا ہے۔ بارہ ماہ اِس گھاس کو وہاں جا کر آپ شناخت کر سکتے ہیں پنجاب کے گاؤں کے رسید ... واقف ہیں اِسی قسم کا ایک اور خوشبودار گھاس پنجاب میں پیدا ہوتا

ہے۔ کہ جس کو زمیندار "کھوئی گھاس" کہتے ہیں۔ یہ گھاس بھی "رُوسا گھاس" کے خاندان سے ہے۔ "رُوسا گھاس" کے پتوں
کو پانی میں ڈال کر اور نرم آگ پر پکا کر پھر اس کا پانی چھان کر اس میں دُودھ اور میٹھا ملا کر بطور چائے گرم گرم پینے سے
پسینہ آ کر زُکام۔ بخار اور اِنفلوئنزا دُور ہو جاتا ہے۔ اِسکے پتوں کا تیل دو سے تین بُوند کی مقدار میں دُودھ کیساتھ
پلانے سے گٹھیا اور ریح کی دردوں میں فائدہ ہوتا ہے + موضع علی جبیج نزد "سیدوالا" ریلوے سٹیشن (N.W.R)
جڑانوالہ ضلع لائل پور میں سینکڑوں ایکڑ زمین پر گورنمنٹ پنجاب نے رُوسا گھاس لگا رکھا ہے۔ اور اسی مقام پر ایک
بُہت بڑی ڈسٹلری پلانٹ (جدید قسم کا آلہ کشید) بنایا ہُوا ہے۔ کہ جس میں اِس گھاس کا تیل کشید ہوتا ہے۔ اور سینکڑوں
گیلن یہ تیل باہر بھیجا جاتا ہے۔ جڑانوالہ ریلوے سٹیشن لاہور کے قریب ہی ہے۔ مُلک کے نوجوانوں کو چاہئے۔ کہ وہاں
جا کر اس گھاس کے کھیت اور اس سے تیل تیار کرنیوالی مشینری کا معائنہ کر کے اپنی معلومات بڑھائیں۔ اِسی طرح
ضلع امراوتی کے اِردگرد کے صُوبوں میں بسنے والے نوجوان وہاں کے کھیتوں اور مشینری کو دیکھ سکتے ہیں۔ اِن دونو
کارخانوں کا ذکر کیونکہ اخباروں یا رسالوں میں نہیں آتا۔ اِس لئے ہندوستان کے عوام اِس قیمتی صنعت سے بالکل ناواقف
ہیں۔ اِس لئے آج میں پہلی دفعہ اِس قیمتی پیداوار سے اپنے ہموطنوں کو رُوشناس کرا رہا ہوں۔ زمیندار اگر اپنی زمینوں
میں یہ گھاس لگا کر اس کے اپنے پتوں سے معمولی دیسی آلہ کشید سے عرق کشید کر کے اس عرق پر تیرتی ہُوئی چکنائی
کو الگ کر کے جو کہ دراصل "رُوسا گھاس کا تیل" ہے۔ تجارت کریں۔ تو بھاری فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ یا اس گھاس
کو کشید کرنیکے شہروں میں کارخانے لگائے جائیں۔ اور دیہات والے اس گھاس کو کاشت کر کے ایسے کارخانہ داروں
کے ہاتھ فروخت کر دیا کریں۔ تو اس میں دونو کو فائدہ ہے۔ یہ صنعت نہائت پُرمنافع ہے۔ کہ جسکی طرف آج تک
ہندوستانیوں نے توجہ نہیں دی۔ ہم اس صنعت کے ذریعہ ہزاروں ہندوستانیوں کا پیٹ پال سکتے ہیں۔ میں
اُمید کرتا ہُوں۔ کہ ملک میرے اِس مشورہ سے فائدہ اُٹھائیگا۔ "رُوسا گھاس کا تیل" سر لگانے کے تیل کو اور صابن
کو خوشبودار بنانے میں بکثرت اِستعمال ہوتا ہے۔ اِس تیل سے عطر اور لیونڈر بنائے جاتے ہیں۔ ولائتی خوشبودار
مٹھائی میں پڑتا ہے۔ یہ تیل بطور دوا بھی کام میں آتا ہے۔ اور نہ معلوم کن کن چیزوں میں یورپ اسکو ملا کر فائدہ
اُٹھاتا ہے۔ ہندوستان میں یہ خودرو گھاس کسی کام نہیں آتا۔ ہاں اس کے چھپر گاؤں والے بناتے ہیں۔ یا اس سے
تنور گرم کرتے ہیں۔ بموسم گرما میں اس گھاس کو بطور خس کی ٹٹیوں کے استعمال کیا جائے۔ تو اِس کی مخصوص خوشبو سے
کمرہ مہک جائے۔ اور مچھر بھی نہ ستائیں۔ "رُوسا گھاس کی ٹٹیوں" کا نہائت آسانی سے رواج ہو سکتا ہے +

ہم عاصیوں کا بارِ گُنہ سے جھکا ہے سر — اور خلق کو گمان ہے ہم پر نماز کا
دریا تو اپنی موج کی طغیانیوں میں ہے — کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

کیمیا صفت نباتات

پنیر ڈوڈی یعنی "خجیرہ" یا "اکی"

صوبہ پنجاب۔ صوبہ سندھ اور دریائے ستلج کی وادی میں ایک بوٹی بکثرت پائی جاتی ہے۔ کہ جس کو گاؤں والے چولہوں اور تنوروں میں بطور ایندھن جلاتے ہیں۔ اور اس کو بیکار پیداوار سمجھ کر نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں لیکن یورپ کی دواساز کمپنیاں اس بوٹی کو ہندوستان سے بکثرت منگا کر اس سے قیمتی ادویات تیار کرتی ہیں انگریزی طب میں اس کو "وی تھانیا گوا یگولانس" (WITHANIA COAGUIANS) کہتے ہیں یہ پودا ریتلے علاقوں میں خوب پھلتا پھولتا ہے۔ جن علاقوں میں آک یعنی مدار کے پودے بکثرت ہوتے ہیں۔ وہاں یہ پودا بھی بکثرت ملتا ہے۔

اس کے پتے لیموں یا سنگترہ کے پتوں جیسے لیکن نہایت ننھے روئیں کے باعث پتے اور شاخیں سفید نظر آتی ہیں۔ اس پودے کی جڑ سے ہی کئی شاخیں اڑھائی تین فیٹ تک بلند ہوتی ہیں۔ اور دیکھنے پر یہ پودا جھنڈ کی شکل دکھائی دیتا ہے۔ کہ جس کی بلندی اڑھائی فٹ سے تین فٹ تک ہوتی ہے۔ یہ آک کی طرح مستقل پودا ہے۔ اپنے موسم پر جڑوں سے شاخیں نکلتی رہتی ہیں۔ یعنی ماہ فروری میں جڑوں سے شاخیں نکلنے لگتی ہیں۔ اور ماہ مارچ میں اس کو ہلکے پیلے رنگ کے پھول لگتے ہیں۔ اور وسط مارچ میں یہ پھول پھل کی شکل اختیار کر لیتے ہیں جو کہ بیر کی طرح گول ہوتے ہیں۔ اور ان پر رس بھری کی نسبت موٹا غلاف سفید رنگ کا قدرتی طور پر چڑھا ہوتا ہے۔ اس غلاف کا اندر کا پھل رس بھری جتنا اور اسی قسم کے بیجوں اور گودے سے پُر ہوتا ہے...... آخیر مارچ سے لیکر وسط اپریل تک یہ پھل پک جاتے ہیں۔ اور ایک ایک پودے پر بکثرت لگے دکھائی دیتے ہیں ان پھلوں کا ذائقہ ترش بہ مائل کسیلا ہوتا ہے۔

اس پودے کے پتے اڑھائی سے تین انچ تک لمبے لیکن ذائقہ ان کا بہت کڑوا ہوتا ہے۔ اس لئے مویشی ان کو نہیں کھاتے۔ موسم برسات میں آک کے پودے سوکھ سڑ جاتے ہیں۔ لیکن جڑیں زندہ رہتی ہیں۔ یہی حال اس پودے کا ہے۔ سردیاں گذرنے پر انہی جڑوں سے یہ نمودار ہو جاتا ہے۔ پنجاب کے ضلع میانوالی کے ریتلے علاقوں میں۔ اور اس ضلع کی تحصیل کالاباغ کے ویرانوں میں اس کے بیشمار پودے ہیں۔ وہاں کے لوگوں سے میں نے ان کی اپنی زبان میں اس پودے کا نام دریافت کیا تو انہوں نے بتایا۔ کہ ہمارے ضلع میں اس پودے کو خجیرہ کہتے ہیں۔ اور اس ضلع کا ہر شخص اسی نام سے اس سے واقف ہے۔ وادیٔ ستلج اور پنجاب کے دیگر علاقہ کے سفر میں وہاں کے لوگوں سے اس پودے کا نام دریافت کیا۔ تو انہوں نے بتایا۔ کہ ہم اس پودا کو اپنی زبان

میں " پنیر ڈوڈی " کہتے ہیں۔ ایورویدک ہندی کتب میں بھی اس پودا کا یہی نام ملتا ہے۔ اور کہیں کہیں صرف
" پنیر " ہی اس پودا کو لکھا ہے ؛
سندھ کے دوران سفر میں وہاں کے لوگوں نے اس پودے کا نام اپنی زبان میں " پنیر بند " یا " پنیر جافوطہ "
بتایا۔ اس پودے کے خشک پھل پنساریوں سے " پنیر ڈوڈی " کے نام سے مل جاتے ہیں۔ ہندی شاستری۔ اردو۔
عربی اور انگریزی زبان کی کسی بھی کتاب میں اس مفید پودے پر مکمل روشنی نہیں ڈالی گئی۔ لیکن یورپ اس کے
جادو اثر فوائد سے بخوبی واقف ہے۔ دنیا میں ملک ہالینڈ کا پنیر سب سے افضل اور خوش ذائقہ سمجھا جاتا ہے۔
ہالینڈ کا پنیر بند ڈبوں میں دنیا کے ہر شہر میں فروخت ہوتا ہے۔ یہ پنیر نہائت خستہ۔ ذائقہ میں نمکین اور خوشبودار
ہوتا ہے۔ حالانکہ اور پنیر بلچپے۔ ربڑ جیسے اور مسامدار اور نامرغوب ذائقہ ہوتے ہیں۔ اسلئے کوئی پنیر بنانیوالی کمپنی
ملک ہالینڈ کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ عام طور پر گرم دودھ میں ست لیموں یا رس لیموں یا دہی یا بھیڑ بکری کے خشک
پستانوں کا سفوف ڈال کر دودھ کو پھاڑ کر اور چھان کر پنیر علیحدہ کر لیتے ہیں۔ لیکن ہالینڈ والے ہندوستان سے
" پنیر ڈوڈی " پھل منگا کر دس تولہ " پنیر ڈوڈی " کو تین پاؤ پانی میں ڈال کر بارہ گھنٹہ نہائت مدھم آگ پر
پکاتے ہیں۔ پھر سرد ہونے پر کپڑے میں سے چھان کر تمام گھلی ہوئی " پنیر ڈوڈی " کا رس نکال لیتے ہیں۔ ۵۵ گیلن
دودھ میں اس تیار کردہ رس میں سے نصف ڈالتے ہیں۔ ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد دودھ خود بخود پھٹ جاتا ہے۔ فلالین
کے صاف ستھرے کپڑے میں چھان کر پانی علیحدہ کر دیتے ہیں۔ اور اس پانی میں سے " ملک شوگر " نام کی دوا نکال
کر اس کی تجارت کرتے ہیں۔ اور پنیر میں نمک شامل کر کے اور پریس میں دبا کر ٹھوس کر لیتے ہیں۔ اور ڈبوں میں بھر
کر دنیا کی منڈیوں میں اسکی تجارت کرتے ہیں ؛
ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ پراچین بھارت باسیوں کو اس بوٹی کے یہ خواص معلوم تھے۔ تب ہی انہوں نے اس کا
نام " پنیر ڈوڈی " یا " پنیر " مقرر کیا۔ اور اپنے زمانہ میں اس سے پنیر بناتے ہونگے۔ انقلاب زمانہ کے باعث پراچین
شاستر ضائع ہو گئے۔ اور ہندوستانی اس بوٹی کے خواص بھلا بیٹھے۔ اور اس کو بیکار پودا سمجھ کر تنوروں اور چولہوں
میں جلانے لگے۔ لیکن یورپ اس سے دولت کما رہا ہے۔ اسکے علاوہ انگریز محقق اس کو مسکن اور دافع دادقرار دیتے
ہیں۔ اور اس کے تلخ پتوں کو بخار کے علاج میں مفید تسلیم کیا ہے۔ اس کے علاوہ " پنیر ڈوڈی " میں جگر کی بیماری
دور کرنے اور مدر بول خواص بھی پائے جاتے ہیں۔ یورپ نے اس کے بیجوں اور پھل کے گودے کا ایک ست تیار کیا ہے
کہ جس کی نہائت قلیل مقدار دودھ کو پھاڑنے میں موثر ہوتی ہے۔ یہ ست زیادہ تر یورپ اور امریکہ میں استعمال ہوتا
ہے۔ اور لاکھوں روپوں کی اس کی تجارت ہوتی ہے۔ کیونکہ پنیر وہاں کے لوگوں کی غذا کا ایک جزو ہے۔
اور دماغ کو نشوونما دینے میں پنیر سب سے بہتر خوراک ہے۔ ہندوستان کے ویرانے اس خودرو پودوں سے بھرے

پڑے ہیں۔ اِن کے پھل پودوں پر ہی پکتے ہیں۔ اور ویرانوں میں ہی گل سڑ جاتے ہیں۔ اور کوئی پوچھنے والا نہیں۔ اِس قیمتی پیداوار کی قلیل مقدار پانی کے مول پنساریوں کی دوکانوں پر پہونچتی ہے۔ کچھ یورپ گھاس کے بھاؤ ہندوستان سے خرید لیتا ہے۔ اور اِس سے خوب فائدہ اُٹھاتا ہے ۔ ہندوستانیوں کو چاہئے۔ کہ وہ اِس خودرو لیکن قیمتی پیداوار سے یورپ کی طرح فائدہ اُٹھائیں۔ ہندوستان میں اِس کاشت تیار کر کے یورپ کی نسبت سستے داموں میں یورپ کو اور دیگر ملکوں کو مہیا کر کے مالی نفع حاصل کرنا چاہئے۔ یہ ہمارے ملک کی خودرو پیداوار ہے۔ اسلئے اِسکی تجارت میں کوئی ملک ہمارا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ پنجاب کے غیر ریگستان لیکن ویرانوں میں بھی میں نے اِن پودوں کو کہیں کہیں دیکھا ہے نیز راجپوتانہ میں بھی۔ میری بتائی شناخت کے باعث آپ نہایت آسانی سے اِن پودوں تک پہونچ سکیں گے۔ مزید تسلّی کے لئے آپ اِن پودوں کے نمونے میرے پاس بھیجکر اِن کے صحیح ہونیکی تسلّی کر سکتے ہیں ۔

وَید حکیم صرف اِس پودے کے پھل ہی بطور دوا استعمال کرتے ہیں۔ لیکن پنجاب کے گاؤں کے باشندے بخار اور خرابی خون میں اِس کے پتوں کو پانی میں رگڑ کر پیتے ہیں۔ اور اِن امراض میں یہ مفید ثابت ہوتے ہیں۔ میرے تجربات بھی یہی ہیں۔ مجھ کو اُمید ہے۔ کہ اِس مضمون کی روشنی میں یہ پودا اسی عزت سے دیکھا جائے گا۔ کہ جس کا وہ مستحق ہے۔ اور گاؤں والے اِس سے تنور یا چوٹھا گرم کرنے کی بجائے اِن کی حفاظت کر کے اور اِس پودے کے پھل اور پتے جمع کر کے اِن کی تجارت سے مستفید ہونگے ۔

"پنیر ڈوڈی" نامی پھلوں کو موٹا موٹا کوٹ کر دو تین تولہ وزنی۔ ایکپاؤ پانی میں رات کو بھگو دیں۔ اور صبح کو مَل کر اور کپڑے میں سے چھان کر اِس پانی میں حسب ذائقہ نمک ملا کر موسم گرما میں ہر صبح پینے سے انسان کے چہرہ کا رنگ سُرخ ہو جاتا ہے۔ خون کی خرابی اور جگر کی خرابی دور ہوتی ہے۔ اور بھوک خوب لگتی ہے۔ اور گرم بیماریوں سے حفاظت ملتی ہے۔ یہ سرد ہے۔ اِس لئے جریان احتلام میں بھی مفید ہے۔ موسم سرما میں اِس پانی کو گرم کر کے اور نمک ملا کر ہر روز پینا چاہئے ۔

"پنیر ڈوڈی" کے پیڑ خودرو پیدا ہوتے ہیں۔ صوبہ سرحد میں کوہاٹ اور عیسےٰ خیل کے درمیان جو پہاڑی علاقہ ہے۔ اِسی علاقہ کو وہاں کے لوگ "میدان" کہتے ہیں۔ اِس علاقہ میں "پنیر ڈوڈی" کے پیڑ بکثرت ملتے ہیں۔ عیسیٰ خیل ضلع میانوالی کی تحصیل ہے۔ "مکھڑ وال کالری" جو کہ ضلع میانوالی میں پتھر کے کوئلہ کی کان ہے۔ یہاں بھی یہ پودے افراط سے ہیں۔ اِن کے علاوہ ضلع میانوالی کے موضع (۱) سُلطان خیل (۲) چابری (۳) مٹھا (۴) چوترا۔ اِن چار گاؤں کے گرد و نواح میں نیز موضع ترگ اور کمر مشانی جو کہ دونو ریلوے سٹیشن ہیں۔ اور یہاں سے ہی مندرجہ بالا گاؤں کو لوگ جاتے ہیں۔ یہاں بھی اور ضلع میانوالی کی تحصیل عیسےٰ خیل ریلوے سٹیشن کا گرد و نواح بھی "حمجیح" یعنی "پنیر ڈوڈی" کے خودرو پیڑوں سے بھر پڑے ہیں۔ اپریل سے ماہ اگست تک اِن کے پھل پکتے ہیں۔ جو کہ

رس بھری کے پھل کی طرح سفید خول میں لپٹے ہُوئے ہر پودے پر بکثرت لگے ہوتے ہیں۔ پھل اندر سے بالکل رس بھری جیسا ہی بیجوں اور گُودے سے پُر ہوتا ہے۔ اِس علاقہ کے لوگ اِس کا گُودا جمع کر کے بڑا سا گولہ بنا کر سُکھا لیتے ہیں۔ اور اِس کو مندرجہ بالا طریقہ سے استعمال کرتے ہیں۔ پٹھان لوگ جوکہ ہینگ بیچتے ہیں۔ میدانی علاقوں میں اسکو بھاری قیمت پر فروخت کرتے ہیں۔ حالانکہ موسم پر بالکل مُفت یہ پھل کئی من ہر روز جمع ہو سکتے ہیں + "پنیر ڈوڈی" پر کسی بھی کتاب میں مُفصل ذکر نہیں ملتا۔ اور نہ عوام اِس سے بخُوبی واقف ہیں۔ اِس لیٔے میں نے اِس پر پُوری روشنی ڈالی ہے۔ تاکہ اِس مُفت کی پیداوار سے میر املک مُستفید ہو سکے۔ ضلع جھنگ اور بلوچستان اور صُوبہ سرحد میں بھی میں نے "پنیر ڈوڈی" کے پودے بکثرت دیکھے ہیں۔ اِس پھل کا نام "پنیر ڈوڈی" اِس لیٔے ہے۔ کیونکہ اِس کے پھلوں سے تازہ پنیر جیسی خُوشگوار خوشبو آتی ہے۔ نیز اِن پھلوں سے پنیر بھی تیار ہوتا ہے۔ اِس لیٔے اِس کا یہ نام رکھا گیا ہے + "پنیر ڈوڈی" کے پھلوں کا ذائقہ کڑواہٹ لیٔے تُرش ہوتا ہے۔ اور پنیر سی خوشبو کھانے پر محسُوس ہوتی ہے۔ جن کو پیٹ پھُولنے کا عارضہ ہو۔ یعنی پیٹ میں گیس پیدا ہوتی ہو۔ وُہ اِس کے پھلوں کو کچل کر پانی میں بھگو دیں۔ اور صُبح کو مل چھان کر اِس پانی میں نمک حسب ذائقہ ملا کر پی لیا کریں۔ اسکے استعمال سے قطعی آرام آجاتا ہے۔ بھُوک خُوب لگتی ہے۔ اور ہاضمہ تیز ہو جاتا ہے۔ "پنیر ڈوڈی" کے پھل کا جب اُوپر کا غلاف اُتار جاتے۔ تب یہ پھل زرد رنگ کا فالسہ کے پھل کے برابر برآمد ہوتا ہے۔ کہ جس کے اندر رس بھری کی طرح بیج بھرے ہوتے ہیں۔ یہ پھل خُشک حالت میں ایک سال تک قابلِ استعمال رہتے ہیں۔ اِس کے بعد گُودے کا رنگ میلا خاکستری پڑ جاتا ہے اِس کے پھل جوکہ تازہ سُکھائے گئے ہوں۔ ہاتھوں سے ملنے پر زرد چھلکا بھی اُتر جاتا ہے۔ کیونکہ گُودے میں لیس ہوتی ہے۔ اسلیٔے تمام پھلوں کے گُودے کو ملا کر اور دبا کر گولہ بنا لیتے ہیں۔ اور جب ضرورت پڑتی ہے۔ اِس گولہ میں سے توڑ توڑ کر کام میں لاتے ہیں۔ جن علاقوں میں یہ نباتات ہوتی ہے۔ وہاں کے لوگ اسکو اَکی بھی کہتے ہیں۔ اِس کے ایک سیر پھل خُشک شُدہ جوکہ ایک سال سے پُرانے نہ ہوں۔ اگر ایک کمرہ میں رکھے جائیں۔ تو تمام کمرہ تازہ پنیر کی خوشبو سے مہک جاتا ہے۔ مٹھی بھر اِن پھلوں کے سُونگھنے پر بھی پنیر کی خُوشگوار خوشبو آتی ہے لیکن اکیلے پھل میں زیادہ خوشبو نہیں ہوتی +

گیس (PRODUCER) پروڈیوسر

اِس گیس کا نام پٹرول کے قائم مقام کی حیثیت سے بہت سُنا جا رہا ہے۔ کیا حقیقت میں یہ پٹرول کی جگہ کامیابی سے لے سکتی ہے؟ ابھی اِس پر بحث کی بہت کچھ گنجائش ہے :۔ یورپ میں خاصکر فرانسیسی افواج میں لاریاں اور دوسری سواریاں کئی سال سے اِسی پروڈیوسر گیس پر چل رہی ہیں۔ یہ گیس جنے [illegible] اور بھاپ گزار [illegible]

اوم

رسالہ

مستانہ جوگی

لاہور

نمبر ۲	ماہ فروری ۱۹۴۵ء	جلد ۳۳

قومی تعمیر

یہ مضمون حوالۂ قلم کرنے سے پیشتر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہم اپنے ناظرین کی خدمت میں ایک اصول کی اہمیت اچھی طرح واضح کر دیں۔ تاکہ ناظرین کے دل میں مضمون کا صحیح مفہوم سمجھنے کے متعلق غلط فہمی کا امکان نہ ہو۔ اس دنیا میں ۲ دو قوانین کام کرتے ہوئے نظر آتے ہیں (۱) طاقت کا قانون LAW OF FORCE (۲) LAW OF LOVE محبت کا قانون۔

بادشاہ وقت یا گورنمنٹ کی حکومت کا انحصار عموماً اُن کی فوجی یا جسمانی طاقت پر ہوتا ہے۔ یعنے وہ LAW OF FORCE کی معرفت سنسار پر حکمرانی کرتے ہیں۔ برعکس اس کے روحانی پیشوا اپنے شششوں (سکھوں) کے دلوں پر پریم کے دوارا راج کرتے ہیں۔ چنانچہ مستانہ جوگی کی تعلیم سنسار کی اصلاح و سُدھار کے لئے دُنیا میں جو پریورتن کرنا چاہتی ہے۔ وہ سب پریم اور محبت کی کشش کے جادو سے کیونکہ محبت اور پریم سے ہی اہل دُنیا کے دلوں پر لازوال اور مکمل فتح حاصل کی جا سکتی ہے۔

انسانی وجود کی بناوٹ مرکب ہے۔ لہذا وہی انسان مکمل ہے۔ جس کے روحانی، دماغی اور جسمانی قواء بیدار اور تربیت یافتہ ہیں۔ اور قوموں میں سب سے افضل اور سب کی سرتاج وہی قوم متصور ہو گی۔ جس کے افراد کی جسمانی۔ دماغی اور روحانی قواء کی ترقی کے متعلق کماحقہٗ کوشش کی گئی ہو۔ اور وہ کوشش کامیاب ثابت ہوئی ہو۔ جیسے ایک آہنی زنجیر کی مضبوطی کا انحصار اس کی کڑیوں کی

مضبوطی پر ہے۔ ایسے ہی ایک سوسائٹی کی خوش حالی، روشن ضمیری اور استحکام کا دارومدار اُن افراد پر ہے
جن سے یہ کمیونٹی بنی ہے۔ چنانچہ اس اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے تمام مہذب ممالک کے مدبرین اور لیڈر
اپنی قوم کے ہر بچہ کی تعلیم و تربیت۔ اس کی جسمانی ترقی اور تندرستی۔ اس کے معاشرتی زندگی کے ہر
پہلو کو بڑے غور سے مطالعہ کر رہے ہیں۔ بلکہ حتی الامکان وہ قوم کے ہر بچہ کے لئے مناسب غذا یا خوراک
بہم پہونچانے، اُن کو صاف ستھرے کھلی ہوائی میں زندگی گذارنے۔ ان کی تعلیم و تربیت کا معقول انتظام
کرنے اور ان کی اقتصادی حالت درست کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں ٭

اس جنگ نے ہر ملک کے مدبرین کی آنکھیں کھول دی ہیں۔ دنیا کی یہ اقوام محسوس کرنے لگی ہیں۔
کہ اگر وہ اس دنیا کی کشمکش کی جنگ میں زندہ رہنا چاہتی ہیں۔ تو انہیں اپنا زاویہ نگاہ تبدیل کرنا ہوگا
اب وہ زمانہ نہیں رہا۔ کہ قوم کا ایک حصہ محلوں میں عیش و عشرت کرے۔ اور دوسرے حصہ کو جھونپڑیاں
بھی میسر نہ ہوں۔ قوم کا ایک حصہ حد سے زیادہ خوراک کھا کر کمزور اور دائم المریض رہے۔ اور دوسرے کو
پیٹ بھرنے کے لئے بھی کھانا نصیب نہ ہو۔ قوم کا ایک حصہ اونچے شالوں و دوشالوں سے ملبوس ہو۔ اور
دوسرے کو اسقدر بھی چیتھڑے نصیب نہ ہوں۔ کہ وہ سردی یا ہوا سے محفوظ ہو سکے ٭

آج سے ۲۷ سال پیشتر یورپ کی بعض اقوام کی حالت بڑی خراب اور قابل رحم خیال کی جاتی تھی۔
لیکن اول جنگ عظیم کے بعد جو تبدیلی یورپ کے اُن افراد کی جسمانی۔ دماغی، اقتصادی اور مجلسی حالتیں
رونما ہوئی ہے۔ اس کو دیکھ کر امریکہ اور انگلستان کے مدبرین حیران و ششدر رہ گئے ہیں۔ اس کا سب
سے زبردست ثبوت جدید جنگ نے پہونچایا ہے۔ جرمنی نے قریباً چھ ماہ کی جنگ میں تمام یورپ کی طاقتوں
کو ہلا دیا تھا۔ اگر روس کی حکومت بھی قدیم زار کی سی ہوتی۔ تو آج روس کا نام و نشان مٹ
گیا ہوتا۔ لیکن روس کی عنان روسی محبان وطن کے ہاتھ میں تھی۔ جنہوں نے روسی عوام کو
اٹھانے کے لئے کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا۔ جنہوں نے روسی کسانوں اور مزدوروں کی تعلیم و
تربیت، اُن کے آرام و آسائش۔ ان کی تفریح اور مسرت میں اضافہ کرنے کے لئے وہ کارہائے نمایاں
کئے۔ جن کی نظیر تواریخ میں دکھائی نہیں دیتی۔ اس کا نتیجہ ہم سب کے سامنے ہے۔ روسی سپاہی اب
کرایہ کا ٹٹو نہیں ہے۔ جو محض چند چاندی یا سونے کے سکوں کی خاطر جنگ میں شریک ہوتا ہے۔ بلکہ
وہ اپنے مادر وطن کی رکشا و حفاظت کرنے کی خاطر میدان جنگ میں خوشی سے قربان ہوتا ہے۔ کوئی
طاقت اُسے روپیہ دیکر نہیں خرید سکتی۔ روسیوں میں جاسوس۔ مخبر۔ غدار اور وطن فروش نہیں ملیں
گے۔ جو زر کے لالچ سے اپنے وطن سے بیوفائی کریں۔ یا اپنے وطن کے راز دشمن پر افشا کر دیں۔ یہ
اسی صورت میں ممکن ہے۔ جب گورنمنٹ وقت روسی رعیت سے اپنوں کا سا سلوک کرے۔ جب امراء
وعوام میں فرق نہ رہے۔ جب سب کے حقوق مساوی و برابر ہوں ——————
—————— جب خاندان یا نسب کے لحاظ سے جاہ و حشمت کی تقسیم نہ ہو۔
بلکہ ذاتی قابلیت و استعداد کی بناء پر برتری و عظمت کا تعین کیا جائے۔ جس ملک کے لوگوں میں ایسی
مکمل مساوات۔ برادرانہ آزادی اور جمہوریت پائی جاتی ہے۔ اُسی ملک کے لوگ بڑی سے بڑی قربانی
کے خوشی سے متحمل ہوتے ہیں ٭ انسانی اور قومی ترقی کا ایک اصول اور راز اوپر بیان کیا

گیا۔ جیسے یہ قومی ترقی اور شخصی فلاح، بہبود و انفرادی تسکین و اطمینان قلب کے لئے لابدی ہے۔ ایسے ہی یہ اصول بین الاقوامی صلح و آشتی۔ شانتی اور امن و امان کے لئے لازمی ہے۔ نوع انسان ایک بڑا کنبہ ہے۔ جو مختلف اقوام اور مختلف ممالک کے لوگوں میں منقسم ہے۔ اگر ایک کنبہ کے ممبران کے دلوں میں امتیاز و تفریق۔ حسد و رقابت۔ عناد و بغض کی چنگاریاں روشن کی جائیں۔ جس کا ذمہ وار خاندان کا بزرگ ہوتا ہے۔ جو اپنی کج فہمی۔ کوتاہ اندیشی۔ دور رعایت کی حکمت عملی سے سارے خاندان میں اشانتی۔ بے اطمینانی اور بے چینی پھیلا دیتا ہے۔

ایسے ہی دنیا میں آجکل جو اشانتی، بے چینی، بد امنی اور ناراضگی کی لہر دوان ہے۔ اسکے ذمہ دار وہ قومی لیڈر اور مدبرین ہیں۔ جو نسلی۔ رنگی۔ قومی تعصبات کے ماتحت دنیا کی دیگر اقوام کے باشندوں سے غیریت کا سلوک کرتے ہیں۔ اگر ان مدبرین کی سمجھ میں یہ بات آجائے۔ کہ تمام نوع انسان ایک بڑا کنبہ ہے۔ اور تمام کنبہ کے ممبران کے مساوی حقوق اور ذمہ داریاں ہیں۔ اور ہر قوم کے آدمی کو خواہ وہ کسی نسل اور کسی ملک سے ہو۔ اور خواہ اس کا کوئی رنگ ہو۔ برابر حقوق ہیں۔ کہ وہ جس ملک میں چاہے۔ بود و باش کر سکے۔ اس کے حصول تعلیم کے متعلق کوئی بندش یا پابندی نہ ہو۔ اس کو تجارت یا بیوپار کے لئے ہر ملک میں موقع و سہولتیں میسر ہوں۔ جیسا کہ اس ملک کی حکمران قوم کے ممبران کو اس ملک میں حاصل ہیں۔ ایسے ہی دنیا کے ہر ملک کے لوگوں کے لئے اجازت ہو۔ کہ وہ دنیا کی جس سلطنت کی نوآبادی یا مقبوضات میں آباد ہونا چاہیں۔ یا مستقل رہائش اختیار کرنا چاہیں۔ اختیار کر سکیں۔ کیا یہ بے انصافی اور اندھیر نہیں ہے۔ کہ ایک ملک کے باشندگان کروڑوں ایکڑ عمدہ اور زرخیز زمین آنیوالی پشتوں کے لئے محفوظ رکھ لیں ——— ——— اور دوسرے ملک کے لوگ جو عمدہ اراضی کی عدم موجودگی کے باعث قحط و فاقہ کشی سے ہلاک ہو رہے ہیں۔ انہیں اس محفوظ شدہ اراضی میں کاشت کرنیکی اجازت نہ ہو۔ انسانی خود غرضی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ چنانچہ دنیا کی بعض اقوام نے اس قسم کی اجارہ داری سے دنیا کو دوزخ میں تبدیل کر دیا ہے۔ جس سے دن بدن معصوم اور بے گناہ اقوام کو ان کے قدرتی حقوق سے محروم کر دیا گیا ہے۔ یہ ناراضگی دن بدن بڑھ رہی ہے۔ مہابھارت میں ایک کروڑ روپیہ کی سکشا درج ہے۔ کہ "دنیا انصاف پر کھڑی ہے۔" جہاں اس سنہرے اصول کو پس پشت ڈال دیا گیا۔ وہاں ہلچل، شور و شر، فتنہ و فساد کی آتش جل اٹھتی ہے۔ جس سے ظالم اور مظلوم۔ انصاف کش اور انصاف خواہ دونو کو کم و بیش دو چار ہونا پڑتا ہے۔

گذشتہ جنگ کی طرح اس جنگ کا بھی تھوڑے عرصہ بعد خاتمہ ہو جائیگا۔ لیکن کیا جنگ کے ختم ہونے سے لوگوں کے دلوں سے ناراضگی۔ بے اطمینانی۔ بے چینی کے جذبات جو جنگ کے اصل اسباب ہیں۔ ختم ہو جائیں گے؟ آپ اپنی اعلیٰ قوت سے دشمن پر فتح حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن آپ اپنی اعلیٰ قوت سے اس کا دل فتح نہیں کر سکتے۔ دل فتح کرنے کے لئے اعلیٰ اخلاقی طاقتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور اخلاقی طاقت اس وقت تک پیدا نہیں ہوتی۔ جبتک انسان کے دل میں خوف خدا نہیں ہوتا جبتک انسان خدا کا وصل یا دیدار حاصل نہیں کرتا۔ وصل و دیدار حاصل کرنے کے لئے تپسیا یا

بھگتی کی ضرورت ہے۔ اور بھگتی بغیر مرشد کامل کی دیا دِرِشٹی سے پراپت نہیں ہوتی۔ اِس لئے دُنیا کے لوگوں کو جب تک تیاگ پرمارتھ پراپت نہیں ہوتا۔ اُن کا دُنیا کی جانب سے زاویہ نگاہ ہرگز نہیں بدلے گا۔ دُنیا بار بار جنگ کی آتش میں گرے گی۔ کیونکہ بے اِنصافی مظلوم کو آج نہیں۔ تو کل جنگ کے لئے مجبور کریگی۔ راون کی بے اِنصافی نے گُل کھلایا۔ سونے کی لنکا جل گئی۔ راون اور اُس کا خاندان تباہ ہوگیا۔ دریودھن کی بے اِنصافی نے کورو ونش کا ناش کر دیا۔ ہیلن کو بھگا لے جانے والے عاشق کو اپنی قومی تباہی کا خمیازہ اُٹھانا پڑا۔ اَلغرض تواریخ کے اوراق تو اُن لوگوں کو سبق دے سکتے ہیں۔ جو اُن سے سبق اور عبرت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن جو اپنی ہٹ دھرمی اور ضد پہ قائم ہیں۔ اُنہیں تواریخ کچھ نہیں سِکھا سکتی۔

ہاتھ سے چپّو چھوٹ نہ جائے

دُھندلے بادل چھٹ گئے آخر — "جیون رس" کا بند ہے ٹوٹا
چوٹ لگی ہے عمرِ رواں کو — میٹھا سا اِک نغمہ پھوٹا

مَن پر سُندر بدلی چھائی
سوچ میں ڈوبا نیند سی آئی

رات سُہانی اُجلا موسم — ندی کنارے شام کا ڈیرا
بھول گیا ہے شوق میں لیکن — سب سے عشق جدا ہے تیرا

عشق نیا ہے پریت نئی ہو
جگ میں تیری ریت نئی ہو

گھاٹ سے تجھ کو دُور تھا چلنا — تیری ناؤ گھاٹ لگی ہے
مَیں ڈرتا ہوں دوست کہ تیری — عمرِ جواں میں آگ دبی ہے

ہاتھ سے چپّو چھوٹ نہ جائے
دیکھنا! ہستی ٹوٹ نہ جائے

شنکھ کی تقدیس

ہندو دھرم میں

ہندوستانی لٹریچر میں "شنکھ" کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ مذہبی، مجلسی، سیاسی اور دیگر کاموں میں اِس کا عام استعمال ہوتا ہے۔ صبح شام دیو مندروں میں ہونیوالی آرتی کے وقت اُس کی بلند اور باثر گونج دِل پر وجد کی سی حالت طاری کر دیتی ہے۔ ہندوؤں کے گھروں اور مندروں میں دیو مورتی کے آگے گھنٹی کے ساتھ شنکھ کے بھی درشن ہوتے ہیں۔ بھارت ورش زمانہ قدیم سے شنکھ سے واقف ہے۔ یجروید۔ سنگھتا برہدارنیک اُپ نشد۔ اتھرووید سنگھتا کے شنکھ منی سوکت اور کوشک سوتر میں اِس کا ذکر مِلتا ہے۔ اور یہ بھی لکھا ہے۔ کہ جس بچے کے گلے میں شنکھ منی کو منترت کر کے باندھ دیا جاوے۔ اُس کی عمر بڑھ جاتی ہے۔ نکشتر کلپ میں بھی یہی کہا گیا ہے۔ شنکھ پاپ سے بچاتا ہے شنکھ کی مدد سے راکششوں کا ناش کیا جاتا ہے۔ شنکھ تمام امراض کی لاجواب دوا ہے۔ وہ سب رتنوں سے اعلےٰ ہے۔ غرضیکہ اسطرح ویدک ساہتیہ میں پہلے پہل اتھرووید سے ہمیں شنکھ کے متعلق کافی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

"امرکوش" کے مشہور مترجم بھانوج دیکشت "ویاکھیا شدھا" میں شنکھ شبد کا ارتھ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ کہ کلیان کاری ہونے اسکی دھونی منگل کاری ہونے۔ اور غربت کا ناش کرنے والا ہونے کی وجہ سے اِس کا نام شنکھ ہے۔ "واری ورگ" میں اِس کا تذکرہ ہونے سے اِس کا سمندر سے پیدا ہونا صاف ظاہر ہے۔ امرت منتھن پر نکلنے والے ۱۴ (چودہ) رتنوں میں شنکھ بھی شامل ہے۔ دیو پوجن میں اِس کا خاص حصہ ہے۔ وراہ پوران میں بتلایا گیا ہے۔ کہ دیو مندر کا دروازہ کھولنے سے پہلے ہر روز گھنٹی یا شنکھ کا بجانا ضروری ہے۔ شنکھ وغیرہ کے بجائے بغیر دیو مندر کا دروازہ نہ کھولنا چاہیئے۔ جو شخص شنکھ وغیرہ کا شبد کئے بنا ہی بھگوان کو جگا دینے والا ہے۔ وہ ایک جنم تک بہرہ ہوتا ہے۔ "شری وشنو پوجا اپرادھوں" میں بھی بغیر شنکھ بجائے بھگوت دوار کھولنا ایک اپرادھ مانا گیا ہے۔ شری منتر مہودَدھی "ویرمتر اُدے" کے "پوجا پرکاش" میں لکھتے ہیں کہ شنکھ کو بجاکر دوار کھولنا چاہیئے۔ "برہد نارد پران میں بتلایا گیا ہے۔ کہ دیو مندر میں شنکھ کی دھونی کرنے والا سب پاپوں سے چھوٹ کر برہم لوک کے سکھوں کو بھوگتا ہے۔ ارگھ پاتروں میں شنکھ کا پہلا درجہ ہے۔ "آگم" سے پتہ چلتا ہے۔ کہ شنکھ میں چاول، پھول اور جل لیکر ارگھ پردان کرنے سے سمندر سمیت پرتھوی کے دان جیسا پھل مِلتا ہے۔ متذکرہ بالا پران میں یہ بھی لکھا ہے۔ کہ کپلا گئو کا دودھ شنکھ میں لیکر وشنو کو اشنان کرانے سے یگیہ پھل مِلتا ہے۔ دوسری گئووں کا دودھ شنکھ میں بھر کر بھگوان کو اشنان کرانے سے وید پاٹھ کا پھل پراپت ہوتا ہے۔ شنکھ میں تیرتھ جل لے کر جو دوادشی کے دن وشنو کو اشنان کراتا ہے۔ ایک بوند جل سے اُس کے سو خاندان کا کلیان ہو جاتا ہے کلا نام تارتت شتی سکندھ پران" [illegible]

[illegible] پاپ [illegible] جل [illegible] شنکھ میں لیکر

وشنو اشنان کرانے سے پورب جنم کے پاپ نشٹ ہو جاتے ہیں۔ نیز جو شنکھ میں چندن وغیرہ سگندھ والی اشیاء ملا کر جل کو "نمونا رائنائے" اس منتر سے وشنو کو اشنان کراتا ہے۔ وہ پھر جنم نہیں لیتا ہے +

دوسرے سب دیوتاؤں کے پوجن میں جہاں شنکھ کے استعمال کا عام ذکر ملتا ہے۔ وہاں شو پوجا میں اس کی ممانعت ہے۔ شنکھ اور سوریہ کے پوجن میں شنکھ کا استعمال نہ کرنا چاہیئے + "سدھانت سنگرہ" میں بھی لکھا ہے + "منتر مہا ارنو" میں بھی کہا ہے۔ کہ شو اور سورج کی پوجا میں شنکھ کی بجائے تانبے کے بنے پاتر کو برتنا درست ہے + "گرڑ پران" بتلاتا ہے۔ کہ شنکھ میں چندن لیکر جو وشنو پر چڑھاتا ہے بھگوان اس پر سو برس تک بڑے خوش رہتے ہیں + "سکندھ پران" میں لکھا ہے۔ کہ جو ویشنو وشنو کا چرنامرت شنکھ میں لیکر اپنے ماتھے پر دھارن کرتا ہے۔ وہ سب تپسویوں میں سریشٹ ہے۔ نیز جو وشنو کا چرنامرت شنکھ میں لیکر اور اس میں تل ملا کر ویشنوؤں کو دیتا ہے۔ اس کو سو چندراین برت کا پھل ملتا ہے۔ تلسی دل کو ملانا بھی مفید بتلایا ہے + گرڑ پران میں لکھا ہے۔ کہ تلسی دل والا جل گنگا جل کے برابر ہے۔ جو اسے ماتھے پر دھارن کرتا ہے۔ اسے تیرتھ اشنان کا پھل ملتا ہے۔ شنکھ جل کو وشنو بھگوان کے مستک پر گھما کر اس جل کو جو ویشنو اپنے گھر میں چھڑکتا ہے۔ اس گھر میں کوئی برا واقعہ نہیں ہوتا +

دیو پوجا کے پہلے شنکھ کی بھی پوجا کرنی چاہیئے۔ وشنو پوجا میں شنکھ بہت ضروری ہے۔ اگست جی نے کہا ہے۔ کہ جو وشنو شنکھ کے بغیر وشنو کی پوجا کرتا ہے۔ اسے پوجا کا پھل نہیں ملتا۔ شنکھ کو دیوتا کے سامنے ستھاپت کرنا چاہیئے + سکندھ پران میں کہا ہے۔ کہ جس گھر میں بھگوان کے آگے شنکھ اور گھنٹی نہیں ہے۔ اسے ویشنو کیونکر کہا جائے؟ شنکھ کو زمین پر نہ رکھنا چاہیئے۔ ورنہ آٹھ بار گائتری منتر جپ کر تیپائی (شنکھ رکھنے کی بیٹھکی) پر رکھنا چاہیئے۔ گرڑ پران میں یہ بھی بتلایا ہے۔ کہ تمام تیرتھ بھگوان واسدیو کے حکم سے شنکھ میں نواس کرتے ہیں۔ اس لئے شنکھ کا پوجن کرنا چاہیئے۔ "گوبند ارچن چندرکا" میں لکھا ہے۔ کہ شنکھ کے اوپر کے حصہ میں چندرما۔ اندر ورن۔ پیچھے پرجاپتی اور آگے گنگا اور سرسوتی کا نواس ہے۔ شنکھ کو جل سے دھوکر یہ پرارتھنا کرنی چاہیئے۔ کہ "اے شنکھ! آپ زمانہ قدیم میں سمندر سے پرگٹ ہوئے۔ اور وشنو نے اپنے کر کمل (ہاتھ) میں دھارن کیا۔ تمام دیوتاؤں نے آپ کا نرمان کیا ہے۔ میں آپ کو نمسکار کرتا ہوں۔ آپ کے بھیانک شبد سے پاتال کے رہنے والے راکشش ڈر جاتے ہیں۔ آپ کو نمسکار ہے۔ آپ پن داتا اور منگل کرتا ہو۔ مجھے شانتی پردان کریں"۔ تتو ساگر سنگھتا میں شنکھ کو گیان دینے والا بتلایا گیا ہے۔ شکتی پوجا میں بھی اس کے استعمال کا خاص طریقہ مخصوص ہے +

کئی دیوی دیوتاؤں کے ہاتھ میں ہونا۔ اپ نشدوں۔ آگموں۔ تنتروں اور دوسرے گرنتھوں کے اپاسنا پرکرن سے ثابت ہوتا ہے۔ وشنو۔ سوریہ۔ مہا گنپتی۔ لکشمی۔ واسدیو۔ نرسنگھ۔ گائتری۔ درگا وغیرہ کے دھیان میں شنکھ کا ہونا ملتا ہے۔ بھگوان وشنو کا شنکھ ساکشات وید سوروپ ہے شریمد بھاگوت میں درج ہے۔ کہ دھرو تپسیا کے بعد [illegible] بھگوان کا [illegible] ہوا۔ تب

وُہ ہاتھ جوڑ کر ڈرا ہُوا سا سامنے کھڑا رہا۔ اِس سے کچھ بھی نہ بولا گیا۔ یہ دیکھ کر بھگوان نے کرپا کر کے اپنے برہم سوروپ شنکھ سے اُس کے گال پر سپرش کیا۔ بس پھر کیا تھا۔ بھگوتی سرسوتی دیوی دھروُ کی زبان پر براجمان ہو گئیں۔ ہردہ گیان کے پرکاش سے بھر گیا۔ اور وُہ پربھو کی استوُتی کرنے میں محو ہو گیا ✽

برہا میں ملاپ

جو برہا کا دُکھ سہتے ہیں سکھی! پریتم وُہ پا جاتے ہیں

کیوں بھٹک گئی اِک ٹھوکر سے
بھر نین کٹورے کیوں برسے
مَن مندر کے پٹ کھول سکھی
مَن موہن ٹھاکر آتے ہیں
جو برہا کا دُکھ

لے پُشپ کہانی سُن سجنی
کِسی توڑ لیٹے رَج کی رجنی
آیا جب اپنا ہار چلے
بن ہار گلے کو جاتے ہیں
جو برہا کا دُکھ

بس بانس کلیجہ چھدوایا
برہا کی آگنی تڑپایا
بن سے آ بن سی بن گئی پھر
وُہی بنسی شیام بجاتے ہیں
جو برہا کا دُکھ

ہیرے اور لعل جواہر سب
نکلے تھے کان سے پتھر جب
جب چام اُدھڑا تب چمک اُٹھے
سر "پی" کے شوبھا پاتے ہیں
جو برہا کا دُکھ

چکّر کئی چکّر کھائے جب
چکری سے چکّر آئے جب
ہُوا نام سُدرشن چکّر پھر
اُنگلی پر شیام بٹھاتے ہیں
جو برہا کا دُکھ

پھنستے ہیں پیار کی دُنیا سے
روتے ہیں یاد کی دُنیا سے
ہنس ہنس پھر ہنسی آتی ہے
جب ہنس سرو وز پاتے ہیں
جو برہا کا دُکھ

پی بن پینا اور کھانا کیا
جی بن جینا اور جانا کیا
بستے ہیں "پی" کی آنکھوں میں
جو گیت پیا کے گاتے ہیں
جو برہا کا دُکھ

موسیقی اور مذہب

موسیقی نام ہے ساز و سرود کا۔ ہندی میں اس کو سنگیت کہتے ہیں۔ ہندو اس علم کو "نارد ودیا" بھی کہتے آئے ہیں۔ نارد جی کو برہما کا بیٹا کہتے ہیں۔ دیومالا کی رُو سے کہا جاتا ہے۔ کہ اُنہوں نے ہی انسانوں کو علم موسیقی سکھایا ہے ٭

موسیقی کی ایجاد کے بارے میں مختلف روایات ہیں۔ لیکن سبھوں نے دیوتاؤں کو اس کا موجد بتایا ہے۔ یونانیوں نے "زیوس" کی ۹ بیٹیوں کو موسیقی کا موجد ٹھہرایا ہے۔ مصر والوں نے "اسائیرس" "ٹمپین" اور "ہرمز" کو موسیقی کے موجد کہا ہے۔ ہندوؤں کا عقیدہ ہے۔ کہ مہادیو جی نے موسیقی کو ایجاد کیا ہے۔ اور حقیقت تو یہ ہے۔ کہ خوشی اور غمی کو ترنم آواز میں ادا کرنا ایک جبلت ہے۔ جو کسی ایک شخص یا قوم کی ملکیت نہیں ہے۔ بلکہ ہر شخص اور ہر قوم اس میں برابر کی حصہ دار ہے۔ البتہ آواز کو فنی طور پر ادا کرنے کا طریقہ یعنی علم موسیقی سب سے پہلے ہندوستان میں ایجاد ہوا۔ تحقیقات سے ثابت ہے۔ کہ آج سے تین ہزار سال پہلے بھی سائنٹیفک علم موسیقی کا وجود تھا۔ "سام وید" ہزاروں سال قبل کی مقدس کتاب ہے۔ جس کے منتر گائے جاتے ہیں۔ اور اس میں گانے کی مذہبی اہمیت بتائی گئی ہے۔ اسی طرح گندھار وید کو موسیقی کی قدیم اور پہلی کتاب مانا جاتا ہے ٭

موسیقی کی ایجاد کے سلسلہ میں ایک نکتہ یہ بھی واضح ہوتا ہے۔ کہ اس کے موجد دیوی دیوتا ہی تھے۔ اس طرح موسیقی ایک نیک اور مہاتمائی شغل ثابت ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ ہندو مہاتماؤں کی پسندیدہ موسیقی پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ اور خواہش رکھتے ہیں۔ کہ موسیقی کے ذریعہ "پرماتما" کے پیارے بنیں۔ اسی بناء پر وہ کہتے ہیں۔ کہ موسیقی خدا کی قربت حاصل کرنے کا ایک آسان ذریعہ ہے۔ ایک بات اور بھی قابل غور ہے۔ کہ دیوی دیوتا علم موسیقی کے ماہر ہی نہیں تھے۔ بلکہ مختلف راگ اور آلات موسیقی کے موجد بھی تھے چنانچہ ہماری ہندوستانی موسیقی میں جتنے راگ کہے جاتے ہیں۔ وہ تمام اپنی دیوی دیوتاؤں کی ایجاد ہیں۔ جیسے شنکرا بھیروی۔ سری۔ کیدارا۔ مالکونس۔ بھیروں۔ کلیانی اور للت وغیرہ۔ آلات موسیقی میں سرودسی (وینا یا وینا) کے موجد نارد جی ہیں۔ بانسری کے کرشن جی۔ اور طنبورہ کے طنبور ناجی رشی ہیں۔ کہتے ہیں۔ کہ راون بھی علم موسیقی کا بڑا ماہر تھا۔ "راونتا" جو کہ ایک قسم کا باجہ ہے۔ اسی کی ایجاد مانا جاتا ہے۔ ان باتوں سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے۔ کہ دیوی دیوتاؤں کو موسیقی سے کتنا پریم تھا؟ دیوتاؤں اور موسیقی کے اس قریبی تعلق کے بعد ہندو کہہ اُٹھتے ہیں۔ کہ خدا اور موسیقی ایک ہی چیز ہے۔ قدیم رشیوں کا قول ہے۔ کہ خدا کے وجود میں اعتقاد لانے کا بڑا ذریعہ موسیقی ہے۔ غیر اقوام بھی موسیقی کی بیحد عزت کرتی ہیں۔ چنانچہ جرمنی کا ایک مشہور شاعر "کیٹس" تمنا کرتا ہے کہ مرتے وقت مجھے موسیقی سناؤ۔ اس سے بڑھ کر میری کوئی آرزو نہیں ہے ٭ جان مورلے صاف کہتا ہے۔ کہ اس کو خدا سے محبت نہیں۔ جس کو موسیقی سے محبت نہیں ٭ اسلام نے بھی موسیقی کو ناجائز نہیں کہا موسیقی کی حالت کا یہ حال ہے۔ کہ انگریزوں کے سام "حمدیہ" نظمیں۔ ہندوؤں کے بھجن۔ سبھوں

کے سمجھنا۔ اور مسلمانوں کے قصیدہ بردہ میں موسیقی سے کام لیا جاتا ہے۔ خواہ کوئی مذہب ہو۔ اُس میں موسیقی داخل ہے۔ اس لئے کہ پراگندہ خیالی کو دُور کرنے اور انسانوں کو خدا کی طرف مائل کرنے میں موسیقی ہی کو کمال حاصل ہے۔ ہندوؤں کا کوئی مذہبی کام موسیقی سے خالی نہیں ہوتا۔ ہر مندر میں گھنٹے، نقارے اور کرشن کی تصویر میں بانسری۔ سرسوتی دیوی کے ہاتھوں میں بین موسیقی کی زبردست اہمیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے۔ کہ شادی ہو۔ کہ غمی۔ رزم ہو کہ بزم۔ موسیقی کا وجود ضروری خیال کیا گیا ہے۔ بالکل اُسی طرح جس طرح خدا کا تصوّر اور یاد ضروری ہے۔ خواہ رنج ہو۔ کہ راحت ❋

بعض لوگ موسیقی سے اِس خیال سے نفرت کرتے ہیں۔ کہ وُہ بُرائی کی طرف مائل کرتی ہے۔ حالانکہ حقیقت کچھ اور ہی ہے۔ واقعہ یہ ہے۔ کہ اگر ہر نیک اور مُفید چیز یا فن کو غلط اور بُرے طریقے پر استعمال کیا جائے تو ضرور اُس کے محاسن ضائع ہو کر بُرائی پیدا ہو جائیگی۔ مثلاً آگ کی افادیت سے کسی کو انکار نہیں۔ لیکن اگر اِس کا غلط استعمال کیا جاوے۔ اور دہکتی آگ میں کُودا جائے۔ تو ظاہر ہے۔ کہ آگ کُودنے والے کو جلا دیگی حالانکہ یہ وُہی آگ ہے۔ جس کے بغیر انسانی زندگی ناممکن ہے۔ اِسی طرح فن سپہ گری ایک اہم اور مُفید فن ہے جس کے سہارے قومیں امن و امان سے رہتی ہیں۔ لیکن اگر اِس فن کو غلط طور سے استعمال کرکے.... ذاتی خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ بنایا جائے۔ تو قومیں مُصیبت۔ تباہی اور موت کے چنگل سے کسی طرح محفوظ نہیں ہو سکتیں ❋ اِن مثالوں سے مقصود یہ ہے۔ کہ فی الواقع موسیقی نہایت اہم اور مُفید فن ہے۔ بشرطیکہ اِس فن کا درُست اور مُناسب استعمال ہو ❋

دُوسرے فنوں کی مانند اِس میں بھی افادیت ہے۔ اور جس کا مقصد یہ ہے۔ کہ کمزور دلوں میں توانائی اور نیکی پیدا کرے۔ اور انسان کو خدا کے قریب کر دے۔ اب اگر کوئی شخص اُس کو خدا سے دُور کرنے والے کاموں میں استعمال کرے۔ شراب اور تمباکو کی محفلوں میں گندے اشعار کو غیر فنی طریقہ پر گا کر نفسانی خواہشات کی تفریح اور آسودگی کا ذریعہ بنائے۔ اور اِس شغل میں اپنا وقت ضائع کرے۔ تو ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ اِس کی تباہی اور بربادی کے سوائے اور کیا ہو سکتا ہے؟ یہ ایک حقیقت ہے۔ قوموں کی تباہی اور بے راہ روی موسیقی سے نہیں۔ بلکہ اِس کے غلط استعمال سے واقع ہوتی ہے۔ لوگوں کا یہ خیال کہ موسیقی آدمی کو بُرائی کی طرف مائل کرتی ہے۔ محض اِس لئے ہے۔ کہ اِس کا استعمال غلط کیا جاتا رہا۔ ایسے اشخاص جو موسیقی کا صحیح استعمال نہیں جانتے۔ وُہ اگر اِس کا استعمال نہ بھی کریں۔ تو بھی بُرائی کی طرف ہی مائل رہیں گے۔ ورنہ جس طرح آگ کے صحیح استعمال سے انسان کی بقا ممکن ہے۔ اِسی طرح موسیقی کے صحیح اور درُست استعمال سے پرہیزگاری۔ بلند کرداری پیدا ہوتی ہے۔ اور اِس عمل کے شائق دیوتاؤں کی مانند خدا سے قربت اور نیکی حاصل کرتے ہیں۔ موسیقی صرف فن ہی نہیں۔ بلکہ فنِ عالیہ ہے۔ اور اِس لحاظ سے اِس کا مقصد دُوسرے فنوں سے اعلیٰ ہے۔ یعنی اِس کا مقصد خدا اور بندے میں لگاؤ پیدا کرنا ہے۔ مختصر یہ کہ خدا اور موسیقی میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جسکی بناء پر اِس کو ہر مذہب میں ممتاز مقام حاصل ہے۔ خدا اور موسیقی ایک ہی ہستی کے دو مختلف نام ہیں۔ اور موسیقی کے بغیر مذہب کا تصوّر ممکن نہیں ہے ❋

ناچ

یہ تیرا حسین ناچ ہے یا شام کی مُرلی ۔ جو ارض و سما کون و مکاں ناچ رہے ہیں
سیماب کی مانند، ترے رقص کی ہلچل ۔ ہاں تیری طرح سارے جہاں ناچ رہے ہیں

عالم ہمہ بدمست ہے، بیخود ہیں فضائیں ۔ کھویا ہوا احساس ہے ڈوبے ہوئے جذبے!
میں اور ترے صاعقہ انداز اشارے ۔ بس تھم کہ گلے ملنے کو ہیں سانجھ سویرے

اک گردش ہنگام ہے دیوی مرا گلشن ۔ بھونرے ہیں کہ منڈلاتے ہیں چمن کی کلی پہ
روتا ہوں تو ہنستے ہیں مرے باغ کے مالی ۔ کہتے ہیں سدا ناچ رہے جگ کا پس منظر!

لیکن تجھے کیا ناچ اسی انداز سے پیہم
ٹھوکر سے تری لرزہ بر اندام ہو عالم!

تلاش لاحاصل

میں بھاگا جا رہا ہوں۔ اس آہوئے رمیدہ کی طرح جو اپنے ہی نافے کی خوشبو سے پاگل ہو کر جنگل کے تاریک سایوں میں بھاگ رہا ہو ✤

مئی کے مہینہ کی رات ہے۔ اور جنوب کی طرف سے قدرے خنک ہوا چل رہی ہے۔ میں راستہ بھول کر آوارہ پھر رہا ہوں ✤

مجھے اُس چیز کی تلاش ہے۔ جسے میں حاصل نہیں کر سکتا۔ اور میں اُس چیز کو پاتا ہوں۔ جس کی میں تلاش نہیں کرتا ✤

میری اپنی خواہشات کا عکس میرے منہ سے باہر نکل کر رقص کرتا ہے ✤

میں اُس عکس کو مضبوطی سے پکڑنے کی کوشش کرتا ہوں۔ لیکن وہ مجھے دھوکا دیتا ہے۔ اور صحیح راستہ سے دور ہٹا دیتا ہے ✤ مجھے اُس چیز کی خواہش ہے۔ جسے میں حاصل نہیں کر سکتا۔ اور میں اُس چیز کو پاتا ہوں۔ جس کی مجھے تلاش نہیں ✤

زندگی

اُفقِ مشرق سے اُبھرا ہوا سورج انتہائی سُرعت سے بلندی کی طرف جا رہا تھا۔ وہ پکارا۔ "زندگی بلندی کا پہلا نام ہے"۔ دوپہر ڈھل گئی۔ سورج کا چہرہ زوال کے خوف سے زرد ہو گیا۔ اب وہ پستی کی عمیق ترین وادی میں ڈوب گیا۔ رات نے کروٹ لیتے ہوئے کہا۔ بلندی اور پستی کی کشمکش کو کیا کہئے خیمہ میں جوان بخت و جوانِ سال لہریں اُمنگوں بھرے دل سے پیدا ہوئیں۔ پھر ٹکرائیں پھر معدوم ہو گئیں۔ معلوم ہو گیا۔ "زندگی نام ہے موت و حیات کی باہمی کش مکش کا"۔ بگولے کی زد میں آیا ہوا کاغذ آسمان کی طرف جا رہا تھا۔ معلوم ہوا۔ کہ "نیرنگیٔ عالم کا دوسرا نام زندگی ہے"۔ بھنورے نے اپنے ہونٹ گلاب سے پیوست کر دیئے۔ اور بھنبھنایا۔ "زندگی نام ہے ابدی تشنگی کا"۔ بلبل نے نالۂ فریاد کے افسانے سناتے ہوئے کہا۔ "زندگی ایک مسلسل دکھ اور کرب کا نام ہے"۔ نسیم سحری اٹکھیلیاں کرتی ہوئی آئی۔ اور اس نے کلیوں کو گدگدا کر شگفتہ کر دیا۔ نوشگفتہ کلیوں میں آواز آئی۔ "زندگی ایک عارضی مدہوشی ہے"۔ شبنم پھولوں کے منہ دھونے آئی۔ غنچے پھول ہونے کی خوشی میں قہقہہ زن ہوئے۔ "زندگی ایک قہقہہ ہے۔" لیکن مستعار۔ سبزہ گھاس کی آغوش میں بہتی ہوئی ندی بولی:۔ "زندگی پیہم سفر ہے"۔ پروانہ نے اپنا سر شوریدہ شمع سے ٹکراتے ہوئے کہا۔ "زندگی اپنی مطلب براری کے لئے مسلسل کد و کاوش کے بعد سوختہ ہو جانے کا نام ہے"۔ اونگھتے ہوئے ستاروں کی محفل سے آواز آئی۔ "زندگی ایک وقتی ترنم ہے"۔ خوش گلو مطرب نے ساز کی غیر آہنگ تانوں کو ہم آہنگ کرتے ہوئے راگ چھیڑ دیا۔ "زندگی نام ہے مر مر کے جیئے جانے کا"۔ یتیم کے قلب و جگر سے نکلی ہوئی آہ عرش بریں سے ٹکرائی۔ اور اس نے باچشم نم تھرتھراتے ہوئے ہونٹوں سے کہا۔ "زندگی آنسوؤں کی نہ تھمنے والی جھڑی کا نام ہے"۔ لالہ نے سینہ چیر کر داغہائے دل دکھائے۔ سوسن بزبانِ حال رُوداد غم بتا چلی۔ نرگس محوِ نظارہ بنی۔ قمری نے حدیث سوز و گداز چھیڑی۔ معلوم ہوا۔ کہ "زندگی اندوہ و الم کی تصویر ہے"۔ اور سڑک پر کوئی گاتا ہوا جا رہا تھا ؎

کوئی نغمہ ہے نہ کوئی ساز ہے　　زندگی آواز ہی آواز ہے

دل نے کہا۔ "چند دھڑکنوں کا نام زندگی ہے۔ اور میری آخری دھڑکن کا نام ہے موت"۔

"کیا تجھے معلوم ہے۔ کہ آسمان کہاں ہے؟ اس کی کوئی حدود نہیں۔ نہ اس کی کوئی ابتدا ہے۔ نہ انتہا۔ نہ اس کی صبح ہے اور نہ شام۔ میں آج آسمان کی فضا میں ایک غریب یاتری کی طرح پھرتا رہا۔ صدیوں بعد میں خاکی جسم لیکر اور اس دنیا کا بیٹا بن کر پیدا ہوا۔ آج میرے جسم، میری محبت۔ میرے دل کے اضطراب۔ میرے ذوق، میری سعی و کوشش اور میرے عیش و غم میں آسمان موجود ہے۔ آسمان میری زندگی اور موت کی لہروں پر ہر لحظہ بدلتے ہوئے رنگوں کی صورت میں چمک رہا ہے۔ آج وہ میرے غموں کا مظہر ہے اور میری زندگی میں تکمیل پذیر ہو رہا ہے"۔

تین سو سال پہلے کا ہندوستان

تختِ طاؤس

سلاطین عالم رعایا پر اپنا رُعب قائم کرنے کیلئے ہمیشہ سے مُختلف طریقے کام میں لاتے رہے ہیں۔ وقتاً فوقتاً فوجوں کے مُتحرک ہونے، عجیب و غریب عمارتوں کے قیام اور دربار کے مُختلف طریقوں سے آراستگی و پیراستگی وغیرہ وغیرہ کا مقصد سطوتِ سُلطانی کے ساتھ جبروت پیدا کرنے کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ اس لئے کسی بادشاہ وقت کو یہ خیال پیدا ہونا کہ خزانہ شاہی میں بیش بہا بیکار پڑے ہوئے جواہرات کو ایک تخت کی شکل میں مُنتقل کیا جائے۔ کوئی امر عجیب نہیں +

"تختِ طاؤس" اسی خیال کی جیتی جاگتی تصویر کہا جا سکتا ہے۔ جبوقت شاہجہان نے عنان حکومت ہاتھ میں لی۔ دولت مُغلیہ کا سُورج عین عروج پر تھا۔ بیشمار دولت اور لاانتہا جواہرات جو خزانوں اور جواہر خانوں میں شاہانِ ممالک خارجہ کے تحفہ جات، اُمراؤ شہزادگان کے نذرانوں، اور مفتوح حُکمرانوں کے مالِ غنیمت کے سلسلے میں جمع ہو گئے تھے۔ بیکار پڑے تھے۔ اس نفاست پسند بادشاہ کی طبیعت سب سے پہلے "تختِ طاؤس" بنانے پر آمادہ ہوئی۔ تاکہ وُہ خزانہ بے بہا ایسی شکل میں مُنتقل ہو جائے۔ کہ خاص و عام کو اسے دیکھنے کا موقعہ مل جائے۔ حُکم ہُوا کہ وُہ سب جواہرات جو مُغل مُعلیٰ میں محفوظ ہیں پیش کئے جائیں۔ ان میں سے ۸۶ لاکھ روپیہ کے بیش قیمت جواہرات جن کا وزن ۶ من ۲۰ سیر ۶ چھٹانک اور تین تولہ تھا۔ مُنتخب ہوئے۔ اور یہ سب جواہرات ۱/۲ ۳۱ من سونا قیمتی ۱۴ لاکھ روپیہ میں جڑانے کا فرمان صادر ہُوا اور بے بدل خان جہتمم زرگر خانہ شاہی اس تخت کے بنوانے پر مامُور ہوئے +

"تختِ طاؤس" پانچ لاکھ کاریگروں کے زیر انتظام و صنعت سات سال کی مدت میں ۱۶۳۴ء میں بنکر تمام ہُوا۔ یہ تخت ۱/۴ ۳ گز طویل ۱/۲ ۲ گز عریض۔ ۵ گز بلند اور نشمن تھا۔ جس میں ایک سو آٹھ لال رسو اسو رتی سے ڈھائی سو رتی تک کے وزنی) اور ۱۶۰ زمرد ۳۶ سے ۷۲ رتی کے وزنی) جڑے ہوئے تھے اور دو دو فٹ اُونچے ۸ طلائی مُرصع پاؤں پر قائم تھا۔ تخت کے گرداگرد گیارہ تختے مُرصع و مغرق بہ جواہر ٹیکنے کے لئے بطور حاشیے کے لگے ہوئے تھے۔ اور صرف بیچ کا تختہ جو صدر میں بادشاہ کے تکیہ لگانے کے لئے بنایا گیا تھا۔ دس لاکھ روپے میں تیار ہُوا تھا۔ اس تختہ میں یُوں تو بڑے بڑے بیش قیمت لال جڑے ہوئے تھے۔ لیکن بیش بہا اور تاریخی لال خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ یہ لعل شاہ عباس صفوی اوّل بادشاہ ایران نے جہانگیر کو تحفتہً بھیجا تھا۔ اور اسکی قیمت ایک لاکھ روپیہ تھی +

تکیہ گاہ کے درمیانی اُبھرے ہوئے حصّے کے عین وسط میں ایک ہیرے کا ستارہ لگا ہُوا تھا۔ جس کی شعائیں چاروں طرف پھیل کر عالم برق پیدا کرتی اور تماشائی کی آنکھوں کو خیرہ کر دیتی تھیں۔ یہ ستارہ ایسی ترکیب سے بنایا گیا تھا۔ کہ گھمایا بھی جا سکتا تھا + تخت کی چھت گنبد نما خالص کُندن کی اندر سے بیشتر مینا کار اور کہیں کہیں مُروبیت کے ساتھ مُرصع۔ خصُوصاً باہر کی طرف لعل، یاقوت، الماس سے مزین توقع بہ موقع موتیوں کی لڑیوں سے جھلے بنے ہوئے جس میں اسلحہ سُلطانی آویزاں رہتے تھے۔

درمیان میں ایک بڑا صاف شفاف بیش قیمت پتھر جس سے نظر آر پار ہو سکے۔ ۲۶۰ گرین وزن کا لعل و نیلم سے گھرا ہوا اِس طرح آویزاں تھا۔ کہ تخت پر جلوس کرنے والے کی نظر سامنے رہے۔ بارہ زمردیں ستونوں اور جڑاؤ محرابوں پر قائم تھی۔ درمیانی محراب پر ایک طلائی درخت آویزاں تھا جس میں لعل، یاقوت اور زمرد وغیرہ کے پھل پھول اور پتے لگے ہوئے تھے۔ اس درخت کے اردگرد دو نظیری مرصع طاؤس دُم پھیلائے کھڑے تھے۔ تخت پر چڑھنے کے لئے تین طلائی مرصع و مفرق جواہر سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں ÷

"تخت طاؤس" کے مصارف کے متعلق مؤرخین میں بہت کچھ اختلاف ہے۔ مشہور فرانسیسی سیاح جوہری ٹیورنیئر جس نے اس تخت کو بچشم خود دیکھا تھا۔ اس تخت کی قیمت کا اندازہ ۶۰ لاکھ پونڈ ۹ کروڑ (۹۰۰۰۰۰۰۰) روپیہ کیا تھا ÷

وہ ایسا عجیب و غریب تخت تھا۔ جس کی نظیر آج تک دنیا کو نہ ملی۔ ۱۷۳۹ء میں دہلی کی لوٹ کے وقت اور شاہی مال و متاع کے ساتھ یہ تخت بھی نادر شاہ کے ہاتھ پڑا۔ اور وہ اُس کو اپنے ساتھ ایران کو لے گیا وہاں یہ عدیم المثال تحفہ زمانہ کے ہاتھوں محفوظ نہ رہ سکا۔ اور نادر شاہ کے مرنے کے بعد آپس کی خانہ جنگی میں یہ دُنیا کو متحیر کر دینے والا تخت طاؤس بھی پارہ پارہ ہو گیا ÷

مآلِ کار

(۱)

مآلِ کار تھک کر بہتے بہتے کنارِ آب ٹھہرا ہے سفینہ
اُمیدیں یوں روانہ ہو رہی ہیں بطیں سوئی ہوئی آبِ رواں میں
بہی جاتی ہیں جیسے چُپکے چُپکے

(۲)

مَیں اِک خوابِ گراں کے سائے میں ہوں مجھے آغوشِ عکسِ سُرمگیں میں
ہوائے شام لوری دے رہی ہے سکوتِ یاس مجھ پر چھا گیا ہے
کچھ ایسے جسطرح دھیمی سی ضو میں تھکی آنکھوں پہ گر جاتی ہیں پلکیں

(۳)

بطیں سوئی ہوئی آبِ رواں میں ہوئی جاتی ہیں اب آنکھوں سے اوجھل
کہ آخر کار تھک کر بہتے بہتے
کنارِ آب ٹھہرا ہے سفینہ

کورکشیتر

یہ اعزاز "کورکشیتر" کے مقام کو ہی حاصل تھا۔ کہ یہاں پر زمانۂ شجاعت کی مشہور جنگ مہابھارت کوروں اور پانڈوں کے درمیان ہوئی تھی۔ جس میں شری کرشن مہاراج نے خود حصہ لیا تھا۔ کورکشیتر کی سرزمین کے ساتھ اس جنگ کے بہت سے واقعات منسوب ہیں۔ جو ہندوں کو اس مقدس مقام پر بلانے کے لئے باعث کشش ہیں ؞

"کوروکشیتر" کا میدان دہلی کے شمال میں تقریباً سو میل کے فاصلہ پر ہے۔ اور اس میدان میں انبالہ سے ۲۵ میل کے فاصلہ پر تھانیسر کے قصبہ کے جنوب میں ایک بڑی جھیل ہے۔ جسے "تیرتھ کوروکشیتر" کہا جاتا ہے۔ "شری کرو" مہابھارت کی جنگ کے بہادروں کے بزرگوں میں سے تھے۔ یہ کہا جاتا ہے۔ کہ انہوں نے اس مقدس تیرتھ کے کنارے تپسیا کی تھی۔ اس سے تقریباً سو گز کے فاصلہ پر ایک چھوٹی جھیل ہے۔ جسے "سایں ہیتا" کہتے ہیں۔ ان جھیلوں کے گرد و نواح میں یاترا کی تقریباً ۳۶۰ جگہیں ہیں۔ ایک چھوٹے سے علاقہ میں اتنی زیادہ جگہوں پر پوتر پانی کے پائے جانے کا سبب زمین دوز دریا سرستی (سنسکرت میں اسے سرسوتی کہا جاتا ہے) کا ہونا ہے۔ جس کی سطح پر بہت سے جوہڑ، تالاب اور جھیلیں ہیں۔ ہر ایک کے ساتھ مندر بنا ہوا ہے۔ اور کوئی نہ کوئی روایت وابستہ ہے۔ اسطرح دریا کے کنارے کے ساتھ ساتھ پانچ میل کے فاصلہ میں چونتیس ۳۴ مندروں سے کم نہیں ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور "کولا چراچن" یا "گنگا تیرتھ" ہے ؞

سورج گرہن کے موقعہ پر تقریباً پانچ لاکھ ہندو "کورکشیتر" کی جھیلوں میں اشنان کرنے کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ اس پوتر پانی میں نہانے سے ایک ہندو کو مکتی ملتی ہے۔ بعض اوقات اسے اگلی دنیا میں انسان سے زیادہ اونچا درجہ ملتا ہے ؞

ہندوؤں کی مقدس کتابوں میں درج ہے۔ کہ "کوروکشیتر" کے پاک تیرتھوں میں سے کسی میں کسی وقت بھی نہانے سے بہت سے فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ سورج گرہن کے دوران میں تمام چھوٹے پانی کے ذخیرے ایک عقیدے کے بموجب دو بڑے تالابوں میں اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ اس لئے سورج گرہن کے وقت نہانے سے باقی اوقات کی بنسبت زیادہ فائدہ ہوتا ہے۔ ہر ایک ہندو کا یہ مقصد ہوتا ہے۔ کہ وہ سورج گرہن کے تھوڑے سے عرصہ میں ان دونوں تالابوں میں اشنان کر لے۔ اور اگر وہ ایسا کر لیتا ہے۔ تو اس کا برھما دیوتا کی لافانی دنیا میں پہنچنا یقینی امر ہو جاتا ہے ؞

علاوہ ازیں یہ عام خیال ہے۔ کہ گرہن کے موقعہ پر دھرتی ماتا گرہن سے پیدا ہونیوالی دوسری خرابیوں کے باعث بری حالت میں پھنسی ہوتی ہے۔ اس لئے پوتر پانی میں اشنان کرنا لازمی ہوتا ہے۔ اور اشنان کرنے کے لئے سب سے زیادہ مقدس جگہیں تھانیسر اور سنہیتسا کے تالاب ہیں۔ ہزاروں سال سے ہر ایک سورج گرہن کے موقع پر کورکشیتر کے میدان میں تھانیسر کے مقام پر ایک بڑا مذہبی میلہ لگتا ہے ؞ اشنان کرتے وقت لوگوں کا مذہبی جوش نہایت شدید ہوتا ہے۔ اس وقت یاتریوں کا بڑا ہجوم ایک تالاب سے دوسرے کی جانب نہایت سرعت سے بڑھتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ سینکڑوں گھاٹوں پر بیشمار آدمی اشنان کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ہزاروں

یاتری جب یکایک پوتّر پانی تک جانے والی سیڑھیوں کے نزدیک پہونچتے ہیں۔ اُن میں جوش و خروش پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ تمام مناظر یاتریوں کی دِھیمی دِھیمی پرارتھنائیں بھجنوں اَور سُریلے گیتوں کی صداؤں کی گونجیں گھنٹیوں کے بجنے کی آوازیں دِل پر ایک دیرپا خیالِ نقش پیدا کر دیتی ہیں ✤

عام مُقدّس جگہوں کی طرح یہاں پر بھی براہمنوں کے پاس بھاری بھاری رجسٹر ہوتے ہیں جِنمیں وہ یاتریوں کے نام اَور دیگر تفصیلات درج کر لیتے ہیں۔ یہ لوگ یاتریوں کے لیئے جگہ وغیرہ کا اِنتظام کرتے ہیں۔ اُن کے لیئے ضروری رسُوم کی اَدائیگی کرتے ہیں۔ اَور اُن کے اَشنان کرتے وَقت منتر وغیرہ دوہرانے کی غرض سے گھاٹ پر موجُود رہتے ہیں۔ اَور ہر ایک سے دان لیتے ہیں۔ یہ بات نہایت اہم سمجھی جاتی ہے۔ کہ ہر یاتری کے لیئے وُہی برہمن یا اُس کا ہی کوئی جانشین ہو۔ جو کہ یاتری کے آباؤ اجداد کا برہمن تھا۔ رجسٹروں کے ساتھ فہرستیں لگی ہوتی ہیں۔ جِس سے نام وغیرہ ڈھونڈنے کا کام آسان ہو جاتا ہے ✤

عام یاتریوں کے عِلاوہ بہت سے لوگ مُقدّس جگہوں کو دیکھنے کے لیئے میلے میں آتے ہیں۔ ہزاروں کی تعداد میں راکھ ملے ہُوئے تپسّوی سادھو وغیرہ مَوجُود ہوتے ہیں۔ یہ لوگ عام طَور پر یا تو ہجُوم میں دیکھے جاتے ہیں۔ یا ...اؤں اَور چبُوتروں پر چھتریوں یا جھاڑیوں اَور دَرختوں کے سایہ میں آلتی پالتی لگائے بیٹھے نظر آتے ہیں ... سادھو مُقدّس کِتابیں پڑھ رہے ہوتے ہیں۔ کچھ خیالات میں مگن ہوتے ہیں۔ کچھ ہیبت ناک سختیاں ...بل رہے ہوتے ہیں ✤

ہندوستان کے

اُردُو اخبارات کی اِبتدا

یہ زمانہ پنجاب میں غدر ۱۸۵۷ء سے بھی سات آٹھ سال پہلے شروع ہوتا ہے۔ جب انگریزوں نے ۱۸۴۹ء کے مُطابق ؟ اِس کا نیا نیا الحاق کیا تھا۔ اُن اَیّام میں سارے ہندوستان میں اخبارات کی تعداد ...س سے زیادہ نہ تھی۔ اُن میں دہلی کا "سراج الاخبار" جو ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ کے نام سے نکلتا ...اور مولانا آزاد مرحوم مُصنّف آبِ حیات کے والد کا اُردُو اخبار بھی شامِل تھے۔ اُس زمانہ کے اخبارات ...دارو مدار صرف خبروں کی اَشاعت پر تھا۔ کسی سرکاری یا غیر سرکاری واقعہ پر تبصرہ بہت کم ہوتا تھا۔ ...کہنا چاہیئے۔ کہ نہیں ہوتا تھا ✤

جس طرح آج سے قریباً ساٹھ سال قبل "پیسہ اخبار" کے اَجراء نے اُردُو اخبارات کی کایا پلٹ دی تھی۔ اسی ...نا جب ۱۸۵۰ء میں منشی ہرسُکھ رائے کائستھ نے جو مضافات سکندرہ نزد آگرہ کے رہنے والے تھے لاہور میں مقیم تھے "کوہ نُور" کے نام سے لاہور سے اخبار جاری کیا۔ تو اُس نے واقعات و حالات پر رائے ...شروع کر کے اُردُو صحافت کی ترقی کی راہ میں ایک قدم اَور آگے بڑھایا۔ اَور واقعات پر کسی قدر ...ن کے ساتھ رائے زنی کرنا اس زمانہ میں چُونکہ نئی بات تھی۔ اِس لیئے اُس اخبار کو نہ صِرف پنجاب بلکہ ...دوستان میں اپنی طرز کا پہلا اخبار کہتے تھے ✤ اِس اخبار کے خریدار ہندُو مسُلمان اَور سِکھ ہی نہ تھے۔ بلکہ ...بھی تھے۔

مسٹر سلیمن اور مسٹر میگریگر (لاہور کے پہلے ڈپٹی کمشنر) اور بعض دوسرے انگریزوں کے نام بھی ”اخبار کوہ نور“ کے پرانے رجسٹروں میں دیکھے ہیں۔ بلکہ چند ایک انگریز اس اخبار کے نامہ نگار بھی تھے۔ اور یہ سب اردو پڑھ سکتے اور اردو لکھ سکتے تھے۔ منشی نولکشور ۔۔۔۔۔۔ جو لکھنؤ کے مطبع اودھ اخبار اور اودھ اخبار روزانہ کے مالک تھے۔ ابھی اخبار کے عملہ میں جو ۱۸۸۳ء میں روزانہ ہوگیا تھا۔ کام کرتے تھے +

آہ! وہ کیا زمانہ تھا۔ اخبار کے خریداروں میں ہندوستانیوں کے علاوہ انگریز بھی تھے۔ اور بعض صرف خریدار ہی نہ تھے۔ بلکہ قلمے درمے سرپرستی کرتے تھے۔ پھر اس سے زیادہ یہ عجیب بات تھی۔ کہ اخبار کے ایڈیٹروں میں ہندو مسلمان کی تمیز نہ تھی۔ مالک اخبار منشی ہرسکھ رائے ہندو تھے۔ لیکن اس دور میں منشی اور پنڈت گوپی ناتھ کے علاوہ سب مسلمان ادیب اور اہل قلم ہی ”کوہ نور“ کے دامن سے وابستہ رہے۔ ان میں منشی ہادی علی (بعد میں مالک سیف الاخبار) تاج الدین۔ منشی نولکشور (بعد میں سی آئی۔ای) میرزا وحدر (مالک مطبع صدر) منشی نثار علی شہرت (مالک نصرت الاخبار) مولوی سیف الحق ادیب۔ مولوی محرم علی حسینی (بعد میں مالک رفیق ہند۔ خان بہادر وکیل) ۱۸۹۸ء سے قبل قابل ذکر ہیں۔ ۱۸۹۸ء کے بعد جبکہ منشی ہرسکھ رائے اور اُن کے ورثاء انتقال کرچکے تھے۔ اُن کی ایک رشتہ دار اردو لکھی پڑھی عورت پاربتی نام جو شاید اُنکی بہو تھی۔ اُس اخبار کی مالک تھی۔ اُس کی ملکیت میں یہ اخبار وسط ۱۹۰۴ء تک جاری رہا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے علاوہ بعض عیسائی بھی اُس کے ایڈیٹر رہے ہیں +

۱۸۶۶ء کے کچھ عرصہ کے بعد لاہور کی انجمن پنجاب نے جس کے صدر سر لیپل گریفن مصنف پنجاب چیفس وسیکرٹری گورنمنٹ پنجاب (بعد میں ایجنٹ گورنر جنرل) جو اردو زبان بہت اچھی طرح بولتے اور لکھتے تھے۔ انجمن پنجاب کے نام سے ایک ماہوار رسالہ جاری کیا۔ ان کی اور بابو روبن چندر رائے (بنگالی اردو دان) کی زیر ادارت ونگرانی یہ رسالہ شائع ہوتا تھا۔ چونکہ سیکرٹری گورنمنٹ پنجاب اس کے نگران کار اور ایڈیٹر تھے۔ اس لئے گورنمنٹ بھی اس کی دوسو کاپیاں خریدا کرتی تھی۔ اس رسالہ میں تصویریں بھی ہوتی تھیں۔ تاریخی اشخاص اور تاریخی مقامات کی تصویریں بھی چھپا کرتی تھیں۔ جن کی وجہ سے اس کی قدر وقیمت بہت بڑھ گئی تھی۔ راقم الحروف نے اس کے دو سال کے فائل دیکھے تھے۔ جن میں منشی امیچند دہلوی۔ پروفیسر آزاد دہلوی اور مولانا الطاف حسین حالی کے نظم ونثر مضامین بھی تھے +

۱۸۷۷ء کے قریب لاہور سے ایک اور اخبار ”اتالیق“ کے نام سے جاری ہوا جس کے سرپرست اور بانی مسٹر ہالرائیڈ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم تھے۔ اُن کی زیر ہدایت ونگرانی منشی پیارے لال دہلوی اُس کے ایڈیٹر تھے۔ اس میں جغرافیہ اور سائنس پر نہایت مفید مضامین شائع ہوا کرتے تھے +

۱۸۶۸ء میں صوبہ بہار کے مقام مظفر پور سے ایک اخبار اخبار الاخبار کے نام سے سائنٹفک سوسائٹی بہار کے اہتمام سے جاری ہوا۔ اس سوسائٹی کے ۳۱۸ ممبروں میں ۱۲۸ مسلمان ۱۶۲ ہندو اور ۲۸ یورپین تھے۔ اور وہ سب اس کے خریدار تھے۔ ”مسٹر فٹز ایڈورڈ (FITIZ EDWARD) جید عالم تھے۔ اور اردو زبان کے ماہر۔ اس کے قلمی معاونوں میں تھے + ”وکٹوریہ گزٹ“ کے نام ایک انگریز نے ان ہی ایام میں سہارنپور سے ایک اردو اخبار جاری کیا۔ جس کی زبان نہایت

"کوہ نور" (سنہ ۱۸۵۰ء) سے دو چار سال کے بعد گوجرانوالہ سے "چشمۂ فیض" کے نام سے ایک اخبار لالہ دیوان چند پوری نے جاری کیا۔ جو انگریزوں کے علاوہ ابوظفر بہادر شاہ بادشاہ دہلی کے نام بھی جاتا تھا۔ بھی اخبار غدر کے بعد سیالکوٹ سے "وکٹوریہ پے پر" کے نام سے جاری ہوا۔ جو آج سے چند سال قبل جاری تھا۔ ریاست جموں و کشمیر میں جب ریذیڈنسی کا اقتدار بڑے زور پر تھا۔ تو آنریبل ریذیڈنٹ کے علاوہ اُن کی تحریک سے ریاست کے مدارس میں بھی یہ اخبار خریدا جاتا تھا ✤

چیفس کالج اجمیر کے ابتدائی ایام میں "ایس۔ ڈبلیو فیلن" نام ایک انگریز اس مدرسہ کے نگران بھی تھے اور ضلع کے انسپکٹر مدارس بھی۔ اُنہوں نے لیتھو کا ایک مطبع قائم کر کے "خیر خواہ خلق" کے نام سے اُردو کا ایک ہفتہ وار اخبار جاری کیا۔ راجپوتانہ کے علاقہ میں اُردو کا یہ پہلا اخبار تھا۔ سوہن لال اور اجودھیا پرشاد اس کے ایڈیٹر تھے۔ دونوں ایڈیٹروں کو اُردو زبان پر کامل عبور تھا۔ اس اخبار کے اجراء کا زمانہ غدر سنہ ۱۸۵۷ء سے دو سال بعد (سنہ ۱۸۵۹ء) بتایا جاتا ہے ✤

منشی نولکشور لکھنوی نے جو لاہور کے "کوہ نور" سے ایڈیٹری سیکھ گئے تھے۔ سنہ ۱۸۵۸ء میں "اودھ اخبار" کے نام سے لکھنؤ سے ایک اخبار جاری کیا۔ اس اخبار نے مصائب غدر کے بعد دُنیائے صحافت کو ایک نئی زندگی بخشی۔ سنہ ۱۸۷۴ء میں یہ اخبار روزانہ ہوگیا۔ اور ہندوستان کا یہ پہلا اخبار ہے۔ جو سنہ ۱۸۵۸ء سے آج تک زندہ چلا آتا ہے۔ اس کے مشہور ادبی و سیاسی معاونوں میں پنڈت رتن ناتھ سرشار۔ مولوی عبدالحلیم شرر۔ لسان العصر اکبر الہ آبادی کے علاوہ ایک انگریز مسٹر پامر بھی تھے۔ جن کو اُردو میں بہت اچھی صلاحیت تھی ✤

ممکن ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی چند اخبارات ہوں۔ جن کے بانیوں اور قلمی و مالی معاونوں میں انگریزوں کا نام لیا جاتا ہو۔ البتہ "پیام عاشق" ایک ماہوار رسالہ میں جو سنہ ۱۸۹۸ء میں قنوج سے شائع ہوتا تھا۔ چند ایک اینگلو انڈین اصحاب کی اُردو غزلیں دیکھی گئی ہیں ✤

گذرے دنوں کی یاد

رات کے پُرکیف سکوت میں جبکہ نیند کی آہنی زنجیریں مجھ پر مسلط نہیں ہوتیں۔ ایام گذشتہ کی یاد مجھے جذب کر لیتی ہے ✤

۱۔ عہد بچپن کی مسرتیں اور غم پیار کی باتیں اور اُن صورتوں کو جو کبھی فرطِ مسرت سے چمکا کرتی تھیں اور اب پژمردہ پھولوں کی مانند مرجھا گئی ہیں۔ میری آنکھوں کے سامنے آتی ہیں ✤ اسی طرح رات کے پُرکیف سکوت میں جبکہ نیند کی آہنی زنجیریں مجھ پر مسلط نہیں ہوتیں۔ ایام گذشتہ کی تلخ یاد مجھے جذب کر لیتی ہے ✤

۲۔ جب میں اپنی آنکھوں کے سامنے اُن دوستوں کی تصویریں پاتا ہوں۔ جو موسم خزاں کے افتادہ اوراق کی طرح تہ خاک دب چکے ہیں۔ تو اپنے آپ کو بحر یاس میں ڈوبا ہوا پاتا ہوں ✤

اسی طرح رات کے پُرکیف سکوت میں جبکہ نیند کی آہنی زنجیریں مجھ پر مسلط نہیں ہوتیں۔ ایام گذشتہ کی تلخ یاد مجھے جذب کر لیتی ہے ✤

اشوک اعظم

آسمان کی تاروں بھری نیلگوں سطح پر چاند اپنی پوری تجلیوں کے ساتھ اِس طرح مسکرا رہا تھا جیسے کسی آزادی کی جگہ پر کوئی کافر حسینہ اپنی کنیزوں کے ساتھ دِل بہلا رہی ہو۔ فضا پر سکون مسلط تھا۔ لیکن اشوک اعظم اپنے راج محل کے پائیں باغ میں کسی گہرے فکر میں ڈوبا ہوا تسکین کی تلاش میں بھٹک رہا تھا۔ درباری بھی خاموشی کے ساتھ اسکے نقوشِ قدوم پر گامزن تھے ٭

آخر ایک درباری نے مہرِ سکوت توڑتے ہوئے عرض کی "پریاگ میں بھی مہاراج کے نام کا ایک ستون تیار ہو گیا ہے" ٭

دُوسرا بولا :۔ "تو کیا وُہ ٹیکسلا کے مینار کا مقابلہ کر سکتا ہے" ؟

تیسرے نے کہا :۔ ٹیکسلا کا ستون کیا چیز ہے ؟ وُہ تو اِندر پرستھ میں اپنی شان کا اکیلا ہے۔ پانڈوؤں کی عظمت و اعزاز کا تذکرہ تو صرف مہابھارت تک محدود ہے۔ لیکن اشوک اعظم کا وقار اِتنا بُلند ہے جیسے آنے والی نسلیں بھی دیکھ کر محوِ حیرت رہ جائیں گی ٭

"اشوک اعظم" نے اپنی متجسس نگاہوں کو چاند پر جماتے ہوئے کہا۔ "کیا پتھر پر لکھا ہوا نام حیاتِ ابدی حاصل کر سکتا ہے" ؟ ———— مہاراج کے اِس طنز آفرین سوال نے ہمراہیوں کے لبوں پر مہرِ سکوت لگا دی ٭ جب شہنشاہ اشوک کو کوئی جواب نہیں ملا۔ تو اُس نے خود ہی کہنا شروع کیا "حیاتِ ابدی حاصل کرنے کے لئے پتھروں کی بجائے دلوں پر نام کندہ کرایا جاتا ہے۔ اشوک کے نام سے مینار ضرور تیار ہو گیا۔ لیکن خود اشوک نے ایسا کوئی کام نہیں کیا۔ جسے دُنیا ابد تک دوہراتی رہے" ٭

ہمراہیوں پر سکتہ کی سی کیفیت طاری تھی۔ پھر بھی ایک نوجوان درباری نے جرأت سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "وُہ شہنشاہ جس کا پرچمِ حکمرانی دُور دراز تک کے علاقوں پر لہراتا ہے۔ جس کے نام سے سینکڑوں ریاستیں لرزہ بر اندام ہو جاتی ہیں۔ متعدد حکمران جس کی خاکِ پا کو اکسیر سمجھ کر آنکھوں میں لگاتے ہیں۔ بھلا اِسے دُنیا بھول سکتی ہے" ؟

مگر اشوک اعظم اِس جواب کی پروا کئے بغیر کہتا رہا۔ "اشوک درد و غم کا دُور کرنیوالا۔ دُوسروں کی حکومتیں چھین کر اور اپنی حدود سلطنت کو وسیع بنا کر بھی اشوک ہی کہلا سکتا ہے۔ جو لوگوں کی آزادی چھینے خراج حاصل کرنے کیلئے دُوسروں کو مُبتلائے فکر کر دے۔ کیا وُہ اشوک ہو سکتا ہے ؟ خوشامد کرنے اور باتیں بنانے کے لئے بھی مُنہ چاہیئے" ٭

چاند نے اشوک اعظم کے مُنہ سے نِکلے ہوئے مذکور جملے سُن کر اپنے رُخِ پر نُور کو ابر کے آنچل میں چھپا لیا اور اشوک اعظم آہستہ آہستہ اپنے محل کی طرف چلنے لگا ٭ شہنشاہ راج محل میں چلا گیا۔ اور درباری عشرت محل میں۔ جس میں جگہ بہ جگہ نقرئی و طلائی شمعیں روشن تھیں۔ اور جن کی روشنی سے پُورا ہال بُقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ عُود و عنبر کی لپٹیں دِل و دماغ کو متوالا بنا رہی تھیں حاضرین خوش جمال نازنینوں کے رقص سے محظوظ

ہو رہے تھے۔ اشوک اعظم کی عشرت گاہ تھی۔ جہاں وہ دلبستگی کی غرض سے آیا کرتا تھا۔ لیکن آج وہ اس محل میں آکر لطف اندوز ہونے کی بجائے اپنے کمرے میں اُداس پڑا ہُوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے درباری لباس اُتار کر شب خوابی کے کپڑے پہن لیئے۔ اور کمرۂ خاص کے چراغ گل کر کے خاموشی کے ساتھ باہر نکل گیا +

اشوک اعظم کو اُداس دیکھ کر چاند بھی کسی حجلۂ خاص میں استراحت کرنے چلا گیا تھا۔ ہر طرف اندھیرا چھایا ہُوا تھا۔ اشوک اعظم نے بڑی سڑک کو چھوڑ کر ایک تنگ و تاریک گلی میں چلنا شروع کر دیا +

سنتری نے آواز دی۔ "کون ہے"؟

"اشوک بولا۔" ایک پُر امن شہری" +

سنتری نے کہا۔" کہو اشوک اعظم زندہ باد" +

اشوک اعظم نے جھینپتے ہوئے سنتری کے الفاظ دوہرائے۔ گلی میں معمولی سی روشنی تھی۔ چلتے چلتے وہ ایک شکستہ سے مکان کے سامنے رُکا اور دروازہ کھٹکھٹایا +

آواز آئی۔" آجاؤ۔ دروازہ کھلا ہُوا ہے" +

اشوک اندر چلا گیا۔ ایک ضعیفہ پھٹے پُرانے کپڑوں کے ایک ڈھیر پر بیٹھی ہُوئی تھی۔ وہ اشوک کو دیکھتے ہی گرجی۔" تم چور ہو۔ چوری کرنے آئے ہو" +

شہنشاہ بولا" نہیں۔ بلکہ میں ایک مالدار آدمی ہُوں۔ مُصیبت زدوں کی حاجت روائی کرتا ہُوں" +

ضعیفہ نے آبدیدہ ہو کر کہا۔" میری حاجت روائی کون کر سکتا ہے"؟

شہنشاہ بولا۔" میں۔ اور اگر تمہاری حاجت ایسی ہی بڑی ہوگی۔ تو شہنشاہ سے پُوری کرا دی جائیگی" +

یہ سُن کر ضعیفہ کے پژمردہ اور بے رونق آنکھوں سے آنسوؤں کے دھارے پھُوٹ نکلے۔ اور اُس نے اشوک کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہُوئے پُوچھا۔" تم اشوک کو جانتے ہو"؟

اشوک بولا۔" بہت اچھی طرح" +

ضعیفہ نے چراغ اُٹھا کر اشوک کی صُورت کو قریب سے دیکھتے ہُوئے کہا۔" تو کیا وہ میری حاجت پُوری کر دے گا"؟

اشوک:۔" یقیناً اشوک اپنی بے اندازہ دولت اور طاقت کے ذریعہ سب کچھ کر سکتا ہے" +

ضعیفہ نے پُوچھا:۔" کیا اُسے غریبوں سے ہمدردی ہے"؟

اشوک نے دبی زبان سے کہا۔" سُنا تو ہے" +

بُڑھیا بولی:۔" وہ اشوک ہے۔ اُسے کوئی غم نہیں ہے۔ کیا وہ دوسروں کو غم کے بارے سبک دوش کر سکتا ہے"؟

اشوک کہنے لگا۔" یہ غلط ہے۔ کہ اُسے کوئی غم نہیں ہے۔ اُسکی خلوت افکار کی آغوش ہے۔ پھر بھی وہ دوسروں کے غم دُور کرنے کی کوشش ضرور کرتا ہے" +

بڑھیا طنز کے ساتھ بولی" اُسے اور غم۔ تعجب ہے"؟

اشوک نے کہا۔" ہاں! اُس نے اپنی حکومت کی حدود کو بہت وسیع کر لیا ہے۔ مگر اب وہ یہ سوچتا ہے۔ کہ آخر اتنی بڑی سلطنت سے کیا فائدہ ہے۔ جوں جوں اُس کی سلطنت بڑھتی جاتی ہے۔ اُس کے گرد جمع ہونے والے [illegible] اپنے دل کا درد نہیں کہہ

سکتا۔ کیونکہ وُہ خود ضرورت مند ہیں۔ دردمند نہیں ÷

بُڑھیا نے بغیر کسی استعجاب کے چراغ کو اُس کی جگہ پر رکھ دیا۔ اور آنسو پونچھ ڈالے۔ اُس کی آنکھیں کبوتر کے خون کی طرح سُرخ ہو گئیں۔ وُہ جنونیوں کی طرح بکنے لگی :-

"تم اشوک ہو! اشوک اعظم۔ آدھی رات کو جبکہ ساری دُنیا غفلت کی میٹھی نیند سو رہی ہے تم اپنے عیش و آرام کو چھوڑ کر چوروں کی طرح ایک بے سہارا بُڑھیا کے جھونپڑے میں گھُس آتے ہو۔ جانتے ہو دُنیا تمہیں کیا کہے گی۔ تم راجہ ہو۔ تمہارے پاس بے اندازہ دولت ہے۔ تمہارا نام دُنیا میں ہر ایک کی زبان پر ہے۔ لیکن اسوقت تو تم چوروں کی طرح بھٹک رہے ہو۔ مگر نہیں۔ میں نے سُنا ہے۔ کہ قاتل اُس جگہ ضرور بھٹکتا ہے۔ جہاں اُس نے کسی کا خون بہایا ہو۔ شہنشاہ! تم میری حاجت روائی کرنے آئے ہو؟ تم چور ہو! تم نے ایک بیوہ کی زندگی چھین لی ہے۔ اُس کے گھر کے ایک نہیں۔ بلکہ دو چراغ بجھا کر اُسے اندھیرے میں بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیا ہے۔ تم کیا جانو۔ کہ ایک بیوہ نے اپنے دو بچّوں کو کن اُمیدوں اور مصیبتوں کے ساتھ پالا ہوگا۔ آہ! میرے بچّے! جنہیں تمہارے آدمیوں نے ملک الموت بن کر مجھ سے چھین لیا۔ وُہ تمہارے فوجی سپاہی بنا کر میدانِ جنگ میں بھیج دیئے گئے۔ اِن کے سہارے تمہاری جیت ہوئی۔ تمہاری اُمیدیں پروان چڑھیں۔ مگر میری آس پر پانی پھر گیا۔ میرے گھر کے ساتھ میری کوکھ بھی اُجڑ گئی۔ تم نے میرے بچّوں کو مجھ سے چھینا ہے۔ تم موت کے فرشتے ہو۔ آدمی کہتے ہو۔ کہ تیری حاجت پوری کروں گا۔ اگر یہ بات ہے۔ تو لاؤ میرے بچّے مجھے واپس کر دو۔ اشوک۔ تم اشوک ہو نا؟ لاؤ میرے بچّے مجھے واپس دے دو ÷

اشوک اعظم کا سر بارِ ندامت سے جھک گیا۔ اور وُہ آبدیدہ ہو کر بغیر کچھ کہے سُنے خاموشی کے ساتھ باہر اندھیرے میں غائب ہو گیا ÷

ایک معمولی کمرے میں دیوار سے سر لگائے ہوئے اشوک فرش پر بیٹھا تھا۔ مغموم اور اُداس۔ ملازم داخل ہو کر شاہی آداب بجا لایا۔ اور بولا سیناپتی حاضر ہونا چاہتے ہیں ÷

"آسکتے ہیں" اشوک بولا ÷

سیناپتی نے آکر عرض کیا "کالنگا کی راجکماری آج شام کو جہاں پناہ کے حضور میں حاضر ہونے والی ہیں" ÷

اشوک اعظم نے حیرت زدہ نگاہوں سے سیناپتی کو دیکھ کر دریافت کیا :- "کالنگا کی شہزادی۔ کیوں کس لئے؟"

سیناپتی نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا :- "مہاراج کے چرن چھونے کے لئے" ÷

اشوک نے ایک ٹھنڈی سانس لیکر سیناپتی کے چہرے پر سے نگاہیں ہٹا لیں۔ مگر سیناپتی کہہ رہا تھا "کالنگا کا راجہ جنگ میں ہمارے بہادر سپاہیوں کی تلواروں کا سہارا لے کر ہمیشہ کے لئے موت کی آغوش میں سو گیا۔ مہارانی پہلے ہی سُورگباش ہو چکی تھیں۔ اب صرف راجکماری رہ گئی ہے۔ وُہ مہاراج کے درشن کر کے اطاعت کا اظہار کرنا چاہتی ہے" ÷

اشوک نے دریافت کیا "قیام کہاں ہوگا؟"

سیناپتی بولا "فرمان شاہی کا انتظار ہے"!

اشوک نے کہا ... کے بعد ... خالی کر دیا جائے۔ وہیں اس کے درباروں کی

رہائش کا بھی انتظام فوری کر دیا جائے۔ جاؤ ہم خود بھی آ رہے ہیں" ۔

تھوڑی دیر بعد اشوک خود اُس باغیچے میں پہونچ گیا۔ تمام انتظامات اُس کی نگرانی میں ہونے لگے۔ وہ راجکماری کے آرام و آسائش کے لئے ہدایات دے رہا تھا ۔

کالنگا کو ابھی حال ہی میں مہاراج نے فتح کر کے اپنے راج میں شامل کر لیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ کہ راجکماری کے آنے کا مطلب کیا ہے۔ کیا اُسے بھی کوئی شکایت ہے۔ کیا وہ بھی ضعیفہ کی طرح میرے دل میں کوئی گہری چٹکی لینی چاہتی ہے۔ وہ دن بھر اسی سوچ میں رہا۔ شام کے وقت اُس نے سینا پتی کو حکم دیا۔ کہ سوار فوجوں سے راجکماری کا سواگت کیا جائے ۔

اشوک اعظم کے حکم کے مطابق فوجی سوار شہر کے باہر راجکماری کے استقبال کے لئے تیار کھڑے تھے۔ خود اشوک اعظم بھی بنفس نفیس شہر پناہ کے دروازہ پر راجکماری کا انتظار کر رہا تھا ۔

غروب آفتاب کے ساتھ ہی کالنگا کا چاند طلوع ہوا۔ راجکماری شہر پناہ کے دروازہ پر پہونچکر پالکی سے اتری۔ شہنشاہ استقبال کے لئے چند قدم بڑھا۔ راجکماری نے چاہا۔ کہ خود کو مہاراج کے قدموں میں ڈالدے لیکن اشوک اعظم نے اُسے فوراً سنبھال لیا۔ مہاراج پر سکتہ سا طاری تھا۔ مہاراج کی نگاہیں ہزاروں حسن و جمال دوشیزاؤں کی رعنائیاں دیکھ چکی تھیں۔ لیکن راج کماری کے حسن و جمال کا جادو اُسکے دل و دماغ پر اثر گیر تھا ۔

اشوک اعظم کی یہ کیفیت دیکھکر دیکھنے والوں کے لبوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہو کر غائب ہو گئی۔ مہاراج نے خود کو سنبھالا۔ اور راجکماری سے کہا۔ "پاٹلی پتر تمہاری تشریف آوری پر فخر کرتا ہے" ۔

راجکماری قدم بوس نگاہوں سے نغمہ پرور آواز میں بولی۔ "میں تو داسی ہوں مہاراج" ۔

راجکماری کو آئے ہوئے کئی دن گذر گئے۔ مگر اُس کے آنے کا مقصد کسی پر نہیں کھلا۔ خود اشوک اعظم روزانہ راجکماری کی بارگاہِ جمال میں حاضری دینے آتا تھا۔ راجکماری کے مقصدِ ورود سے ناواقف تھا مہاراج میں بھی یہ جرأت پیدا نہ ہو سکی۔ کہ وہ خود ہی اس سلسلہ میں کوئی سوال کر لیتے ۔

راجکماری عام لڑکیوں سے بہت زیادہ جداگانہ ذہنیت و فطرت کی لڑکی تھی۔ نہ اُسے بناؤ سنگار سے دلچسپی تھی۔ اور نہ رقص و موسیقی سے۔ البتہ جب کبھی اُس کا جی چاہتا۔ وہ ستار پر خود ہی نغمہ ریزی کیا کرتی اُسکے نغموں میں بلا کا درد تڑپتا تھا ۔

لیکن اس اداسی اور خاموشی کے باوجود اُس کے حسن کے سحر آفرین اثرات، شائستگی، سنجیدگی اور علمی استعداد نے اشوک کے دل میں اپنے لئے بہت کچھ گنجائش پیدا کر لی تھی ۔

شروع شروع تو شہنشاہ صرف چند منٹ کے لئے صبح شام راجکماری کی مزاج پرسی کے لئے آتے رہے۔ لیکن رفتہ رفتہ مہاراج کا کافی وقت راج کماری کی قربت میں گذرنے لگا۔ اور انہیں جلدی یہ احساس ہو گیا۔ کہ راج کماری کی محبت اُن کے دل کی گہرائیوں میں گھر کر چکی ہے ۔

شام کی رنگین لطافتیں فضاؤں میں بکھری پڑی تھیں۔ مہاراج اور راجکماری کھڑکی میں کھڑے ہوئے قدرت کی پیدا کردہ دلفریبیوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ کسی قدر فاصلہ پر ایک ہرے بھرے درخت کی پھننگ پر دو معصوم پرندے بیٹھے ہوئے تھے۔ مہاراج کی نگاہیں جیسے ہی اُن پرندوں کے مسرور جوڑے پر پڑیں اُن کے دل میں ایک ہوک سی اُٹھنے لگی [illegible]

سے دیکھا۔ اور دل ہی دل میں سوچنے لگے۔ کہ راجکماری جب سے پاٹلی پتر آئی ہے۔ اُس نے اپنے زیورات اُتار لے کے بعد پھر ایک تار بھی نہیں پہنا۔ اشوک اعظم نے کسی قدر جرأت سے کام لیا۔ اور اپنی نگاہیں پھر پرندوں کے جوڑے پر جما کر راج کماری سے کہنے لگے :-

" تم جب سے آئی ہو راجکماری۔ ہم سے اپنے متعلق ایک بات بھی نہیں کہی۔ کیا کوئی راز ہے" ؟

راجکماری نے مہاراج پر ایک گہری نظر ڈال کر پھر مناظر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا :- " نہیں مہاراج! نہ کوئی بات ہے۔ اور نہ کوئی راز۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے۔ کہ میں ایک اناتھ ابلہ ہوں۔ یتیم لڑکی، آجکل اپنے ایک مہربان عزیز کے ہاں ٹھہری ہوئی ہوں۔ اور اُن کے علاوہ اب میرا اس دنیا میں ہے بھی کون؟" یہ کہکر راجکماری خاموش ہو گئی۔ اُس نے کالنگا یا اپنے باپ کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں کہا ✣

اشوک بولا :- لوگ اپنی خاندانی بڑائی ظاہر کرنے کے لئے اکثر خود ہی ایسے ذکر کرتے ہیں۔ جن سے اُن کا بڑاپن ظاہر ہو۔ مگر میں دیکھ رہا ہوں۔ کہ تمہیں اس قسم کی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ پھر بھی تمہارا دل اُمیدوں اور ارمانوں کی آماجگاہ تو ضرور ہوگا۔ کیا تم مجھے اپنی کسی خواہش سے واقف کر سکتی ہو۔ بولو میں تمہاری کون سی خواہش پوری کر سکتا ہوں راجکماری!

راجکماری بولی :- شکریہ! میری کوئی خواہش نہیں مہاراج!

اشوک نے کہا :- یہ کیا بات ہوئی راجکماری! تم بے فکری کے ساتھ اپنی خواہش کا اظہار کرو... میں شہنشاہ ہوں۔ تمہاری ہر خواہش پوری کر سکتا ہوں راج کماری ✣

راجکماری بولی :- بیشک مہاراج آپ شہنشاہ ہیں۔ میری کیا۔ بلکہ دنیا کی خواہشات پوری کر سکتے ہیں۔ لیکن میری کوئی خواہش نہیں مہاراج ✣

اشوک نے کہا :- " تکلف نہ کرو راجکماری" ✣

راجکماری بولی :- اُمیدیں اور حسرتیں زندگی کا دوسرا نام ہیں مہاراج ✣

اشوک نے کہا :- ہاں راجکماری! اُمیدیں جب پوری ہوتی ہیں۔ تو انسان کو سکون ملتا ہے۔ مگر میں آج اتنی بڑی سلطنت کا حکمران ہو کر بھی اپنے راج کے بار سے درد سر محسوس کر رہا ہوں۔ میں نے اپنے تلخ تجربات اور زندگی کے اُتار چڑھاؤ کے پیش نظر اپنی تمام کوششوں کو دوسروں کی فلاح و بہبود کے لئے وقف کر دیا ہے۔ کاش میں کسی ایک کا بھی دکھ درد دور کر سکوں۔ تو اشوک کہلانے کا مستحق ہو جاؤں۔ راجکماری مالا دیکار۔ تم ایک بہادر مہاراجہ کی سپتری ہو۔ تم نے شاہی ناز و نعم کی آغوش میں پرورش پائی ہے۔ تم نے سکون و آرام کی فضا میں انگڑائیاں لیکر گہوارۂ شباب میں قدم رکھا ہے۔ تم نے اپنی گذشتہ زندگی کا ہر لمحہ عیش و راحت کی نغمہ طرازیوں سے لطف اندوز ہو کر بسر کیا ہے۔ لیکن میں سخت متحیر ہوں کہ تم نے اپنے حیاتِ رفتہ کو ایک رنگین رُوحانی خواب سمجھ کر قطعی فراموش کر دیا ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں۔ کہ تم ہر وقت کسی فکرستان کی غیر ہموار گھاٹیوں میں بھٹکتی رہتی ہو۔ راجکماری جب تم گفتگو کرتی ہو۔ تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے تمہارے رنگین و نازک لب لفظوں کی صورت میں موتی اُگل رہے ہیں۔ اور تم ہو۔ کہ مسرت گاہِ عالم کے دروازے پر کھڑی دنیا کے آرام اور عیش کو گھبراہٹ کی نظروں سے دیکھ رہی ہو۔ راجکماری دنیا کو تمہاری ضرورت ہے۔ اس لئے سب کچھ بھول کر دنیا [illegible] نغمہ چھیڑنے

کی کوشش کرو"!

وہی نقرئی چاند..... اپنی نورانی شعاعوں کو تجلی بخش رہا تھا۔ تاروں پر موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ فضاؤں میں ہواؤں کی تحریک سے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے دور ندی کے اس پار کوئی ساز ارمان بردھیمے مگر سُریلے سُروں میں رُومانی گیت گا رہا ہے۔ اشوک اعظم اپنے پائین باغ میں ٹہل رہا تھا۔ لیکن آج اس کے ساتھ اس کے درباری نہیں تھے۔ بلکہ اس کے دل پر حکمرانی کرنے والی۔ اس کی حسین ترین مہمان یعنی راجکماری مالا دیکار تھی۔ دونوں کے لبوں پر مُہرِ خاموشی لگی ہوئی تھی۔ لیکن اشوک اعظم کا دل کسی بے بادبان کشتی کی طرح جذبات کے طوفانِ بے پناہ میں ہچکولے کھا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے بیساختہ آنسوؤں کے موتی گرنے لگے۔ اس کے دل میں یک بیک یہ جذبہ پیدا ہوا۔ کہ آج اس راز سے راجکماری کو واقف کر دے! جسے وہ اپنے دل کی گہرائیوں میں پرورش کر رہا ہے۔

اسے راجکماری سے محبت تھی۔ وہ چاہتا تھا۔ کہ کالنگا کی راجکماری پاٹلی پتر کی مہارانی بنکر اسکے دل پر بھی حکمرانی کرے۔ اشوک اعظم کے جذبات مشتعل ہونے کی ایک خاص وجہ یہ بھی تھی۔ کہ آج راجکماری اسی شان و شوکت اور اسی آرائش و زیبائش کے ساتھ اشوک اعظم کی ہمراہی میں چاندنی رات کو رومانی فضاؤں میں سبزہ زار پر گلگشت کر رہی تھی۔ جس میں اشوک اعظم نے اس کو پہلی مرتبہ پاٹلی پتر آنے کے بعد دیکھا تھا۔ آخر جب اشوک حدود و ضبط سے گزر گیا۔ تو اس نے کہنا شروع کیا:۔ "تمہیں معلوم ہوا ہے کہ آج کی رات میں نے تمہیں دعوتِ گلگشت کیوں دی؟"

راجکماری نے حجاب پرور انداز میں جواب دیا۔ "نہیں"!

اشوک وارفتگی کے عالم میں کہنے لگا:۔ "راج کماری جب سے تم نے پاٹلی پتر میں قدم رکھا ہے۔ میرے دل کی تاریکیاں تمہاری تابشِ حسن سے منور ہو گئی ہیں۔ میں چاہتا ہوں۔ کہ ایک مرتبہ تم مجھے میرا نام لیکر پکارو! راجکماری! میرا دل تمہارا تخت ہے۔ اور میری حکومت تمہاری سلطنت۔ میری خواہش ہے۔ کہ کالنگا کی راجکماری پاٹلی پتر کی مہارانی بن کر اشوک کی پوری سلطنت پر حکمرانی کرے"۔

راجکماری کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ لیکن تھوڑے ہی وقفہ کے بعد بولی:۔ "اشوک! اگر اس دنیا میں میرے لئے کوئی گنجائش ہوتی۔ تو آج میں اپنی تقدیر پر ناز نہیں بلکہ غرور کرتی۔ مگر افسوس اس دنیا میں میرے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ پھر میں......."

لیکن اشوک بات کاٹ کر بولا:۔

"یہ کیا کہہ رہی ہو راجکماری! دنیا میں تمہارے لئے بہت کچھ گنجائش ہے۔ اگر نہیں ہوگی۔ تو بھی اشوک تمہارے لئے وسیع ترین گنجائش پیدا کر دیگا۔ تم ہاں تو کرو راجکماری"۔

"نہیں اشوک" راج کماری بولی:۔ "میں ایک عورت ہوں۔ اور عورت کا دوسرا نام ہے کمزوری میری بجائے اگر کوئی دوسری عورت ہوتی۔ یا میں عورتوں کی طرح ہوتی۔ تو مجھے تمہارا حکم بجالانے میں کوئی عذر نہیں ہوتا۔ لیکن میں سمجھ چکی ہوں۔ کہ یہ دنیا اور اس دنیا کی ہر چیز فانی ہے۔ یہ سحر آفرین حسن مردانہ جذبات کو بھڑکانے والا شباب! یہ عیش و عشرت میں گم کر دینے والی دولت۔ سب چیزیں فانی ہیں اشوک پھر فانی چیزوں سے کوئی کسی کو ابدی طور پر کیسے خوش رہ سکتا ہے؟ میرے باپ نے حکومت کھو دی۔ وہ فانی چیز تھی۔ لیکن مجھے غیر فانی مسرت حاصل ہو رہی ہے۔ کوئی غیبی طاقت پُراسرار طریقے سے مجھے

اِس دُنیا سے لے جا رہی ہے۔ مَیں اِس دُنیا سے دُور ہوتی جا رہی ہُوں۔ تُم مجھے اِس غیبی طاقت سے کسطرح چھین سکتے ہو اشوک! اب میں راجکماری نہیں ہُوں۔ بلکہ ایک تارک الدُنیا راہبہ ہُوں"

راجکماری کے چہرے سے آسمانی نُور برس رہا تھا۔ آنکھوں میں سکُون آفرین رَوشنی جھلک رہی تھی۔ اُس نے آہستہ آہستہ اپنے زیورات اُتار کر اشوک اعظم کے سامنے سبز گھاس پر ڈالنے شروع کر دیئے۔ اُس کے بعد پھر بیش قیمت شاہی ملبُوسات کو بھی اُتار کر اشوک اعظم کے قدموں پر ڈال دیا۔ جن کے اندر اُس نے ایک جوگیا کفنی پہن رکھی تھی۔ وُہ بغیر کچھ کہے سُنے بھجن الاپتی ہُوئی اشوک اعظم کے پائیں باغ سے نکل کر پاٹلی پُتر کے جنگلوں کی طرف چل دی۔ اور اشوک اعظم آنسوؤں سے بھری ہُوئی آنکھوں سے سکتہ کے عالم میں اُسے جاتا ہُوا دیکھتا رہ گیا۔

دُلہن کا تابُوت

اِک شام کو جب عطر میں ڈُوبا تھا ہمالہ
لیلائے شب اوڑھے ہُوئے تھی سُرخ دوشالہ

گیتی پہ دہکتا ہُوا یُوں عکسِ شفق تھا
یہ عالمِ اسباب بھی سونے کا طبق تھا

آکاش پہ وُہ بادۂ شیراز ۰ ہی تھی
یا نیل میں اِک سُرخ پری تیر رہی تھی

قشقے سے دمکتی ہُوئی گردُونکی جبیں تھی
سیندور کا تھا چرخ تو صندل کی زمیں تھی

گُلشن میں تھا شبنم کا دہکتا ہُوا سینہ
ٹپکا تھا ہر اک پھول پہ حُور(۱۰) کا پسینہ

مغرب کی حسیں وادی میں بُت خانہ کُھلا تھا
یا قلعہ افلاک میں میخانہ کُھلا تھا

ناگاہ دِکھا سامنے تابُوت دُلہن کا
مُرجھایا ہُوا پھُول تھا ہستی کے چمن کا

لپٹی ہُوئی تھی قوسِ قزح ایک کفن میں
اِک شمع حرم یا بجھی رکھی تھی لگن میں

مندر میں کسی گیان میں تھا محو پجاری
یا ابر میں جاتی تھی مہِ نو کی سواری

تاروں کے تصوّر میں شفق کھوئی ہوئی تھی
برسات کی رنگین گھٹا سوئی ہُوئی تھی

خم خانے میں بیخود کوئی مے نوش پڑا تھا
آہُوئے ختن وادی میں بیہوش پڑا تھا

تھی کیفیت اُس نیند کے پُرسحر اثر میں
جسطرح حیا آتی ہے معصُوم نظر میں

بے جان تھی اِک چشمۂ کشمیر کی ماہی
یا ٹوٹی پڑی تھی کوئی چاندی کی صراحی

ٹوٹا ہوا اِک رکھا تھا جبریل کا شہ پر
یا چشمۂ حیوان کا اِک خشک سمندر

کیا قہر تھا یوں راہِ اجل میں وہ لُٹی تھی
چوتھی کی ابھی ہاتھ سے مہندی نہ چھٹی تھی

یوں پھول حسیں سہرے کے کمھلائے ہوئے تھے
تارے یہ شبِ قدر کے شرمائے ہوئے تھے

تابوت کے ہمراہ تھے احباب خوش اطوار
چنگاریاں ٹھنڈی تھیں کہ تھے اشک شرربار

کاندھوں پہ اُٹھائے تھے عروسی کے کنول کو
یا چار ستوں تھامے تھے ہیرے کے محل کو

تھے موت کے بادل میں یہ ہستی کے ستارے
یا تاج محل کے تھے قریں چار منارے

پردے یہ کوئی حسن کے کعبے پہ پڑے تھے
خاتم پہ سلیماں کے نگیں چار جڑے تھے

کاندھوں پہ شعاعوں کے کوئی تختِ ملک تھا
سمتیں تھیں یہ چار اور وہ تابوتِ فلک تھا

حورانِ بہشتی کی تھیں زرتار قبائیں
یا ڈوبتے سورج کی تھیں یہ چار شعائیں

ٹوٹے ہوئے ہیرے تھے کوئی تاج قمر کے
یا تخت میں بلقیس کے پائے تھے گہر کے

شاخوں پہ تھا اِک طائرِ طوبےٰ کا جنازہ
سیارے اُٹھائے تھے ثریا کا جنازہ

جاتی ہے جو اِس شان سے فردوس مقامی
اُٹھے یونہی اے کاش کبھی لاشِ غلامی

میں اپنی ماں کو یاد نہیں کر سکتا۔ لیکن موسم خزاں میں صبح سویرے جب سیوتی پھولوں کی نکہت ہوا میں
تیر رہی ہوتی ہے۔ تو مندر سے صبح کی عبادت کی خوشبو مجھے یوں آتی ہے۔ جیسے وہ
میری ماں کے پاس سے آئی ہو
میں اپنی ماں کو یاد نہیں کر سکتا۔
لیکن جب میں اپنی خواب گاہ کی کھڑکی سے
دور آسمان کے نیلے رنگ کو دیکھتا ہوں تو مجھے
محسوس ہوتا ہے جیسے میرے چہرے پر میری ماں
کی گڑی ہوئی نگاہوں کی خاموشی تمام آسمان پر پھیل گئی ✦

مانڈلے کے شاہی محلات

یوں تو ملک برما کی چپہ چپہ زمین سے اس کی گذشتہ شان و شوکت، رفعت و عظمت عیاں ہے۔ اس کے سر بفلک پگوڈے داستانِ عظمت سنا رہے ہیں۔ پہاڑوں کی چوٹیوں سے ہمیں پیغامِ غم دے رہے ہیں اس کی مسمار و منہدم عمارات اب بھی اپنی شان و شوکت کا اظہار کر رہی ہیں۔ ہر کھنڈر دعوتِ اشکباری دیتا ہے۔ لیکن "مانڈلے کے شاہی محلات" جو اپنی شان میں یکتا تھے۔ آج کس مپرسی کی حالت میں اپنی داستانِ غم زبانِ خموشی سے بیان کر رہے ہیں۔ کوئی کتنا ہی مسرور دل کیوں نہ ہو۔ ان کو دیکھ کر ضرور چار آنسو بہا دیگا۔ ان کی حسرت افزا ہوا، ان کا مایوسانہ نظارہ ہر ایک کو متاثر کر دیتا ہے۔ حسرت، مایوسی یاس اور حرمان یہاں مجتمع ہیں۔ زمانہ بھر کی بے مہریاں اور بدنصیبیاں آج ان پر وقف کر دی گئی ہیں ؛

کوئی اہل برما ہو۔ یا غیر ملک کا باشندہ۔ سیاح ہو یا مسافر، مانڈلے میں آ کر اسے پہلے یہی خواہش ہوتی ہے۔ کہ چل کر شاہی محلات کو دیکھیں۔ لیکن ان کا نظارہ انہیں کو لطف دیتا ہے۔ جن کو زمانے نے دنیاوی خوشیوں سے محروم کر دیا ہو۔ جن کو قسمت کی نارسائیوں نے تباہ و برباد کر ڈالا ہو۔ جو رنج و غم سے خوگر ہو کر ان کے لطف اٹھاتے ہوں۔ وہ ان کے نظارہ سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں اور اپنے حسیات و جذبات کے تلاطم خیز سمندر سے چار آنسو ان کی نذر کر سکتے ہیں ؎

اشک باری کے بہانے ہیں وہ اجڑے بام و در
گریۂ پیہم سے بینا ہے ہماری چشم تر

لیکن یہ کب ہو سکتا ہے۔ جب تک کہ ہم کسی شے کی حالت سے پورے پورے واقف نہ ہوں ہرگز اس سے متاثر نہیں ہو سکتے۔ ہمارے دل پر اس کی حالت جب ہی اثر انداز ہوگی۔ جبکہ ہم اسے اچھی طرح سمجھ لیں۔ اس لئے ضروری ہے۔ کہ شاہی محلات سے ناظرین کو پوری پوری واقفیت بہم پہنچائی جائے ؛

اس کی موجودہ صورت سے اس کی گذشتہ حالت کا اندازہ نہیں لگ سکتا۔ کیونکہ اس میں بہت کچھ تبدیلیاں کر دی گئی ہیں۔ ان کا بہت بڑا حصہ مسمار کر دیا گیا ہے۔ جہاں اب ایک چھوٹا سا گلزار نظر آتا ہے۔ لیکن ان پھولوں سے بھی حسرت ٹپکتی ہے۔ ان کی خوشبو بھی ایک خوش کن منظر پیش کرتی ہے۔ نقش و نگار طلا کاری مٹ چکے ہیں۔ اب اس کی حقیقت ایک مردہ جسم سے کچھ زیادہ نہیں۔ روح زندگی اب ان میں نہیں۔ وہ شوخیاں نہیں رہیں۔ وہ گرمیاں اب سرد پڑ چکی ہیں۔ البتہ بربادیوں کا ایک نقشہ ہے۔ جو آنکھ بھر کر دیکھا نہیں جاتا۔ ہو کا عالم، سنسان فضا ایک غضب ڈھاتی ہے۔ ہزاروں لاکھوں دیکھنے کو آتے ہیں۔ اور دیکھ کر چلے جاتے ہیں۔ ٹہلتے ہیں ہنستے ہیں کھیلتے ہیں۔ لیکن آہ! وہ نہیں جانتے۔ کہ اسی جگہ جہاں وہ اسقدر بے ادبیاں کرتے ہیں۔ کوئی زمانہ تھا کہ ہوا بھی حکم پر چلتی تھی۔ پرندہ پر نہیں مار سکتا تھا۔ لیکن نہیں۔ یہ ان کی غلطی نہیں۔ وہ نہیں جانتے۔ کہ یہ تاجداران برہما کی ایک مٹتی ہوئی نشانی ہے۔ جو کسی حد تک زمانے کی تباہی خیز ہاتھوں سے محفوظ ہے۔ ... محلات آج کھنڈروں سے بھی بدتر ... صرف یہی ایک

ادم

رسالہ

مستانہ جوگی

لاہور

نمبر ۸	ماہ اگست ۱۹۴۵ء	جلد ۲۳

انسان اپنے عالمِ جذبات میں!

"وہ ناقوسِ کلیسا کی دردناک اور ماتمی آواز اختتامِ روز کی خبر دے رہی ہے۔ تھکے ہوئے مویشی پیچدار راستوں سے ہو کر سر جھکائے ہوئے چراگاہ سے گاؤں کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ کسان اور مزدور آہستہ آہستہ اپنے گھروں کو واپس جا رہے ہیں اور سبھوں نے دنیا کو میرے اور تنہائی اور تاریکی کے لئے ادھر چھوڑ دیا ہے"۔

انسانی زندگی ایک لامتناہی سمندر کی مانند ہے۔ اس کی امنگ اور اس کے ولولے مدوجزر ہیں۔ جو اس کی حالت اور اس کی کیفیت میں اتار چڑھاؤ یعنی انقلاب پیدا کرتے رہتے ہیں۔ اس کے خیالات اس کے جذبات موسمی ہوائیں ہیں جو کبھی سرسبزی اور شادابی پھیلاتی ہیں۔ اور کبھی بادِ صرصر و سموم کی مانند اس کے دل و دماغ میں ناامیدیوں، حسرتوں، ہجومِ یاس کی مدد سے ایک پژمردگی اور ایک افسردگی پیدا کرتی ہیں۔ ہاں کبھی کبھی اس انسانی سمندر میں طوفان بھی آتے ہیں۔ جو اس کی امیدوں، اس کی تمام آرزوؤں کے جہازوں، بادبانوں اور کشتیوں کو ناکامی اور نامرادی کے چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا کر چکنا چور کر دیتے ہیں

ع اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

موجودہ زمانہ کے مادہ پرست چاہے اسے کچھ ہی کہیں۔ اور دماغی کمزوری یا تخیل سے تشبیہ دیں۔ یہ واقعات ہیں جن سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ ایک شخص ابھی کچھ ہے اور ابھی کچھ۔ ابھی تو خیالات میں پاکیزگی [illegible] کی ایسی لہریں اٹھ رہی ہیں کہ [illegible] بڑھتے ہوئے

خیالات تقدس۔ زہد و تقویٰ پر فرشتوں کو بھی رشک آتا ہے۔ مگر آہ یہ حالت دیر تک قائم نہیں۔ رہتی اور ہم
خیالی کی ایسی تیرہ و تار بھول بھلیاں میں جا پھنستے ہیں۔ جہاں سے نکلنا تو درکنار نکلنے کا خیال بھی کوسوں
انسان جب تمام دنیا سے ہاتھ اٹھا کر عالم تنہائی کا ایک گوشہ پسند کر لیتا ہے۔ کیا وہ اس وقت اکیلا
نہیں نہیں۔ جوش جذبات و فور خیالات کا ایک مینا بازار اس کے ارد گرد لگا ہوتا ہے۔ اور وہ اپنی خیالی اشیا
دیکھتا ایک دوکان سے دوسری دوکان میں بیچتا ہے۔ اور ایک مقام کو سنسان اور دوسرے کو گلستان بناتا
دنیا والے اسے تنہا سمجھ کر اس پر افسوس کرتے ہیں۔ مگر وہ ایک خندۂ بیجا۔ ایک تبسم زیر لب سے سب کو
دیتا ہے۔ اور زبان حال سے سمجھا دیتا ہے کہ ہم تنہا نہیں۔ بلکہ خیالات کا ایک شہر ہے جو ہمارے گرد بسا ہے
جس میں کبھی تو نا امیدی کا طاعون اپنا اثر دکھاتا ہے۔ اور کبھی حسرت و یاس کی وبا اپنا رنگ جماتی ہے
امید مسیحائی کرتی اور حضرت عشق افلاطون و جالینوس بنکر تمام خرابیوں کو دور کر دیتے ہیں۔
کیا اچھی وہ گھڑی ہے۔ اور کتنی مبارک وہ ساعت جس میں انسان تمام عالم سے الگ تھلگ ایک
ہی دنیا میں جا بیٹھتا ہے۔ وہ ایک ہی وقت میں دیو جانس کلبی بھی ہے۔ سکندر اعظم بھی جولیس سیزر بھی
خود ہی نپولین بنتا ہے اور خود ہی قانون نپولین۔ کبھی ولنگٹن بنکر واٹرلو میں بلوچر کا انتظار دیکھتا ہے
بلرو فون جہاز پر سوار دنیا سے قطع تعلق نظر آتا ہے۔

یہ تو ایک طرف۔ سب سے زیادہ دلکش اور موثر وہ زمانہ ہوتا ہے جب کوئی بھولا ہوا واقعہ یاد آ کر
ایک ٹیس پیدا کرتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ فلاں زبردست شاعر تھا۔ فلاں بلند شعرا تھا۔ مگر سچ یوں ہے
انسان کی زندگی ایک شاعری ہے۔ اس کے کارنامۂ زندگی قصائد ہیں۔ جن کی مضمون آفرینی اور معنی
سلسلہ ان دعاؤں پر ختم ہوتا ہے جنہیں ہم لوگ "موت" کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان قصائد کی
جذبات ہیں جو خدا جانے ہمیں کہاں سے کہاں پہنچاتے اور کس مقام سے کس مقام پر لا ڈالتے ہیں۔ ابھی ہم
کتاب کی تلاوت میں محو تھے کہ کسی پہلے ہمنشین کی یاد نے ٹھونکے دے دے کر بیچین کیا۔ آنکھوں میں آنسو
طبیعت میں سوز پیدا ہوا۔ اور ہم درد دل کی مثنوی لے بیٹھے۔ پرانے شکوے شکایتوں کے دفتر کھل
فوری اثر یہ پڑا کہ پچھلے زخم جو اب انگور ہو گئے تھے ہنس پڑے۔ اور ہم ان کی دلجوئی اور دلداری میں
کتنی راتیں کتنی راتوں کے پچھلے پہرے بچھونوں پر کروٹیں بدل بدل کر کاٹتے گئے ہوں۔ آہ کتنے گل
کی نذر ہو کر تتر بتر ہوتے ہیں۔ مگر اپنا بڑا ہوا گداز ہے کہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے

پشتہ نہیں کہ چرخ کا اے عرش سنبھل جا
امڈے گا مری چشم کا دریا ابھی کچھ اور

کہاں ہیں وہ لوگ جو بزم طرب کیلئے جشن جمشیدی کا سامان کرتے ہیں۔ اے انجمن دنیا کے
اصحاب! آؤ اور ذرا اس تنہائی پسند کے بوستان خیال کی سیر کرو۔ تم کو معلوم ہوگا کہ یہ سناٹا نہیں ؟
ہے بلکہ ہزاروں حسرتیں لاکھوں تمنائیں۔ کروڑوں آرزوئیں ہیں جو ایک پژمردہ دل۔ پریشان دل
منتشر دل کے گرد صف ماتم بچھائے ہوئے ایک طرف سینہ کوبی میں مصروف ہیں۔ اور ایک جانب
کے ڈیرے لئے ہوئے ہیں۔ وہ عزلت اور تنہائی کا متوالا کبھی دائیں دیکھتا ہے کبھی بائیں۔ اور ایک
اس کی باچھیں کھل جاتی ہیں۔ بند قبا ٹوٹ جاتا ہے۔ [illegible] دل کا [illegible] ہزاروں

مگر ایک آہ۔ ایک ٹھنڈی سانس آکر بالکل غائب کر دیتی ہے۔ اور یاس و حرمان کی مجسم تصویر بن جاتا ہے
نگریزی فلسفیوں میں "جھونپڑے کی خوشیاں" ضرب المثل ہیں۔ کاش انہیں اس انجمن در خلوت کے مزے
ہوتے۔ تو وہ تقریباً" کل جھونپڑوں میں آگ لگا دیتے۔ اور تمام ظاہری خوشیوں سے الگ تھلگ ایک
نیا میں آ رہتے۔ جہاں کی سدا بہار چمن آرائی سب کو تھوڑی دیر کیلئے اپنی جانب متوجہ کر لیتی ہے

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا کونسی ایسی بات ہے۔ جس سے یہ گوشۂ تنہائی کے متوالے اپنی دنیا
نے سب سے کنارے پڑے ہوئے ہیں۔ اور وہ کونسا نشہ ہے۔ جو انہیں اپنے ہم جنسوں چرندوں پرندوں
ہنی سے مستغنی بنائے ہوئے اس درجہ مسرور کر رہا ہے۔ اس کا جواب۔ ماہران سیاست مدن و علم الارض
یتے۔ کہ انسان اوائل زمانہ میں تنہا تھا۔ سوسائٹی سے واقف بھی نہ تھا۔ اس کی یہ خصلت اس کی اولاد
ں تک باقی ہے۔ اور تعلیم و ترقی نے اس کے شوق تنہائی کو غور و خوض سے بدل دیا ہے۔ لیکن کیا یہ جواب
اور دل لگتا ہوا۔ اور تھا حکمران لوگوں کو تسلیم بھی ہے۔ جن کے معتدبہ اوقات ایسے ہجوم خیالات میں
ہیں۔ اور جو ہزار سوسائٹیوں جلسوں اور انجمنوں پر اپنی ایک سکنڈ کی آزاد تنہائی کو ترجیح دیتے ہیں

بجھی ہوئی آگ

گاہ جہاں میں تو سبھی ممکن ہے
کہ یہ سوچ رہا ہوں کہ سر راہ کی آگ
دیکھ کر تجھ کو یہاں آج تعجب نہ ہوا
راکھ بنکر بھی نہ کیوں بھولی نشیمن اپنا

رہتے ہیں پل بھر میں بچھڑ جانے کو
کر دنیا ہے یادوں کو فضا میں تحلیل
پھر بھی جاتے ہوئے کچھ اشک ڈھلک جاتے ہیں
قہقہے اشک دھندلکے میں سرک جاتے ہیں

کی راہ پہ تم سے ملاقات بھی ہوئی
سایوں کی گھنی چھاؤں میں نیند آئی ہے
چشمہ دیکھا تو تھکا ماندہ مسافر ٹھہرا
جس سے اب تک ہے تصور کا دھندلکا گہرا

پھر آنکھ کھلی، کوئی نہ تھا، تم بھی نہیں
ارمان تہ دام پرندوں کی طرح
اشک بے ساختہ آنکھوں سے بہے جاتے تھے
اپنی مجبوری کو چپ چاپ سہے جاتے تھے

رسالہ میں سالہ کے نئے خریدار بنانیوالے پریمیوں کی فہرست شائع ہوگی

ذہن پر چھائے ہوئے پھولوں کا گلدستہ ہے
ولولے ڈوب گئے وقت کے طوفانوں میں

اب تو یہ تاب نہیں کہ تجدید کروں
اب تو بیٹھے ہیں لئے گہری محبت کا سکوں

تمہیں لے آیا ہے گم گشتہ سہاروں کا خیال
اب تو ہیں صرف بہاروں کے خزاں دیدہ نقوش

بھیگتی آنکھوں سے چھپتے نہیں دل کے گھاؤ
رہ سکو ان کے سہارے تو یہاں رہ جاؤ

زندگی کے آخری ہنگامے کے نام

نور کا تڑکا ہوا —— گھناؤنی گھٹائیں نیلے آسمان کی ہموار چھاتی پر سرکتی ہوئی کائنات کے سر پر منڈلانے لگیں —— نیم تاریکی کے عالم میں گلشن کی گل پوش ادائیں اور بھی دلکش معلوم ہو رہی تھیں —— ننھے آم کے درخت چپ سادھے کھڑے تھے۔ کوئل اپنی مدہوش صدا سے ان کی خاموشی سے چھیڑ چھاڑ کر رہی تھی مگر بے حس آموں کے سینوں میں بھی دھڑکن پیدا نہ ہوئی —— یکایک آسمان آنسو برسانے لگا۔ جیسا ایک ننھا منا یتیم بھوک کی شدت سے بیقرار ہو کر بلک رہا ہو اور اس کی مہربان ماں اسے سینے سے لگا کر چپ کرانے کی کوشش کر رہی ہو ... نیم غصے سے اس کے گالوں پر طمانچہ مار دے اور اس غریب کی آنکھوں سے ننھے ننھے آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلے۔ کبھی ختم نہ ہونے والا سیلاب —— دوسرے لمحہ زور سے ہوا چلی۔ خاموش آم ہلے اور ان کے سینے زور زور سے دھڑکنے لگے —— دفعتاً آسمان کے آنسو تھم گئے —— وہاں آموں نے نہا دھو کر سبز لباس پہن لیا۔ کلیاں اپنے گلابی سے گالوں کو نکھرائے جھومنے لگیں۔ پھول گریباں چاک کئے آبدیدہ آنکھوں سے گلاب کو تکنے لگے مگر یہ صورت تھوڑی دیر رہی۔ مالی آیا اور اس کے بعد بعد نازک کلیوں کی طرف بڑھے ... صبا نے ایک ننھی منی کلی کے کان میں کچھ کہا۔ کلیاں لرز گئیں۔ تو کلیاں توڑنے لگا۔ جھنجھلاتے ہوئے اور تمکنت سے انگلیوں سے لہو کی پتلی سی دھار بہہ نکلی۔ اور خون سے لتھڑی ہوئی انگلیاں کلی منہ بند کئے اچھل کر اس کے ہاتھ سے جا گری۔ ہاتھوں کے جھٹکے اور ملتی ہوئی ٹہنیوں سے بکھر بکھر کر نرم پتیاں سنہرے جسم سے چھوٹ گئیں۔ دیوانے پھول سر پیٹ کر رہ گئے گریباں چیتھڑے چیتھڑے ہو کر زمین پر آ رہے۔ کونپل کلی دیوتا کے چرنوں میں جانے سے پہلے ہی مرجھا چکی تھی —— صہبا پرست لڑکھڑاتی ہوئی جوانی میں آیا۔ اور ادھر ادھر بیتابانہ نگاہ دوڑانے لگا۔ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ صہبا پرست کی محبوب کلی نرم و نازک کلی اسے کہیں دکھائی نہ دی —— اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ ذہن کے وسیع صحرا میں گرم گرم لو چلنے لگی۔ اور وہ چکرا کر زمین پر گر پڑا —— کائنات اس کی آنکھوں میں تاریک ہو چکی تھی ✤

نوٹ۔ جو احباب جی ... اور جن کا پتہ غیر مکمل اور مشکوک ہوتا ہے ایسے آمدہ خطوط کا جواب ہم نہیں دے سکتے ... اور ... آئندہ ... کیا کریں ✤

پیغام شباب

مجھے میرے شباب کا پیغام آیا۔ کہ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔
بہار کی کانپتی ہوئی پتیوں پر۔
جہاں مسکراہٹیں آنسوؤں کیلئے تیار کی جاتی ہیں۔
وہ کہتا ہے۔ "میرے پاس آجاؤ"
زندگی کے پرانے ٹکڑے ۔ کو عبور کر کے ۔۔۔۔۔۔ موت کے دروازے میں سے۔
اس لئے کہ خواب مرجھا جاتے ہیں۔ اور آرزوئیں مایوسیوں سے بدل جاتی ہیں ۔۔۔۔۔۔ لیکن میں
غیر فانی ہوں۔
تم مجھے بار بار ۔۔۔۔۔۔ زندگی کے سفر میں ہر کنارے پر مل سکتے ہو۔

گیت

او گیت سنانے والے تو
تنہائی میں یہ سوچ کبھی
کیوں بھول گئے وہ گیت ہمیں
جن گیتوں میں تھی مستی سی
جو جیون رس برساتی تھی
کیوں بھول گئی وہ ریت ہمیں

او گیت سنانے والے تو
تنہائی میں یہ سوچ کبھی
کی ہم نے یہ نادانی کیوں
ہم بھول گئے وہ بانی کیوں
سب سا بھی جس کو سنتے تھے
سر اپنا جس پر دھنتے تھے

مَیں چاہتا ہُوں

اِن عالیشان ایوانوں کی بنیادیں میرے الفاظوں کے جادُو سے ہل جائیں۔ اِن چمکتی ہوئی دمکتی ہوئی آسمان سے باتیں کرتی ہوئی منزلوں میں خود بخود تلاطم پیدا ہو جائے۔

میں ہنسوں —— خوب ہنسوں —— میرے ساتھ وہ بیکس بھی ہنس پڑیں۔ جن کی زندگیاں ان فلک نما عمارتوں کے زیرِ سایہ ختم ہو چکیں جنہیں اپنے خون پسینہ کی اُجرت نہ مل سکی۔

میرے طنزیہ قہقہے اِن ایوانوں کو سربسجدہ کریں اور ہر ہر اینٹ سے خُون بہنے لگے —— اِس بہتے ہوئے خون میں چیخیں بلند ہوں —— ایسی چیخیں جو سیدھی خدا تک جا پہنچیں —— بےبسی مسکرا کر سر اٹھائے سرکشی بے بسی سے دم توڑ دے —— ! ہاں یہی چاہتا ہوں اور بھی جانتے کیا کیا —— ؟

دُھندلکے

(۱)

فضا نمیں ہیں بھیگی برستا ہے بادل ہواؤں کے شانے پہ اڑتا ہے آنچل
شگوفے محبت کے کھلنے لگے ہیں لگایا "تمنا" کی آنکھوں نے کاجل

(۲)

نگاہوں میں شُعلے تڑپنے لگے ہیں تمنا کے بادل اُمنڈنے لگے ہیں
مگر آہ کیسے دکھاؤں میں اخگر مرے دل کے پارے پگھلنے لگے ہیں

ہندوستان کے قدیم کُتب خانے

پاٹن کی جین لائبریری

ہندوستان میں جتنے قدیم کُتب خانے ہیں اُن تمام میں جینیوں کے کُتب خانے بہت پرانے ہیں جہاں جینیوں کی خاص بستی ہوتی ہے۔ وہاں تھوڑی بہتی کتابوں کا ذخیرہ ضرور ہوتا ہے لیکن پاٹن، کھمبات، جیسلمیر، احمد آباد میں بہت بڑا کتابوں کا ذخیرہ ہے سوا سو برس پہلے تو لیمبڑی۔ بھڑوچ۔ سورت۔ بیکانیر اور دھرا آباد وغیرہ میں بھی بڑے بڑے کتب خانے تھے مگر اب نام ہی نام ہے۔ وہاں کی مختلف کتابیں اب احمد آباد وغیرہ ...

کی لائبریریوں اور عجائب گھروں کی زینت بن رہی ہیں۔ ہندوستان کے چند شہروں کی لائبریریوں میں تھوڑی سی کتابیں ہیں۔ ان شہروں میں پاٹن سب سے پُرانا شہر ہے اس کے بعد جیسلمیر اور مرشد آباد کا نمبر ہے۔ ہمارا یہ مضمون پاٹن شہر کے کُتب خانہ سے متعلق ہے۔

پاٹن انہل پور پاٹن یا سدھ پور پاٹن کے نام سے بھی مشہور ہے۔ مسلمانوں نے اپنی تصانیف میں پاٹن کا نام نہر والا لکھا ہے۔ پاٹن کی شہرت کا باعث یہاں کی لائبریری ہے۔

پرانا نوشتہ :- سمت ۸۰۲ بکرمی میں ون راج چاوڑے نے پاٹن بسایا اور اُس وقت سے یہاں کے کُتب خانہ کا سلسلہ شروع ہوتا ہے چونکہ جینیوں کے اچاریہ شیل گن سوری کی مدد سے ون راج نے اپنے ارادوں میں کامیابی حاصل کی تھی۔ اسی لئے وہ جین دھرم کی بڑی عزت کرتا تھا۔ یہ شہر بساتے اور اس کو رونق دیتے ہوئے سب سے پہلے اس نے جین مندر کا نقشہ ڈالا تھا۔ پنجاسر نامی گاؤں سے پارشوناتھ کی نہایت ہی عمدہ اور بڑی مورتی اس مندر میں لا کر سنتھاپت کی۔ پیشتر یہ گاؤں پاٹ نگر کے نام سے مشہور تھا۔ ون راج کے باپ جے شکر کے زمانہ میں قنوج کے راجہ بھونر نے اسے ویران کر دیا جس وقت پاٹن کی بنیاد ڈالی گئی اُس وقت یہ بالکل ویران تھا کچھ عرصہ بعد ہی پھر آباد ہو گیا۔ دن بدن ترقی ہونے لگی۔ مارواڑ اور کاٹھیاواڑ وغیرہ شہروں سے ہزاروں جینی خاندانوں نے یہاں آ کر بود و باش اختیار کی۔ سادھوؤں کی تعداد بھی کثرت سے نظر آنے لگی مگر وہ سادھو آج کل کے سادھوؤں کی طرح نہ تھے جن کے متعلق کبیر صاحب نے فرمایا ہے :-

کبیرا بھیس اتیتھی کا کرتوتی کرے اپرادھ
باہر دیسے سادھو گتی۔ ماہیں بڑا اسادھ
اُجول دیکھ نہ دھیجئے۔ بگ جیوں ماندے دھیان
دھورے بیٹھ چپوٹسی۔ یُوں لے بوڑے گیان

بلکہ ان میں سچی سادھوتا تھی جیسا پھر کہا ہے :-

نر ویری نش کامتا۔ سائیں سیتی نیہہ
وشیوں سے نیارا رہے۔ سادھن کا مت ایہہ
سو آنگی سب سنسار ہے۔ سادھو سمجھی بچے پار
ان لیکش کوئی ایک ہے۔ لکشی کوئی ہزار
سادھو جن سب میں رمیں۔ دُکھ نہ کاہو دیہہ
اپنے مت گاڑھا رہیں۔ سادھن کا مت ایہہ
سادھو ہزاری کاپڑا۔ تا ئیں مل نہ سمائے
ساکت کالی کابلی۔ بھاویں تاہے چھپائے

جو سادھو وہاں آ کر جمع ہوئے وہ حقیقی سادھو تھے انہوں نے ہندوستان کے مختلف حصوں سے بیشتر کتابیں یہاں منگوائیں جن میں طرح طرح کی تصنیفات کا ذخیرہ تھا گویا اس طرح اس کُتب خانہ کی بنیاد پڑی۔ گیارہویں صدی سے یہاں بھی کتابیں تصنیف ہونے لگیں۔ اُس وقت سے پانچسو برس تک یہ سلسلہ برابر جاری رہا [illegible]

سدھ راج اور کمار پال کے عہدِ سلطنت میں یہاں ہزاروں عمدہ کتابیں لکھی گئیں۔ ان کے زمانہ سلطنت میں ایک سال بھی ایسا نہ ہوگا جس میں دس بیس عمدہ کتابیں نہ لکھی گئی ہوں۔ اس وقت ملک میں ہر طرح سے امن و امان تھا اور ہر قسم کی سہولتیں تھیں۔ راج دربار میں ہمیشہ دس پانچ قابل سادھو موجود رہتے تھے۔

جس شہر میں جو کتاب تصنیف ہوتی تھی وہیں کار ئیس اُس کتاب کی سینکڑوں جلدیں خرید لیتا۔ سدھ راج جے سنگھ دیو نے ہیم چندر اچاریہ کے بناتے ہوئے ویاکرن کی ہزاروں جلدیں نقل کرا کر راج دربار کے علاوہ دور دور شہروں میں پہنچائیں جہاں جہاں کتب خانوں کا پتہ لگا وہاں وہاں اس ویاکرن کی کاپیاں بھیجی گئیں۔

مہاراج کمار پال علمی چرچوں میں خوب دلچسپی لیتے تھے اُنہوں نے تو اس کا ایک محکمہ ہی علیحدہ رکھا تھا۔ تقریباً سات سو مصنف ہمیشہ کتابیں لکھنے میں مصروف رہتے۔ کروڑوں روپے اس علمی کام پر خرچ کئے جاتے تھے۔ اُنہوں نے بڑی بڑی اکیس لائبریریاں قائم کیں۔ اپنے گورو شری ہیم چندر آچاریہ کی تصنیف کتابوں کو سونے کے پانی سے لکھوا کر لائبریریوں میں رکھا۔

مانڈو گڈھ جو دھار کی ریاست میں ہے وہاں چودھویں صدی میں پیتھڑ شاہ نامی ایک معتبر شخص گذرا ہے اُس نے اپنے گورو شری دھرم گھوش سے بھگوتی سوتر سنا تھا۔ اس سوتر میں جہاں جہاں گو یا اے گوتم کا لفظ آیا وہاں ایک ایک سونے کی انگوٹھی اُس نے چڑھائی تھی۔ اُن کی کل تعداد چھتیس ہزار ہوئی تھی دھرم گھوش نے اس سرمایہ سے ہزاروں کتابیں تصنیف کرائیں اور اُنہیں ریشم کے رومالوں میں لپیٹ لپیٹ کر دیوگری بھڑوچ آبو وغیرہ مقامات کے کتب خانوں میں رکھوا دیں۔ یہی ہے سچے سادھو کا کام ـــ سادھو کی زندگی پرمارتھ کی زندگی ہے ؎

سادھو سوئی جانئے۔ چلے سادھو کی چال
پرمارتھ راچے۔ بولے وچن رسال

موجودہ کتب خانے

اس وقت پاٹن میں چھوٹے بڑے بارہ کتب خانے ہیں۔ پانچ بڑے اور باقی چھوٹے ہیں۔ تمام کتابوں کی تعداد چودہ ہزار ہے اُن میں سے ساڑھے چھ سو تو تاڑ کے پتوں پر لکھی ہوئی ہیں باقی کاغذ پر۔ پہلے یہ کتب خانے جینی لوگوں کے تحت میں تھے۔ مگر کچھ عرصہ سے ان کی سرپرستی گرہستیوں پر ہے۔ کرنل ٹاڈ صاحب کے وقت سے ان کتب خانوں کی شہرت عام ہو گئی ملک کے علم دوست صاحب ... سب سے پہلے ٹاڈ صاحب نے اپنے راجستان میں اس کا ذکر کیا۔ پھر اور بہت سے انگریز اس کو دیکھنے کیلئے آئے اور ان کتابوں کی نقلیں لیگئے انہوں نے مختلف فہرستیں بھی تیار کیں۔ اُنہیں فہرستوں نے یورپ والوں کو اپنی طرف متوجہ کیا اور تب سے آج تک ہزاروں انگریز علم دوست یہاں آچکے ہیں۔ پہلے یہ کتب خانے بہت محفوظ حالت میں تھے۔ بڑی کوشش سے لوگوں کو ان کے درشن ہوتے تھے کوئی تیس برس پہلے شری کانت وجے مہاراج جب وہاں گئے آپ بڑے علم دوست شخص تھے۔ بعض کتابوں اور فہرست کی نقلیں حاصل کیں۔ نئی نئی فہرستیں تیار کرائیں۔ کتابیں رکھنے کیلئے لکڑی کے خوبصورت بکس [illegible] کوشش سے

بمبئی کے جوہری سیٹھ چونی لعل پنا لعل نے اکتالیس ہزار کا اثاثہ منظور کیا۔ مکان بنوانے کا حکم دیا۔ چنانچہ مکان بن جانے پر جو کتابیں اِدھر اُدھر پھیلی ہوئی تھیں وہ سب ایک جگہ ہو گئیں۔

بائیس برس ہوئے ہونگے جب کہ شری سیاجی راؤ گائیکواڑ کی سرکار نے یہاں کے کتب خانوں کیلئے چمن لال بھایا بھائی دلال ایم اے کو بھیجا تھا۔ اُنہوں نے شری کانت وجے جی کی مدد سے کتب خانوں کو دیکھا بھالا۔ کتابوں کی فہرست تیار کی۔ اِس فہرست کے طبع ہونے پر یہاں کے کتب خانوں کی نسبت بہت کچھ معلومات کا سامان بہم پہنچایا گیا۔ پانچ بڑے کتب خانوں میں جو ۱۳۰۴ کتابیں تاڑ کے پتوں پر لکھی ہوئی ہیں وہ تین لکڑی کے صندوقوں میں بھری ہیں اور نہایت ہی پُر مغز کتابیں ہیں۔

ایک کتب خانہ پارشوناتھ کے مندر میں ہے اس میں ۷۵۰ کتابیں ہیں یہ تمام کاغذ پر لکھی ہوئی ہیں اور کتنے ۱۲۱ اور ۰۰ا بیچے درمیان کی لکھی ہوئی ہیں ان میں بھی علم ادب کی بہت بیش قیمت کتابیں ہیں۔

تیسرا نمبر اُن کتابوں کا ہے جن میں سے بہت سی جیدو شاہ نامی ایک کروڑپتی سیٹھ کی لکھی ہوئی ہیں۔ اُن میں سے ۳۰۴۵ کتابیں کاغذ پر اور بائیس کتابیں تاڑ کے پتوں پر لکھی ہوئی ہیں یہ سولہویں صدی کی معلوم ہوتی ہیں۔ چوتھا ذخیرہ بخت جی کی سیری میں ہے اس میں ۶۰۸۲ کتابیں کاغذ اور ۱۴۰ تاڑ کے پتوں پر لکھی ہوئی ہیں مگر ان چوتھے کتب خانہ میں سنسکرت پراکرت اور گجراتی زبان کی کتابوں کا مجموعہ ہے۔ کاویہ۔ کوش۔ جوتش۔ چھند۔ النکار۔ سد حانت اور اتہاس وغیرہ ہر قسم کی کتابیں ہیں جو زیادہ تر کاغذوں پر لکھی ہوئی ہیں۔

تاڑ کے پتوں پر کتابیں

یہاں کے کتب خانوں میں جتنے پُرانے تاڑ کے پتے ہیں۔ اُتنے پرانے نیپال کو چھوڑ کر ہندوستان کے کسی دوسرے حصہ میں نہیں۔ مدراس کے بعض حصوں میں تاڑ کے پتوں پر بہت قیمتی کتابیں لکھی ہوئی ہیں جو پرانے کتب خانوں میں ہیں مگر وہ زیادہ پُرانی نہیں ہیں۔ ڈاکٹر برنل کی تحریر کے مطابق دکن میں جو سب سے زیادہ پُرانا تاڑ پتہ ملا ہے وہ ۱۴۲۸ء کا ہے مگر پاٹن میں جو تاڑ کے پتے ہیں وہ اُن سے بہت پُرانے ہیں سمت ۱۲۶۵ بکرمی تک کی لکھی ہوئی کتابیں یہاں موجود ہیں اس کے بعد کی کوئی لکھی ہوئی کتاب نہیں ملتی۔ یہاں جتنی کتابیں ہیں وہ کھمبات۔ دھولکا۔ کرن وتی۔ چندراوتی۔ ڈونگرپور۔ بیجاپور وغیرہ مقامات میں سدھ راج۔ کمار پال۔ بھیم دیو۔ ویسل دیو۔ سارنگ دیو۔ سوم سنگھ دیو وغیرہ راجاؤں کے عہد میں لکھی گئی ہیں۔ حروف سب دیوناگری کے ہیں

بعض پُرانی کتابوں کے حروف کچھ کچھ بنگلہ کے حروف سے ملتے ہیں حروف نہایت ہی خوبصورت سڈول اور دلکش ہیں۔ جین مصنفوں نے بڑی ترقی دی ہے اور فن انشا پر خاص احسان کیا ہے ایک بات اور حیرت انگیز ہے کہ تاڑ کے پتوں پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں وہ باوجودیکہ ایک ہزار برس سے بھی پُرانی ہیں لیکن اُنکی سیاہی اُتنی پختہ ہے کہ ایک لفظ کی بھی شکل نہ بگڑی ہے نہ دھندلی پڑی ہے۔ یہ اُس زمانہ کی سیاہی ہے جب ہندوستان کو مغرب کی ہوا بھی نہیں لگی تھی۔ تاڑ کے پتوں پر تصاویر بھی ہیں مگر وہ اتنی خوبصورت نہیں۔ اُن تصاویر میں رنگ بھی بھرا ہوا ہے۔ ان پتوں کی تصویریں سمت ۱۲۶۴ بکرمی کی ہیں۔

عام طور پر تاڑ کے پتے مالابار سے منگائے جاتے تھے۔ مالاباری پتے بہت عمدہ پتلے اور مضبوط ہوتے ہیں ان میں بھی تاڑ کے پتے ملتے ہیں لیکن وہ زیادہ چکنے پتلے اور مضبوط نہیں ہوتے۔ دکن کے پتوں پر لکھنے کے

بجائے حروف اچھے کھودے جاتے ہیں اُس زمانہ میں مصنف عموماً کاتستھ اور برہمن ہی ہوتے ہیں جین سادھو
بھی کتابیں لکھا کرتے تھے کتنے ہی آچاریوں نے تو یہ قاعدہ ہی بنا لیا تھا کہ ہر سادھو کو دن بھر میں ۲۵ سے ۵۰
شلوک تک ضرور لکھنے چاہئیں۔ تاڑ کے پتوں پر جو ہندسے ہیں وہ عجیب و غریب ہیں۔ اُن کی شکل کسی قدر
یوں ہے:- (۶۰) (۵۰) ع (۴۰) ف

تاڑ کے پتے کے بیچ میں ایک سوراخ رہتا ہے اُس میں سُوت یا ریشم کی باریک ڈوری ڈال کر تمام پتے
ساتھ باندھ دیئے جاتے ہیں۔ کتاب کے دونوں طرف مضبوط لکڑی کی پٹیاں لگی رہتی ہیں۔ اُن پر پکے رنگوں سے
تصویریں بنی ہیں جو جینیوں کے یگوں کے نظارے دکھاتی ہیں۔

نایاب کتابیں

پاٹن میں تاڑ کے پتوں پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں اُن میں جینیوں کے علاوہ بودھوں اور برہمنوں کے
مقدس نوشتے ہیں۔ بودھوں نے مختلف پُرانے ترک شاستر ہندوستان میں ضائع ہو چکے ہیں مختلف محققوں کی
تحریر سے اُن کا پتہ چلتا ہے وہ تمام گرنتھ یہاں موجود ہیں۔
برہمنوں اور جینیوں نے جو زبان اور حروف ان کتابوں میں استعمال کئے ہیں اُن سے زیادہ پُرانے وہ حروف
ہیں جو بودھوں نے اپنی تصانیف میں استعمال کئے ہیں۔ کاویہ۔ النکار وغیرہ کی جو پُرانی کتابیں وہ بڑی نایاب
کتابیں ہیں اُن میں زیادہ تر ایسی کتابیں ہیں جو اور کسی کتب خانہ میں نہیں ملتیں۔ بلہن کوی کا ذکر ما دیو
چسرت مشہور کتاب ہے۔ چمپو کاویہ کا کچھ حصہ یہاں کے کتب خانہ میں ہے۔ بال رامائن۔ کپور منجری وغیرہ
مصنف کوی راجیشور کا تصنیف شدہ کاویہ میمانسا' نامی کتاب بھی ہے جو نہایت ہی نایاب اور نادر نسخہ ہے
ورلبھ نامی کاتستھ شاعر کی مشہور و معروف تصنیف اُدے سُندری خصوصاً قابل ذکر ہے۔ بان
ہرش چرتر کے مقابلہ میں ورلبھ نے اس کتاب کو تصنیف کیا تھا اس کے آٹھ حصے ہیں شروع میں کاتستھوں
کی تاریخ کے متعلق شاعر نے بہت سی جاننے والی باتوں کا اظہار کیا ہے اس کا مطالعہ ہر کاتستھ کیلئے ضروری

کاغذ پر لکھی ہوئی کتابیں

جتنی پرانی کتابیں تاڑ کے پتوں پر لکھی ہوئی ہیں۔ اُتنی کاغذ پر نہیں۔ کاغذ بہت عرصہ تک ٹھہر بھی نہیں
سکتا۔ ہمارے دیکھنے میں جتنے کاغذات آئے ہیں۔ اُن میں سب سے پرانا سمت ۱۳ کا لکھا ہوا ہے اس سے پہلے کا
کوئی نہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ کاغذ ہندوستان میں چودھویں صدی میں رائج ہوا مگر ہم اس سے متفق نہیں
کیونکہ راجہ کمار پال سمت ۱۱۶۶ - ۱۲۳۰ کے عہد میں کاغذ کا پتہ چلتا ہے پُرانے لوگ کاغذ پر لکھنا اچھا نہ سمجھتے تھے
تاڑ کے پتوں کو کاغذ پر ترجیح دیتے تھے۔ جب کسی وجہ سے مالابار سے تاڑ کے پتوں کا آنا بند ہو گیا تب کاغذ پر لکھ
کا رواج ہوا۔ سمت ۱۴۰۵ سے سمت ۱۵۰۰ تک اسی پچیس برس کے عرصہ میں لاکھوں کتابیں تاڑ کے پتوں سے کاغذ پر
نقل کی گئیں۔ جین کتب خانوں میں کاغذ پر لکھی ہوئی کتابیں زیادہ پرانی رہتی ہیں۔ کاغذ زیادہ تر کشمیر
[illegible] احمد آبادی کاغذ کا بھی رواج عام ہو گیا۔

کاغذ پر کالی روشنائی کے علاوہ ہنگل کی بنی ہوئی لال روشنائی سے بھی بعض مصنف لکھتے تھے۔ سونے اور چاندی کی سیچی روشنائی سے لکھی ہوئی بہت سی کتابیں ملتی ہیں جینیوں کا کلپ سوتر بھی اسی سیاہی سے لکھا ہوا ہے۔ اس سیاہی سے لکھنے میں بڑی دقت ہوتی تھی۔ اچھے سے اچھا زود نویس بھی مشکل سے چالیس پچاس شلوک دن بھر میں نقل کر سکتا تھا سو شلوک نقل کرنے میں کم از کم بیس پچیس روپیوں کی سیاہی خرچ ہوتی تھی جو سیاہی استعمال کی گئی ہے وہ پانچ چھ سو برس کی پرانی ہونے پر بھی بدستور چمکدار ہے۔

شاید یہ سُن کر آپ کو تعجب ہوگا جس طرح مرد کتابیں لکھا کرتے تھے اسی طرح پرانے زمانے میں عورتیں بھی لکھا کرتی تھیں۔ بڑے بڑے شریف گھرانوں کی عورتوں کی لکھی ہوئی کتنی ہی کتابیں اس کتب خانہ میں موجود ہیں جن کی لکھائی نہایت ہی دلکش اور نفیس ہے۔

تاڑ کے پتوں کی طرح کاغذ پر لکھے ہوئے گرنتھوں کی حفاظت کی جاتی ہے اوپر سادہ کاغذ لپیٹ کر اوپر اس پر ایک سادہ کپڑا لگا کر کتاب ڈبے میں رکھ دی جاتی ہے۔ یہ ڈبے لکڑی کاغذ اور چمڑے کے بنتے ہیں اور مضبوط ہوتے ہیں ایک ایک ڈبے میں کوئی دو ہزار صفحات کی کتاب آجاتی ہے۔ ڈبہ قیمتی رومال سے لپیٹ دیا جاتا ہے پھر اس پر ایک اور سادہ کپڑا لگا کر وہ بستہ صندوق میں رکھ دیا جاتا ہے۔

اُن کے کاغذی کتب خانہ کا ذخیرہ بہت بڑا ہے۔ جین دھرم کے علاوہ ویدک دھرم کی بھی کتابیں بہت ہیں۔ جینیوں نے بڑا احسان کیا کہ اس کتب خانہ کی حفاظت کی۔ جب کبھی اُن پر مصیبت آئی اُنہوں نے کتابوں کو سب سے پہلے محفوظ کیا ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ اُنہوں نے راتوں رات زمین کھود کر اس میں کتابوں کو دفن کر دیا پھر جب امن قائم ہوگیا تو کھود کر ویسے ہی سجا دیں۔ دوسری مرتبہ اُنہوں نے اونٹوں پر لاد کر کتابیں جیسلمیر بھیج دیں۔ جیسلمیر میں اس وقت جو کتابیں موجود ہیں وہ وہی ہیں الغرض جینیوں نے سخت سے سخت مصیبت کے وقت بھی بھارت ورش کے قیمتی لٹریچر کو ضائع نہیں ہونے دیا۔ اس لئے بھارت باسیوں کو جین دھرم کا خاص طور پر ممنون ہونا چاہئے۔

وہ نور بھی ہے اور نار بھی ہے

ہر شئے دُنیا کی پردہ ہے — اور حامل صد اسرار بھی ہے
ان بھیدوں میں ان پردوں میں — تصویرِ جمالِ یار بھی ہے
اِدراک رہینِ ہمت ہے — ہمت ہی نہیں تو کچھ بھی نہیں
گلزارِ جہاں میں جو شے ہے — وہ پھول بھی ہے اور خار بھی ہے
اس محفل میں اب پہنچا ہے — دل اپنی تمنائیں لے کر
اظہارِ تمنا جرم جہاں — اور کچھ کہنا دشوار بھی ہے

یہ فہم و ذکا سے بالا ہے — بربادِ خرد کیا سمجھیں گے
اپنا ہی جلوہ ہے ہر سُو — اپنی ہی نظر بے کار بھی ہے

چِتون بھی ذرا ترچھی ترچھی — ہونٹوں پہ تبسّم بھی رقصاں
مطلب یہ ہے عرضِ مطلب پر — انکار بھی ہے اقرار بھی ہے

پھر کوئی نہیں اپنا رہتا — جب وقت بُرا آ جاتا ہے
ماحولِ محبت میں جینا — آسان بھی ہے دشوار بھی ہے

جو چاہے کرے انسان، پھر بھی — جو کرنا چاہے کر نہ سکے
اِک حد تک یہ اس دُنیا میں — مجبور بھی ہے، مختار بھی ہے

سب کیفِ محبت کھو بیٹھے! — بدنام ہوئے دِل کے ہاتھوں
جو سیرت کا شیدائی تھا — اب صُورت سے بیزار بھی ہے

ساقی کی نظر کا کیا کہنا — ماشاء اللہ، ماشاء اللہ
دیوانہ اس کی محفل میں — مدہوش بھی ہے ہشیار بھی ہے

دِل کی دُنیا روشن کر دے — ہر سانس میں یہ آتش بھر دے
کہتے ہیں جسے اُلفتِ بسمل — وہ نُور بھی ہے اور نار بھی ہے

مہاکوی کالیداس

زبانِ سنسکرت جو آج سے ہزارہا برس پیشتر سرتاجِ عالم تھی اور جس کو اب بھی اُم الالسنہ ہونے کا فخر حاصل ہے۔ اُس میں نہایت اعلیٰ درجہ کے شاعری کے دفتر پائے جاتے ہیں۔ عرفانِ حقیقی کا نہایت عالیشان کام اور فلسفہ اور حکمت کا اشراقی اور الہامی چارج شاعری کے سُپرد تھا۔ نیز خدماتِ مذہبی اور شاہی کے بہت سے کام شاعری ہی سے متعلق تھے۔ اب بھی پرانے شلوکوں سے اُن کا پتہ چلتا ہے۔ سنسکرت بجائے ایسی زبان ہے جو دیوتاؤں کی زبان کہے جانے کی سزاوار خیال کی جا سکتی ہے اور اگرچہ اس کے اصول نے اُسے اختلاطِ عام سے بچائے رکھا تاہم اُس کی شاعری نے وہ بلند مرتبہ حاصل کیا جو آپ ہی اپنا نظیر ہے۔ اس کا حسن اور اُس کی بہتایت کسی اور زبان کو نصیب نہیں ہوتی۔ مہابھارت اور راماین کے زمانہ [illegible] زبان کی شاعری درجۂ کمال تک پہنچا دیا۔

جن شعرائے سنسکرت کی فکر بلند پرواز نے ان کو اس عالمِ فانی سے عالمِ جاودانی میں پہنچا دیا۔ اُن میں مہاکوی کالیداس کو نہایت بلند رتبہ حاصل ہے! وہ صرف آسمانِ ڈراما پر ہی آفتاب ہو کر نہیں چمکا بلکہ ایک اعلیٰ پایہ کا رزم نگار شاعر بھی گذرا ہے۔ یہ وہ مشرقی شاعر تھا کہ جس کی طبّاعی کی تیز شعاعوں نے مغرب کو بھی مطلعِ انوار بنا دیا۔ وہ صرف اپنے ہم وطن شعراء کا ہی سرتاج نہیں بلکہ ساری دُنیا نے اس کی اُستادی کا لوہا مان لیا ہے۔

اگرچہ زبانِ سنسکرت میں کئی مقبول شاعر ہو گذرے ہیں مگر سچ یہ ہے کہ کالیداس کو اُن سب پر فوقیت ہے جو حُسنِ قبول اس کے کلام کو حاصل ہوا وہ کسی اور کو میسر نہیں ہوا۔ برتری تو ایک طرف کوئی اس کی ہمسری کا بھی دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اس کی تصانیف میں طبیعت کی روانی اور کلام کی متانت ایسی اعلیٰ درجہ پر واقع ہوئی ہے کہ اس کی کوئی دوسری نظیر اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

بعض ماہرانِ فن کا قول ہے کہ زبانِ سنسکرت کی شاعری جو مبالغہ سے گذر کر غلو کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ مہاکوی کالیداس کے کلام میں اعتدال کی پابند نظر آتی ہے۔ اس کا کلام حسنِ شاعری کا ایک لطیف مرقع پیش کرتا ہے۔ یہ اس کا زورِ طبیعت ہی نہیں بلکہ اعتدال اور سلاست کا بھی سبب ہے، کہ جرمن کا مشہور شاعر گوئٹے[1] اس کا مسخر ہو گیا۔

مگر کالیداس کی سب سے بڑی تعریف جس کا ہم اُوپر اشارۃً ذکر کر چکے ہیں یہ ہے کہ وہ تمام اصنافِ سخن پر قادر تھا جس طرح اُس کے ڈرامے بے نظیر مانے جاتے ہیں۔ اُسی طرح اس کی رزمیہ نظمیں بھی لاثانی تسلیم کی گئی ہیں جس طرح اُس نے ڈرامے کو معراجِ کمال پر پہنچا دیا اسی طرح اس کی شاعری بھی اس کے طبع رسا کے ذریعہ بلندی اور شہرت کے فلک الافلاک پر چمکی۔ اُس کی تصنیفات میں ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اُن کے مضامین نہایت پاکیزہ ہیں اور جن اشخاص کا اُن میں ذکر آیا ہے وہ وفاداری اور نرم دلی کے ساتھ متصف ہیں، ایک اور کمال یہ بھی ہے کہ جو کچھ اس نے حوالۂ قلم کیا۔ اُس سے بہت زیادہ خود ناظرین کے متخیلہ کے لئے چھوڑا ہے۔

مہاکوی کالیداس کی اعلیٰ شاعری کا اثر کچھ ہندوستان ہی میں محدود نہیں رہا۔ بلکہ ممالکِ غیر کے علما بھی بجد اُس کے کلام سے مستفیض ہوئے ہیں، وہ یک زبان ہو کر اس بات کے معترف ہیں کہ کالیداس شعرائے سنسکرت کا سرتاج ہے۔ بلکہ مشہور سیاح اور فلاسفر ون ہمبولٹ[2] نے اُس کو تمام اقوامِ عالم کے شعراء میں ممتاز درجہ دیا ہے۔ اور سر مانیئر ولیمس[3] و دیگر باکمال عُلما نے اُسے شیکسپیئر[4] کا ہم پلہ کہا ہے! یہ تعریف کچھ کم نہیں ہے۔ جن لوگوں نے کلیاتِ شیکسپیئر کو دیکھا ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ شیکسپیئر صرف انگلستان کا نہیں بلکہ دُنیا کا نہایت بلند خیال اور اپنے

---

[1] گوئٹے جرمن کا سب سے اعلیٰ شاعر گذرا ہے۔ وہ ۱۷۴۹ء میں پیدا ہوا۔ ۱۸۳۲ء میں وفات پائی۔ اعلیٰ درجہ کا شاعر ہونے کے علاوہ وہ ناولسٹ۔ آرٹسٹ۔ فلاسفر اور سائنٹسٹ بھی تھا۔
[2] الگزنڈر ون ہمبولڈ گذشتہ صدی کا نہایت مشہور فلاسفر محقق اور سیاح گذرا ہے۔ وہ ۱۷۶۹ء میں پیدا ہوا اور ۱۱ فروری ۱۸۵۹ء کو وفات پائی۔
[3] سر مانیئر ولیمس زبان سنسکرت کے ایک عالم و فاضل تھے۔ وہ ۱۸۱۹ء میں بمقام بمبئی پیدا ہوئے اور آکسفورڈ یونیورسٹی میں تعلیم پائی اور وہیں ۱۸۵۹ء میں زبان سنسکرت کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ اُنکی تصنیفات بیشمار ہیں۔ ۱۸۸۶ء میں اُنکو موقعہ افتتاحِ انڈین انسٹیٹیوٹ (دارالفقہ آکسفورڈ) "نائٹ" کا خطاب ملا۔ یہ انسٹیٹیوٹ اُنہی کی کوششوں سے قائم ہوئی تھی۔
[4] ولیم شیکسپیئر انگلستان میں سب سے بڑا ڈراما نویس اور رزم نگار شاعر گذرا ہے جو اپنے اہل وطن کی قدردانی کے باعث ملک الشعرائے انگلستان کہلایا۔ [illegible] ۱۶۱۶ [illegible]

پایہ کا اکیلا شاعر گذرا ہے، کالیداس فی الحقیقت اُسی کا ہم پلہ ہے! لیکن آخر وہ کیا چیز تھی جس نے اُس کے کلام
شہرتِ عام اور بقائے دوام کا درجہ عطا کیا؟ اس کا جواب مولوی محمد عزیز صاحب بی۔اے اس طرح دیتے ہیں
"کالیداس کا طرزِ بیان نہایت سادہ ہے" مگر سادگی دلکشی اور جامعیت کا رنگ لیئے ہوئے ہے۔
گویا کہ دوسرے الفاظ میں سہل ممتنع ہے۔ وہ پورانوں کی لفاظی سے بھی اسی طرح دور ہے جس
طرح متاخرین کے تصنع سے اور اعجاز نما ایجاز نے اُس میں ایک خاص خوبی پیدا کر دی ہے
اگرچہ اُس کے کلام میں بھی صنائع و بدائع موجود ہیں مگر ان میں آورد کا نام نہیں ہے اور خاص
کر تشبیہ میں اس کو یہ کمال ہے کہ ہر تشبیہ معنی کے لحاظ سے دلفریب اور باعتبارِ موزونیت
تام ہے۔ اس کا طرزِ ادا اس کی پیاری گنگا کے مشابہ ہے جس کا صاف شفاف پانی عجیب
دلربا شان سے گنگناتا لہراتا آہستہ آہستہ بہتا چلا جاتا ہے اور دونوں طرف ہرے بھرے
کناروں پر رنگ برنگ کے قدرتی پھول معشوقانہ انداز سے جلوہ فروشی کرتے ہیں۔ اس کو
دوسرے شعراء پر فکر کی بلند پروازی اور علوِ خیالات میں خاص ترجیح ہے۔ مناظرِ فطرت کے
بیان میں اُس کو بڑی قدرت ہے اور اس کے الفاظ کچھ ایسا طلسم کرتے ہیں کہ تھوڑی دیر کے
لیئے تو ضرور انسان علائقِ دنیا کو بھول کر کسی اور عالم میں پہنچ جاتا ہے"!

فی الحقیقت کالیداس کی شاعری کی سچی تعریف یہی ہے کہ وہ الفاظ میں قدرت کی چلبلی تصویر کھینچکر سامنے کھڑی
کر دیتا ہے اور انسان کے دل میں داخل ہو کر اس کے اندرونی جذبات اور خیالات کو عجیب پیرایہ اور اُس کے
اصلی روپ اور رنگ میں دکھاتا ہے اگرچہ اس میں کلام نہیں کہ اس کی شاعری مبالغہ سے خالی نہیں ہے اور
شعرائے مشرق کے تتبع میں بعض بعض جگہ مبالغہ سے گذر کر اغراق و غلو سے بھی کام لیا ہے لیکن اسکی تشبیہات
اور استعارے اس غضب کے ہیں کہ اُن سے صرف جدتِ طبعی و بلند پروازی کا اظہار ہی نہیں ہوتا بلکہ یہ امر
پایۂ ثبوت کو پہنچتا ہے کہ کالیداس کا مطالعہ قدرت نہایت زبردست اور وسیع تھا۔ جن لوگوں کو اس کا کلام
سمجھنے کی صلاحیت ہے وہ اس کے ایک ایک شعر پر تصویرِ حیرت بنجاتے اور عالمِ بیخودی میں محو ہو کر پکار
اُٹھتے ہیں: سبحان اللہ! کیسا ذہن رسا پایا ہے"! گویا باتوں ہی باتوں میں رگِ جان پر نشتر لگانے کی اُس
کو قدرت حاصل ہے۔

کالیداس کے حالاتِ زندگی اس قدر پردۂ اخفا میں ہیں کہ یورپین محققین و مبصرین بھی اُن کا کچھ پتہ
نہ لگا سکے۔ البتہ بندہ مالا کے مصنف نے جو اس عدیم المثل شاعر کا ذکر کیا ہے۔ اُس سے صرف اتنا
پتہ چلتا ہے کہ کالیداس راجہ بکرماجیت والی اجین کے دربار میں آجکوی (ملک الشعراء) کے درجۂ اعلیٰ پر فائز
تھا۔ بکرماجیت کے دربار میں نو مشہور عالی دماغ عالم تھے۔ جو نورتن کہلاتے تھے۔ انہی میں کالیداس بھی
رتن تھا جیوتر ودیا بھرن کے مصنف نے نورتن کے ناموں کی صراحت اس طرح کی ہے:۔ (۱) دھنونتری
(۲) کشپنک (۳) امر سنگھ (۴) شنکو (۵) بیتال بھٹ (۶) گھٹ کھرپر (۷) کالیداس (۸) وراہ مہر
(۹) وررُوچی۔ اس روایت سے کل محققین نے اتفاق کیا ہے۔ کیونکہ کالیداس نہ صرف درباری رسم ور[illegible]

بکرماجیت خود بھی ایک عالم پنڈت تھا۔ اس سے نہ صرف اس کی مملکت میں علم و ہنر کا رواج ہوا بلکہ اس کی قدر دانی
[illegible] کی علماء بھی [illegible] سبقت لے گئے

سے پُورے طور پر آگاہ نظر آتا ہے۔ بلکہ اُس کی تصنیفات میں جہاں کہیں بکرماجیت کا نام آیا ہے اُس نے اُسے نہایت ادب و احترام کیساتھ لیا ہے، اِسی طرح اجّین کے بیانات میں بھی حب الوطنی کی بو آتی ہے۔ پس اِن حالات سے یہی نتیجہ اخذ ہو سکتا ہے کہ وُہ بکرماجیت کے دربار کا ایک بے بہا جوہر تھا۔

کالیداس نے اپنی تشبیہوں اور استعاروں میں جس قدر درختوں اور بیل بوٹوں سے کام لیا ہے وہ کوہ ہمالیہ کے سلسلہ میں پیدا ہوتے ہیں اور اُن میں سے زیادہ تر کشمیر میں پائے جاتے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وُہ کشمیر کا متوطن تھا۔ لیکن یہ خیال کہاں تک صداقت پر مبنی ہے؟ ہم اس پہ کوئی صحیح رائے قائم نہیں کر سکتے۔ کُتب تواریخ سے اُس کے حالات پر کچھ روشنی نہیں پڑتی ہے اور نہ اُس کی ولادت وغیرہ کا حال ہی کُھلتا ہے۔ روایات سے صرف اسی قدر معلوم ہؤا ہے کہ کالیداس قوم کا گڈریہ تھا۔ لیکن علما کی صحبت اور اپنی لائق اہلیہ وِدّیا دھرمی کی تعلیم کی برکت سے وُہ کمال حاصل کیا کہ ایک بھی اس کی باریک بینی و نکتہ سنجی کی گرد تک کو نہ پہنچ سکا۔ اس کی تصانیف و نیز روایتوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کو سیاحت کا بھی بیحد شوق تھا اور بالخصوص شمالی ہند کا اُس نے بہت دورہ کیا۔ وُہ سیر و شکار کا بھی دلدادہ تھا اور چونکہ اس کی طبیعت حُسن پرست تھی مگر وُہ عیاش نہ تھا۔ اُس کی تصانیف اس امر پہ بھی روشنی ڈالتی ہیں کہ مذہب و فلسفۂ مذہب پر بھی اُس کو خاصا عبور تھا، نیز یوگ اور ویدانت سے بھی واقف تھا اور قدرے طب اور نجوم میں بھی دخل رکھتا تھا۔ یہ بھی تحقیق ہوا ہے کہ آخری عمر میں کالیداس سنیاسی ہو گیا تھا۔ شاکت مت والے "قدرت پرستی" کے دعویدار ہیں اور چونکہ کالیداس کو قدرت کیساتھ ایک خاص قسم کا لگاؤ تھا۔ وہ اس کے "نثر نگار" مواصلت کی کیفیت عمدہ الفاظ میں بیان کر سکتا تھا۔ لہٰذا یہ لوگ اس کو شکتی کا بھگت سمجھ کر بیحد عزت و تعظیم سے پیش آتے تھے اور اپنی ضعیف الاعتقادی سے اس کو وہ درجہ دینے کو تیار تھے جس کو ہر سلیم الطبع شخص ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا۔

اُجّین میں چھپراندی کے کنارے پر اس لاثانی شاعر کی سمادھی (مقبرہ) ہے۔ یہ وُہ جگہ ہے جہاں قدرتی مناظر انسان کو بے اختیار اپنی طرف کھینچتے ہیں اور جہاں دریا کی فیاضیوں نے ایک لہلہاتا ہؤا سبزہ زار پرندوں اور درندوں کے مسکن کے لئے بنا دیا ہے۔

کالیداس کے نام سے ایک اور بھی سنسکرت زبان کا مشہور شاعر گذرا ہے۔ اس کا ذکر راجہ بھوج کے عہد حکومت میں آتا ہے۔ اس کی نسبت مشہور ہے کہ وُہ ورنگل (صوبہ مدراس) کا رہنے والا تھا۔ اس سے بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ کالیداس بکرماجیت کے زمانہ سے لیکر بھوج کے زمانہ تک زندہ رہا۔ مگر یہ خیال ہر پہلو سے غلط ہے۔ اوّل تو ان دونوں کی شاعری میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ دوم ایک طول طویل زمانہ دونوں راجوں کے درمیان حائل ہے۔ یہ بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی کالیداس اس دراز مدت تک موجود رہا ہو چنانچہ بان بھٹ اپنی کتاب ہرش چندر میں لکھتا ہے کہ:-

---

[1] مولوی محمد عزیز مرزا صاحب بی۔ اے کے خیال میں کالیداس قوم کا برہمن تھا۔ ہم اس رائے کو ماننے کے لئے تیار ہیں بہت ممکن ہے کہ یہ کشمیر کے کاشتکار یا کشمیری پنڈت ہوں ان کا گڈریا ہونا بعید از قیاس ہے [2] منو سمرتی کی شرع کے ... [illegible] ... ہونے کیلئے کسی قسم کے آدمی کو بھی ممانعت نہیں ہے پس یہ قرین قیاس ہے کہ تارک کے معنوں میں لفظ سنیاسی کا استعمال کیا گیا ہو۔

"کالیداس کے زبان سے نکلے ہوئے الفاظ ہیں وہی لطف آتا ہے جو تلسی کی منجری دیکھنے سے لیتنوؤں کو حاصل ہوتا ہے"
بان بھٹ شالباہن کے سمت ۵۶۲ میں گذرا ہے اور بھوج کا جلوس سمت ۹۰۴ (شالباہن) میں ہوا تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ کالیداس مسیح سے کہیں پہلے ہوا ہے۔ اس میں کسی طرح کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں مگر بھوج کا کالیداس بھی زبان سنسکرت کا ایک عالم شخص تھا اور بہت سی تصنیفات اس کی یادگار ہیں۔

مہاکوی کالیداس برہسپتی کے زمانہ میں تسلیم کیا گیا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ وہ پہلی صدی عیسوی میں گذرا ہے اس پر کل محققین نے اتفاق کیا ہے۔ سید محمد حسین رضوی نے اپنی کتاب "ڈراما پر ایک دقیق نظر" میں ہندوستان میں ڈراما کا آغاز پانچویں صدی عیسوی میں بتایا ہے۔ یہ ایک ایسی رائے ہے کہ جس کو کوئی صحیح العقل ماننے کیلئے تیار نہ ہوگا۔ اوّل تو خود کالیداس ہی اوّل صدی عیسوی میں ہوا ہے جس کو سنسکرت ڈرامہ کی روح رواں کہنا چاہیئے۔ علاوہ ازیں مہابھارت میں صاف لکھا ہے کہ سری کرشن جی کے بیٹے بہ نفس نفیس ایک ڈراما میں پارٹ لیتے تھے اور جدید محققین کی تسلیم کردہ رائے کے مطابق بھی مہابھارت سن عیسوی سے چودہ سو برس پیشتر کی تصنیف ہے۔ پانینی جو زبان سنسکرت کا ایک نہایت عالم و فاضل اور علم صرف و نحو کا مقبول مصنف گذرا ہے اپنی شہرۂ آفاق کتاب میں شیلالین اور کرسو کا ذکر کرتا ہے جو ڈرامانویسی کے آفتاب تھے۔ یہ مصنف بھی قبل از مسیح گذرا ہے۔ بہرکیف یہ وہ تاریخی واقعات ہیں کہ جن میں اختلاف کی گنجائش نہیں!

کالیداس کی تصانیف کثیر التعداد بتائی جاتی ہیں۔ لیکن محققین نے سولہ کتابیں اس سے منسوب کی ہیں اور بعض کی رائے میں کسوٹی پر کسنے سے صرف سات ہی پوری اُتری ہیں یعنی:-

(۱) رُت سنگھار۔ اس میں ہندوستان کے چھ موسموں کو چھ نظموں میں اس خوبی اور لطف کیساتھ دکھایا ہے کہ مطالعہ سے موسمی کیفیت کی تصویریں آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہیں۔

(۲) کمار سنبھو۔ اس میں جنگ کے دیوتا کارتکیا کی پیدائش کا ذکر ہے۔

(۳) رگھوبنس۔ یہ بڑی مشہور نظم ہے۔ اس میں رگھو کے باپ راجہ دلیپ سے لیکر راجہ رام چندر کے خاندان کے حالات اور اس کی اور اس کے دادا رگھو کی مہمات کا حال نہایت دلکش پیرایہ میں لکھا گیا ہے۔

(۴) میگھدوت (یعنی قاصد ابر) اس میں ایک ہجر کے مارے قیدی نے ابر کو قاصد محبت بنایا ہے۔

(۵) شکنتلا۔ اس کا قصہ مہابھارت سے اخذ کیا گیا ہے۔ یہ وہ مشہور ناٹک ہے جس کی چاردانگ عالم میں شہرت بھی ہوئی ہے۔ بہت سی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ یورپ و امریکہ کے بعض مقامات میں اس کا تماشا بھی کیا جاتا ہے۔ اس میں ایک خاص خصوصیت یہ ہے کہ اعلیٰ ذات والوں کی گفتگو تو شستہ سنسکرت میں تحریر کی گئی ہے اور ادنیٰ اقوام کی پراکرت میں جو نیچ اقوام کی سنسکرت کہلاتی ہے۔[1]

(۶) وکرم اُروسی۔ یہ بھی ایک مشہور ناٹک ہے۔ اس میں پریاگ کے راجہ وکرم اور پری اُروسی کے عشق کا قصہ لکھا گیا ہے کہ پری درخت کی انب بیل کی صورت بن گئی تھی۔

---

[1] سنسکرت ڈراما کی سب سے ممتاز اور عجیب خصوصیت یہی ہے کہ اس میں کل ڈرامہ کے اشخاص اپنے خیالات کا اظہار ایک ہی زبان [illegible] نہیں [illegible] طریق [illegible] حیثیت [illegible] مختلف [illegible] خیالات کی ترکیب عنصری کسی دوسرے ملک کے ڈراما میں نہیں پائی جاتی۔ یہ صرف سنسکرت ہی کا حصہ ہے۔

۱) مال وکاگنی متر - یہ بھی ایک ناٹک ہے۔

جن محققین نے کالیداس سے سولہ کتابیں منسوب کی ہیں۔ وہ مندکرہ بالا سات کتابوں کے علاوہ ان نو کتابوں کو بھی کالیداس کی تصنیف مانتے ہیں (۸) مہاپدماشٹک (۹) گنگاشٹک (۱۰) راکشش کادیہ (۱۱) کرپور منجری (۱۲) شرت بودھ (۱۳) پرشنوتر مالا (۱۴) اسجن درجن (۱۵) شرنگار (۱۶) ناسیارنو۔

کالیداس کی تقریباً کل تصنیفات کا ترجمہ زبانِ انگریزی میں ہوچکا ہے! در بعض کا ترجمہ فرانسیسی جرمنی۔ بنگالی و دیگر زبانوں میں بھی ہوا ہے۔ لیکن کس قدر حیرت واستعجاب کا مقام ہے کہ دو کرم اُردسی کے ترجمہ کے سوا کوئی اور بہترین ترجمہ زبانِ اُردو میں نہیں ہوا جس سے ہمارے لٹریچر (علم ادب) میں اضافہ ہوسکے۔ اگر ہمارے باکمال شعراء کالیداس کی تصنیفات کو ملاحظہ فرمائیں تو دیکھیں گے کہ اُن کی طبع رسا اور افکار و قوتِ خیال کیلئے کیسا وسیع میدان موجود ہے اور اُن کی جدت پسند طبائع کے لیئے ان میں کیسے کیسے اچھوتے مضامین بھرے پڑے ہیں۔ اِس بات کی سخت ضرورت ہے کہ ہمارا لٹریچر بھی ایسے صنفِ کلام کے فیض سے محروم نہ رہے جس سے دوسرے مُلک والوں نے بیحد فائدہ اُٹھایا ہے۔ اور چونکہ کالیداس کی تصانیف میں ایک خاص تاثیر موجود ہے جو انسان کے دماغ کو بلند پروازی کی طرف مائل کرسکتی ہے۔ اسلیئے ہمیں اُمید رکھنا چاہیئے کہ ہمارے شعرائے نامدار اس طرف توجّہ فرماکر نہ صرف اپنے ملک کے لٹریچر کو فائدہ پہنچائینگے بلکہ خود بھی سچی اور لازوال شہرت حاصل کرینگے !!!

اِندر دیوتا

(یہ نظم رگ وید کی ایک حمد کا ترجمہ ہے)

اِندر دیو کی شکتی پربل
راج ہے اُس کا بادل بادل

(۱)

سب سے بلند اور سب سے اعلیٰ   تخت ہے اُس کا بادل کالا
سب سے زیادہ قوت اُس کی   سب کے دلوں میں عظمت اُس کی

اِندر دیو کی شکتی پربل
راج ہے اُس کا بادل بادل

(۲)

پربت اور پہاڑ بنایا   ہلتی دھرتی کو ٹھہرایا

نیلا نیلا گنبد اُوپر چار طرف سے صاف
اِندر دیوتا کی شکتی پربل
راج ہے اُس کا بادل بادل

(۳)

اَندر اُس کا باہر اُس کا ندی اُس کی ساگر اُس
بجلی اُس کے اشاروں میں ہے سورج عہدہ داروں میں
اِندر دیو کی شکتی پربل
راج ہے اُس کا بادل بادل

(۴)

گائے بنائی، دودھ پلایا بیل بنا کے رتھ کو
گھوڑا اُس کا اُسی کا ہاتھی وہی لڑائی میں بھی سا
اِندر دیو کی شکتی پربل
راج ہے اُس کا بادل بادل

(۵)

بستی اور بیاباں اُس کے کھیت پہاڑ اور میداں اُس
اُس کی دیا سے بادل چھائے جل تھل ساگر اُس نے بنا
اِندر دیو کی شکتی پربل
راج ہے اُس کا بادل بادل

(۶)

بِترا سے پانی برسایا داسوں کا ابھمان (غرور) مٹا
ہے اُس کا ہتھیار نرالا جی لیوا ہے اُس کا بھا
اِندر دیو کی شکتی پربل
راج ہے اُس کا بادل بادل

(۷)

[...]و میں ہے آواز اُسی کی تیر میں ہے پرواز اُسی کی
[...]ں کا قابو سب کے اُوپر ہے وہ سب کے اندر باہر
اِندر دیو کی شکتی پربل
راج ہے اُس کا بادل بادل

(۸)

[...]وں کو دھرتی سے مٹایا آریہ لوگوں کو پھیلایا
[...]نیکوں کا وہی سہارا اُسی نے روہن کو بھی مارا
اِندر دیو کی شکتی پربل
راج ہے اُس کا بادل بادل

(۹)

[...]ل گیان ہے اُس کا گانا سومارس اُس کا نذرانہ
[...]نا اُس کی پریم سہیلی سب سے نرالی اور البیلی
اِندر دیو کی شکتی پربل
راج ہے اُس کا بادل بادل

(۱۰)

[...]ہ پرجا اُس کے پجاری ہم اور تم سب اُس کے بھکاری
[...]ہ سمجھنا اِندر نہیں ہے اُسی کی چھایا ساری زمیں ہے
اِندر دیو کی شکتی پربل
راج ہے اُس کا بادل بادل

(۱۱)

[...]رتی اور آکاش کا مالک سب کے دل کی آس کا مالک
[...]ز پڑھو توصیف میں اُسکی گاؤ بھجن تعریف میں اُس کی
اِندر دیو کی شکتی پربل
راج ہے اُس کا بادل بادل

دیورشی نارد

ہندو دھرم میں نارد دیوتا کا وجود بڑے بڑے جلیل القدر دیوتاؤں میں شمار ہوتا ہے۔ وہ برہما کی شکتی اور اُس کے گیان کا مظہر ہے۔ ارض و سما کی بسیط فضائیں اس کے حسین نغمات سے معمور ہیں جن کو وہ خدائے بزرگ و بالا کی حمد و ثنا میں الاپتا ہوا کونین کی وسعت پر چھاجاتا ہے۔ وہ خدا کے ان مخصوص اور مقرب بارگاہ دیوتاؤں میں سے ہے۔ جن کو ہندو دھرم کے مطابق خود برہما نے اپنی شکتی تسلیم کیا ہے۔ حقانیت میں وہ بے نظیر تبحر رکھنے کی وجہ سے دُوسرے دیوتاؤں کا ممدوح بن گیا ہے۔ پرانوں کی تواریخ کے متعلق اس کا علم حتمی ہے۔ نجوم میں وہ ماہر بے بدل ہے۔ علم عروض۔ موسیقی۔ شاعری اور لسانی میں اپنا جواب نہیں رکھتا وہ اکمل سیاست دان ہے اور دُنیا کے حالات ماضی۔ حال اور مستقبل سے مکمل واقفیت رکھتا ہے۔ دُنیا کے کسی کونے میں کسی وقت کوئی واقعہ اس کی غیب بین نگاہوں سے مخفی و متوازی نہیں رہتا۔

وہ انسانی قلوب کی ماہیت اور فطری جذبات کو جاننے والا ہے۔ دُنیا میں آشتی اور جنگ، حب و بغض سکون و اضطراب، ضعف و توانائی اور جملہ عناصر کی کشمکش جو جمادات، حیوانات اور نباتات میں بقائے نوع کیلئے مخفی یا نمایاں ہوتی ہے اُس کی تخلیق کا ذمہ دار یہی جلیل القدر دیوتا ہے۔ اس کے دیوتا ہونے سے پیشتر کی زندگی کے حالات سے بہت کم لوگ واقف ہونگے۔ چونکہ یہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ اس لئے ہم ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں:۔

اپنے موجودہ لباس میں ظاہر ہونے سے پیشتر کے جنم میں وہ ایک غریب خادمہ کا لڑکا تھا۔ اس کی ماں ایک چھوٹے سے گاؤں میں مفلوک الحال زندگی بسر کرتی تھی اور دن بھر کام میں مصروف رہنے کی وجہ سے اپنے اس ننھے معصوم بچے کی طرف پوری توجہ نہ کر سکتی تھی۔ چنانچہ اس کی تربیت سے ہمیشہ غافل رہتی۔ معصوم بچہ کس مپرسی کی حالت میں گاؤں کی گلیوں میں مارا مارا پھرتا۔ اکثر گاؤں کے باہر بھی چلا جاتا۔ جہاں ایک پرانی کٹیا میں چند مہاتماؤں کی مجلس آراستہ ہوتی۔ یہ سادھو کوئی خدا رسیدہ لوگ تھے جو اپنی ریاضت شاقہ کے بعد قدرے آرام لینے کی خاطر سال کے کسی نہ کسی حصہ میں یہاں آکر جمع ہو جایا کرتے تھے اور ان کے وجود سے گاؤں پر رحمت کے بادل چھا جاتے۔ گاؤں کے لوگ ان خدا رسیدہ مہنتوں کیلئے پرشاد لے جاتے اور یہ بچہ اُن کے دسترخوان کے بچے کھچے پرشاد سے کاسہ لیسی کر کے اپنی بھوک کی آگ کو بجھا لیتا۔ اس ریزہ چینی سے اُس کی بدھی روشن اور اس کا قلب منور ہو گیا۔ چنانچہ اب وہ کٹیا کے ایک گوشے میں بیٹھ کر ان مہنتوں کی عرفانی گفتگو کو سُننے اور سمجھنے کی کوشش کرتا۔ اُس کے اس شوق سے سادھو بھی اس کی طرف مائل ہو گئے اور اُنہوں نے اپنی فراست سے جانچ لیا کہ یہ ہونہار بچہ ایک جوہر قابل ہے۔

گاؤں سے رخصت ہونے سے پیشتر اُنہوں نے اس بچے کو اُپدیش دیا اور اپنی توجہ سے اس کے سینے میں ایک ایسی شمع روشن کر گئے جو مشتعل ہو کر تجلی کی صورت میں نمودار ہو گئی۔ اب وہ بچہ اکثر غور و فکر میں کھویا ہوا نظر آتا۔ اور گاؤں والوں سے [illegible]

تھوڑے عرصہ بعد جب یہ بچہ ابھی پورے پانچ سال کا بھی نہیں ہوا تھا تو اس کی ماں کا سایہ

سر سے اُٹھ گیا۔ اب اس کا اس گاؤں میں ہی بلکہ تمام دُنیا میں سوائے خدا کے کوئی نگہبان نہ تھا۔ لیکن اس کے سینے میں جو شمع روشن تھی اس کی ہدایت کیلئے کافی تھی۔ اپنے گاؤں کو چھوڑ کر جنگل میں بسیرا اختیار کر لیا اور اکثر ایک درخت کے نیچے سمادھی لگا کر بیٹھ جاتا۔ طویل ریاضتِ شاقہ کے بعد آخر اُسے خدا کی تجلی نظر آئی جو ایک لحظ میں اس کے ہوش و خرد پر بجلی گرا کر روپوش ہو گئی۔ جب وہ اپنے ہوش میں آیا تو اُسے دیدار کی آرزو نے مزید بیقرار کر دیا۔ لیکن انتہائی یکسوئی کے بعد بھی اُسے دوبارہ جمالِ ایزدی نصیب نہ ہوا۔ آخر جب صبر کا دامن اُس کے ہاتھ سے چھُوٹ گیا تو اسے فضا میں سے ایک آواز سُنائی دی ——— اے کم سِن بزرگ تجھے اس جنم میں اس سے زیادہ دیدار نصیب نہیں ہو سکتا۔ البتہ جب تو زندگی کے موجودہ لباس کو بدل کر دوسرے جنم میں ظاہر ہوگا تو پھر تو نہ صرف ہمارے دیدار سے مشرف ہوگا بلکہ ہماری شکتی کا مظہر اور ہمارے گیان کا عالم حقیقی بن جائیگا۔"

اس غیبی آواز سے وہ مطمئن ہو گیا اور برہما کے دھیان میں اپنی بقیہ حیات کو گزار کر آخر دیوتا کے رُوپ میں ظاہر ہوا اور عالم اور اہلِ عالم کو اپنی شکتی اور گیان کا مداح بنا لیا۔

گگن میں تان کیا گونجی!

گگن میں تان کیا گونجی کسی پیارے کی مُرلی کی
مدھر بھی ہے رسیلی بھی، کبھی ہوتی ہے تیکھی بھی
سُنی جب وہ پپیہے نے تو اُس کو پڑ گئی پی کی
لگا وہ بولنے پی پی!
سُنا جب اس کو کوئل نے، تو اس کی چونچ سے نکلی
دھُونی کچھ باوروں کی سی

گگن میں تان کیا گونجی کسی پیارے کی مُرلی کی
اُٹھی جھنکار موروں کی۔ اُدھر گانے لگے پنچھی
ہزاروں بولیاں اپنی!
چکور آپے سے باہر ہو گئے، مینا اُدھر بولی!
پکار اُٹھا اُدھر طوطی
گگن میں تان کیا گونجی کسی پیارے کی مُرلی کی

فدا سر دُھن لئے اپنے پہاڑی ندیوں نے بھی
ہواہیں آگئی مستی
اُدھر جھرنوں کی جھر جھر ہے اِدھر سرگم ہے سوتوں کی
کہیں رِم جھم ہے برکھا کی
گگن میں تان کیا گونجی کسی پیارے کی مُرلی کی

سلونے سانورے سے جا کہو یہ بینتی میری
رکھوگے پنجرے میں ہی
پڑے تک بیڑیاں یہ واسنا کی کیا نہ ٹوٹیں گی؟
نہیں ملنے کی آزادی؟
گگن میں تان کیا گونجی کسی پیارے کی مُرلی کی

قدیم ہندوستان میں کھیل

کوچن کے پہلے دیوان مسٹر اے۔ ایف۔ ڈبلیو ڈکسن آئی سی ایس لکھتے ہیں کہ قدیم ہندوستان میں کسرت وغیرہ کے بارے میں بہت کم علم ہے۔ رامائن مہابھارت و دیگر ماخذ سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ شکار کھیلنا۔ شہ سواری کرنا۔ ہاتھیوں کی دوڑ کرانا۔ مکے بازی کرنا کشتی کرنا۔ پٹہ لڑانا۔ چکر پھینکنا۔ ان کے لطف اندوز ہونے اور سیر و تفریح کے مختلف طریقے تھے۔ ہندوؤں کے دیوتا ہنومان جی جسمانی اصلاح کاروں کے بھی دیوتا تھے۔ ان کی رہنمائی میں ہندوستان میں بہت قدیم زمانوں میں جسمانی ٹریننگ ہوئی ہے اصلی جسمانی تربیت اس چیز کا سنگِ بنیاد ہے۔ جس پر کہ ایک راسخ الاعتقاد اور سچے ہندو کا روزانہ معمول پر مبنی ہے۔ ہندوؤں کے مذہبی اور ذہنی دستور ایک کامل جسمانی تربیت کے سسٹم پر مبنی تھے۔ وزا کا سندھیا واندنم جس کو ہر ایک ہندو کرتا ہے۔ ایک جسمانی تربیت کا سسٹم ہے جس میں کہ سانس اور جسم کی دیگر حرکات پر قابو پانے کے لئے زور دیا جاتا ہے۔ دن کا کام شروع کرنے سے پہلے علی الصبح دریا میں یا کنوئیں پر اشنان کرنا۔ اس کے بعد سوریہ نمسکار کرنا اور پھر مقدس تلسی کے پودے کے گرد چکر لگانا ہندو کے لئے ضروری قرار دیئے گئے تھے۔

ہم جانتے ہیں۔ کہ ہندو تاریخ کے سنہری عہد میں دیا نمہ یعنی جسمانی تربیت ہر ایک صغیر و کبیر برنا و پیر کے لئے ضروری [illegible] جسمانی فضیلت حاصل کرنے پر زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ ایک ہی طرف خیال رکھنے کو ضروری سمجھا جاتا تھا۔

کیونکہ دلی جاؤ کے بغیر کوئی بھی ورزش کافی مؤثر ثابت نہیں ہو سکتی۔

آریوں کے تعلیم دینے کے گروکل کے طریقے ہیں ایک گرو کے زیر نگرانی ایک آشرم میں جو شہروں کے شور و غل سے دور تنہا جنگلوں میں ہوتا ہے جسمانی ذہنی و اخلاقی سب قسم کی ہدایات پر زور دیا جاتا تھا کھلی جگہ کی کھلی ہوا میں جنگلی جانوروں کے درمیان آزاد اور لطف کی زندگی بسر کرنے کیلئے طالب علم میں اتنی زیادہ طاقت ہو جاتی تھی۔ جو زمانہ حال کے کھیل ہرگز ہرگز عطا نہیں کر سکتے۔

طالب علم اپنے روزانہ معمول کے کام میں اتنی دوڑ دھوپ کرتے تھے۔ کہ انہیں سوائے ہاتھ پاؤں کے تھوڑی سی باقاعدہ ورزش کھینچنے اور کوئی ورزش کرنے کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ ڈنگل سوریہ نمسکار اور آسن وغیرہ ایسی کسرتیں ہیں جو کہ آج کل بھی کی جاتی ہیں۔

راماین میں لکھا ہے۔ کہ جنگ کے دوران میں راجہ دشرتھ کے رتھ کا پہیہ کیچڑ میں پھنس گیا تو رانی کیکئی ان کی مدد کیلئے آئیں اور کیچڑ سے پہیہ نکال دیا۔ ہندو عورتیں روزانہ تلسی کے پودے کے گرد چکر لگاتی ہیں جو کہ عام طور پر ان کے گھر میں اُگا ہوتا ہے۔ ہندو زن و مرد مندر کے گرد اگرد چکر لگاتے ہیں۔ یہ چیزیں ظاہر کرتی ہیں کہ توانا و کمزور انسان کیلئے بھی ہلکی ورزش مذہبی فرائض کے طور پر لازمی قرار دی گئی تھی۔

جنوبی ہند میں کافی قدیم زمانے کے کھیل اب تک جاری ہیں جن میں سے کچھ مندرجہ ذیل ہیں ان کے بارے میں مدراس کے راجے بہادر آر کرشنا راؤ بھوشلے نے اطلاع دی ہے۔ گلی ڈنڈا:۔

یہ بہت قدیم زمانے سے کھیلا جاتا ہے۔ جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں۔ کہ اس میں ایک کھلاڑی ڈنڈے سے گلی کے کنارے پر مارتا ہے۔ اور جب گلی ہوا میں اُچھلتی ہے تو پھر ڈنڈا مار کر اس کو زیادہ سے زیادہ دور پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔ دوسرے کھلاڑی اس کو پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں اور جو پکڑ لیتا ہے پھر وہی کھیلتا ہے۔

قدیم ہندو جنہوں نے فن تیراندازی کو ترقی دی۔ خود بخود گھوڑے پر سے نشانہ لگانے میں طاق تھے۔

تیراندازی:۔ تیراندازی میں کئی تیر ایک ساتھ چھوڑنے کا فن بھی شامل تھا۔ اور تیر واپس تیرانداز کے پاس آجاتے تھے۔ گرو درونا آچاریہ کے پاس جو کہ قدیم وقتوں کے جسمانی تربیت کے اعلیٰ واعظوں میں سے تھے۔ ایک ایسا طریقہ تھا۔ کہ جب وہ اپنے چیلوں کو تیراندازی سکھاتے تھے۔ تو ایک مصنوعی پرندہ درخت پر بٹھا دیتے تھے۔ اور ہر ایک کو اس پر نظر جمانے کے لئے کہتے تھے۔ صرف وہی چیلا نشانہ لگانے میں کامیاب ہوتا تھا جو کہتا تھا کہ مجھے سوائے پرند کے اور کوئی حصہ نظر نہیں آتا۔ ارجن اپنے زمانے کے مشہور تیرانداز تھے اور گرو درونا اچاریہ کے چیلوں میں سے ابھمنیو اور ایکلاویہ کے نام بھی قابل غور ہیں۔

کشتی:۔ کشتی قدیم وقتوں میں بھی لڑی جاتی تھی ٹانجور کے مرہٹہ بادشاہوں کی سرپرستی میں تربیت یافتہ پہلوان رکھے جاتے تھے۔ راجہ سفوجی جو کہ ٹانجور کا حکمران تھا۔ پہلوانوں کی طاقت کی آزمائش کشتی کر کے کرتا تھا۔

مہابھارت میں لکھا ہے کہ بھیم اور جراسندھ میں ۲۸ دن تک برابر کشتی ہوتی رہی اور آخر کار جراسندھ کو شکست ہوئی۔

فٹ بال کی قسم کے ایک کھیل کا ذکر ادی پاروا میں آیا ہے۔ اس کی تفصیل درج نہیں۔ اور ٹیہ بازی

توہر دلعزیز کھیل تھا۔ گذشتہ زمانہ میں پولو کھیلنے کا عام رواج تھا۔ اور گیند میں سے کافی
روشنی نکلتی تھی۔ **ہکے بازی:۔** بدھ لوگ اپنی خانقاہوں کی حفاظت کیلئے اس کا استعمال کرتے
تھے۔ بدھ جاتا کے مطابق ٹیکسالا کی یونیورسٹی پروفیسروں کی تیراندازی میں فضیلت کی وجہ سے بہت مشہور
تھی اور وہاں سندیں بھی دیجاتی تھیں۔

حیوان کے کھیل:۔ زمیندار جو کہ زمینوں کے مالک ہوتے تھے۔ شکار کھیل کر لطف اندوز ہوتے تھے۔
وہ شکار کھیلنے کیلئے عموماً "ہاتھی۔ گھوڑے وغیرہ استعمال کرتے تھے۔
ہرنوں کا شکار کرنے کیلئے چیتوں کو بھی تربیت دیجاتی تھی۔ عام طور پر گیدڑوں۔ ہرنوں جنگلی سوروں
چیتوں اور شیروں کا شکار زیادہ کیا جاتا تھا۔

بیلوں کی لڑائی:۔ بیلوں کی لڑائی بھی ایک عمدہ شغل تھا۔ آج کل بھی ریاست مدورا میں لوگ اس کے
بہت شائق ہیں۔ ایک بیل جس کے سینگوں پر روپوں کی تھیلی بطور انعام بندھی ہوتی تھی میدان میں چھوڑ
دیا جاتا تھا اور کچھ آدمی جو کہ نہتے ہوتے تھے۔ بیل سے لڑ کر انعام لینے کی کوشش کرتے تھے۔ مرغ بازی
کا بہت شوق تھا۔

ان سب باتوں سے عیاں ہے کہ قدیم زمانے میں مشرقی ممالک میں سیر و تفریح کا خیال رکھا جاتا
تھا۔ اور ہر ایک ہندوستانی طالب علم کھیلوں کی قدر بھی جانتا تھا۔

برسات

پھر دلِ محزوں کو تڑپانے کا موسم آگیا
پھر کسی مدہوش پہ مرجانے کا موسم آگیا

آگیا پھر میکشوں کے واسطے دورِ نشاط
حضرتِ ناصح کے سمجھانے کا موسم آگیا

ذرہ ذرہ سے نمایاں حسنِ عالمتاب ہے
پھر خرد کو کام میں لانے کا موسم آگیا

دیکھ کر وہ مسکرائے، مسکرا کر چھپ گئے
اب لجانے اور شرمانے کا موسم آگیا

ہر طرف ہے جھومتی کالی گھٹا مستانہ وار
توڑ کے توبہ کو پی جانے کا موسم آگیا

آبشاروں کا ترنم سبزہ زاروں کی بہار
بے پیئے ہی مست ہو جانے کا موسم آگیا

پھر کسی کی یاد دل میں چٹکیاں لینے لگی
پھر کسی کو یاد فرمانے کا موسم آگیا

ننھی ننھی بوندیاں ہیں اصل میں آبِ حیات
مردہ حسرت کو جلا دینے کا موسم آگیا

جا چکا دورِ خزاں اب آگیا عہدِ بہار
پھر دلِ ناداں کو سمجھانے کا موسم آگیا

چار سُو ماحول غور و فکر ہے گھیرے ہوئے
شعریت میں غرق ہو جانے کا موسم آگیا

مُغل دربار کی جھلک

ں کا درباری جاہ و جلال اور آداب و دستور اپنی جگہ ایسی پرشکوہ تہذیب کا نمونہ تھے جن کی مثال دنیا
درباروں سے نہیں ملتی۔ مغلوں کے دربار کا نقشہ ایک ایسی تصویر ہے جسے اس وقت کی کلچر کا مکمل آئینہ
مغلوں کے دربار میں ملک کے بہترین دماغ۔ مصور، سپاہی، اہل علم و ہنر جمع رہتے تھے۔ اور بادشاہ
ں صحبت، مشورہ خاص اور دستِ سخا سے ہر وقت فائدہ اُٹھاتے تھے۔ کیونکہ بادشاہ زمین پر
سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے اس کا احترام اور وقعت و عزت پرستش کے درجہ تک پہونچ جاتی تھی۔
ر میں پہونچنا یا اچھی جگہ پانا ایک امر مشکل تھا۔ اس کیلئے دولتِ دنیا یا دولتِ دین یا دولتِ کمال و ہنر
تھا جس میں کوئی ذاتی جوہر نہ ہوتا تھا۔ دربار میں بادشاہ سے ہم کلامی اور ہم نشینی کا فخر حاصل نہیں
درباروں اور تقریبات کے موقعہ پر جب درباری ایوان سجائے جاتے تھے ہر شخص کی حیثیت اور
ت کے اعتبار سے اس کیلئے جگہ مقرر کی جاتی تھی خواہ خواص ہوں یا عوام۔ سب کو بادشاہ
ہاتھ باندھ کر نظریں نیچی کئے کھڑا ہونا پڑتا تھا۔ خواہ کتنا ہی بڑا رتبہ ہو۔ کھڑے رہنا لازمی
ن سنگھ امبر جے پور کا راجہ دربارِ اکبری کا مشہور جرنیل تھا اور چونکہ کسی قدر لنگ کا عذر تھا
ہونے کے عصا کے سہارے دربار میں کھڑا ہوتا تھا۔ یہ عصا اب بھی جے پور میں موجود ہے
ن خاص خاص حالت میں بدل سکتا تھا۔ مثلاً جہانگیر نے اپنے لڑکے شہزادہ خرم کو اس پابندی
مستثنیٰ کر دیا تھا جب کہ وہ دکن کی فتوحات و کامیابی کے بعد آگرہ واپس آیا۔ اس وقت
کا خطاب دیا گیا۔ اور تختِ شاہی کے قریب سونے کی مرصع کرسی بچھائی گئی اور شہزادہ کو اس پہ
عزاز بخشا گیا۔

ب بادشاہ تخت پر جلوہ افروز ہوتا تمام حاضرینِ دربار "کورنش" بجا لاتے تھے اور کورنش کا طریقہ یہ تھا
والا اپنا سیدھا ہاتھ ماتھے پر رکھ کر سر کو جھکاتا۔ اپنی بے بسی، بے چارگی، اور حقیری ظاہر کرتا تھا
ے اپنا سر حضور کے سامنے رکھ دیا ہے بادشاہ جو چاہیں کریں۔

نے جہاں اور ایجادات کیں وہاں درباری آداب بھی تھے۔ مثلاً اس نے ایک سلام جاری کیا تھا جس کا
ں آدمی فرش تک اپنا سر جھکا کر اور کمر کو خم کر کے آہستہ آہستہ ہاتھ اوپر اُٹھاتا تا اور ہلاتا ہوا لاتا تھا۔
قہ سلام کا مدعا یہ تھا۔ کہ جہاں پناہ کے لیے میں اپنا سارا سراپا۔ سراپا وجود نذر کرتا ہوں
میں رکھتا ہوں۔ جب کسی کو جاگیر ملتی تھی یا کسی درباری کو خلعت و اعزاز یا رتبہ یا انعام دیا جاتا
ے تین مرتبہ تسلیم ادا کرنی پڑتی تھی اور دیگر موقعوں پر صرف ایک مرتبہ کافی ہوتا تھا۔

ن الٰہی" جاری ہونے کے بعد اکبر کے حاشیہ نشینوں نے ایک اور سلام یا طریقہ آداب جاری کیا
د سجدہ کہا جاتا ہے۔ چونکہ سجدہ صرف خدا ہی کو کیا جاتا ہے۔ اور کوئی بندہ اس درجہ کا مستحق نہیں
ں لیے اس کا بڑی [illegible] مسلمانوں کی خفگی دیکھ کر اکبر نے سجدہ کا رواج صرف خاص خاص
نشینوں کے لیے مخصوص کر دیا تھا [illegible]

کہا جاتا ہے کہ سجدہ کی رسم جہانگیر کے عہد تک قائم رہی۔ مگر شاہ جہان نے اُسے یک قلم موقوف کر
بادشاہ سے براہ راست کوئی گفتگو نہ کر سکتا تھا۔ تخت گاہ سے نیچے ایک حاکم عرضیاں۔ محضرنامے
تحریریں لینے کیلئے کھڑا رہتا تھا۔ زبانی احکام و ارشادات بھی اسی افسر کے ذریعہ بادشاہ تک پہونچائی جاتی
تھیں۔ اور اگر کبھی بولنے کی ضرورت پڑ جاتی تھی۔ تو بہت آہستہ سے نظریں نیچی کئے اور انتہائی انکسار کے
ساتھ بولنا پڑتا تھا۔

ایک چشم دید گواہ ایک مغل دربار کی بابت کہتا ہے:۔

بادشاہ کے مقدس لبوں سے کوئی لفظ یا جملے نکلے۔ خواہ اس کی حقیقت کچھ بھی اہم نہ ہو۔ مگر اہل دربار
اور جملہ حاضرین کا فرض تھا۔ کہ وہ سنتے ہی اپنے ہاتھ آسمان کی جانب اُٹھاتے ہوئے کرامت کرامت کا
پکاریں۔ مطلب یہ تھا۔ کہ جو کچھ بادشاہ نے کہا ہے کرامت اور حیرت آسمانی تعجب کی بات ہے جس پر سب کا
بات چیت میں اپنے آپ کو انتہائی حقیر اور بے حقیقت ظاہر کرنا انکساری کرتے ہوئے۔ بادشاہ کو
دُنیا کی صفتوں کا مالک ہے۔ تمام دُنیا کی دولت اور علم و ہنر کا اور لطافت و ثروت کا مالک دکھانا۔ آداب
میں شامل تھا۔

برنیر ایک جگہ لکھتا ہے!

ایک دفعہ ایک بنیا پیش ہوا اس نے بنائے ہوئے طریقوں سے بادشاہ کو جن الفاظ سے مخاطب کیا
وہ سنئے:۔

"میرے آقا میرے حضور! جب آپ کے قدم زمین پر لگتے ہیں۔ تو اقبال سے مرعوب ہو کر وہ کانپنے لگتی ہے
آپ زمین پر چلتے ہیں۔ تو وہ آٹھ ہاتھی جن پر زمین قائم ہے۔ آپ کی طاقت اور وزن سے لرزنے لگتے ہیں"
بادشاہ نے اس پر مسکرا کر کہا۔ "ہاں جبھی تو ہم پیدل نہیں چلتے پھرتے پالکی میں گزرتے ہیں"
درباری آداب صرف اس ہی ملک کے لوگوں کے لئے نہیں تھا۔ بلکہ کسی ملک اور جگہ کا آدمی ہو۔ اور
آئے تو اُسے اس تہذیب کا نمونہ پیش کرنا پڑتا تھا۔ خاص کر ایرانیوں کے لئے یہ سختی کا حکم تھا ان کو لازمی طور
ان تمام مشکلات کے شکنجہ میں سے گذرنا اور طوعاً و کرہاً یہ تمام احکام بجالانے پڑتے تھے۔

دربار میں کھڑے ہو کر کوئی شخص بھی کھانس نہیں سکتا تھا۔ کھانسی کو روکنا آنکھوں کی پلکوں کو
روکنا اور جسم کی سختی کو مجسمہ کی حد تک پہونچا دینا ایک خاص مشق اور عادت کے بعد درباریوں کو خود
بخود معلوم ہو جاتا تھا۔ اور یہ سب کام بغیر کسی بناوٹ یا تکلیف کے ہوتے رہتے تھے۔ بادشاہ کے رشتے اور
نزدیکی تعلق رکھنے والے بھی ان سخت پابندیوں سے مستثنےٰ نہیں کئے جا سکتے تھے۔ سر طامس رو۔ دربار
جہانگیری کا سفیر آنکھوں دیکھا حال کہتا ہے۔

میں نے شہزادہ خرم کا چہرہ دربار کے وقت بار بار دیکھا ہے۔ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ اس کے چہرے
پر سنجیدگی اور متانت اس قدر کہاں سے آ جاتی ہے۔ ایک خاص انداز سے کھڑا ہوتا ہے ہنسی۔ مسکراہٹ
یا اوچھا پن تو بڑی چیز ہے۔ چہرے کے اعصاب سے کسی حد تک جذبے کے اظہار کی توقع نہیں کی جا سکتی۔
بس ایک خاص حالت میں وہ بُت کی طرح گوش بر آواز کھڑا رہتا ہے۔ اسے ادب اور تہذیب کہتے ہیں۔
اور [illegible]

...آداب اور رسوم کی پابندی لازمی تھی۔
...بادشاہ کا دربار ملک کی اونچی سے اونچی عدالت تھی۔ جہاں ہر شخص اپنی جائز شکایات پیش کر سکتا تھا۔ خود ...ایک ایک عرضی کو سن کر فیصلہ دیتا تھا اور اس کا حکم آخری فیصلہ ہوتا تھا جس کو منصفانہ اور غیر جانبدارانہ ...تا تھا۔ جہانگیر نے ایک بہت بڑی گھنٹی اپنے محل میں لگا رکھی تھی۔ جس کی زنجیر قلعہ کے باہر لٹکی رہتی تھی۔ ...لمبی تھی۔ ایک سرا قلعہ آگرہ کے شاہ برج میں اور دوسرا دریا کے کنارے ایک پتھر کے ستون ...ہوا تھا۔ فریادی جب اس کو بجاتا تھا۔ تو بادشاہ ہر وقت اس کی فریاد کو سننے کیلئے محل سے ...تا تھا۔
...کہا جاتا ہے کہ ایک دفعہ کسی گدھے نے چرتے چرتے اتفاقیہ اس زنجیر کو کھینچ لیا جس کی آواز سن کر ...شاہ نکل آیا تحقیق کرنے پر معلوم ہوا ہے۔ کہ اس کا مالک بہت کنجوس تھا۔ اور گدھے کو اچھی طرح ...نہیں دیتا تھا۔ اس کی فریاد کی بھی رسائی ہو گئی اور گدھے والے کو تنبیہ کر کے چھوڑ دیا۔
چونکہ ملک گیری اور سلطنت میں بادشاہ کی ذات ایک مرکزی حیثیت رکھتی تھی اور عوام کو بادشاہ کی ...سے محبت اور دلچسپی بھی بڑی حد تک ہوتی تھی۔ اس لئے ہر بادشاہ کو یہ لازمی کام تھا۔ کہ وہ صبح کو اپنی ...عوام کو دکھا کر یہ یقین دلائے کہ وہ زندہ ہے۔ اور ان کی ضروریات سے بے خبر نہیں ہے۔ اس رسم ...درشن کہا جاتا تھا۔ دربار کی جانب ایک برج قلعہ معلیٰ میں جھروکہ کے نام سے ہوتا تھا۔ جس میں صبح ...بادشاہ سورج کے نکلنے کا نظارہ کرتا تھا۔ نیچے ریت پر ہجوم خلائق ہوتا تھا۔ جو اس وقت تک نہیں ...تا تھا۔ جب تک ان کا بادشاہ خود درشن سے انہیں سرفراز نہ کرتے۔ یہ بات اس قدر بڑھی کہ برہمنوں ...ایک خاص فرقہ درشنیوں کے نام سے پیدا ہو گیا۔ جو اس وقت تک ناشتہ نہ کرتے تھے جب تک بادشاہ ...نورانی چہرے کی کرنیں ان پر اپنی برکتیں نازل نہ کر دیں۔ جھروکہ درشن کی رسم شاہجہان کے عہد میں خاص ...ر جاری تھی۔ لوگ بادشاہ کے درشن ہوتے ہی اپنے سروں کو بچا کر کے بادشاہ سلامت کا نعرہ لگاتے ...بادشاہ گاؤ تکیہ سے لگ کر اپنا چہرہ مخلوق کی طرف کر دیا کرتے تھے۔ تازہ سورج کی کرنیں بادشاہ کے ...نی چہرے اور چمکتے ہوئے درباری کپڑوں اور مرصع کار جواہراتی زیورات پر پڑتی تھیں۔ دولت و ثروت ...اقبال کا ایک مجسمہ لوگوں کی نظروں سے گزرتا تھا کہ وہ دن بدن ہمگن رہتے تھے۔ جھروکے کے نیچے آنے ...کی پبلک بلا روک ٹوک آ سکتی تھی۔ اور اکثر لوگ ایک رسی ہوئی رسی میں اپنی عرضیاں باندھ دیا کرتے ...۔ اور بادشاہ تک یہ تمام مراسلات جاتے تھے۔
درباری تخت کے گرد چاندی کا ایک کٹہرا رہتا تھا۔ اور کسی قدر اونچی جگہ پر ایک تخت رکھا جاتا تھا ...کے بعد ایک حلقہ آتا تھا۔ جس میں بادشاہ کی اولاد اور سفیر بھی رشتہ دار عزیز راجہ اور بہت ہی معزز ...ستی آ سکتی تھی۔ مگر یہ سب لوگ کھڑے رہتے تھے۔ بادشاہ کے سامنے کوئی بیٹھ نہیں سکتا تھا۔ اس ...بعد عہدے دار اپنے درجہ کے مطابق کھڑے ہوتے تھے۔ آخر میں مخلوق کیلئے کھلی ہوئی جگہ ہوتی تھی۔ ...دو ہزاروں انسانوں کا مجمع ہوتا تھا مگر خاموشی اور انتظام ادب اور قاعدہ اس قدر عمدہ ہوتا تھا۔ کہ ...برت ہوتی تھی۔ بادشاہ ... [illegible] ... نے میں نقارے پر چوب پڑتی تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ بادشاہ نے عدل شروع کر دیا۔ لوگ بادشاہ

سلامت" کی آواز لگاتے اور نظریں نیچی کیے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے۔ سب سے پہلے غیر ملکی خبریں سنائی جاتی
تھیں۔ اور لڑائیوں کے اخبار یعنی مخبر لوگوں کی بھیجی ہوئیں رپورٹیں پیش ہوتی تھیں پھر مخلوق کی باتوں کی طرف
توجہ ہوتی تھی اور دوپہر تک یہی سلسلہ رہتا تھا۔ دوپہر کے آرام کے بعد شام کو جانوروں کی لڑائی کا تماشہ دیکھا
جاتا تھا۔ پھر رات کو خاص محفل ہوتی۔

شاہ جہاں اکبر کے بعد سب سے زیادہ پُرشوکت دربار منعقد کرنے کی وجہ سے مشہور ہے۔ اس کے
دربار اور ایک مغل بادشاہ کے روزانہ پروگرام کا خاکہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

شاہ جہاں صبح ۴ بجے بیدار ہوتا تھا اور صبح ہونے تک نماز اور عبادت میں مشغول رہتا تھا جس میں
کم از کم دو گھنٹہ لگ جاتے تھے۔ پھر بادشاہ جھروکہ میں آجاتے تھے۔ دریائے جمنا کے بیلے میں رعایا
آپ کی صورت دیکھنے کیلئے مشتاق و بیقرار رہتا تھا۔ بادشاہ کی شکل کو دیکھ کر لوگ بادشاہ سلامت کے نعرے
لگاتے تھے۔ تقریباً نصف گھنٹہ تک اِدھر اُدھر کی بات چیت کرنے کے بعد بادشاہ مصاحبوں کے ساتھ
جھروکہ درشن سے ہاتھیوں کی لڑائی کا تماشہ دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ اور صبح کو کم از کم پانچ میچ
کے ضرور ہوتے تھے۔

آگرہ میں شاہ جہان کا دربار عام اب تک بنا ہوا ہے۔ اور دہلی میں بھی موجود ہے جو صناعی اور فن تعمیر
کے کمالات کا نمونہ ہے۔ صبح کو سات بجے کے قریب اُمراء اور ارکان دولت اور رعایا کے عام افراد جمع ہوتے
تھے۔ تخت کے گرد سپاہی تعینات رہتے تھے۔ بادشاہ کے تخت کے پیچھے ایک آدمی چنور ہلاتا تھا اس کی پشت پر
زرکار شاہی پرچم نشانِ سلطنت لہراتا تھا جس کی آب و تاب کو دیکھ کر یورپین سیاح بھی حیرت زدہ ہو جاتے
تھے۔ اور اپنے سفرناموں میں مغل درباروں کی عظمت و شوکت کے افسانے لکھتے تھے۔

ایوان دربار کو مرصع کاری جواہرات اور بیش قیمت آلات و سامان سے مزین کیا جاتا تھا جس کی
سج دھج مغلوں کی نفاست تصور اور فنی مناسبت کا مظاہرہ ہوتی تھی۔ بادشاہ سات بجکر چالیس منٹ پر
عام طور پر دربار ہال میں آجاتا۔ بادشاہ کے تخت پر پہونچتے ہی نقارخانے میں چوب پڑتی تھی۔ دربار کے کام
سے فارغ ہو کر تقریباً ایک گھنٹہ شاہی افواج کا معائنہ خاص خاص باجگزاروں اور سلطنت کے غور و فکر
میں صرف ہوتا تھا۔

فوجی معائنہ میں جنگی جانوروں کا معائنہ ایک خاص بات ہوتی تھی۔ مثلاً معائنہ کی ابتداء میں گھوڑے
بادشاہ کی نظروں سے گزارے جاتے تھے۔ تمام اطراف و ممالک کے چیدہ چیدہ گھوڑے سواری مبارک کیلئے ملاحظہ
کئے جاتے تھے۔ نیز نسل کشی اور فوجی کاموں کیلئے گھوڑوں کی پرورش اور دیکھ بھال کی طرف بھی بادشاہ کی
خاص توجہ تھی۔ معائنہ کے بعد سدھانے والوں کی ہمت افزائی کرتا تھا۔

سر طامس رو مشہور انگریز سیاح جو دربار جہانگیر کو اپنی آنکھ سے دیکھ کر گیا تھا۔ اس کا ایک مصاحب
ٹیری نام اس کی بابت لکھتا ہے کہ:۔

بادشاہ دین۔ جہانگیر بادشاہ کے سامنے سے ایک شیر گزارا گیا۔ سُنا گیا کہ یہ شیر اسقدر سدھایا
گیا ہے کہ کسی کو نقصان نہیں پہونچاتا [illegible] شیر [illegible] صفوں
سے اس طرح گذر گیا جس طرح کوئی کتا گزر جاتا ہے۔ شیر نے کسی کو گزند نہیں پہونچایا۔

دربارِ عام کی تزک و احتشام تو آپ نے دیکھ لی۔ اس کے بعد دربارِ خاص منعقد ہوا کرتا تھا جس کی آب تاب اور شوکت و جلال کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ یہاں پر بھی وہی آداب برتنے جاتے تھے اور کچھ امور سرکاری جو خاص مشورے طے کرنے کیلئے ہوتے تھے۔ یہاں غور و فیصلہ کی منزل سے گزرتے تھے۔ تمام دن مختلف مصروفیتوں میں گزرتا تھا دوپہر کو زنانہ میں تشریف رکھتے تھے۔ اور شام کو چار بجے باہر تشریف لاتے تھے۔ عام طور پر ایک دربار پھر منعقد ہوتا تھا۔ اور مغرب کے وقت تک رہتا تھا۔ اور سورج ڈوبنے کے وقت تک دربار ختم کیا جاتا تھا۔ شاہجہاں نماز پڑھنے کے لئے دربار سے اُٹھ کھڑا ہوتا تھا۔ رات میں حرم میں رقص و سرود کی محفلیں ہوتی تھیں۔ شاہجہاں خود اچھا موسیقی دان تھا اور ان مجالس کے ذریعہ فنِ موسیقی اور فنِ رقص کی ہمت افزائی کرتا تھا۔ تاکہ ہند کے یہ قابلِ فخر فنون قدر نہ کرنے کے باعث مٹ نہ جائیں۔ رات کو سونے سے قبل داستان یا کوئی کتاب تحریر کرنا بھی بادشاہ کے شغل میں شامل تھا۔

رات کو راحت کرنے کے بعد صبح سے پھر وہی پروگرام شروع ہو جاتا تھا۔ جیسا کہ مغلوں کا زمانہ رہا اور جیسے جیسے مزاج و حالات کے بادشاہ ہندوستان کے تخت پر آتے رہے مغل درباروں اور مغل بادشاہوں کی روزانہ زندگی کے آداب و رسوم ویسے ہی ویسے بدلتے گئے مگر عام طور پر یہی پر تو ہر مغل دربار میں دیکھا جاتا ہے۔

ہندو سے مسلمان مسلمان سے ہندو

بن بن کے ہر اک کام بگڑتا ہے الٰہی
بس بس کے چمن اپنا اُجڑتا ہے الٰہی
دونوں پہ اثر ایک سا پڑتا ہے الٰہی
کس واسطے پھر ہند میں لڑتا ہے الٰہی
ہندو سے مسلمان مسلمان سے ہندو

آپس ہی میں یہ جھگڑے یہ تکرار غضب ہے
اک دوسرے سے مائل پیکار غضب ہے
کیوں گرم تعصب کا ہے بازار غضب ہے
جب دیکھئے ہیں لڑنے کو تیار غضب ہے
ہندو سے مسلمان۔ مسلمان سے ہندو

ہر سمت سے ہے ملک کی تذلیل کا ساماں
ہے قوم ستم دیدہ بھی حیران و پریشاں
احباب جو گریاں ہیں تو اغیار ہیں خنداں
صد حیف! ہے اس حال میں بھی دست و گریباں
ہندو سے مسلمان مسلمان سے ہندو

وہ ظلم کا بیداد کا طوفان بپا ہے
ہے قوم مصیبت میں وطن [illegible]
اے اہلِ وطن! اس قدر افسوس کی جا ہے
اس پستی پہ بھی لڑنے کو تیار کھڑا ہے

ہمدرد کوئی دہر میں اپنا نہ رہے گا
دُنیا میں وقار اپنے وطن کا نہ رہے گا
اِس طور سے طور اپنا غلامانہ رہے گا
جب تک تو اِس طرح سے ہی بگڑا نہ رہے گا
ہندو سے مُسلمان مُسلمان سے ہندو

آپس میں محبت ہو تو کیا ہو نہیں سکتا
نفرت سے کسی کا بھی بھلا ہو نہیں سکتا
کام اِس سے کوئی اور بُرا ہو نہیں سکتا
سرشار کسی طور جُدا ہو نہیں سکتا
ہندو سے مُسلمان ۔ مُسلمان سے ہندو

رُوحیں آوازیں دیتی ہیں

رُوحیں آواز دیتی ہیں پیغام سُنائے جاتے ہیں
ہر سمت سنگین پہرے ہوتے ہیں خواب دکھائے جاتے ہیں
ہر گام پہ چھینکیں ہوتی ہیں اور دل سہمائے جاتے ہیں
کچھ قبل بُرے دن آنے کے آثار بتائے جاتے ہیں
ایک ہیبت طاری ہوتی ہے اُف گھر کے در و دیوار ہیں
کچھ موت سے پہلے اعزا اسائے دکھائے جاتے ہیں
اُف موت کے آگے خاک کوئی انساں کی مدد کر سکتا ہے
جانا ہے جنہیں کب کہتے ہیں اک آس بندھائے جاتے ہیں
سب جیتے جی کا ناطہ ہے پھر جائے یہاں کون آتا ہے
آنکھیں نہ چراتے تھے جو کبھی مُنہ آج چھپائے جاتے ہیں
دنیا جھوٹی ہم جھوٹے تھے سب جھوٹا کھیل تماشا تھا
مرنے والے جب مرتے ہیں یہ راز بتائے جاتے ہیں
جو مارے خوشی کے دنیا میں پھولے نہ سماتے تھے ہرگز
وہ قبر کے سانچے میں اک دن دیکھا کہ سمائے جاتے ہیں
کھُلتا ہی نہیں کچھ بھید یہاں قدرت نے کرشمے کیا سمجھیں
دُنیا کے فریبوں سے ہر دم ناوک غم کھائے جاتے ہیں
اس نیند کی ماتی بستی میں ہم کس سے کہیں اور کون سُنے
جب کوچ کا ڈنکا بجتا ہے سوتے بھی جگائے جاتے ہیں
مرنا جینا تو دنیا میں ہر روز لگا آتا جاتا ہے
کیوں لوگ پریشاں ہوتے ہیں کیوں رہنمائے جاتے ہیں
مرنا برحق ہے دنیا میں کیسی کیسی موت مریں
افعال جو جیسے ہوتے ہیں لوگوں کو سُنائے جاتے ہیں

ڈھونڈھے نہ سکوں یاں ملتا ہے بیتاب ہے ہستی جس کیلئے
ذرے بھی اگر ہیں کچھ سشتور وہ قبر میں پائے جاتے ہیں

شیر، چیتے اور ریچھ وغیرہ جنگلی جانور پالنے کے طریقے

(ایک ماہر سرکس کے قلم سے)

بہت ہی کم لوگ ہیں جو شیروں اور دیگر بہائم کو مقید دیکھ کر اس خطرہ اور مصیبت کا اندازہ کر سکیں جو ان کو یہاں تک لانے میں پیش آتا ہے۔ ایک ایک شیر پر سینکڑوں پونڈ کی رقم صرف کی جاتی ہے ایک خوفناک جانور کو شکار کر لینا اس کو زندہ گرفتار کر لینے سے بدرجہا آسان ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ اس کو کسی قسم کا زخم نہ پہنچے۔

ہندوستانی شیر کو زندہ پکڑنے میں بہت ماہر ہیں وہ ایک قسم کے بڑے بڑے پتوں پر لیسدار مادہ چپکا دیتے ہیں۔ شیر کا اس پر قدم پڑتا ہے تو وہ پاؤں سے چمٹ جاتا ہے اور شیر اس سے رہا ہونے کیلئے سر کی مدد لیتا ہے جس کا نتیجہ یہ کہ سر بھی اس قسم کا ہو جاتا ہے۔ اب اس کی طبیعت خراب ہوتی ہے جی گھبراتا ہے۔ اور وہ زمین پر لیٹنا شروع کر دیتا ہے اب تمام پتے اس کے جسم پر چمٹ جاتے ہیں۔ وہ غصے سے دیوانہ سا ہو جاتا ہے۔ بس پھر کیا شکاری آتے ہیں اور جالوں سے پھانس لیتے ہیں۔

بعض لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ ان خوفناک جانوروں کو سدھانے کے بعد ان سے کوئی خطرہ نہیں رہتا۔ سدھانے کے بعد بھی ان سے اتنا ہی خطرہ ہے۔ جتنا کہ جنگلی شیر کے سامنے جانے سے۔ میں نے ان لوگوں سے جو سالہا سال تک ان کے ساتھ بسر کرتے ہیں گفتگو کی ہے۔ اور سب کا یہی خیال ہے اور میں خود بھی عرصہ سے یہی کام کر رہا ہوں۔

مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ ایک ملازم دروازے پر اس انتظار میں کھڑا تھا کہ ریچھ تماشا کے بعد اپنے پنجروں میں واپس آجائیں۔ سب جب حسب معمول اندر چلے گئے لیکن ایک کے مزاج سے شرارت ٹپکتی تھی وہ اچانک مڑا اور ملازم پر حملہ آور ہوا اور ایک سیکنڈ میں اسے گرا دیا۔ امداد فوراً پہنچ گئی لیکن ملازم شدید زخمی ہو چکا تھا اس کا ایک بازو تو اس بری حالت میں تھا کہ بعد میں ڈاکٹروں کو کاٹنا پڑا۔

یہ تو خیر اتنا خطرناک اور سنسنی خیز حادثہ نہیں۔ اس کے بعد بھی مجھے ایک حادثہ کا تجربہ ہوا۔ اس کی یاد سے میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور بخار سا محسوس ہونے لگتا ہے۔ ہمارے سرکس میں البرٹ نیلسن ایک نوجوان تھا۔ سب لوگوں میں ہر دلعزیز۔ وہ شیر کے بچوں کے ساتھ کھیلنے کا عادی۔ ہر روز صبح وہ کچھ دیر کے لئے شیر کے بچوں کے پنجرہ میں جاتا اور ان کو اپنے ہاتھ سے کھلاتا۔ ان بچوں کے پنجرہ کے ساتھ سب سے بڑے "شیر راجہ" رہتا تھا۔ نوجوان پنجرے کے سلاخوں کو پکڑے کھڑا تھا اور شیر اس طرح معلوم ہوتا تھا کہ خواب گراں میں مست خراٹے لے رہا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ نوجوان بھی بے پرواہ تھا۔

ہم اچانک ایک خوفناک چیخ سن کر کانپ اٹھے۔ دیکھا کہ نوجوان کرنل راجہ کے پنجہ میں تھا۔ ہمارے حواس گم ہو گئے۔ ہاتھوں میں سکت نہ رہی ہم تو اپنی آنکھوں سے نوجوان کو مرتا دیکھ رہے تھے لیکن ایک حبشی ملازم نے بہادری اور جانبازی سے اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر شیر پر حملہ کر دیا لیکن باوجود اپنی تمام کوششوں کے نوجوان کو شیر سے مہیب جانور کے پنجۂ قیامت سے رہا کرانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ نوجوان بری طرح ... کیلئے حملہ آور رہا تھا ہم نے ... [illegible]

[illegible] نوجوان کو باہر کھینچا۔ نوجوان کو باہر کھینچ تو لیا لیکن ... [illegible]

ہو سکا۔ نصف گھنٹہ ہی میں دم توڑ دیا۔

چیتا نہایت ہی خوفناک جانور ہے۔ آرام سے بیٹھا ہوتا ہے لیکن معلوم نہیں کس وقت شرارت پر آمادہ ہو جائے
بارہ چودہ فٹ تک اوپر اچھل سکتا ہے بعض اوقات اس سے بھی زیادہ تندی اور غضب میں تمام جنگلی جانوروں
میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک دفعہ سرکس کی مشہور ایکٹرس بھی اس جانور کے پنجہ سے بڑی مشکل سے بچی۔
وہ اپنا کام ختم کر کے بنگلہ کی طرف آئی۔ اس وقت ایک ملازم نے اسے بتایا کہ ایک چیتا جنگلے کے نزدیک پھر رہا ہے۔
مس کنسیل چیتوں کے مزاج سے بخوبی واقف تھی۔ فوراً واپس پلٹی۔ لیکن چیتا اپنی پوری طاقت سے اچھلا اور
مس کو پکڑ لیا۔ اور اس کی گردن پر اپنا پنجہ جما دیا۔ آخر چیتے کو ہلاک کر کے اس نیم مردہ لیڈی کو بچایا گیا۔

ہمارے ہاں ایک نہایت ہی خوبصورت اور طاقتور شیر پکڑا ہوا آیا۔ قد بہت لمبا۔ ایال نہایت خوبصورت
اور آنکھیں شعلہ کی طرح روشن یعنی آج تک ایسا طاقتور اور خوبصورت شیر کبھی دیکھنے میں نہ آیا تھا۔ وہ اپنی
مرضی کا مالک تھا۔ کسی کے اشارہ کی بہت کم پرواہ کرتا تھا۔ اس کے سدھانے والے کو بہت سی تکالیف اور مصائب
کا سامنا کرنا پڑتا تھا وہ نہایت خطرناک تھا۔ اس نے ایک آدمی کو ہلاک اور کئیوں کو زخمی کیا تھا۔ لیکن باوجود
اس کے اس کو ہلاک کرنے کو جی نہ چاہتا تھا اس کے پنجے اتنے طاقتور تھے کہ بیان نہیں کیا جاتا۔

اس کی بڑی زبردست نگرانی کی جاتی۔ سختی کی بجائے نرمی کا سلوک کیا جاتا لیکن اس کا اس پر مطلقاً
کوئی اثر نہ ہوتا تھا وہ ہر وقت اس موقعہ کی تلاش میں رہتا تھا کہ موقعہ ملے تو خوراک دینے والے ہی کو چبا ڈالے
مگر بس نہ چلتا تھا۔ اس کو کسی شرارت یا غلطی کی سزا دینا مصیبت مول لینے کے مرادف تھا اس لئے بہتر
اور مناسب یہی سمجھا گیا کہ اس کو ہر طرح آرام سے رکھا جائے اور کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچائی جائے اور
اکیلا گھبراتا تھا اور روز بروز کمزور ہو رہا تھا۔

اب اس کی محبت کیلئے ایک اور شیر لایا گیا۔ دونوں کے کمروں کے درمیان ایک لوہے کا مضبوط
جنگلہ تھا۔

ایک دفعہ سوچا گیا کہ ان کو ایک بہت بڑے پنجرہ میں منتقل کر دیا جائے تاکہ عوام بآسانی اس کو دیکھ سکیں۔
موسم نہایت خوشگوار تھا۔ ہزارہا لوگ شہر میں جمع ہوئے تھے۔ ہر طرف خوشی و مسرت کا دور دورہ
تھا۔ دونوں شیر چپ چاپ اپنے اپنے پنجروں میں بیٹھے تھے۔ ایک کو تو نہایت آسانی سے دوسرے پنجرے میں
منتقل کر دیا گیا۔ لیکن قیصر کے چہرہ سے شرارت کے آثار ظاہر تھے۔ اس کے ماتھے پر غصہ سے بل پڑ رہے تھے۔
دو چار منٹ نہایت بے چینی سے ادھر ادھر ٹہلا کیا۔ پھر اچانک گرجا سب کے دل دہل گئے۔ گرج کیا تھی
رعد کی کڑک تھی۔ وہ غصہ سے کانپا اور پنجرہ کے اوپر کی طرف کودا۔ اس کے کودنے میں اتنا زور تھا کہ پنجرہ خود
بخود ہی آگے چلنے لگا۔ پیشتر اس کے کہ دوسرے پنجرے کا دروازہ بند کر دیا جائے۔ وہ ان کے سروں پر
کودا اور گلی میں آ رہا۔ اب وہ بالکل آزاد تھا گویا افریقہ کے گھنے جنگلوں میں پھر رہا ہو۔

اس تک پہنچنا موت کے منہ میں جانا تھا۔ لیکن باوجود اس خطرہ کے اس کو از سر نو گرفتار کرنے کی
کوشش کی گئی۔ اب شہر کی حالت قابل دید تھی۔ شیر غصہ میں گرج رہا تھا۔ زمین کانپتی ہوئی نظر آتی تھی کئی لوگ
خوف سے دیوانے ہو [illegible] جانیں
نفس۔ اگر کوئی اس کے سامنے آ کر شکار ہو گیا۔ تو اس کیلئے ذمہ دار ہم تھے۔ علاوہ ازیں عوام میں

...دکا اندیشہ تھا۔ ہر شخص کو اپنی جان بچانے کی فکر تھی۔ ہزاروں کی تعداد میں ایک مقام پر جمع ہو گئے۔ سب زبانی
...ہا تھا۔ عملی کام کرنے کی کسی میں جرأت و ہمت نہ تھی۔

اب شیر سیور میں جانے کے لئے بیتاب تھا لیکن اس نے پنجرہ میں رہنا ہی بہتر خیال کیا۔ اب شیر کا
...نے والا اپنے تین آدمیوں کیساتھ پہنچا اور بڑی مشکل اور چالاکیوں سے اسے قابو میں کیا۔ اس وقت سارے
...میں یہی آواز گونج رہی تھی۔ "شیر کو قابو کر لیا گیا۔ شیر پھنس گیا"۔ گھنٹہ دو گھنٹہ بھر تک یہی غلغلہ یہی
بلند رہا۔ کانوں پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

شیر کو پنجرہ میں بند کرنے کے بعد عوام کے جوش میں اضافہ ہو گیا۔ وہ پنجرہ کی طرف ٹوٹ پڑے۔ گویا دریا
...ٹوٹ گیا ہو۔ ہر طرف آدمی ہی آدمی دکھائی دیتے تھے۔ کوئی نعرے لگاتا تھا کوئی گاتا تھا کسی نے سدھانے
...والے کو اٹھا کر دکھایا۔ سب اس کی بہادری کی تعریف میں رطب اللسان تھے۔ ہزاروں آدمی اس خوفناک شیر کے
...کیلئے آئے حتیٰ کہ ہمیں داخلہ بند کرنا پڑا۔ لوگ خوشی سے واپس جا رہے تھے لیکن ہمارا خون خشک ہوا
تھا۔ شیر ابھی غصہ کے عالم میں تھا۔ وہ پنجرہ سے باہر آجانے کی کوشش کر رہا تھا۔

سیور کے منہ پر کئی آدمی مسلح کھڑے کر دیئے گئے۔ شیر نے گرجنا اور شور مچانا بند کر دیا۔ ایک لحظہ کیلئے بالکل
سکون قائم ہو گیا۔ مگر یہ سکون اسی قسم کا تھا جو عموماً سمندر میں ایک خوفناک اور زبردست طوفان سے
...کر ملتا ہے۔ تین آدمی پنجرہ کا دروازہ بند کرنے کے لئے مامور کئے گئے۔ وہ اندر گھسے ہی تھے کہ شیر سامنے نظر
...سیوں کے ساتھ شکاری کتے بھی تھے۔ جو نہایت سخت جان اور پھرتیلے واقع ہوئے تھے۔

شیر نے پھر ایک دفعہ مقابلہ کیا۔ غصہ سے وہ دیوانہ ہو رہا تھا۔ اس کی گرج سے دیر سے دلیر آدمی کا بھی
...ل گیا۔ شیدا اچانک نظروں سے غائب ہو گیا۔ اب اس کی حالت نہایت خراب تھی۔ چھلانگ لگا کر اس
...گردن توڑ دی تھی۔ فوراً رسیوں سے جکڑ لیا گیا اور اس درندوں کے بادشاہ کو ایسے پنجرہ میں مقید
...کیا جس میں سے بچنے کی امید ہی نہ تھی۔ اب وہ ہمیشہ کیلئے مقید ہو گیا۔

روحِ انقلاب

...ل لاشوں پہ لاشے الاماں　　موت کے بجتے ہیں تاشے الاماں

...گیتی پہ ہے انگاروں کی ڈھال　　ہے ہوا کے دوش پر شعلوں کا جال

...ہے شعلوں سے روئے آفتاب　　سُرخ ہے شعلوں سے دامانِ سحاب

...شعلے کھا رہے ہیں برق و تاب　　تپ رہی ہے ان میں روحِ انقلاب

رکشا والا

پانچ سال سے وہ بھاگ بھاگ کر جی رہا تھا۔

جی رہا تھا —— جیسے کالی راتوں میں ٹوٹے ہوئے ستارے جیتے ہیں! —— "جیسے طوفانی ساحلوں کے پاس پاس بہنے والے شکستہ سفینوں کے بوسیدہ ٹکڑے جیتے چلے جاتے ہیں؛ بے اختیار!"

جوانی کا وہ انقلابی زمانہ جب جسم کے اندر چھپی ہوئی زندگی جینے کی سب سے پہلی تمنا کرتی ہے اور جی چاہتا ہے کہ دنیا کو توڑ پھوڑ کر ہر روز ایک نئے سرے سے بنایا جائے۔ دیوانے شباب کے وہ طلسمی دن رات جب انسان کو پہلی اور شاید آخری بار موت کو پیار کرنے کی ہمت میسر ہوتی ہے اور زندگی کے آڑے ترچھے بھیانک راستے حسین خوابوں کے نیم روشن دھندلکوں میں تحلیل ہو کر ایک جذباتی کہکشاں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

ایسا حشر انگیز و بیش قیمت زمانہ —— اور پھر اس کے پورے پانچ سال۔

نہ جانے انسان کیا سے کیا بن جائے —— اڑنے کی سکت ہو تو ایک بیباک چنگاری بنکر چاند ستاروں کے پہلو پر آگ کی سرخ لکیر سی بناتا چلا جائے... افتادگی پر مائل ہو تو ذروں کے ننھے کلیجوں میں ڈوب کر آندھی کر دینے والی آندھیاں پیدا کرے...... قسمت سے جنگ کرنے کیلئے آمادہ ہو تو صرف ایک اشارہ پر وقت کی رفتار کو روک کر کھڑا ہو جائے.... اور اگر کہیں حسن و محبت سے متصادم ہو تو صرف ایک ساعت میں وہ سب کچھ بن جائے جسے صدیاں بھی تباہ نہیں کر سکتیں۔

مگر غریب رکشا والا اب تک کچھ بھی نہ بن سکا تھا جوانی کے پانچ سال اسے جو کچھ دے سکتے تھے اس سے زیادہ اپنے ساتھ لوٹ کر لیگئے تھے۔ کیونکہ بھوک بہر حال جوانی سے زیادہ مہیب و زبردست طاقت ہے اور بھوک صرف مٹانا ہی جانتی ہے شاید اسی لئے کہتے ہیں کہ مفلس کبھی جوان نہیں ہوتا اور اگر کسی طرح ہو بھی جائے تو پھر زیادہ دن جی نہیں سکتا۔

پھر جب کوئی یوں مسلسل پانچ سال تک اپنے خون کو پسینہ بنا بنا کر ٹپکانے اور ہانپ ہانپ کر اپنے کلیجے کو تھکا دینے کے بعد بھی کچھ نہ بن سکے تو آخر زندہ رہنے کیلئے کون سے فریب کو آسرا بنائے؟

لیکن شاید بہت سے لوگ محض اس لئے بھی تو جیتے رہتے ہیں کہ انہیں مرنا میسر ہی نہیں کبھی کبھی موت زندگی سے بھی بڑی مجبوری بن جاتی ہے اور شاید ایسی ہی مجبوری تھی وہ بھی جس سے آزاد ہونے کیلئے رکشا والا اپنی دکھیا زندگی کو لئے ہوئے پانچ سال سے رکشا کو گھسیٹتا پھرتا تھا۔

خاک دھول میں اٹے ہوئے وحشیوں کے سے بڑے بڑے بال...... غبار سے لدی ہوئی بوجھل پلکوں والی دو بجھی بجھی سی آنکھیں، میلی کچیلی دھجیوں کے نیچے ہانپتا ہوا چوڑا چکلا سینہ...... میل کی موٹی تہوں میں چھپے ہوئے فولادی بازو...... نیلی نیلی ابھری ہوئی رگوں والی برہنہ ٹانگیں...... راستہ کی گھناونی کیچڑ میں پھٹے ہوئے غلیظ پاؤں اور ان سب کے پیچھے دو نازک و خوبصورت پہیوں پر دوڑتی ہوئی مخملیں گدوں والی نظر فریب رکشا!

کتنا بھیانک تھا یہ تضاد!

[illegible] ...... اور بھی زیادہ انسانیت کش ہو گیا تھا۔ رکشا والے کے بیتاب قدموں نے اونچی نیچی سڑکوں کی گندگی میں جس قدر زیادہ ٹھوکریں کھائیں۔ رکشا

...پیئے اتنے ہی سُبک اور خوبصورت بنتے گئے...... اس کے میلے جسم پہ لپٹے ہوئے غلیظ کپڑے جتنا زیادہ تار
...ہوئے رکشا کی نشست کے غلاف اسی قدر حسین و نفیس ہوتے گئے۔

وہ اپنی بے مایۂ جوانی کی قوتوں کو جتنا زیادہ بھاگ کر اپنے پیچھے بکھیرتا گیا اس کی رکشا اتنی ہی تیزی
...کو چن چن کر اپنے اندر جذب کرتی چلی گئی ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے رکشا آہستہ آہستہ رکشا والے کو کھاتی چلی جا رہی ہے
پھر جو کچھ ہو رہا تھا وہ تو ناگزیر تھا رکشا صرف اس ظالم حد تک رکشا والے کی ملکیت تھی کہ چاہے دوڑتے دوڑتے
...ٹانگوں کی اُبھری ہوئی تنی ہوئی رگیں ٹوٹ ہی کیوں نہ پڑیں۔ خواہ ہانپتے ہانپتے اس کے پھیپھڑے بوسیدہ
...دھونکنی کی طرح پھٹ ہی کیوں نہ جائیں لیکن پھر بھی اس کے ہاتھوں کی گرفت رکشا کے بازوؤں سے علیحدہ
...ہو...۔ یعنی رکشا چلتی ہی رہے...... مسلسل...... صبح و شام...... جب تک وہ چلتی
...رہے گی وہ رکشا والے کی ہے اور رکشا والا اس کا...... اس کے پہیوں کی گردش ذرا بھی رُکی تو پھر رکشا والے
...کی ختم ہی سمجھئے...... لیکن رکشا کا مسلسل رواں رہنا صرف اسی پہ موقوف نہ تھا کہ رکشا والا ایک ذلیل
...جانور کی طرح دوڑتا چلا جائے جب رکشا پر بیٹھنے والا ہی کوئی نہ ہو گا تو وہ چلے گی کیسے؟ اور اس لئے حقیقت
...میں رکشا کے مالک وہ تھے جن کی جیب میں پیسے تھے...... وہ جو انسانیت سوز رکشا میں بیٹھ کر کم از کم
...تھوڑی دیر کیلئے خدا بن جانا چاہتے تھے...... وہی جن میں اس قدر سنگدل بن جانے کی جرأت تھی کہ رکشا والے
...کے بے تحاشہ بھاگتے رہنے پر بھی ذرا چیں بہ جبیں ہو کر ایک کرخت آواز میں کہہ سکیں کہ...." ذرا تیز چلو جی ٹانگوں میں
...دم نہیں رہا کیا؟

اور وہ چاہتے تھے کہ چاہے رکشا والا فاقے کرتا کرتا ایک بہتی ہوئی ندی کی طرح سوکھ کر رہ جائے لیکن ان کی
...رکشا زیب و زینت، نفاست و امانت میں بالکل ان کی ہی رکشا معلوم ہو، انہیں یہ سوچنے کی فرصت نہ تھی
...اور نہ ضرورت کہ بدبودار و دریدہ کپڑوں میں لپٹا ہوا یہ فلاکت بدوش انسانی جانور جو تمدن کے خوبصورت ہنگاموں
...میں ایک گھناؤنے خواب کی طرح رواں دواں پھرتا ہے محض ہوا پھانک کر نہیں جی سکتا۔ وہ اگر ایسی
...فضول باتوں کو سوچنے بیٹھ جاتے تو بھلا یہ تمدن کا اتنا بڑا کارخانہ کون چلاتا؟ ایک بیچارہ رکشا والا ہی
...نہیں بلکہ زندگی کے راستوں میں ہر قدم پر اسی جیسے نہ جانے کتنے مُردے لڑکھڑاتے پھرتے ہیں کوئی کہاں تک
...ان کا دل دُکھاتا پھرے...... جب ہم بے سوچے سمجھے آرام سے جی سکتے ہیں تو بیکار اپنا کلیجہ خون کرنے سے کیا فائدہ؟
جن کو قدرت نے زندگی بھر مرتے رہنے ہی کیلئے پیدا کیا ہے اُن کیساتھ ہمدردی کرنا ایک لاشعوری خودکشی ہے۔
لیکن زندگی و تمدن کے اس فلسفے کی بھلا ایک غریب رکشا والے کو کیا خبر ہو سکتی تھی اُسے اپنی زندگی میں سوچنے
...کی ضرورت ہی نہ پڑتی تھی ——— نہ فرصت اور نہ مہلت ——— اور ذہنی جمود کے اس طویل عرصے کے بعد
...اب تو شاید اب یہ بھی یاد نہ رہا تھا کہ رکشا پر سوار ہونے والے مہذب و بلند مرتبہ انسانوں کی طرح اس کے
...پاس بھی ایک دماغ ہے، جس کی حرکت کی تمام تو تمیں مفلسی اور پیہم حیوانی مشقت کے پسینے سے زنگ خوردہ ہو کر
...فطری عمل سے محروم و معذور پڑی ہیں۔ اسے بالکل یاد نہ تھا کہ اس نے کبھی کچھ سوچا ہو۔ جب وسیع شہر کی
...سڑکوں کے جال میں وہ اپنی رکشا کو کھینچتا ہوا گذرتا تھا تو اُسے تو یہ محسوس ہوتا تھا کہ دماغ کا سارا کام اس
...کی ٹانگیں کر سکتی ہیں...... اس کے قدموں کو شہر کے تمام راستے حفظ تھے اور سڑکوں کے تمام نشیب و فراز
...... راستوں [illegible]

کہ اپنے برہنہ سینہ پر بیشمار پہیوں کی گڑگڑاہٹ اور متعدد انسانی قدموں کی چاپ کے زبردست ہنگامے میں بھی
اور ہر سڑک اس کے پاؤں کی دھیمی آہٹ کو بہت دور سے پہچان لیتی تھی اور فاصلے سمٹ سمٹ کر اس طرح
لگتے تھے گویا کسی دیوتا کے استقبال کے لئے لپک رہے ہیں۔ پھر بھلا اس غیر محسوس اُنس اور غیر شعوری ہمدردی
مقدس ماحول میں رکشا والے کو راستہ سوچنے کی ضرورت ہی کیا تھی ...... اور راستہ سوچنے کے علاوہ
کے نزدیک اپنے دماغ کا استعمال ہی کیا ہو سکتا تھا؟

بایں ہمہ جذبات و احساسات کے لحاظ سے وہ اس قدر مُردہ نہ تھا یہ سچ ہے کہ اس کی نامراد جوانی
ایک اس انقلاب سامان ساعت کا تجربہ نہ ہوا تھا جب انسان دو خوبصورت آنکھوں کے سایہ میں اپنی ایک
کو جیسے کر دوسری زندگی اختیار کر لیتا ہے اور اُسے خبر بھی نہیں ہوتی ...... یہ صحیح ہے کہ اسے اور جذباتی
کا علم نہ ہو سکا تھا جب حیات کا سارا التہاب مٹ کر محض ایک دھڑکتی ہوئی چنگاری میں تبدیل ہو جا
اور انسانی ہستی ایک جذبۂ بے اختیار کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں رہتی اس میں شک نہیں کہ وہ انسانوں کے
خوابوں سے واقف نہ تھا جو صدیوں سے نفس پروری اور ہوس پرستی و نشاط کوشی اور معصیت کی نیندوں
خمیر سے تیار ہو ہو کر مادی خواہشات کے انبار میں اپنی تعبیروں کو تلاش کرتے آئے ہیں۔

لیکن آخر وہ انسان تھا اور انسان ہوتے ہوئے وہ مجبور تھا کہ کچھ نہ کچھ چاہے ...... کبھی نہ کبھی کو اپنا
یہ تو ممکن ہے کہ انسان بے سوچے سمجھے جیتا رہے لیکن کون ہے جو کبھی کچھ نہ چاہے اور پھر بھی جی سکے۔
رکشا والا مفلس و فاقہ کش سہی مگر محض بھوک کی آگ تو روح کو راکھ نہیں بنا سکتی۔ وہ محض ایک جانور
لیکن اپنے دل کی دھڑکن کو کیسے بند کر سکتا تھا۔

زندگی کے اندھیرے میں خواہشات اور تمنائیں خوبصورت کرنوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ رکشا والے کی
تاریکی کو بھی ایک چھوٹی سی کرن نصیب تھی۔

اس بیش قیمت کرن میں دو حسین و سُبک پہیے تھے۔ اور وہ ان کو اپنی زندگی کے ہر ایک تاریک گوشے
کھینچتا پھرتا تھا۔ یہ اس کی رکشا تھی۔

اسے کس قدر محبت تھی اپنی خوبصورت رکشا سے! —— کوئی کیا جانے —— جب میل دو
پیہم دوڑتے رہنے کے بعد اس کی گندی نم ہتھیلی پر چند پیسوں کی صورت میں مکروہ انسانی بوجھ کو گھسیٹنے کی
رکھ دی جاتی تو اُسے یہ بھی یاد نہ آتا کہ اس کے ہانپتے ہوئے چوڑے سینے اور پسینہ سے تر اور قوی بازو
کی قوت مسلسل بھوک سے جنگ کرتے کرتے بیدم ہو کر گر پڑنے کو ہے، اسے اس کا احساس نہ ہوتا کہ شہر کی
تنگ و غلیظ گلی کے مسمار شدہ مکان میں اس کی بوڑھی اندھی ماں اس کے قدموں کی آہٹ پر اپنی دکھیاری زند
کی آخری اُمید لگائے بیٹھی ہے —— اس کا پہلا خیال تو صرف یہ ہوتا تھا کہ اتنی دور تک اتنے بھاری
کو سنبھالے رکھنے سے کہیں اس کی عزیز رکشا کے نازک پہیوں کو کوئی صدمہ تو نہیں پہونچا، بالکل ایک دیو
کی طرح وہ رکشا کا طواف کرنے لگتا اس کے دل کی ضربات تیز تر ہو جاتیں، اس کی ساری محبت اور اس کی
روح کا سارا شوق سمٹ کر اس کی نظروں سے ٹپکنے لگتا اس کا جی چاہتا کہ بے اختیار اپنی تھکی ہوئی رکشا
لپٹ جائے اور اس کے مخملیں گدّوں پر اپنی پیاسی آنکھیں رکھ کر کہے —— میں کیا کروں، میری
مجھے دوڑنا ہی پڑتا ہے اور میرے ساتھ تجھے بھی کاش! میں ایک پتھر کی طرح بے حس و حرکت

سکتا کاش مجھے اس کی اجازت ہوتی کہ تیری نازک ہستی کو کچلنے والی وزنی لاشوں کو اپنے شانوں پر اُٹھا کر لے جا سکوں ـــــ لیکن آہ ـــــ میرے شانے گندے ہیں ـــــ میرا لباس دریدہ و متعفن ـــــ اور تیرے گدے نرم و خوبصورت ـــــ لوگ تجھے چاہتے ہیں ـــــ مجھے نہیں۔ وہ تیری قیمت ادا کرتے ہیں ـــــ میری نہیں ـــــ کتنے حریص ہیں یہ انسان ـــــ اگر وہ صرف تجھے ہی مجھ سے چھیننے کی کوشش نہ کریں تو ان کی خدائی میں کونسی کمی رہ جائے گی مگر وہ کہتے ہیں رکشا ہماری ہے ـــــ ایک غریب کے قبضے میں یہ دو خوبصورت پہیے بھی نہیں دیکھ سکتے وہ! ـــــ وہ چاہتا تھا کہ یہ سب کچھ کہہ ڈالے ـــــ یہ اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ـــــ مسلسل کہتا رہے ـــــ یہاں تک کہ اس کی رکشا اُسے اپنے آغوش میں لیکر اُن بعید فضاؤں کی طرف پرواز کر جائے جہاں انسانی لاشوں کو چلنے پھرنے کا شوق نہ ہو۔ لیکن یہ سب کچھ کہنے کیلئے اس کے پاس الفاظ ہی کہاں تھے۔ الفاظ دماغ کی پیداوار ہیں رکشا والے کے پاس "دماغ" نہ تھا لیکن صرف دل..... اور دل کی کائنات ایک تڑپ کے ماسوا کچھ نہیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جب اُسے اپنی رکشا پر بہت ہی محبت آتی تو وہ کچھ کہنے کی بجائے رو پڑتا تھا ـــــ کس قدر سادہ مگر طوفانی محبت تھی یہ ـــــ کتنی حیرتناک! ـــــ کیسے یقین آسکتا تھا کہ وہ جسے جینے کیواسطے ایک ذلیل جانور کے پیکر میں تبدیل ہونا پڑتا ہے اپنے سینہ میں اپنا مقدس دل اور اس قدر شدید احساسات رکھ سکتا ہے کون باور کرے گا کہ چوب و آہن کی یہ حقیر مخلوق ـــــ رکشا ـــــ ایک مردہ انسان کے قالب میں اس قدر عمیق جذبات کی تخلیق کر سکتی ہے ایسی بے تکی باتوں پر کون ایمان لا سکتا ہے بھلا؟ ـــــ ایسی کہانیوں کے واسطے اس بیسویں صدی میں بھی کوئی جگہ نہیں۔ "تختِ طاؤس" اور "کوہ نور" کے ساتھ شہنشاہوں کی داستانِ تعشق ہو یا قلوپطرہ مصر اور لیلئ نجد کے رنگین رومان ـــــ حسن و محبت کے پسِ منظر پر گناہ و ہوس کا عریاں رقص ہو یا پھر سیم و زر کے پردوں پر فریب و منافقت کے خوبصورت مناظر ـــــ ہمیں ان سب کی ضرورت ہے ان میں کم از کم ایک زندگی تو ہے ـــــ ایک تڑپ ایک سنسنی ـــــ ایک حقیقت ـــــ ان مناظر اور افسانوں سے اور کچھ نہیں تو تھوڑی دیر کیواسطے "حظِ نفس" تو ملجاتا ہے مگر بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ ـــــ ایک ننھی رکشا اور ایک رکشا والا ـــــ وہ دونوں چاہتے تھے ایک دوسرے کو ـــــ دیوانہ وار ـــــ کس قدر لغو! ـــــ سراسر بے بنیاد اور بے کیف ـــــ ایسے مضحکہ خیز رومان صرف دیوانوں کی دنیا میں ہی ممکن ہو سکتے ہیں ـــــ مگر کون ہے جو بتلائے کہ دیوانہ کون ہے ـــــ ہم یا وہ جو دیوانے کہے جاتے ہیں؟ ـــــ کیا یہ ممکن نہیں کہ دنیا اس منزلِ فریب سے آگے شروع ہوتی ہو جسے ہم ہوش و حواس کے نام سے تعبیر کرنے لگتے ہیں کیا یہ حقیقت نہیں کہ بلندی و پستی خیر و شر اور قرب و بعد محض اضافی مفہوم رکھتے ہیں؟ پھر اگر ہوش و دیوانگی کا وجود بھی ایک دوسرے کے عدم کے بعد زندہ نہ رہ سکتا ہو تو کیا تعجب! ـــــ اچھا یہ محض دیوانگی ہی سہی لیکن دیوانگی بھی تو ایک حقیقت ہے ـــــ اس میں بھی تو ایک حقیقت ہے ـــــ ایک تڑپ ـــــ پھر ایک بدنصیب وحشی رکشا والا اپنی رکشا کو تختِ طاؤس یا کوہِ نور کی طرح چاہنے پر مجبور ہو جائے تو اس میں ہنسنے کی بات کیا ہے، پانچ طویل سال سے رکشا تنہا زندگی کی واحد انیس رہی تھی۔

زندگی کے اونچے نیچے راستوں پر دونوں دوش بدوش شب و روز رواں دواں رہے تھے اپنی طویل معیت

کے بعد بھی اگر نوجوان مٹنے کے باوجود اپنی رکشا پر محبت کے فطری تقاضوں کو مرکوز نہ کر دیتا تو اپنی زندگی کی بھیانک
میں اب تک کبھی کا مر چکا ہوتا جسم تو بھوک کی آگ میں جلتے رہنے پر بھی متحرک رہ سکتا ہے مگر روح محبت سے
ہو کر ایک پتھر بن جاتی ہے —— وہ پتھر جس پر لاتعداد زندگیوں کے خوبصورت آبگینے ٹوٹتے آئے ہیں۔
—— دُنیا میں —— انسانوں میں —— محبت کا راج کہاں نہیں ہے —— ؟ سپاہی
دلہن اس کی تلوار ہے اور مصنف کا محبوب اُس کا قلم —— شاعر اپنے جذبات کا پرستار ہے اور فلسفی اپنے
افکار کا —— منفی و مادی بصارت جسم کی رعنائیوں کو پوجتی ہے اور مذہبی بصیرت روح کی رنگینیوں کو
—— حیوانیت اپنے کام و دہن کی تسکین چاہتی ہے اور انسانیت اپنے ترک و ایثار کی لذت —— اور جو
جو کسی کی بھی پرستش نہیں کرتا اُسے مجبوراً خود اپنی پرستش کرنی پڑتی ہے —— اس کے سوا کوئی چارہ کار
نہیں —— یہ کچھ نہ کچھ چاہنا بھی کس قدر بے اختیار فعل ہے —— کس قدر اضطراری و ناگزیر ضرورت ہے
بیدار رہتے ہوئے بھی ہم سب کے سب مجبور ہیں کہ دن رات خوابوں سے کھیلتے رہیں اور دنیا کی کسی نہ کسی محبوب شے کو چاہتے
اپنا بنانے اور اپنا بنا کر تباہ کر ڈالنے کے اتنا ہی کھیل کو جاری رکھیں —— یہی شوق مسلسل —— یہی
سوختن ناتمام —— رُوحِ حیات ہے —— زندگی کے اس ستم ظریف قانون نے رکشا والے کو بھی مجبور کر دیا تھا
کہ اپنی زندگی کی ویرانیوں کو گوارا بنانے کے لئے خوبصورت مرکزِ خیال و منظر تلاش کرے —— پھر بھلا اس کی سبک و
نازک رکشا سے زیادہ حسن و جمال اُسے کہاں مل سکتا تھا اس کے جوانی کے تمام سہانے خواب کالی رات کے روشن ستاروں
کی طرح جس آفتاب سے کسب نور کر سکتے تھے۔ وہ یہی رکشا تھی —— زندگی میں رکشا سے آگے اور کیا کیا ہو سکتا ہے؟
اس کی فکر رکشا والے کو نہ تھی —— نہ فکر اور نہ ضرورت۔

مگر آخر کار ایک انقلاب نے اس کی زندگی کو تہ و بالا کر دیا۔

یہ انقلاب جس قدر شدید تھا اتنا ہی برق رفتار بھی —— پُر غیض آندھی کا ایک جھونکا جس نے ایک انسانی
شمع کے تھرتھراتے ہوئے شعلے کو پہلے بھڑکایا اور پھر خاموش کر دیا۔ وہ ستارہ جو آسمانی رفعتوں میں اپنی کرنیں بکھیرتا
ہوا نہ جانے کب سے آوارہ و سرگرداں تھا۔ ناگاہ ایک پُراسرار چاند کے قریب سے گذرا اور جذب و کشش کے صرف
ایک لطیف جھٹکے میں پارہ پارہ ہو کر فنا ہو گیا۔ تاریکی کے سینے پر روشنی کی ایک باریک لکیر کوندگئی۔ زندگی کو ایک
تباہ کن جھٹکا سا محسوس ہوا اور بس پھر وہاں کچھ بھی نہ تھا۔

رکشا والے نے دیکھا کہ رکشا کی گھومتی ہوئی دُنیا کے اُس پار دو خوبصورت آنکھیں نہ جانے کہاں سے اچانک
طلوع ہو گئی ہیں۔ محبوس و خفیہ جذبات کا طوفان خطرناک سُرعت و شدت کیساتھ اُمڈا اور دیکھنے والوں نے دیکھا
کہ ایک ساعت کے بعد نہ وہاں وہ رکشا تھی نہ وہ رکشا والا —— یہ دونوں ان دو ساحر آنکھوں کی پہنائیوں
میں جذب ہو چکے تھے۔

طوفانی بارش کے شور میں "فرش پا" کے اس پار سے سہمی ہوئی ایک نسوانی آواز پکار رہی تھی —— "رکشا
رکشا"! —— رکشا والے نے نظر اُٹھائی اور بس اس ایک نظر میں اُس نے وہ سب کچھ
پایا جس کے واسطے آج تک انسان کوئی لفظ نہیں بنا سکا۔ آج زندگی میں پہلی بار اُسے یہ محسوس ہوا کہ دُنیا میں
رکشا سے زیادہ مسحور کن کوئی مخلوق بھی ہو سکتی ہے۔

دو ساحر آنکھوں والی ایک نحیف و نزار ... زندہ سوچ [illegible]

—— جیسے مسکراتی ہوئی بجلی کی ایک حسین لہر مجسم ہو کر رہ جائے۔
اور وہ وہاں بارش کے طوفان میں ایک خوفزدہ ہرنی کی طرح چلا رہی تھی —— "رکشا؟ —— رکشا؟"
آج سے پہلے نہ جانے کتنی مرتبہ رکشا والے کو نسوانی آوازوں نے پکارا تھا وہ ہر قدم پر ایسی آوازیں سننے کا عادی تھا اور ان کے مفہوم کو سننے سے پہلے سمجھ جاتا تھا۔ لیکن آج اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ جب عورت کو اس طرح پکارتی ہے تو اُس کے معنی کیا ہوتے ہیں وہ شاہراہ کے بالکل وسط میں اپنی رکشا کو لئے ہوئے ایک دیوانہ کی طرح استادہ تھا اور اس کے چاروں طرف متعدد قسم کی گاڑیاں اسے راہ سے ایک طرف ہٹانے کے لئے شور کر رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ مجروح دل انسانیت کا ایک دیوتا ہے جو سائے تمدن کی رفتار کو روک کر کھڑا ہو گیا۔
دوسرے ہی لمحہ زرّیں ساری والی دوشیزہ اس کی رکشا کے مخملیں گدّوں پر بیٹھی ہوئی کہہ رہی تھی —— "چلو —— جلدی —— لکشمی بھون!"
رکشا والے نے سُنا جیسے اُس کی شرابور غلیظ قمیص کے نیچے دھڑکتا ہوا دل کہہ رہا ہے —— "لکشمی بھون چلو —— جلدی —— بہت تیز" —— موسلا دھار بارش —— اور رکشا! —— سہانے لمحات میں انسان عقل سے بہت دور اور قسمت سے بہت نزدیک ہو جاتا ہے۔
نصف گھنٹے کے بعد پانی میں ڈوبی ہوئی رکشا ایک عالیشان کوٹھی کے پورٹیکو میں کھڑی تھی نیم آلودہ ساری "شفاف غمازی" کو چھپاتے ہوئے مرمریں دوشیزہ ایک ساعت کے واسطے ایک "شعلہ بے مایہ" کے سامنے جھکتے ہوئے تھی اور اس کے بعد —— فطرت اور برق و باراں کے غیض نے جن انسانی تمدنی امتیازات کو نصف گھنٹے کو مٹائے رکھا تھا لکشمی بھون کی ایک جھلک نے اُن سب کو پھر اُبھار دیا۔
رکشا والے کو ہوش سا آیا —— زرّیں ساری میں لپٹا ہوا مرمریں خواب وسیع اور سربفلک کوٹھی کے آراستہ برآمدوں کی بھول بھلیوں میں غائب ہو چکا تھا اور رکشا والے کی کانپتی ہوئی ہتھیلی پر ایک چونی چمک رہی تھی۔
شرابور بالوں میں اپنی لرزاں اُنگلیوں سے شانہ کرتا ہوا وہ رکشا کے قریب پہونچا لیکن دوسرے لمحے ہی اُس کی آنکھیں جھپک کر رہ گئیں۔ رکشا کے خوبصورت گدّے پر ایک سُرخ رومال پڑا ہوا تھا۔
اُس رات غریب رکشا والا صبح تک بیدار ہی لیٹا رہا۔ شام سے ہی اسے نہ جانے کیوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے جسم کی طنابیں ٹوٹ گئیں ہیں اور جب شب میں نو بجے وہ اندھی ماں کیساتھ کھانا کھا کر لیٹا تو اس کا جسم بخار کی پوری شدت سے جل رہا تھا۔ بایں ہمہ آج زندگی میں پہلی بار اُسے اپنی رُوح کا ریشہ ریشہ نامعلوم سرور و کیف میں ڈوبا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اور شاید یہی وجہ تھی کہ بوڑھی اندھی عورت کو ذرا بھی شبہ نہ ہو سکا۔ آج اُس کی مفلسی کا چراغ خلافِ معمول تیزی سے جل رہا ہے۔ غریب ماں کو کیا خبر کہ آسمانوں کی پراسرار خلوتوں میں تقدیر کے دو ستارے ناگاہ اپنے مقامات تبدیل کر چکے ہیں رکشا والا آج بے اختیار اور مسلسل مسکراتا رہا تھا بات بات پر ہنسے دیتا تھا —— اور اندھی عورت مسرور تھی کہ اس کی خشک مٹھی کے اندر ایک چونی زیادہ بچ گئی تھی۔

لیکن رکشا والے کو آج جذبات کے ہیجان میں کچھ ہوش نہ تھا۔ کالی رات کے تاروں بھرے اندھیرے میں

اس کیلئے ایک نئی زندگی جنم لے رہی تھی۔ بخار کی شدت اور نہ معلوم جذبات کے تلاطم میں اس کی دنیا آج ہر ساعت میں اس طرح بنتی اور بگڑتی محسوس ہوتی تھی جیسے کھولتے ہوئے پانی کی سطح پر حبابوں کا رقص —— ستاروں سے لیکر اس کی کھلی ہوئی آنکھوں تک اگر کوئی شئے کائنات میں باقی رہ گئی تھی تو صرف خواب ہی خواب۔ وہ خواب جو ایک نادار جوانی پر حرام ہونے کے باوجود بے اختیار چلے ہی آتے تھے۔ ان سہانے خوابوں کے ایک سِرے پر کہکشاں کے اس پار ایک نظر فریب رکشا چپ چاپ اُداس کھڑی تھی اور دوسری طرف ایک دھڑکتے ہوئے دل کے بالکل قریب ایک چھوٹا سا معطر رُومال —— اور پھر اُن کے بالکل درمیان ایک چمکتی ہوئی چونی!

ناگاہ لکشمی بھون کے گلپوش بالاخانے پر دو سحر طراز خوابیدہ آنکھوں نے دیکھا کہ آسمان پر ایک جوان ستارہ ٹوٹا اور خوبصورت رکشا کی سی تیزی کیساتھ اندھیرے کے سینے پر ایک روشن خراش پیدا کرتا ہوا تحت الثریٰ میں جا گرا۔

رکشا اب بھی چل رہی ہے۔ سڑکوں کے نشیب و فراز پر اس کے سُبک پہیے اب بھی اسی طرح مکردہ انسانی بوجھ اُٹھائے پھرتے ہیں —— بارش کے طوفان اب بھی اسی طرح راہ گیروں کو سراسیمہ و تر بتر کر دیتے ہیں رکشا والے تھے تھپیڑے ابھی تک تہذیب و تمدن کی بھٹی کو دھونک رہے ہیں —— لکشمی بھون کے آراستہ برآمدوں کی بھول بھلیوں میں آج بھی زریں ساریاں آنکھ مچولی کھیلا کرتی ہیں —— شاید زمین کے ساتھ ساتھ زندگی بھی گول ہو کر رہ گئی ہے۔

لیکن ——؟

خدا جانے کیوں ——؟

ایک "ساحرہ" دنیا بھر کی تمام رکشاؤں سے نفرت کرنے لگی ہے۔

اچانک ——!

ایک رکشا والا بُری طرح شراب پینے لگا ہے —— بے تکان —— مسلسل —— خصوصاً اسی روز جب اچانک زوروں سے بارش ہو جائے ——،

—— اور وہ چھوٹا سا خوبصورت معطر رُومال؟ کہیں ہو گا۔

—— کون جانے ٭

نعرۂ حق

جفا شعار، ستم کیش، حریت دشمن
ڈرا رہا ہے تو آنکھیں یہ کیا دکھا کے مجھے

مرے قدم کو ہو جنبش یہ غیر ممکن ہے
پیام شوق سے دے درد و ابتلا کے مجھے

کوئی مجھے رہِ حق سے ہٹا نہیں سکتا
اگر یقین نہ ہو دیکھ لے ہٹا کے مجھے

زباں پہ کلمۂ حق کے سوا جو حرف آ جائے
تو پھونک دے میری غیرت ابھی جلا کے مجھے

ہے آ[illegible] تلخ غم
[illegible] مجھے

ہے میرے واسطے معراج روح تختۂ دار
تو خوش اگر ہے تو ہو دار پر چڑھا کے مجھے

...ہر سے لئے منزدہ بقائے دوام
...ا کے کسی سے میں وہ نہیں سکتا
...خیال میں گر ہوں میں قابل تسخیر
...طرف سے اجازت ہے تجھ کو عام اس کی

ستا رہا ہے تو احکام کیا قضا کے مجھے
نہ رکھ سکے گا تو ہر گز کبھی دبا کے مجھے
تو دے بجھا سکے غم و آلام میں پھنسا کے مجھے
کہ دے سکے تو غم و رنج انتہا کے مجھے

خوشی کے ساتھ ہوں راضی ہر ابتلا کیلئے
تو منتخب مجھے کر تو سہی جفا کے لئے

تابوت فروش

مشہور روسی افسانہ نگار پشکن کے افسانے کا آزاد ترجمہ

شام ہو چکی تھی۔ اور وہ اپنے مکان کے ایک تاریک گوشے میں بیٹھا گرم گرم چائے کی ساتویں پیالی ...ں سے لگانیوالا ہی تھا کہ اسے گذشتہ ہفتے کی بات یاد آ گئی۔ توبہ! کتنا خراب موسم تھا! برف میں لپٹی ...تند و تیز ہوا کے جھکولے چل رہے تھے! ور اس کی نحیف و شکستہ تابوت ڈھونے والی گاڑی یوں ہچکولے ...ہی تھی جیسے کوئی دقیانوسی کشتی یکایک کسی اُمنڈتے ہوئے سیلاب کی زد میں آ جائے! اور وہ اس کا ...لبادہ تو بالکل بادبان معلوم ہو رہا تھا۔ نہ جانے کتنی بار اس نے اپنے لبادہ کے بوسیدہ دامن کو گھٹنوں کے ...دبائے رکھنے کی کوشش کی تھی لیکن ہر مرتبہ وہ نکل بھاگتا اور فضا میں پھڑ پھڑانے لگتا۔ اسی کھینچ تان ...وہ کئی جگہ سے پھٹ بھی گیا تھا۔ پرڈ خورف نے ایک ٹھنڈا سانس لیا۔ اور سوچنے لگا۔ اس کے پاس تجہیز ...کفن کے سامان کی کتنی کمی ہے۔ صرف چند معمولی تابوت رہ گئے ہیں جنہیں اس زمانے میں کوئی نہیں پوچھتا ...آخر وہ نئے سامان کے لئے اتنی کثیر رقم بھی کہاں سے لائے؟ یکایک اُمید کی ایک کرن پھوٹ پڑی۔ مسز ...نا جیسی دولتمند عورت اب تک زندگی اور موت کے درمیان بھٹک رہی تھی۔

لیکن مسز ٹرو کنا زندگی کو الوداع کہنے میں حد درجے کی کاہل واقع ہوئی تھی۔ اور یہ صورت حال پرڈ خورف ...ایک تشویشناک فکر بن گئی تھی۔ پھر اسے ایک دوسرا اندیشہ بھی کھائے جا رہا تھا۔ کہیں اس بڈھی عورت ...تجہیز و تکفین کا کام اس کے ورثا کسی دوسرے شخص کے سپرد نہ کر دیں۔ اُمید کی وہ جگمگاتی ہوئی کرن ...پڑنے لگی اور چائے کی دسویں پیالی خالی کرتے کرتے تو اس کے چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا رہ گیا ...یاس انگیز خیالات کے سمندر میں ڈوبنے لگا۔ اچانک دروازے پر کسی نے دستک دی اور گویا وہ سمندر ...ر سے اچھل کر سطح پر آ گیا۔

"اندر آئیے"

اس نے دستک کا جواب دیا اور سنبھل کر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

"معاف کیجئے" پرڈ خورف کے سامنے ایک جرمن تاجر کھڑا مسکرا رہا تھا۔ "معاف کیجئے میں آپ کی ...نہائی میں مخل ہوا۔"

"تشریف رکھئے" پرد خورف نے استقبال کرتے ہوئے پُوچھا۔ کیسے آنا ہُوا؟" "جی بات یہ ہے" نووارد نے
تے ہوئے کہا۔ "میں آپ کا پڑوسی ہُوں" اور ایک چھوٹے سے مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "وہ سامنے
لا مکان جس کا دریچہ آپ کو نظر آرہا ہے۔ میری قیام گاہ ہے۔ کل میں اپنی شادی کی سالگرہ کے موقع پر ایک
ن سیمیں منا رہا ہُوں امید ہے آپ اپنی لڑکیوں کیساتھ شریک ہو کر میری مسرتوں میں اضافہ کریں گے"۔
پاس کی ایک تند و تیز لہر اُٹھی اور پرد خورف کو بہالے گئی۔ اس کا جی چاہا وہ اس "جشن سیمیں" منانے
ے جرمن کو فوراً کمرے سے باہر نکل جانے کا حکم دیدے لیکن وہ رُک گیا اپنی زندگی کی یکسانیت سے وہ تنگ
آ گیا تھا اور کچھ تنوع چاہتا تھا ایسا تنوع جو جس ... اپنی اگر ... عافیت میں سے
وہ تفکرات کے ... پوس پینے والے کیڑوں سے ایک وقتی نجات حاصل کرے اس نے دعوت قبول
ں اور سر کی جنبش سے نووارد کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اسے رُخصت کر دیا۔
دُوسرے دن ٹھیک وقت مقررہ پر وہ اپنی لڑکیوں کے ساتھ جرمن ہمسایہ کے یہاں چل پڑا چھوٹا سا
ن اور مہمانوں کی کثرت کہیں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ پرد خورف نے مہمانوں پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی
طرف جرمن تاجر اور پیشہ ور کچھ کچھ بھرے ہوئے تھے۔ سارے مجمع میں پرد خورف کو صرف ایک روسی نظر
۔ وہ پولیس کا بوڑھا معمولی سپاہی اُرکو۔ لیکن معمولی سپاہی ہونے کے باوجود وہ تمام لوگوں میں
از نظر آرہا تھا۔ کیا بلا کی جاذب شخصیت تھی! پرد خورف نے سوچنا شروع کیا۔ کاش اسے اُرکو
دوستی کا شرف حاصل ہوتا!! . . . . . اور جب کھانا چُنا گیا تو اس نے اُرکو کے عین پہلو میں ایک
نشست حاصل کر لی۔ انواع و اقسام کے کھانے میز پر لدے ... اور مہمان چٹخارے لے لے کر کھا رہے
بے پناہ تعریفوں کے پُل باندھ رہے تھے۔ لیکن پرد خورف اپنی کرسی پر بیٹھا اُرکو کے انہماک اور اس کے
نوں کی تیز رفتاری کو اپنی حیرت زدہ کنکھیوں سے تک رہا تھا۔
"پیٹ ہے یا خندق؟"
اس نے ارکو کی ٹھُسی ہوئی پلیٹ کی جانب دیکھا۔
"اچھے خاصے چار آدمیوں کی خوراک یہ بڈھا سپاہی ہڑپ کر جانے پر تُلا تھا"!
یکایک بالکل غیر ارادی طور پر پرد خورف نے خود اپنے لقموں کی رفتار تیز کر دی اور مہمانوں کا شوق
غب پہلے سے دوچند ہو گیا۔
ابھی لقموں کی دوڑ جاری تھی کہ میزبان نے شراب کی بوتل سنبھالی اور "پیاری لوئی کا جام صحت" کہتے
ئے فوراً ایک جام خالی کر دیا۔ پھر گلاس رکھ کر اس نے اپنی پانچ کم پچاس برس کی بیوی کو شب اول کی سی
کت کیساتھ گلے لگایا۔ اور اس کے صحت مند و توانا رُخسار پر ایک زوردار بوسہ ثبت کر دیا۔ مہمانوں نے
"پیاری لوئی" کی صحت کا دم بھرتے ہوئے اپنے اپنے گلاس خالی کر دیئے۔
"معزز مہمانوں کا جام صحت"۔ شراب کی دوسری بوتل کا کاک اُڑا اور میزبان نے دوسرا جام نوش
۔ معزز مہمانوں نے اپنے میزبان کی فراخ دلی کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہوئے دوبارہ اپنے گلاس
لی کر دیئے۔ جام ہائے صحت کی تعداد بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ ایک تانتا سا بندھ گیا۔ ہر مہمان نے فرداً فرداً
سرے مہمان کا جام صحت نوش کیا۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ ... کا جام صحت۔ ... اس پاس بیٹھے

نوآبادیات کا جام صحت۔ کارخانوں کے مزدوروں کا جام صحت اور ان مزدوروں کے سوتے خنکے آقاؤں کا جام صحت بھی غٹ غٹا یا گیا۔

پرد خورف جام پر جام چڑھائے جا رہا تھا متواتر اور پیہم! اپنے حال و مستقبل سے بے خبر! خون چوس لینے والے تفکرات کے گھناؤنے کیڑے اس سے بہت دُور تھے۔ وہ اپنی مردہ رگوں میں زندگی کا گرم گرم مچلتا ہوا محسوس کر رہا تھا اور اس فکر میں تھا کہ ظرافت میں ڈوبی ہوئی کوئی ایسی بات کہی جائے جو محفل کی محفل کو ہنسی کا گول گپا بنا دے۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ پاس کی کرسی سے ایک منچلا نانبائی لڑکھڑاتا اٹھا اور چھلکتا ہوا جام فضا میں بلند کرتے ہوئے بولا:-

"اپنے اپنے گاہکوں کا جام صحت!"

نیم بد ہوش مجمع میں ایک نئی ہل چل پیدا ہوئی اور تعظیم و تکریم کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ موچی اپنے پُرانے کرم فرما درزی کو آداب بجا لایا۔ درزی نے بھی اپنے قدیم ننھا سا موچی کو جھک کر تسلیم کیا اور نان بائی نے خود زمین بوس ہو کر دونوں کو بندگی عرض کی۔ آداب و تسلیم کا یہ سلسلہ ابھی جاری ہی تھا کہ اٹھا اور پرد خورف سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا:-

"کیوں یار؟" "تم اپنے مدفون گاہکوں کا جام صحت نوش نہیں کر رہے ہو؟"

قہقہے کا ایک بے پناہ سیلاب اُمڈ پڑا۔ لیکن پرد خورف؟ وہ خاموش رہا۔ یہ توہین۔ یہ کھلی توہین وہ کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ لیکن اٹھ کر چلا آنا بھی تو بد اخلاقی کی بات ہوتی۔ وہ بیٹھا رہا۔ خاموش مہر بر لب! شراب انڈلتی رہی یہاں تک کہ رات نصف سے زیادہ گذر گئی۔ اور مہمان رخصت ہونے لگے پرد خورف بھی اٹھ کر چلا آیا۔ نشے میں چُور اور غصے سے بھوت! آخر ان احمقوں نے کیا سمجھ رکھا ہے .... قہقہہ؟ ..... ہوں! بے تمیز! کیا میرا پیشہ ان گدھوں کے پیشے سے کسی طرح کم معزز ہے ...... پرد خورف نے علم اخلاق کے ماہروں کی سی جرح چھیڑ دی۔ کیا تابوت فروش اور جلاد میں کوئی فرق نہیں ہے؟ .... ٹھیر جاؤ! ابھی بتاتا ہوں ..... خیال تھا انہیں ایک دن اپنے گھر کھانے پر بلاؤں ...... لیکن نہیں ..... کبھی نہیں! ...... اب اور ایسی غلطی! .... اب میں اپنے مربیوں کی دعوت کروں گا ...... ہاں! ہاں!! انہیں ضرور بلاؤں گا .... انہیں اپنے مدفون گاہکوں کو ...... مرحوم محسنوں کو ......؟

کم سن خادمہ جو پرد خورف کے پیروں سے موزے نکال رہی تھی۔ اپنے آقا کا منہ تکنے لگی۔

"کیا بک جھک رہے ہیں آپ؟ بھلا آج تک کبھی نے ایسی بات بھی کی ہے! دعوت اور مُردوں کی۔ جائیے سو رہیے۔ اب صبح ہوا چاہتی ہے۔"

"آں ...... آ ...... ں۔"

پرد خورف نے جمائی لی۔ ہاں ہاں ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہوں۔ کیا مرا نام پرد خورف نہیں .... بلاؤں گا .... انہیں ضرور بلاؤں گا .... اور کل ہی ...... آنا .... ضرور آنا .... اے مرحوم محسنو! ضرور آنا ...." اور اپنے مرحوم محسنوں کو نوید دیکر پرد خورف بستر پر پڑ رہا۔ چند منٹ وہ خراٹے لے رہا تھا

مسنر ٹروکن نے آخر زندگی کو الوداع کہہ ہی دی۔ ایک ملازم پرد خورف کو خبر کرنے آیا۔ اور پر د
جیسے باچھیں کھل گئیں۔ اب وہ پرانی تابوت ڈھونے والی گاڑی کے بدلے ماسکو جا کر ایک نئی گاڑی
اور تجہیز و تکفین کے تمام سامان رنگ برنگ کے کفن غسل دینے کیلئے ابٹن۔ کچھ صابن۔ بدن پر ملنے کیلئے
برادہ تابوت کیلئے تختے اور تختوں کیلئے کیل کانٹے وہ تمام سامان لا کر قرینے سے دوکان میں سجا دیگا
ہوئی نیم وا آنکھوں سے پرد خورف نے اپنے مستقبل کا فرحت زا منظر دیکھا اور اس نیک ساعت کے احترام
کو ایک نقرئی سکہ بطور انعام عطا کر کے خود مسنر ٹروکن کے مکان کی سمت ہو گیا۔ مکان کے عین دروازہ
پولیس کے افسروں۔ آس پاس کے تاجروں اور مسنر ٹروکنا کے دور و نزدیک کے رشتہ داروں کی ایک
منڈلا رہی تھی۔ پرد خورف کا دل یکایک نفرت کے شدید جذبے سے بھر گیا۔ یہ جمگھٹا! یہ خود غرض
ہجوم! انسانی لاش پر پٹ جھڑ کی طرح ٹوٹ پڑنے والے گدھوں کا آسمانی غول!!! ۱۰۰۰۰۰
دونوں ہاتھ اپنی ناک پر رکھ لئے۔ وہ لاش کی سٹراند اور تیز بدبو محسوس کرنے لگا۔ تیز تیز قدم
اِن گدھوں سے کتراتا۔ وہ سیدھا مسنر ٹروکنا کی خوابگاہ میں جا کر ہی رُکا۔

خوابگاہ کی تمام کھڑکیاں اور دریچے بند کر دیئے گئے۔ شمع جلائی گئی۔ اور مسنر ٹروکنا کی زرد
ہیئت لاش میز پر لا کر رکھ دی گئی۔ عزیز و اقارب سرخ سُرخ آنکھیں اور پھولی پھولی ناکیں لئے
مرنے والی کے اس بیجان جسم کی آخری زیارت کرنے آئے اور شمع کے ٹمٹماتے ہوئے سائے میں پادری
دُعائے مغفرت پڑھنی شروع کی تو پرد خورف نے مسنر ٹروکنا کے بڑے صاحبزادے کو جا کر اطلاع
و تکفین کا تمام سامان درست ہے۔ صاحبزادے نے شکریہ ادا کرتے ہوئے تابوت کی قیمت وغیرہ
کی ایمانداری پر چھوڑ دی لیکن پرد خورف نے انہیں یقین دلایا کہ وہ ایک پیسے کا بھی ناجائز
کریگا۔ بھلا اس نے آجتک کبھی ایسا کیا ہے؟ ایسا ہی ہوتا تو لوگ اس کی شکایتیں نہ کرتے
کی مزید تشفی کے لئے مسنر ٹروکنا کی جائداد کے مشیر اعلیٰ نے بھی پرد خورف کی ایماندارانہ خدمات
کر دی۔ اور جب پرد خورف ان کو سلام کر کے لوٹنے لگا تو دونوں کی نگاہیں ٹکرائیں اور معنی خیز طور پر
دن پرد خورف بری طرح مصروف رہا۔ لیکن رات کے دس بجے جب وہ مسنر ٹروکنا کو سپرد خاک کر
آ رہا تھا تو اس کے چہرے پر تکان اور خستگی کے آثار کے بدلے مسرت اور اطمینان کی آسودگی جھلک

دس بجے رات کا وقت۔ صاف و شفاف آسمان پر ننھے ننھے بے شمار تاروں کی سج دھج تھی
مدھم روشنی میں پرد خورف تیز تیز قدم اٹھاتا گھر لوٹ رہا تھا۔ مکان قریب آیا تو کسی کو دروازہ
صحن میں داخل ہوتے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

اب یہ اتنی رات گئے کون صاحب ملنے تشریف لائے ہیں؟ وہ بڑبڑایا اور چل پڑا معاً اسے
خیال آیا۔ کہیں صاحبزادیوں میں سے کسی کا کوئی سرپھرا عاشق تو نہیں؟ چند روز ہوئے ایسی ایک
بھی گذر چکی ہیں۔ اور اکثر اس نے اپنی لڑکیوں کو دریچے سے باہر جھانکتے ہوئے بھی دیکھا بلکہ
شک یقین سے بدل گیا اور وہ غصے سے دہکتا ہوا شعلہ بن گیا۔ اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ وہ
[illegible]

سپاہی کی موجودگی۔ اس نفنگے کو گرفتار کرنے میں ضرور مفید ثابت ہوگی۔ وہ چپکا دروازے کے

جانے کیلئے مُڑا ہی تھا کہ ایک دُوسرے نفنگے عاشق سے ٹکر ہوتے ہوتے رہ گئی۔

"کون ہو تم؟"

پرد خورف زور سے چیخا لیکن اس چیخ کے بدلے نووارد نے صرف اپنے سر کی سفید ٹوپی اُتار دی اور مسکرا دیا۔

ندامت سے پردخورف کا سر جھک گیا۔ یہ تو اس کا ایک قدیم آشنا تھا!

"معاف فرمائیے" اس نے بڑی لجاجت سے کہا۔ "میں سمجھا کوئی ایسا ویسا آدمی ہے۔ اندر تشریف لے چلیئے اور غریب خانے کو رونق بخشئے۔"

"تکلف برطرف"! اس کے دوست نے جواب دیا۔ "اندر چلو اور ہمیں راہ دکھاؤ۔"

پردخورف نے دروازہ کھولا اور مہمان کو لئے صحن میں داخل ہؤا۔ وہ دل ہی دل میں سوچنے لگا بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ دوست ساتھ ساتھ ہو اور دوست کا نام دماغ سے کالے کوسوں دُور لیکن اس میں اس کا کیا قصور! یہ کم بخت حافظہ ہی کچھ ایسا بدطینت ہے کہ کچھ یاد ہی نہیں رکھ سکتا۔ وہ جھلّا سا گیا اور حافظہ کو کوسنے لگا۔

پردخورف کو کچھ متفکر اور شکست قدم پا کر اس کے دوست نے ایک ڈانٹ پلائی۔

"سوچ کیا رہے ہو؟ سیدھے اپنے ڈرائنگ روم میں لے چلو!" نہ جانے اس آواز میں کیا اثر تھا کہ پردخورف پر رعشہ سا چھا گیا۔ اس نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور جلد جلد سیڑھیاں طے کرتا ہؤا بالائی منزل پر پہنچا۔ ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولتے ہی اس کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ اس کا کمرہ مہمانوں سے پُر تھا وہ بید مجنوں کی طرح کانپنے لگا۔ اس کا جی چاہا کہ ایک چھلانگ لگا کر بالائی منزل سے نیچے کود پڑے۔ لیکن اس نے اپنے دونوں پیر زمین میں گڑے ہوئے محسوس کئے۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ لیکن اس نے دل کی دھڑکن کو دباتے ہوئے یہ یقین کر لینا چاہا کہ وہ جو کچھ دیکھ رہا ہے محض وہم ہے۔ صرف وہم! لیکن اس کی تندرست و توانا آنکھیں کھلی تھیں۔ اور کمرے میں چلتے پھرتے زندہ سائے منڈلا رہے تھے۔ ان سایوں کے مہیب چہرے اور ان چہروں پر دھنسے ہوئے غاروں جیسے دہن۔ آنکھوں کی جگہ دو چھوٹے چھوٹے تاریک اور بے نور گڑھے! لیکن اس یکسانیت کے باوجود ہر ایک سایہ دُوسرے سائے سے مختلف اور ممتاز تھا۔ یہی اپنی مخصوص انفرادیت کی جھلک لئے ہوئے۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ ان سایوں میں صنفی تقسیم بھی نظر آ رہی تھی۔ پردخورف نے گھبرا کر اپنی آنکھیں بند کر لیں اور شاید وہ ہمیشہ یوں ہی آنکھیں بند کئے ساکت کھڑا رہتا لیکن اس نے کچھ ہمت کی اور آنکھیں کھول دیں اس نے دیکھا کہ اس کے گرد حلقے کی شکل میں تمام سائے اپنے اپنے سروں کو خم کئے کھڑے ہیں۔ بدن پر اطلس اور ریشم کی جھلملاتی قیمتی پوشاکیں ہیں اور سروں پر جاہ کی بنی ہوئی تھیں ٹوپیاں حلقے سے باہر تھوڑی دُور پردخورف کو ایک دُوسرا منحنی سایہ کھڑا نظر آیا پھٹے پرانے میلے کچیلے کپڑے میں ملبوس اور سر ٹوپی کی زینت سے یکسر محروم!

یہ سایہ بالکل الگ تھلگ کھڑا تھا۔ نظریں جھکی ہوئی اور چہرے سے اپنی کمتری کا تلخ احساس جھلک رہا پردخورف نے غور سے دیکھا اور اسے یکایک یاد آگیا ...... یہ قریب کی جرمن نوآبادی کا ایک مفلس مزدور تھا [illegible]

"پروخورف!" حلقہ میں کھڑے ایک سایہ نے جو چہرے مہرے سے فوج کا پنشن یافتہ معلوم ہو
"پروخورف! ہم لوگوں نے تمہاری دعوت قبول کرنی ہے۔ اور اس وقت تمہاری میزبانی کا
کیلئے جمع ہوئے ہیں۔ دیکھو سب ہی موجود ہیں۔ ہاں تمہارے وہ محسن جن کا گوشت گل سڑ
کی ہڈیاں بوسیدہ ہو کر چونا بن چکی ہیں البتہ نہ آسکے۔ پھر بھی ان میں کا ایک شخص تمہاری دعوت
چلا ہی آیا۔"

فضا میں ایک کھڑکھڑاہٹ ہوئی اور گوشت و پوست سے بے نیاز کھوکھلی ہڈیوں کا ا
چیرتا ہوا پروخورف کی طرف بڑھا۔ "کیوں بھئی پروخورف؟" ڈھانچے نے اپنے خوفناک برہنہ
"کیا تمہیں گارڈ کے دستے کا سارجنٹ پیٹر یاد نہیں؟ وہی جس نے ۷۵ برس ہوئے تمہا
سب سے پہلا مال خریدا تھا۔ کیا تمہیں وہ واقعہ یاد نہیں۔ جب شاہ بلوط کے تابوت کے بدلے
سے مجھے صنوبر کا ایک نفیس تابوت عطا کیا تھا۔ حالانکہ تم نے قیمت شاہ بلوط کے تابوت کی
ہڈیوں کے ڈھانچے نے اظہار تشکر کے طور پر پروخورف کو سینے سے لگانا چاہا۔ اور ا
ہڈی اس کی طرف بڑھا دی۔

پروخورف نے ایک چیخ ماری۔ ایک جست کے ساتھ اپنے کو اس خوفناک معانقے سے
ہڈیوں کا وہ پنجر کڑکڑاتا ہوا زمین پر آ رہا۔ اور تمام کمرے میں ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ اپنے
توہین کا بدلہ لینے کے لئے تمام دوسرے سائے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور انتقام! انتقام!! کی صد
کے در و دیوار ہلنے لگے۔ دیکھتے دیکھتے پروخورف ان خوفناک اور مہیب سایوں کے نرغے میں
سانس رکنے لگا۔ دم گھٹنے لگا۔ اور وہ چکرا کر سارجنٹ پیٹر کی بوسیدہ ہڈیوں کے پنجر پر

آفتاب طلوع ہو کر بلند ہو چکا تھا۔ اور اس کی چمکیلی شعاعیں پروخورف کے بستر کو گرما
نے ایک کراہ کیساتھ آنکھیں کھولیں۔ بدن کی نس نس میں اس کو درد محسوس ہوتا۔ ایک عج
رہ رہ کر آنکھوں کے سامنے اس نے کمرے پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی۔ سائے جا چکے تھے اور کم
کونے میں بیٹھی سماوار پر چائے کا پانی گرم کر رہی تھی۔

"صبح بخیر آقا!" خادمہ نے صبح کا سلام کیا۔ "خوب سوئے آپ تو۔ ابھی ابھی ہمسایہ د
کی دعوت میں شریک ہونے کا پیغام دیا تھا۔ لیکن آپ سو رہے تھے۔ اور میں نے جگانا منا
"مسٹر ٹروکن کا آدمی آیا تھا۔ کیوں؟ خیر تو ہے؟"

خادمہ بولی "مر گئیں کیا؟"

"عجب احمق لڑکی ہے" وہ جھلا گیا۔ "کہاں ہے۔ تیرا دماغ؟ تو نے خود ہی مج
کا سامان درست کرنے میں مدد دی ہے۔ اور تو پوچھتی ہے۔ مر گئیں کیا؟"

خادمہ بھی جھلا اٹھی اور بولی "تمہیں ہوش و حواس تو نہیں کھو گئے۔ یا اب تک
باقی ہے؟ کل دوپہر کے بعد سے تو آپ جرمن دوستوں کیساتھ دعوت میں شریک تھے
نشے میں چور گھر لوٹے اور دوخت پشتر بڑے خراٹے لے رہے تھے!"

اوہ! ... پروخورف چونک کر اٹھ بیٹھا اور اطمینان کا سانس لیتے ہوئے بولا:-

ر رہی ہو؟"

"تو کیا جھوٹ بول رہی ہوں" خادمہ نے جواب دیا۔ "اگر یہ بات ہے"۔ ۔ ۔ ۔ پروفیسر
بجائے نس نس میں ایک خوش گوار چمک سی محسوس کی۔
بات ہے تو لاؤ ناشتہ اور چائے"! ☆

قافلے

(۱) صبح

ہے چار سمت خلق کا ہجومِ بیکراں رواں
ملوں سے وہ اٹھا دھواں
تبسموں کے رُوپ میں یہ آنسوؤں کے کارواں
میں کیوں کھڑا ہوں راہ میں

(۲) دوپہر

فضائے بام و در پہ آتشیں غبار چھا گیا
نظر کو غش سا آ گیا
کوئی نزار و ناتواں سڑک پہ لڑکھڑا گیا
میں کیوں کھڑا ہوں راہ میں

(۳) شام

جلیں وہ شمعیں منعموں کی انجمن سنور گئی
سیاہی اور نکھر گئی
یہ کون ننھی جو یوں مرے قریب سے گذر گئی
میں کیوں کھڑا ہوں راہ میں

(۴) رات

سمٹ کے ہر مکان میں رنجِ اضطراب ہو گئی
فضا خموش ہو گئی
ابھی جو شمع جل رہی تھی تیرگی میں کھو گئی
میں کیوں کھڑا ہوں راہ میں

سارسوں کی عدالت

فطریات کے طالب علم جانتے ہیں کہ سارسوں کی جماعت اخلاقی اعتبار سے بہت ترقی یافتہ ہوتی ہے۔ انیسویں صدی کا مشہور ماہر حیوانات بریہم لکھتا ہے کہ حیوانی بادشاہت میں سارسوں کا اخلاقی معیار سب سے بلند ہوتا ہے۔ وہ اس معیار کو قائم رکھنے کیلئے باقاعدہ اجلاس بھی منعقد کرتے ہیں۔ چنانچہ اس نے متعدد ایسے اجلاس دیکھے جن میں تقریباً ایک صد سارس جمع ہو کر گرما گرم بحث میں مصروف تھے۔ اس سلسلے میں ہنگری کے ایک اخبار "پیسٹ" میں ایک دلچسپ مضمون شائع ہوا ہے۔ جس میں ایک عینی شاہد نے بتایا ہے کہ ہنگری سے قریب ایک جھیل کے کنارے سارسوں کی ایک عدالت قائم ہوئی جس میں دو مجرم سارسوں کو عبرتناک سزا دی گئی۔ اس مجال کی تفصیل یوں ہے۔ کہ ایک روز تاس مضمون نگار باہر سیر کرنے کو گئے تو انہوں نے جھیل کے کنارے بیسیوں سارسوں کو اضطراب و ہیجان کی حالت میں جمع دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ کسی اہم معاملے پر غور کر رہے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد تقریباً ۱۷۰ سارس حلقہ باندھ کر ایک ٹانگ پر کھڑے ہو گئے۔ دائرہ کے اندر دو بدنصیب سارس سر نیوڑائے کھڑے تھے۔ گویا مجرم ہوں۔ اتنے میں ایک بہت بڑا سارس حلقہ میں سے نکلا۔ اور جج کی طرح دونوں پرندوں سے اپنی زبان میں باتیں کرنے لگا۔ مجرموں نے اس کا مناسب جواب دیا۔ پھر حاضرین میں سے بعض نے قیں قیں کی۔ جو غالباً "جرح" کا حیواناتی رنگ تھا اس کے بعد جج سارس اپنی جگہ پر واپس آ گیا۔ اور دو تین اور بوڑھے سارسوں سے "مشورہ" کر کے مجرموں سے دوبارہ مخاطب ہوا۔ ایک سارس کو تو اس نے اپنی چونچوں سے زمین پر بٹھا دیا۔ دوسرے کو اس نے اپنی قیں قیں سے ایک طویل وعظ کیا۔ جو مضمون نگار کی سمجھ میں تو نہ آیا۔ البتہ باقی سارس اسے خوب سمجھ رہے تھے۔ وعظ و نصیحت سننے کے بعد مجرم نے پر پھیلائے۔ اور کسی نامعلوم مقام کی طرف اڑ گیا۔ اب دوسرے مجرم کی باری آئی۔ اس کا جرم چونکہ زیادہ سنگین معلوم ہوتا تھا۔ اس لئے تمام سارس اس پر ٹوٹ پڑے۔ اور اسے چونچیں مار مار کر اسی جگہ ہلاک کر دیا۔ جب سارسوں کی عدالت برخواست ہو گئی۔ تو مضمون نگار نے مجرم کی لاش کو اٹھا کر دیکھا۔ تو وہ "نر" سارس کی تھی۔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ یہ جوڑا "بداخلاقی" کا مرتکب ہوا تھا۔ اس لئے عدالت نے ان پر مقدمہ چلایا۔ اور مادہ کو تو تنبیہہ کر کے چھوڑ دیا۔ لیکن نر کو سزائے موت دی۔ کہا جاتا ہے کہ سارسوں کی ایسی عدالت کبھی کبھار قائم ہوتی ہے۔ اور فطریات کے طالب علم اس منظر کو دیکھنے کے لئے ترستے رہتے ہیں۔

وصیتیں

ناولوں میں جن عجیب و غریب وصیتوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ ان میں سے غالباً پورشیا کے باپ کی وصیت سب سے مشہور ہے۔ لیکن حقیقت بعض اوقات افسانے سے بھی بڑھ کر کشش انگیز ثابت ہوتی ہے۔ چنانچہ تاریخ اور سوانح کی کتابوں میں بعض ایسی دلچسپ وصیتیں درج ہیں کہ ان کو پڑھ کر انسان کو یقین ہو

ا ہے کہ "عظمت" اور "جنون" میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ مشہور فلاسفر جیری بینتھم اپنے پیچھے جو ہدایات چھوڑ گیا
میں یہ بھی مرقوم تھا۔ کہ میرے مرنے کے بعد میری کھال اُتار کر اس میں بھُوسہ بھر دیا جائے۔ اور کپڑے پہنا کر میری
ش کو کرسی پر اِس طرح بٹھا دیا جائے جس طرح میں خود سوچ بچار کے وقت بیٹھا کرتا تھا چنانچہ اس کی وصیت
ل کیا گیا۔ اور یہ لاش یونیورسٹی کالج لندن میں اب بھی ایک شیشے کی الماری میں رکھی ہوئی ہے۔ فلاسفر
کھوپڑی اس کے دونوں پیروں کے درمیان پڑی ہے۔ بعض وصیتیں نظم کی صورت میں لکھی گئی ہیں چنانچہ
ن الزبتھ کی منظوم وصیت کا خلاصہ یہ ہے۔ "میں چاہتی ہوں کہ جب میری زندگی کی ندی اُتر جائے۔ تو
رے جسم کو نذرِ آتش کر دیا جائے۔ اور اُس کی راکھ کو دریائے چارلس کی ہنگامہ خیز موجوں کے سپرد کر دیا جائے
ن اگر دریا کا پانی برف سے بدل چکا ہو۔ تو راکھ کو ایک کشتی میں رکھ کر ساحل سے ایک میل دور لیجایا جائے
خدا کا وسیع سمندر مجھے ہمیشہ کیلئے اپنی آغوش میں لے لے"۔ اس نظم میں نہ صرف ترنم ہے بلکہ مضمون بھی
ت منطقیانہ ہے۔ مشہور لندن کے فلپ تھکنی نے اپنی وصیت میں لکھا۔ "میری وفات کے بعد میرا دایاں بازو کاٹ
رے بیٹے لارڈ آڈلے کو دے دیا جائے۔ تاکہ یہ منظر دیکھ کر وہ ہمیشہ اس فرض کو یاد رکھ سکے۔ جو خدا تعالیٰ
طرف سے انسان پر عائد ہوتا ہے"۔

ایک شخص نے اپنی وصیت میں لکھا کہ میری جائداد میں سے ہر سال میری بیوی کو اتنا سونا دے دیا جائے۔
تنا اس کا وزن ہو۔ عدالت نے یہ وصیت منظور تو کر لی لیکن قرار دیا۔ کہ چونکہ جائداد کی آمدنی مقررہ ہے اور
وہ ہر سال موٹی ہوتی جا رہی ہے۔ اِس لئے اس کا وزن صرف ایک مرتبہ کر لیا جائے۔ تاکہ ہر سال اُسے ایک
جتنا ملے۔

چند برس ہوئے۔ مشہور فرانسیسی ناول نویس ماریس ڈیکوبرا نے یہ حیرت انگیز انکشاف کیا کہ اس
نے سائنٹیفک تحقیقات کیلئے "تقریباً" ایک لاکھ مختلف دوشیزاؤں کے بوسے لئے۔ آخر اس کی نظرِ انتخاب لوسی
ڈالپونے پر پڑی۔ کیونکہ ناول نویس کے خیال میں اس کا مزہ جمال کا بوسہ کامل ترین۔ بے ساختہ اور قوی
ترین تھا۔ لوسی ہنگری کے ایک سیاستدان کی لڑکی تھی۔ وہ عشاق کے جھگڑے سے اِس درجہ گھبرا گئی۔ کہ
اس نے خودکشی کر لی چنانچہ اُس نے مرتے وقت کہا۔ "میں مردوں سے تنگ آ کر اِس دُنیا کو خیرباد کہہ رہی
ہوں"۔ ۱۹ برس کی عمر میں اس کی شادی ایک نوجوان سپاہی سے قرار پائی۔ لیکن اُس نے جلد ہی طلاق کے
لئے عدالت میں درخواست پیش کر دی۔ باپ نے لوسی کو منع کیا۔ لیکن وہ اپنی ضد پر قائم رہی۔ طلاق
کے بعد اسی اخراجات کی زیادتی سے بھوکوں مرنے لگی۔ اُس نے اپنے باپ کے خلاف دعویٰ دائر کر دیا
اور عدالت میں بیان دیتے ہوئے کہا۔ "میرے باپ کو میرے اخراجات کا یقیناً کفیل ہونا چاہئے۔ کیونکہ
میں نے اُسے ہرگز نہیں کہا تھا۔ کہ وہ مجھے دُنیا میں لانے کا باعث بنے۔ میری پیدائش کا ذمہ دار وہ
ہے۔ اِسلئے میرے اخراجات کی کفالت بھی اُسی کو کرنا چاہئے"۔ عدالت نے لوسی کی منطق کو تسلیم کیا
لیکن اُس کی درخواست کو یہ کہتے ہوئے مسترد کر دیا۔ کہ یہ ملک کا رواج یا قانون نہیں ہے۔ اسکے بعد وہ
پیرس چلی آئی۔ جہاں پھر مرد پروانہ وار شمع جمال کے گرد جمع ہو گئے لیکن [illegible]
آ کر خودکشی پر مجبور ہو گئی۔

فروری کے ۲۸ دن!

روم میں تقویم کی درستی قیصر جولیس کے زمانے سے ہوئی۔ اُس نے اس سے پہلے کی تمام غلط تقویموں کو نئے سرے سے درست کیا اور شاہ نیوما کے قاعدے کو مع یونانیوں کے ترمیم کے جس میں آفتاب نقطۂ اعتدالِ ربیعی پر ۲۵ مارچ کو آیا کرتا تھا درستی سے جانچنا شروع کیا۔ اور جب اس سے اپنے وقت کے غلط تقویموں مقابلہ کیا تو ۶۷ یوم کا فرق نظر آیا۔ اب اس فرق کو مٹانے کیلئے اس نے اپنے پہلے سال کے نومبر و دسمبر میں دو ماہ کا غیر معمولی اضافہ کیا۔ اس طرح گویا نومبر گذرنے کے بعد دوسرا نومبر ۳۳ یوم کا اور بڑھایا۔ اور دسمبر گذرنے کے بعد دوسرا دسمبر ۳۴ یوم کا اور بڑھایا۔ اس طرح ۶۷ یوم کا ایک کبیسہ قائم کر کے نقطۂ ربیعی کو ٹھیک ۲۵ مارچ پر لایا۔

اب جولیس نے سال کو ۳۶۵ یوم پر دوبارہ قائم کیا۔ مگر طریقہ اس کا نیا قرار دیا۔ اس طرح کہ تین سال تو ۳۶۵ یوم کے ہوا کریں اور چوتھا سال ۳۶۶ کا ہوا کرے۔

اس طرح چوتھائی یوم کی کسر ہر سال میں برابر ہونے لگی اس نے مہینوں کے دنوں کی ترتیب بھی نئے سرے سے شروع کی یعنی جنوری، مارچ، جولائی، ستمبر، نومبر یہ پانچ مہینے ۳۱ یوم کے قرار دیئے اور باقی مہینے باستثنائے فروری ۳۰ یوم کے قرار دیئے۔ فروری معمولی برسوں میں ۲۹ دن کا اور ہر چوتھے برس ۳۰ یوم کا قرار پایا یہ ایک یوم کا اضافہ اخیر ماہ میں نہیں ہوتا تھا، بلکہ ۲۴ یا ۲۵ تاریخ مکرر مانی جاتی تھی۔ اس طرح گویا یوم کا اضافہ ہو جاتا تھا۔ مگر مہینہ کا خاتمہ ہمیشہ ۲۹ ہی تاریخ کو ہوا کرتا۔

الغرض یہ جولین کلینڈر حضرت عیسیٰ کی ولادت سے ۴۶ برس قبل اور شہر روما کی بنیاد سے ۷۰۸ برس بعد قائم ہوا۔ اور اس وقت کا ہی کلینڈر اس وقت تک ایک خفیف ترمیم کے ساتھ جاری ہے۔ قیصر جولیس نے جو مہینوں کی تعداد ۳۱ اور ۳۰ یوم کی اور فروری کی مقدار ۲۹ یا ۳۰ یوم کی قرار دی۔ اس کا عملدرآمد دُور تک ہونے لگا مگر خاص اپنے مُلک میں کمی کے ساتھ ہوا۔ فروری کے اضافہ کا جو قاعدہ چوتھے سال کیلئے مقرر ہوا تھا وہ پادریوں کی خود رائی سے تیسرے سال ہونے لگا اور ابھی ۳۶ سال گذرے تھے کہ بجائے ۹ مرتبہ کے ۱۲ مرتبہ فروری کے یوم میں اضافہ کر دیا گیا۔

خوش نصیبی سے جولیس کے بعد شاہ اگسٹس روما کا بادشاہ ہوا۔ اور اس نے حساب ماہ و سال پر ہی توجہ کی۔ جب اس کو معلوم ہوا کہ پادریوں کی فیاضی سے جولین کلنڈر میں ۳ یوم کا اضافہ ہو گیا ہے تو اس نے ۱۲ سال آئندہ کیواسطے حکم دیا کہ فروری میں یوم کبیسہ موقوف کیا جائے اور اس طرح بارہ سال گذرنے کے بعد پھر تقویم اپنے شمسی قاعدے پر لائی گئی کچھ دنوں بعد شاہ اگسٹس کے تصورات پر توہمات احمقانہ کا ہجوم ہوا ایک روز سوچتے سوچتے اُس نے خیال کیا کہ جولین کلنڈر میں جولائی کا مہینہ جس کو جولیس کے نام سے منسوب ہے وہ تو ۳۱ یوم کا ہے اور اگست کا مہینہ جس کو میرے نام یعنی اگسٹس سے تعلق ہے وہ ۳۰ یوم کا ہے یہ بات نہایت کسرِ شان ہے لہٰذا اُس نے ایک جدید اعلان کے ذریعہ سے اگست کو جولائی کے برابر کر کے جولیس کے مہینوں کی ترتیب بگاڑ دی اور نتیجہ اس قدر مرتب ہوا کہ اپنے اور جولیس ہر مہینہ کو [illegible]

...لی اور بس۔

جب اگست میں ایک یوم کا اضافہ ہوا تو لامحالہ فروری میں ایک یوم کی کمی کرنی پڑی اس لئے وہ ۲۹ یوم
...۲ یوم کا رہ گیا مگر ایک نقص اور پیدا ہو گیا کہ اب جولائی سے ستمبر تک تین ماہ برابر ۳۱ یوم کے ہو گئے اس
...بنانے کیلئے ستمبر اور نومبر ۳۰ یوم کے ہوئے اور بجائے ان کے اکتوبر اور دسمبر ۳۱ یوم کے قرار پائے۔
شاہ اگسٹس کے عہد میں ماہ فروری ۳ برس تک ۲۸ یوم کا اور چوتھے سال ۲۹ یوم کا قرار پایا۔ مذہبی تقویم
...وری کا یوم کبیسہ جولیس کے حساب سے ۲۴ اور ۲۵ تاریخ کے درمیان بڑھا۔ مگر شہری تقویموں
...وری کے آخر میں اضافہ شروع ہوا جس کے متعلق آگے چلکر ہر جگہ عملدر آمد ہو گیا۔ ۳۲۵ء میں علمائے
...و ہیئت کی ایک کونسل شہر نامبش میں اس غرض سے جمع ہوئی کہ وہ جولین کلنڈر کے حساب پر نظر
...اس وقت یہ بحث پیش ہوئی تھی کہ موجودہ سال ۳۶۵ دن ۶ گھنٹہ کی مقدار سے چل رہا ہے
...ب منطقۃ البروج کے دائرے کو ۳۶۵ دن ۵ گھنٹہ ۶۲ء۹۴۸ منٹ میں طے کرتا ہے اس حساب
...تو جولین کلنڈر فصلی سال سے ۱۱ منٹ ۳۸ء۱۰ سکنڈ ہر برس میں بڑھ جایا کرے گا اور اس
...زیادہ زمانہ گزرنے کے بعد سالانہ فصلیں قبل از وقت ختم ہو جایا کریں گی۔
چنانچہ اس وقت تحقیقات کیگئی تو معلوم ہوا کہ آفتاب جو سابق میں ۲۵ مارچ کو نقطۂ اعتدال
...آیا کرتا تھا اب اس زمانہ میں ۲۰ مارچ کو آجاتا ہے لہذا اس کونسل کے زمانہ میں ۲۱ مارچ ۲۵
...قرار دیگئی اور ۱۲۵۷ برس تک اسی حساب سے تسلیم ہوتی رہی۔
جب پوپ گریگوری سیزدہم والی روم کے عہد میں آخری اصلاح کا زمانہ آیا اور آفتاب کی روش کا
...البروج سے ٹھیک مقابلہ کیا گیا تو حیرت کیساتھ معلوم ہوا کہ نقطۂ اعتدال فصلی ربیعی کھسکتے کھسکتے
...مارچ کو آ گیا ہے لہذا ۱۵۸۲ء میں پوپ گریگوری نے حکم دیا کہ اس سال کے ۱۱ مارچ کو ۲۱ مارچ قرار دیا
اور اس کی مطابقت کے لئے پہلا سال بجائے ۳۶۵ یوم کے ۳۵۵ یوم کا مان لیا جائے، جو قبل کلنڈر
...بعد کے تین سال میں اور فصل میں جو اختلاف واقع ہوتا اس کا سبب تو پہلے سے معلوم ہو چکا تھا
...ل ہے ۱۱ منٹ ۱۰ء۳۸ سکنڈ بڑھ جایا کرتے ہیں لیکن اس کے دفعیہ کا اس وقت تک کوئی علاج
...فروری میں جو اضافہ اب تک ہوتا رہا اس سے پایا گیا کہ ۴۰۰ برس میں تین یوم کی کمی ہو جایا کریگی۔
...لہذا پوپ گریگوری نے قرار دیا کہ اس صدی کے اخیر سال میں جس کے سینکڑے چار عدد پر تقسیم ہو سکیں
...۳۶۶ یوم کا ہوگا اور اس کے درمیان کی تین صدیاں جو پورے چار سینکڑے پر تقسیم نہ ہو سکیں
...فروری ۲۸ یوم کا ہوگا۔ اس قاعدہ کو گریگورین رول کہتے ہیں، اور اس کو باستثنائے یونان و روس
...تمام یورپ نے تسلیم کر لیا ہے چونکہ سن عیسوی ہندوستان میں برٹش عملداری کیساتھ آیا اور گریگورین رول
...کی پابندی ہوا۔ اس لئے یہاں کی تمام جنتریوں کو اس کی پابندی لازم ہے اور یہی وجہ ہے کہ
...کا فروری ۲۹ یوم کے بجائے ۲۸ یوم کا ہوا تھا۔ یہاں تک حساب درست ہونے کے بعد اب آگے
...سے ظاہر ہوا کہ ۴۰۰ برس میں ۲۹ یوم کے ۹۷ فروری ہوں گے۔ اس لئے پہلے ۳۶۵
[illegible]

... بدلتے اب ان کو ۴۰۰ برس پر تقسیم کرنے سے فی سال ۳۶۵ یوم ۵ گھنٹہ ۴۹ منٹ

اور ۱۲ سکنڈ ہوتے ہیں لہذا یہ انسانی قاعدہ اب بھی آسمانی قاعدے سے ۲۸ ۔ ۲۲ سکنڈ آگے بڑھ جاتا ہے اس لئے ۳۸۶۶ برس میں ایک دن کی زیادتی نظر آ رہی ہے اس لئے گریگورین رول کو ہمیشہ ٹھیک کرنے کیلئے طے پایا گیا ہے کہ ۴۰۰۰ برس کے بعد ایک یوم گھٹا دیا جایا کریگا یعنی اس سال کا فروری بجائے ۲۹ یوم کے ۲۸ یوم کا مانا جائیگا۔

بہرحال جو قاعدہ ۱۵۸۲ء سے آئندہ زمانہ کیلئے مقرر ہوا ہے اس کا عمل درآمد بحساب ذیل مانا جائیگا۔

(۱) ہر سال فروری ۲۸ یوم کا ہوگا، مگر چوتھے سال ۲۹ یوم کا ہوگا۔ بشرطیکہ اس سال کا عدد چار سے پورا تقسیم ہو سکے۔

(۲) ہر صدی کے اختتام پر ماہ فروری ۲۸ یوم کا ہوگا۔ مگر چوتھی صدی پر ۲۹ یوم کا ہوگا بشرطیکہ وہ صدی چار سے ٹھیک تقسیم ہو جائے۔

(۳) ہر ہزار سال پر ماہ فروری ۲۹ یوم کا ہوگا مگر چوتھے ہزار پر ۲۸ یوم کا ہوگا۔ بشرطیکہ وہ ہزار کا عدد چار سے ٹھیک تقسیم ہو سکے۔

یہاں تک ہر ایک کسر خواہ ایک دن بڑھا کر مٹائی گئی، یا ایک دن گھٹا کر، مگر سب حالتوں میں چار کے عدد کو لئے رہی ہے لیکن ہزار صدیاں یعنی ایک لاکھ برس گذرنے کے بعد گریگورین رول سے ایک دن کا فرق اور پڑنے والا ہے اس فرق کو مٹانے کیلئے کیا قاعدہ مقرر ہوگا اور جو قاعدہ مقرر ہوگا آیا وہ اس فرق کو مٹائیگا یا نیا فرق پیدا کر دیگا اس کو بجز خدا کے اور کوئی نہیں جان سکتا ❊

دلچسپ سائنٹیفک نوٹ

معدنی طاقت کی بجائے نباتاتی طاقت

ہندوستان میں نباتاتی طاقت اور صنعت کے امکانات

از قلم مسٹر ایس۔ ڈی رام مورتی ایم۔ اے آئی سی ایس سی آئی۔ ای

گذشتہ دو سو برس میں جو تہذیب معدنی تیل، لوہے اور کوئلہ کی بنیاد پر قائم ہوئی ہے اس کے بر قرار رکھنے، تقسیم طاقت مکمل طور پر نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ جو معدنی دولتیں انسان کے تصرف میں آسکی ہیں وہ قطعی ناکافی اور محدود ہیں اسلئے جب تک آفتاب کی طاقت سے ہم نباتات کے ذریعہ مدد نہیں لیں گے، انسان کی ضرورتیں پوری نہیں ہوں گی۔ . . . ہمیں ضرور اس منزل پر پہونچنا ہے جب پاور پیدا کرنے کیلئے معدنی تیل کی جگہ نباتاتی تیلوں کا بخوبی استعمال کیا جانے لگیگا!

[illegible] ہوا ۔ [illegible] ایک انگریز مصنف [illegible] کی، جس کا عنوان تھا [illegible] کوئلہ کی آمد [illegible]

اس کتاب کا موضوع مضمون یہ تھا کہ جدید تہذیب کی بنیاد اس طاقت پہ قائم ہے جو انسان لوہے کوئلہ اور
تیل کے ماحصل سے اخذ کرتا ہے ان طاقتوں ہی کے استعمال نے یورپ میں "صنعتی انقلاب" پیدا کیا تھا
جن اقوام کے پاس یہ معدنیات موجود تھے وہ طاقتور بن گئیں۔ ہندوستان میں لوہا اور تیل موجود ہے۔ مگر محدود
مقدار میں اور تیل تو بہت ہی قلیل ہے۔ بڑی مشکل سے اور ٹیرف (محصولات) کی رعایت کے باعث ہندوستان
میں کچھ تھوڑی بہت لوہے کی صنعت ترقی پر آئی ہے۔ ہندوستان کا کوئلہ اعلیٰ قسم کا نہیں ہوتا۔ تیل کی بڑی
مقدار وہ باہر کے ملکوں سے برآمد کرتا ہے اس لئے ہندوستان زیادہ تر خام اشیاء پیدا کرنے سے زیادہ اب
تک کچھ نہیں کر سکتا ہے' بدیشی ملکوں میں لوہے تیل اور کوئلہ کی دولتیں بہت زیادہ ہیں۔

گذشتہ دس سال میں ان چیزوں کے ماخذوں کے سلسلہ میں بہت سی اہم تبدیلیاں رونما ہوئی ہوئی
ہیں۔ جن ممالک میں پٹرول کی کمی تھی انہوں نے گیس پیدا کرنے والے "آلے" تیار کرکے اس کمی کو پورا کر لیا ہے اسی
وجہ سے اکثر ملکوں میں موٹر گاڑیوں وغیرہ میں پٹرول کی بجائے جلانے کی لکڑی کا کوئلہ کھپ رہا تھا۔ اس
سلسلہ میں مدراس نے ہندوستان کی رہنمائی کی ہے۔ مٹی کے تیل کی کمیابی کے باعث نباتاتی تیلوں کی فوری
ضرورت روشنی کیلئے خاص طور پر محسوس ہو رہی ہے۔ اس کام کے لئے کئی قسم کے لمپ ایجاد ہو گئے ہیں حکومت
مدراس کی طرف سے عنقریب مختلف قسم کے لمپوں کی نمائش کی جانے والی ہے۔ جس سے بتایا جائیگا کہ نباتاتی
تیل کس کس طرح جلایا جا سکتا ہے۔ یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس صوبہ میں جس قدر نباتاتی تیل جلانے کیلئے چاہئے
اتنی مونگ پھلی سے پیدا ہو سکتا ہے جو سات لاکھ ایکڑ زمین پر بوئی جائے۔ آج سے دو سال پہلے تک
مدراس میں مونگ پھلی کی سالانہ کاشت ۴۵ لاکھ ایکڑ زمین کے لگ بھگ تھی حکومت نے اس بات کا بھی تجربہ
کیا ہے کہ "ڈیزل" انجنوں میں نباتاتی تیل طاقت کے بطور استعمال کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ نتیجہ یہ معلوم ہوا ہے
کہ مونگ پھلی کا تیل اس قسم کی مشینوں اور انجنوں میں بخوبی طاقت پیدا کر سکتا ہے۔ اس تحقیقات کے نتیجہ کو دیکھ
کر یہ امر آسانی سے طے ہو گیا ہے کہ کوئلہ اور مٹی کے تیل اور پٹرول کی جگہ ہم اپنے کھیتوں اور جنگلوں سے حاصل
ہوئے تیل اور ایندھن سے اچھی طرح کام لے سکتے ہیں۔

تیل اور کوئلہ کے علاوہ "صنعتی انقلاب" نے لوہے کو بھی اپنی طاقت بنا کر استعمال کیا ہے۔ گذشتہ دس
سال میں اس بات کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ جس جس جگہ لوہا استعمال کیا جاتا تھا۔ اس کی جگہ لکڑی استعمال کی
جائے۔ لکڑی کی حفاظت و پرداخت کے نئے نئے طریقے تجربے میں آ گئے ہیں اور دہرہ دون کی جنگلاتی ریسرچ
انسٹیٹیوٹ میں ایک مدراسی انجنیئر نے خاص طور پر اس میں عملی کامیابی کے نمونے پیش کئے ہیں۔ جنگلاتی
ادارہ میں لکڑی کو بطور ایک کارآمد طاقت کے اب استعمال کیا جانے لگا ہے گو ہر موقعہ پر لوہے کی جگہ لکڑی
استعمال نہیں کی جا سکتی اس سے معلوم ہوا کہ جدید تہذیب جن تین چیزوں پہ ہے یعنی کوئلہ' تیل اور لوہا
ان زمین کی بجائے جنگلات اور کھیتوں کی پیداوار سے کامیابی کیساتھ متبادل کیا جا سکتا ہے۔ کوئلہ
اور تیل کی جگہ بخوبی اور لوہے کی جگہ اکثر مواقع پر۔ اس سے ایک زبردست صنعتی انقلاب کی [illegible]
ابھی تک یہ نظری طور پر ثابت ہوتا ہے البتہ اسے ترقی دیکر بڑے پیمانہ پر پہونچانا وقت اور تنظیم کا [illegible]
طاقت کیلئے معدنیات کی بجائے نباتات کا استعمال کرنا [illegible]
زمین سے حاصل کی جاتی ہے لیکن نباتاتی طاقت زندہ آفتاب سے حاصل کی جاتی ہے' اول الذکر محدود

چیز ہے زمین کے بعض حصوں میں جس قدر لوہا، تیل اور کوئلہ موجود ہے اسے انسان کان کنی کر کے نکال سکتا ہے مگر اس سے زیادہ اگر وہ چاہتے تو زمین نہیں اگل سکتی اس بات کا تخمینہ لگایا گیا ہے کہ دنیا میں اس وقت پٹرول جس مقدار پر صرف ہو رہا ہے اگر اسی رفتار سے نکلتا رہا تو دنیا میں پٹرول کی مقدار دس بیس سال کے بعد ختم ہو جائے گی مگر نباتات سے حاصل کردہ طاقت لامحدود ہے۔ یہ طاقت سورج سے حاصل کی جاتی ہے زمین کے مقابلہ پر آفتاب ایک لامحدود عظیم الشان اور دائمی چیز ہے جسے شاید کبھی زوال ہی نہیں ہوگا۔ معدنی طاقت بہت حرارت کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ جس سے وہ تلف ہو جاتی ہے مگر پودوں، جانوروں اور انسانوں کی طاقت زندگی سے حاصل ہوتی ہے جس سے دیگر حیوانی ریشے اور نباتات حاصل ہو سکتے ہیں وہی خوراک جو انسان کی جسمانی پرداخت کرتی ہے۔ انجن کو بھی چلا سکتی ہے۔ پتھر کا کوئلہ انسان غذا کے طور پر استعمال نہیں کر سکتا۔ لیکن انسان جن چیزوں کو بطور خوراک استعمال کرتا ہے ان سے بہت زیادہ طاقت پیدا کرتا ہے۔ بیجان انجن یا مشین ان چیزوں سے اتنی طاقت اخذ نہیں کر سکتا۔ معدنی طاقت چونکہ دنیا میں محدود ہے اس لئے وہ ملکوں میں لالچ پیدا کرتا ہے اور اس سے لڑائیاں رونما ہوتی ہیں نباتاتی طاقت بشرطیکہ اسے معقول طریقہ پر منظم کیا جائے اپنے لامحدود ماخذ کے باعث دنیا میں لامحدود طاقت انسانوں کو دے سکتی ہے اور اس وجہ سے انسان خود بھی جی سکتا ہے اور دوسروں کو بھی زندہ دیکھ سکتا ہے۔

صنعتی انقلاب جس میں معدنی طاقت کا استعمال شروع ہوا، انسان حکمت و عمل کی ایک لیبارٹری تھی جس میں بڑے پیمانہ پر انسانی عمل و تنظیم کی تخت و ریخت ہوتی رہی اس چیز نے یہ ثابت کر کے دکھایا کہ بڑی مقدار پیدا اس کی کس طرح حاصل کی جاتی ہے اور اسے کس طرح بڑھایا جا سکتا ہے اب اگر انسان یہ چاہے کہ صنعتی انقلاب سے قبل کے عہد میں چلا جائے چھوٹے چھوٹے پیمانوں پہ الگ الگ رہ کر کوئی چیز بنا کر بیچے یا چلائے تو یہ نہیں ہو سکتا۔ آج کل ہم ایک اور انقلاب دیکھ رہے ہیں یعنی معدنی طاقت سے زندہ طاقت کی طرف رجوع۔ زندہ طاقت میں سب سے پہلے نباتاتی قوت کی طرف انسان کی توجہ ہو رہی ہے اور اس کے امکانات بھی بہت ہیں یہ انقلاب یوں بھی اور ضروری ہے کہ سماج زندگی اور حقوق کو اپنے اقتصادی تقاضوں کے ساتھ مطابق کرنے میں [illegible] مدد کریگا۔ اگر ہم معدنی دولتوں پر منحصر رہے تو ہر شخص کو اس کا حق نہیں پہنچ سکے گا اب ہم [illegible] منزل پر پہنچ گئے ہیں جہاں کسی کا گھر بسنے سے پہلے کسی کا گھر ٹوٹنا ضروری ہو گیا ہے [illegible] تہذیب معدنی [illegible] ہے اور کوئلہ کی بنیاد پر قائم ہوئی ہے اس کے برقرار رکھنے کیلئے [illegible] جو معدنی دولتیں انسان کے تصرف میں آ چکی ہیں قطعی ناکافی ہیں ہم چاہتے ہیں کہ جس طرح [illegible] ہر شخص کو آسانی کیساتھ بغیر قیمت مل جاتی ہے۔ اسی طرح آزادی کیساتھ ہر شخص کو [illegible] بھی ملے [illegible] جب تک آفتاب کی طاقت سے ہم نباتاتی قوتوں کے ذریعہ مدد نہیں لیں گے اس وقت تک انسان کی ضروریات مکمل نہیں ہو سکتیں۔

اس انقلاب کو ہم آتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اس لئے یہ ضروری ہے کہ انقلاب سے پہلے اور انقلاب کے بعد کیلئے اپنے آپ کو تیار کریں [illegible] انسان اور حیوان کی غذا کیلئے یا دوا کیلئے یا بعض حالتوں میں پوشش کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور بس انسان نے جتنی جو چیزیں تیار کی ہیں ان [illegible]
[illegible] انگریزی میں [illegible] کہتے ہیں یہ انسان کیلئے غذا مہیا کرتی ہے مگر اب [illegible]

کہ وہ طاقت بھی دے سکتی ہے۔ صنعتی انقلاب سے پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ جاندار طاقت مشین کی نسبت کم کام کرتی ہے انسان جلد تھک جاتا ہے اور مختصر کام کرتا ہے اس کے مقابلہ پر مشین نہیں رکتی اور نہ وہ تھکتی ہے اور کئی گنا زیادہ مقدار تیار کرتی ہے مگر اب ہم دیکھ سکتے ہیں کہ مونگ پھلی سے ہی ہم اسی قدر طاقت حاصل کر پاتے تھے۔ علمی تحقیق اور تجربہ سے مجھے یقین ہے ہم ضرور اس منزل پر پہونچ جائیں گے جب "پاور" پیدا کرنے میں معدنی تیل کی جگہ نباتاتی تیل کو بخوبی استعمال کر سکیں گے۔ تیل اور کوئلہ محدود ہے ایک عرصہ بعد ختم ہو جائے گا مگر مونگ پھلی کو ہم ہمیشہ غیر محدود مقدار میں زمین سے پیدا کر سکتے ہیں ایندھن کیلئے ہمیں جس قدر درختوں اور پودوں کی ضرورت ہوگی اس کا حساب پھیلا کر ہم ضرور پیداوار تیار کر سکتے ہیں۔ پودوں سے انسان خوراک حاصل کرتا تھا اور بس خوراک سے انسان میں حرارت و طاقت پیدا ہوتی تھی اور وہ کام کر سکتا تھا مگر ان پودوں سے مشینیں بھی بالکل اسی طرح چلائی جا سکتی ہیں، جو پودے بطور غذا استعمال میں نہیں آ سکتے انہیں بھی بطور طاقت استعمال کیا جا سکتا ہے جن پھلوں کو ہم کھا نہیں سکتے وہ مشینیں ضرور چلا سکتے ہیں۔ اس لئے انہیں بیکار کیوں ضائع کیا جائے، بعض درخت ایسے ہوتے ہیں جن سے عمارتی لکڑی اور ایندھن میسر آتا ہے۔ اگر زراعت کو صرف غذا تک محدود نہ رکھا جائے تو اس سے طاقت اور ایندھن حاصل کرنے کے امکانات لامحدود حد تک بڑھائے جا سکتے ہیں زیادہ غذا پیدا کرنے سے جو اقتصادی بدحالی پیدا ہوتی ہے اس خطرے کا بھی علاج ہو جائے گا زراعت کے بڑھنے سے زرعی پیداوار و اجناس کی قیمتیں گرنے کا خطرہ جاتا رہے گا۔ پہلے انسان کی غذائیں پیدا کی جائیں اس کے بعد جانوروں کی غذائیں پیدا کی جائیں اور عمدہ مویشی و حیوانات حاصل کئے جائیں اور آخر میں زراعت سے عمارتی لکڑی اور ایندھن کی تیاری کا بندوبست کیا جا سکتا ہے۔

زراعت کیساتھ آب رسانی کی صنعت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ صرف اتنا کہنے سے کام نہیں چلے گا کہ "اور غذا پیدا کرو"۔ غذا تو پیدا کرنی ہی ہے اس کے علاوہ بھی بہت سی چیزیں چاہئیں۔ ہمیں موٹر کاریں موٹر لاریاں، موٹر ٹھیلے، موٹر ریلیں بھی چلانی ہیں جس کیلئے ہمیں لکڑی کا کوئلہ یا الکحل یا تیل کی ضرورت ہوگی ہمیں روشنی کی ضرورت ہے ان سب کے لئے ہمیں نباتاتی تیلوں کی ضرورت ہوگی ہمیں "اور غذا پیدا کرو" کو ذرا بڑھا کر "اور طاقت پیدا کرو" کا نعرہ بھی لگانا ہوگا۔

پودوں کی فنی تحقیقات کے سلسلہ میں مجھے دو اہم مسائل کی طرف توجہ دلانی ہے سب سے پہلی چیز پاک صاف پانی کی بہم رسانی ہے جس طرح کان کنی کی فنی کارگزاری کیلئے لوہے کی اشد ضرورت ہے اسی طرح عمدہ زراعت کیلئے تازہ صاف شدہ پانی کی بھی ضرورت ہے پانی کے ذریعہ زمین سے پودوں تک خوراک پہونچا کرتی ہے جنوبی ہند میں ہمارے پاس زمین بکثرت ہے سورج کی روشنی بھی بہت ہے۔ مگر عمدہ پانی نہیں ہے۔ کسان لوگ جب کوئیں کھودتے ہیں تو صاف سفید پانی نہیں نکلتا۔ دریاؤں کے ذریعہ جو صاف پانی ہم تک پہونچتا ہے اکثر سمندر میں بہ کر ضائع ہو جاتا ہے آپ کو یہ سنکر تعجب ہوگا کہ گوداوری دریا کا پانی صرف چار فی صدی مقدار میں آب پاشی کے کام استعمال میں آتا ہے باقی سب سمندر میں مل کر ضائع ہو جاتا ہے۔ کرشنا دریا کا پانی صرف تین فی صدی کام میں آتا ہے اس سے ظاہر ہے کہ آب پاشی کی صنعت اور نہر سازی کی صنعت کو ترقی دینے کی کس قدر ضرورت ہے۔

میں نے آج سے دس سال قبل یہ سوچا تھا اور اسے خواب سمجھتا تھا کہ ہم بھی تیل کی جگہ [illegible] باتی [illegible] پمپوں میں [illegible] آج وہ درست ثابت ہو گیا اسی طرح یہ خواب بھی کسی دن درست ثابت ہوگا۔ اور آفتاب کو

انسانی ترقی کے ایک آلہ کے طور پر استعمال کرنے کیلئے عظیم الشان پیمانہ پر کام شروع ہو جائے گا۔
اب دُوسری بات سُنئے وہ یہ ہے کہ ہمیں ایسے انجن بنانے چاہئیں جن میں درجۂ حرارت کم ہو معدنی طاقت بہت گرم ہو کر بنتی ہے لیکن انسان حیوان اور نباتات بھی تو انجن ہی ہیں ان میں جو طاقت غذا یا خوراک سے پیدا ہوتی ہے وہ اس قدر گرم نہیں ہوتی اتنی سی حرارت پیدا کرنے کیلئے ہم انجنوں میں لکڑی استعمال کر سکتے ہیں یا لکڑی کو لوہے کی جگہ استعمال کر سکتے ہیں لوہے کی جگہ لکڑی کے استعمال کی صورت اسی وقت پیدا ہو گی جب کم درجہ حرارت کے انجن ہم بنا سکیں۔ ایسا کرنا ممکن ہے کیونکہ قدرت خود ایسے انجن بناتی ہے اور ان کو کام کرتا دکھاتی ہے کیا انسان فطرت کے اس راز کو معلوم نہیں کر سکتا؟
انسان نے پرندوں کو دیکھ کر اڑنا شروع کر دیا۔ انسان سمندری پانی سے تازہ میٹھا پانی بنانا جلد سیکھ جائے گا۔ اس نئی طاقت کے سامنے آنے سے ایک نئی تہذیب جنم لے گی، گذشتہ دو سو سال کی تہذیب اور صنعتی زندگی محدود معدنی ذرائع پر منحصر تھی۔ مگر اب جو صنعتی انقلاب آئیگا اس کی حدیں مقرر نہیں کی جا سکتیں یہ انقلاب پہلے انقلاب کی طرح تنگ نہیں ہو گا۔ بہت وسیع حدود کو محیط ہو گا پھر انسان کا اخلاق بدل جائیگا اب تو معدنی طاقت پر چھین جھپٹ ہوتی ہے ایک کے ہاتھ سے ایک چھینے لیتا ہے اور دُنیا کا امن ہر وقت خطرہ میں ہے مگر نباتاتی خزانوں کی کوئی انتہا ہی نہ ہو گی ایک انسان اگر فائدہ اٹھائے گا تو دوسرا بھی اٹھا سکے گا۔ رواداری وسعتِ قلب و نظر، باہمی بھائی چارہ اور انسانیت پہلے پھولیگی اور تہذیب اس بلند پایہ پر جائے گی جہاں محدود معدنی دولت پر موقوف دو سو سالہ تہذیب نہیں پہونچ سکی ۔
اس وقت ہم سُورج کے بھی ممنون ہوں گے صرف زمین ہی کے لاڈلے نہیں ہونگے آفتاب ہمیں باپ کی طرح پالے گا اور دھرتی ماتا ہمیں اپنے سینے سے لگا لے گی ۔

(صنعت و حرفت)

چُوڑیاں بنانے کی صنعت

ہندُوستان کی عورتوں میں کانچ کی چُوڑیاں پہننے کا عام رواج ہے ہر سال لاکھوں روپوں کی چوڑیاں خریدی جاتی ہیں قصبہ فیروز آباد ضلع آگرہ اس صنعت کا گھر ہے یہاں کی رنگ برنگ کی خوبصورت چوڑیاں ملک کے ہر حصہ میں جاتی ہیں۔ جاپان سے بھی قبل از جنگ بہت آتی تھیں بجز فیروز آباد کے ہندوستان کے دُوسرے حصوں میں ان کے بنانے کا رواج نہیں اسلئے آج ہم اس صنعت پر پوری روشنی ڈالتے ہیں۔
ٹوٹے پھوٹے ٹکڑوں کو صاف کر کے اس میں ایک تہائی سوڈا ایش ریہہ کہ جس کو پنجابی کلر کہتے ہیں شور زمین کی سطح پر سفید رنگ کی جو چیز پھیلی ہوتی ہے یہی ریہہ یا کلر سوڈا ایش کا کام دیتا ہے) ملا کر [illegible]
اس شیشے کو سُرخ۔ سبز و دیگر رنگ دینے کیلئے دھاتی رنگ استعمال ہوتے ہیں مثلاً کاپر سلفائیڈ یا [illegible]

...کی بیماری کا یہ حال ہے کہ ایک تندرست ہوتا ہے تو دوسرا بیمار ہو جاتا ہے۔ پتا جی تھے وہ پرلوک سدھار گئے۔ تب سے میری ماتا بھی ...تی ہیں ان کی سیوا کا بوجھ بھی مجھ پر ہے۔ پھر اپنی زمینوں کی بھی دیکھ بھال کرنا پڑتی ہے اسلئے بڑی مشکل سے وقت نکال کر آپ کے درشن کرنے ... مہاراج اس دکھ سے نجات کا کوئی اُپائے بتائیں رات دن میں ایک منٹ کے لئے بھی چین نصیب نہیں ہوتا۔ کچھ نہ کچھ سی کا یارات دن ...ٹی میں جلتی رہتی ہے پوجا پاٹ سب چھُٹ گیا ہے۔ کولہو کے بیل کی طرح رات دن چکر میں رہتا ہوں۔ سادھو نے کہا کہ بیٹا! ...نے تجھ کو چینٹوں کے سوراخوں پر پیشاب کرواکر جو اپدیش دیا تھا وہ تو بھول گیا اسلئے یہ تیری دشا ہو گئی ہے اس جنم میں تو اس چین ...کو ملنا محال ہے۔ اب تجھ کو اپنے بچوں کے سکھ کی فکر کرنی چاہیئے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ تیری عدم توجہ کے سبب ضائع ہو جائیں اب ...تی ہو۔ اور گرہستی کو پورا سکھ سنسار میں کہیں نہیں ملتا۔

الہام کی بارش ہوتی ہے

...کی اندھیری راتوں میں جب چاند نمایاں ہوتا ہے　　ہر ذرہ بزم ہستی کا انوار بداماں ہوتا ہے
...روشنی ماہِ کامل کی نوری چادر پھیلاتی ہے　　تا حدِ نظر میدانوں میں اک چاندی سی جم جاتی ہے
...گل کے آزاد ہرن آسودۂ راحت ہوتے ہیں　　جب سر زمیں کے سینے پر پیڑوں کے سائے سوتے ہیں

اس وقت بھی ذہن شاعر پر الہام کی بارش ہوتی ہے

...ٹھری ٹھٹھری شاخوں پر سمٹے ہوئے غنچے سوتے ہیں　　جب سرد ہوا سے یخ بستہ دامانِ گلستاں ہوتے ہیں
...دشت کا ہر اونچا ٹیلہ انوار کا مخزن ہوتا ہے　　جب ہستی کا اک اک منظر صد حسن بدامن ہوتا ہے
...رے بزمِ ہستی کی روشن شمعیں بن جاتے ہیں　　جب سازِ رگِ جاں پہ انساں اُلفت کا ترانہ گاتے ہیں

اس وقت بھی ذہن شاعر پر الہام کی بارش ہوتی ہے

...شورش عالم گھبرا کر آغوش فنا میں سوتی ہے　　جب رات کی ہیبت سے یکسر خاموش یہ دنیا ہوتی ہے
...گلشن کے ہر گوشے پر اک تاریکی چھا جاتی ہے　　جب شب کی نمی سے شاخوں پہ ہلکی سی نمی آجاتی ہے
...ڑوں کے پتے مل کر اک مبہم ساز بجاتے ہیں　　خاموش فضائے ہستی پر جب آ کے فرشتے گاتے ہیں

اس وقت بھی ذہن شاعر پر الہام کی بارش ہوتی ہے

...چمن کے دامن میں فطرت کے خزانے کھلتے ہیں　　جب پھول کے نازک کانٹے پر شبنم کے موتی تلتے ہیں
...ر کی کرنیں آ کر کلیوں کا نظارہ کرتی ہیں　　جب فرخ ہوائیں گلشن کے پھولوں کو سنوارا کرتی ہیں
...باغ کے رنگیں منظر پر شبنم موتی برساتی ہے　　جب فصل بہاری دامن میں رنگین نظارے لاتی ہے

اس وقت بھی ذہن شاعر پر الہام کی بارش ہوتی ہے

...گی بے رونق شاخیں جاتی ہیں گلزاروں میں　　جب خاک سی اڑنے لگتی ہے ہستی کے سبزہ زاروں میں
...تند ہواؤں کی رو میں سوکھے پتے بہہ جاتے ہیں　　جب عہدِ خزاں میں گلشن کے خطے ویراں ہو جاتے ہیں
...زاروں میں آندھی سے ہر سمت بگولے اٹھتے ہیں　　جب لو کی تپش سے نظارے جیبا کی نظر سے چھٹتے ہیں

اس وقت بھی ذہن شاعر پر الہام کی بارش ہوتی ہے

مسرت کیا چیز ہے؟

مسرت کیا چیز ہے؟ نہ روپیہ ہے نہ پیسہ ہے۔ نہ عالی شان محل ہیں نہ حکومت و شان ہے اسلئے اگر ان چیزوں سے حقیقی مسرت حاصل ہوتی تو ہم کسی بادشاہ و امیر کو کبھی ملول و افسردہ نہ پاتے ان کے محل میں اور ان کی اس لمیرانہ بلکہ شاہانہ دھوم دھام ہیں۔ سچ پوچھئے تو ہمارے غموں سے بڑے غم اور ہماری حسرتوں سے بڑھی حسرتیں موجود ہیں جس طرح ایک کوہستانی سلسلہ دور سے تمہیں مسطح پر فضا اور دلچسپ معلوم ہوتا ہے اور نزدیک سے جاکے دیکھو تو انتہا سے زیادہ غیر مسطح۔ بہت ہی پُر خطر اور وحشت ناک نظر آتا ہے۔ اسی طرح اے غریبی کی زندگی بسر کرنیوالو! امیروں اور بادشاہوں کی شان و حشمت اور ان کے عالیشان محل تمہیں دور ہی سے عشرت و مسرت کے امن گاہ نظر آتے ہیں مگر ان کے قریب جاؤگے۔ خود ان کی جگہ پر کھڑے ہو کے اور ان کی اصلی حالت کا اندازہ کر کے غور کرو تو صاف دیکھ لوگے۔ کہ خوشی اور مسرت ان کے اس وسیع اور بڑے خزانہ میں تم سے بھی کم اور بہت ہی کم ہے۔

اصلی خوشی ایک دلچسپ خیال ہے۔ عبارت ہے جو اکثر اس دل میں زیادہ ہوتی ہے جس میں خواہشیں کم ہوں جس قدر تم اپنی ضرورتوں کا دائرہ کم کرتے جاؤ گے اسی قدر تمہاری مسرت بڑھتی جائے گی۔ بڑے اور نہایت عالی مرتبہ اور صاحب حکومت امیروں کو بھی کبھی کبھی ادنیٰ طبقہ کے مزدوروں پر رشک کرنا پڑتا ہے یہ معمولی درجہ کے لوگ جنہیں تم فضول اور بیہودہ غرور سے ادنیٰ و کمتر اور حقیر و ذلیل خیال کرتے ہو ان کی حالت کا جب اندازہ کروگے تو عام طور پر انہیں اپنے سے زیادہ خوش پاؤ گے۔ سعدی کے کلام میں اس بادشاہ بنجانے والے فقیر کا یہ جملہ کہ "آں دم غم نانے بود و اکنوں غم جہانے بود" مطلب یہ کہ فقیری کی حالت میں تو صرف ایک روٹی کی فکر تھی مگر بادشاہ بن کر دنیا بھر کی فکر ہو گئی"۔ اب نہ سے سمجھنے کے قابل ہے۔ ان غریبوں کو فقط اتنی فکر ہے کہ قوت لایموت کے لئے دن بھر میں کچھ پیسے فراہم کرلیں ان کے حاصل کرنے کی کوشش میں وہ ہر قسم کی محنت کرنے کو آمادہ ہو جاتے ہیں پھر اس محنت کے بعد جب شام کو اپنی بیوی بچوں میں آکر بیٹھتے ہیں تو ان سے زیادہ مسرور اور خوشحال کوئی نہیں ہوتا۔ ان کی محنت ان کی رات میں آرام کی قدر پیدا کرتی ہے اور اس محنت کا حاصل کیا ہوا مختصر سرمایہ ان کی فکر دور کر دیتا ہے اور یہ دونوں ایسی برکتیں ہیں جن کی بدولت شام کو انہیں وہ اطمینان فارغ البالی اور خوشی دخرمی حاصل ہو جاتی ہے جو ان سے زیادہ استطاعت رکھنے والوں کو کبھی زندگی بھر نصیب نہیں ہوتی۔ ان لوگوں کی حالت دیکھ کے تمہیں بخوبی سبق مل سکتا ہے کہ اگر تم بھی اپنی فکریں محدود اپنی ضرورتیں کم اور اپنی خواہشیں دل سے نکالدوگے تو تمہیں بھی اصلی خوشی حاصل ہو جائیگی اسلئے اگر تمہیں حقیقت میں خوشی و مسرت کی تلاش ہے تو عالیشان محل سلطنت کے دربار اور ظاہری عیش و مسرت کی صحبتوں میں نہ ڈھونڈو بلکہ سے غریب کے جھونپڑے میں جاکے تلاش کرو وہ وہیں ملیگی اور اکثر وہیں رہتی ہے لیکن حد سے زیادہ غریبی انسان کو ذلیل و خوار بنا دیتی ہے ⁂

گندہ جا مسکراتا قید و بندِ دار فانی سے
کہ رونے سے اجل کی چیرہ دستی رک نہیں سکتی

بہاروں کی طرح کر فطرتِ بالیدگی پیدا
جو پستی کو ابھرنا ہے تو پستی رک نہیں سکتی

ابھی انسان کی تقدیر مجبورِ غلامی ہے!
ابھی دنیا میں شخصیت پرستی رک نہیں سکتی

قناعت پیشگی جب تک نہ کچھ سوچے علاج اس کا
کسی صورت وبائے تنگ دستی رک نہیں سکتی

سحر ہو۔ شام ہو فصلِ خزاں ہو موسمِ گل ہو
کسی محور پہ جولانگاہِ ہستی رک نہیں سکتی

سمندر میں فنا کے آج ڈوبی، اور کل ڈوبی
بسے جو ریگِ ساحل پر وہ بستی رک نہیں سکتی

اگر قسمت میں ہے تو جبر سے پہنچائی جائے گی
تری روزی۔ گراں ہو یا ہو سستی رک نہیں سکتی

بغیر ظرف، ذوق سرخوشی اک خبط مطلق ہے
خطا ہے میکشی جب تجھ سے مستی رک نہیں سکتی

... مستی رک نہیں سکتی

نراشا

مہاکوی اور مہاتماؤں کے قول ہیں کہ دنیا آشا کے سہارے قائم ہے اور منش کا جیون بھی آشا کی بنا پر بدستور حرکت کرتا ہے۔ (ج)ب منش کی آشائیں نراشا میں منتقل ہو جاتی ہیں تو اس کی آتما اس پرتھوی سے پرلوک کو سدھار جاتی ہے لیکن میرے کلیش اور نراشا (بھرے) جیون سے ان کے قول غلط ثابت ہوتے ہیں۔ جیسی تمام آشائیں نراشا میں تبدیل ہو گئیں میرے جیون سے آنند و شانتی (رخص)ت ہو گئی مگر اس پر بھی میرا جیون متحرک ہے۔ شاید موت کو بھی مجھ سے نفرت ہو گئی ——— اے پربھو! میرے ہرسے پہاڑ زیادہ (مہل)ت نہ دے یا مجھے آکاش میں بلا لے اور یا میرے کلیش مٹا دے اور دکھی جیون میں رس و آنند پیدا کر دے۔ اے بھگوان۔

تمہاری یاد!

(جب) شب کا دھندلکا چھاتا ہے جب ابر سیہ گھر آتا ہے	جب شب کا سکوں چھن جاتا ہے اک نغمہ سا ہر سو چھاتا ہے
(او)ر پپیہا "پی پی" کہکے پُر درد ترانے گاتا ہے	اور صبح کا تارا گردوں سے با دیدۂ حسرت جاتا ہے
کیوں یاد مجھے آجاتے ہو	کیوں یاد مجھے آجاتے ہو
(جب) نیند کی دیوی آتی ہے پیغام سکوں کا لاتی ہے	میں اکثر سوچا کرتا ہوں پر کہتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں
(ہو)ک سی دل میں اٹھتی ہے اور آنکھ مری بھر آتی ہے	کیوں روٹھے ہوئے سے رہتے ہو اس بات پہ آہیں بھرتا ہوں
کیوں یاد مجھے آجاتے ہو	کیوں یاد مجھے آجاتے ہو

مرگ و حیات

کائنات ایک ایسا بیکراں سمندر ہے جس کا وار پار ناپید ہے زندگی ایک بے پتوار ناؤ کی مانند اس میں بہتی رہتی ہے۔ ناگہانی (حادث)ے اس کا رُخ بدلتے رہتے ہیں کبھی وہ کنارے کی جانب اور کبھی منجھدھار کی سمت بہتی ہے ہر لہر اسے تہ نشین کرنے کیلئے ابھرتی ہے وہ کہاں (جا)تی ہے اور کہاں ڈوبتی ہے اس کا عقدہ حل بے محل ہے لیکن جب کوئی ڈوبنے والا جانب ساحل دیکھتا ہے تو اس سے مرگ و حیات کی کشمکش تیز تر ہو جاتی ہے ڈوبنے والا جانتا ہے کہ اس کے بچاؤ کی کوئی تدبیر بروئے کار نہیں آسکتی۔ اس کے باوجود اپنے بچاؤ کے لئے ہاتھ پاؤں مارتا (ہے مگ)ر اس کی بے بسی اسے اپنے تئیں امواج کے سپرد کر دینے پر مجبور کر دیتی ہے وہ بہا چلا جاتا ہے جہاں طوفان اسے لیجاتا ہے۔ وہ غرق (ہو جا)تا ہے جہاں طوفان اسے ناقابل برداشت بوجھ سمجھ کر اپنے اُبھرے ہوئے کندھوں سے گرا دیتا ہے۔

سکون قلب کی جستجو میں ہم ہزار منزل مارتے ہیں لیکن اس پُر پیچ راستے میں ہر آنے والے اور ہر جانے والے کا نقش قدم ہمیں (منز)ل سے قریب لیجانے کی بجائے منزل سے دور لیجاتا ہے ادھر ادھر رہبر کے بھیس میں صدہا رہزن خندہ برلب اور انگشت نما ہیں (ہم) کم فہمی اور جنون منزل کی وجہ سے ہم اکثر دانستہ لٹ جاتے ہیں۔

حیات ایک مسلسل اضطراب ہے اس اضطراب کی تسکین موت ہے۔ لیکن ہم بے محابا اپنی دون حوصلگی کے باعث مجنونانہ (حیا)ت کا دامن تھامنے کی ... [illegible]

مرگ وحیات ہمارے آغاز و انجام کی بے رنگ تصویر ہے۔ یا ایسا خاکہ ہے جس میں امتداد وقت اپنے نادیدہ موقلم سے مختلف رنگ آمیزی کرتا ہے۔ خود صبح اور تیرگیٔ شام کا اہتمام عالم ہستی میں نہ جانے کب سے ہے اور نہ جانے کب تک ہے۔

اگرچہ محبت کا شغل رنگ آمیزی ہے لیکن میرے خیال میں ہستی ایک نقش زبوں ہے کیونکہ ابھی تک حسن وعشق کی کشمکش کا وہی عالم ہے۔ اور میری آرزوؤں کا فسوں کامیاب نہیں ہو سکا۔

زندگی ایک راہ بے منزل ہے۔ موت کو اس کی منزل قرار نہ دے۔ اے دلِ افسردہ تجھے اندیشۂ مآل کیوں ہے؟

میٹھے میٹھے بول

جل میں بسے کمودنی چندا بسے آکاس — جو ہے جا کو بھاوتا سو تاہی کے پاس

کمودنی کا پھول تالاب کے اندر جل کے بیچ میں ہوتا ہے۔ پر تو چندرماں آکاش کے اندر رہتا ہے۔ جب آکاش میں چندرماں کا ادیہ ہوتا ہے تو کمودنی کا پھول کھِل جاتا ہے جب چندرماں است ہوتا ہے تو کمودنی کا پھول مُرجھا جاتا ہے دونوں کے بیچ میں کتنا فاصلہ ہے لیکن کتنا زبردست سمبندھ ہے۔ سچے پریم کی حالت کا ورنن کیا گیا ہے جس کو جو پسند ہے وہ ہمیشہ اس کے مانو پاس ہی ہے بیرونی فاصلہ چاہے کتنا بھی کیوں نہ ہو۔

کانٹا اوروں کو لگے تڑپے سادھو سمان — سارے جگ کے دُکھ کو سمجھے اپنی جان

سادھو سبھاؤ دنیاک مزاج، لوگوں کا یہ خاصہ ہے کہ اگر دوسروں کو ان کے سامنے کانٹا لگ جائے تو وہ خود تڑپ اٹھتے ہیں۔ ہمدردی کی وجہ سے اس کے دُکھ کو محسوس کرتے ہیں، ایسے مہاتما لوگ ساری دنیا کے رنج و تکلیف کو اپنا ہی خیال کرتے ہیں۔

ساگر کے جیوں ترن میں نوکا ہے پردھان — تیوں بھو ساگر ترن میں برہمچریہ پرمان

جیسے سمندر کو پار کرنے کے لئے کشتی یا جہاز مقدم چیز ہے اسی طرح دنیا روپی دکھ سمندر سے پار ہونے کے لئے برہمچریہ لازمی ہے۔ برہمچریہ پر عمل کرنیوالا کسی پاپ یا گناہ کا مرتکب نہیں ہو سکتا ہمیشہ پرماتما کا سہارا ڈھونڈتا ہے۔ یہی چیز دنیا روپی سمندر سے پار کرتی ہے۔

پہاڑ

شفق کے سرخ سمندر میں آسمان کی نیلی کشتی تیر رہی تھی دور شمال میں برف پوش چوٹیاں دھندھ میں لپٹی ہوئی اس حسین چہرے کی طرح چمک رہی تھیں جس کی خوبصورتی باریک نقاب سے چھن چھن کر باہر آ رہی ہو۔ سائے گہرے اور لمبے ہو رہے تھے درخت گھنے گھنے پتوں میں منہ چھپائے پہرے کے سنتری بنے جو رہے تھے۔ ایک مسرت بخش خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ گویا کائنات کے دل کی دھڑکن بند ہو چکی تھی۔ خوشگوار فضا لطافت میں ڈوبی ہوئی تھی۔

امید کا کیا انجام ہوا۔ ناکام تمنا کیا جانے — ساحل پہ پہنچکر موجوں کا کیا حال ہو دریا کیا جانے

ہر شاخ ہے شمع [illegible] سوز و ساز نہاں — نغمۂ عشرت [illegible] کو دنیا کیا جانے

تیرے گلشن کی مہک اب بھی تو دامنگیر ہے

غمزدوں کی ہر غزل ہر نظم پُر تاثیر ہے
اہلِ دل کے واسطے ہر لفظ اک اک تیر ہے

پریم کے رشتہ سے دل ہے تجھ سے وابستہ مدام
ایک حلقہ ہل نہیں سکتا یہ وہ زنجیر ہے

اٹھ گیا تیرے چمن سے آشیاں تو کیا ہوا
تیرے گلشن کی مہک اب بھی تو دامنگیر ہے

سر میں سودا ہے ترا دل میں ہے تیری آرزو
لب پہ تیرا نام آنکھوں میں تری تصویر ہے

دیکھنا اے چشمِ پُرنم آنسوؤں کو تھامنا
اب لبالب غم سے یہ جامِ دلِ غمگیر ہے

حد سے زیادہ عاشقو! بڑھ جائے دردِ دل اگر
آنسوؤں سے زخمِ دل دھونا بھی اک اکسیر ہے

ہم کو شکوہ کچھ نہیں جور و جفائے دہر کا
کیا گلہ کس کا گلہ اپنی بری تقدیر ہے

قہر میں بھی جس کے رحمت ہے ستم میں بھی کرم
اس کا شکوہ واقعی عاجز بڑی تقصیر ہے

ریاست نیپال میں پشوپتی ناتھ کی یاترا

قریباً ایک سو سال پہلے نیپال کے ایک مشہور تاریخدان کیرک پٹرک نے لکھا تھا۔ کہ نیپال میں اتنے مکان اور مورتیاں ہیں جتنے اس کے باشندے یہ الفاظ قریب قریب درست ہیں۔ کیونکہ نیپال کی وادی میں جس کی لمبائی صرف ۲۰ میل اور چوڑائی ۱۵ میل ہے ہندوؤں اور بودھوں کے کم و بیش تین ہزار چھوٹے مندر ہیں۔

لیکن ان تمام مندروں میں سے پشوپتی ناتھ کے مندر سے زیادہ کوئی مشہور اور مقدس نہیں۔ پشوپتی ناتھ نیپال کا سب سے بڑا دیوتا ہے اس کا نام دیش کے سکوں پر کندہ ہے اور نیپالیوں کے ہاں جنم اور مرتیو معلوں وقت پشوپتی ناتھ کے نام کا سمرن کیا جاتا ہے

صرف نیپال ہی نہیں بلکہ سارے ہندوستان میں پشوپتی ناتھ کی بڑی مان مریادا ہے۔ پشوپتی ناتھ یا حیوانوں کا مالک یہ شوجی کا دوسرا نام ہے اور شوراتری کے روز بھگوان شوجی کے احترام میں یہاں ہر سال جو میلہ لگتا ہے اس میں نیپال اور انگریزی علاقے سے ہزاروں یاتری شامل ہوتے ہیں اس موقعہ کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے نیپال سرکار چند روز کے لئے پاسپورٹ کی تمام پابندیاں منسوخ کر دیتی ہے۔ اور بھاری تعداد میں ہندو نہ صرف دیوتا کے درشن کرنے کو آتے ہیں بلکہ نیپال کی وادی اور کھٹمنڈو کی سیر بھی کرتے ہیں جسے پشوپتی ناتھ کا دروازہ کہتے ہیں۔

پشوپتی ناتھ کا مندر کھٹمنڈو سے شمال مشرق کی طرف قریباً دو میل کے فاصلہ پر اس جگہ واقعہ ہے جہاں بھاگ متی ندی ہرے بھرے جنگل سے اچھلتی کودتی ہوئی گذرتی ہے اس نے مندر کی دلکشی میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔ نیپال کے لوگ پشوپتی کو وہی درجہ دیتے ہیں جو ہندوستان میں بنارس کو حاصل ہے اور وہاں بھاگ متی کو گنگا جیسا مانا جاتا ہے جب ندی کے کنارے کھڑے ہو کر سونے کی چھتوں والے مندروں اور کٹیوں کے شہروں کو دیکھو تو ان پر پڑتی ہوئی سورج کی کرنیں اور نہانے کے لئے دور نیچے ندی تک جاتی ہوئی سیڑھیاں بالکل بنارس کا سا منظر

پیش کرتی ہیں صبح سویرے کی روشنی میں جب پشوپتی میں بنارس کی طرح زندگی کی ہلچل سی جاگ اٹھتی ہے۔ لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ
بھاگ متی کے برف کی طرح ٹھنڈے جل میں اشنان کرتے اور منتر پڑھتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جبکہ شام کے ہجوم میں اکثر اوقات
کچھ پژمردہ لوگ اپنے کسی دم توڑتے ہوئے سمبندھی کو اٹھائے ہوئے گھاٹ پر جاتے دکھائی دیتے ہیں نیپالیوں کا یہ وشواس ہے
کہ اگر ان کی مرتیو بھاگ متی کے کنارے ہو اور ان کے شریر کو ندی کے جل میں پرواہ کر دیا جائے تو انہیں مکتی پراپت ہو جاتی ہے۔ اور وہ
سیدھے سورگ کو جاتے ہیں۔

پشوپتی میں کتنے ہی مندر اور پگوڈے ہیں جنہیں مختلف وقتوں پر مختلف راجاؤں نے تعمیر کرایا تھا۔ بڑے احاطے کے اندر
جہاں سے مندر کو راستہ جاتا ہے کتنی ہی دھرم شالائیں اور رئیسوں راجاؤں کی رہائش گاہیں ہیں۔ بڑا مندر ایک دو منزلہ پگوڈا ہے
جس کے برج سونے کے بنے ہوئے ہیں اور چھت پر سونے کا کام کیا ہوا ہے آخری منزل پر ایک سونے کا گھنٹہ نصب کیا ہوا ہے جس پر
ترشول کا نشان بنا ہوا ہے۔ مندر میں بھگوان شو کی چومکھی مورتی ہے جو ایک شولنگ کے چاروں طرف بنی ہوئی ہے اور ان پر چاندی
سونے کا کام کیا ہوا ہے۔ شولنگ کے سامنے تانبے اور گلٹ کے بنے ہوئے دو بیلوں کی مورتیاں ہیں۔ ان میں سے ایک بہت بڑی ہے
پگوڈا کی غاروں میں ستونوں اور چھتوں پر ہاتھی دانت اور لکڑی کی کتنی ہی مورتیاں جگہ جگہ بنی ہوئی ہیں۔

پشوپتی سے متعلق کئی داستانیں سنی جاتی ہیں ان میں سے ایک کے مطابق ایک مرتبہ بھگوان شو اچانک کیلاش سے غائب
ہو گئے اور ہمالیہ کے جنگلوں میں ہرن کے قالب میں گھومنے لگے ان کا پتہ لگانے میں ناکام ہو کر پاربتی اور دوسرے دیوتاؤں نے وشنو
سے پرارتھنا کی کہ وہ جا کر ان کی تلاش کریں وشنو نے شوجی کو ہرن کے بھیس میں پہچان کر انہیں پکڑنے کی کوشش کی مگر ہرن نے ایک چھلانگ
لگائی اور اس جگہ پہنچ گیا جہاں اب پشوپتی کا مندر بنا ہوا ہے۔ یہاں انہوں نے وشنو کو اپنی اصلی صورت دکھائی اس روز سے پشوپتی کے
مندر کے نزدیک کے جنگل کو مرگ ستھلی یا ہرنوں کے چرنے کی جگہ کہا جاتا ہے یہ کتھا ہموت کھنڈ پران میں آتی ہے

نیپال کے اتہاس کاروں کا بیان اس سے مختلف ہے وہ کہتے ہیں۔ کہ ایک گائے ہر روز ایک خاص جگہ پر بھاگ کر کسی طرح
چلی جاتی۔ ایک دن اس کا مالک اس کے پیچھے گیا۔ اور دیکھا۔ کہ جونہی وہ ایک جگہ جا کر ٹھہر گئی اس کے تھنوں سے دودھ گرنے لگا
یہ دیکھنے کے لئے کہ نیچے کیا ہے اس نے زمین کو کھودا تو پشوپتی ناتھ کا پرکاش دکھائی دیا۔ اس پرکاش سے وہ بھسم ہو گیا یمنی نے جس کے
نام پر نیپال دیش کا نام پڑا ہے اس کے لڑکے کو نیپال کا پہلا راجہ بنایا۔

ان بیانات میں سچائی ہو یا نہ ہو اس میں کوئی شک نہیں کہ پشوپتی ناتھ نیپال کا قدیم ترین دیوتا ہے۔
بیان کیا جاتا ہے کہ پشوپتی ناتھ کا مندر سوریہ ونشی خاندان کے چوتھے راجہ پشتی دیو نے تعمیر کرایا تھا مندر سے ایک دلچسپ شلالیکھ
ملا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پٹنہ میں رتھ یاترا جلوس کے بانی راجہ نریندر دیو پشوپتی ناتھ کے اننیہ بھگت تھے یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے
کہ نیپال میں ہندو دھرم اور بدھ دھرم پہلو بہ پہلو پھیلتے رہے اور ایک دوسرے کے حامیوں میں لڑائی جھگڑا نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ نیپال
مہاتم میں لکھا ہے کہ پشوپتی ناتھ کی پوجا کی اتنی ہی اہمیت ہے جتنی کہ بھگوان بدھ کی۔

ایک روایت کے مطابق بھگوان شنکر آچاریہ نے نیپال یاترا کے دوران میں پشوپتی ناتھ کے مندر کو خستہ حالت میں دیکھ کر اس کی
مرمت کروائی اور اس کی پوجا کو دوبارہ شروع کرایا۔ پشوپتی مندر کے ایک طرف ایک چھوٹی سی کٹیا ہے جہاں شنکر آچاریہ کچھ دیر تک رہے وہاں
ان کی کھڑاؤں ابھی تک رکھی ہیں اور ان کی پوجا کی جاتی ہے۔

دو پلوں کے ذریعہ ندی کو پار کرنے کے بعد دور تک سیڑھیوں سے اترنا پڑتا ہے اس کے بعد ہم جنگل سے گزرتے ہیں اس کے
بعد ایک غار آتی ہے جہاں پشوپتی ناتھ کا وشرام استھان (آرام کرنے کی جگہ) ہے۔ نیپال کے دوسرے مندروں سے مختلف اس
کا احاطہ ... مشتمل ہے جس کے ... ستون کنڈلی والے سانپوں کی سی شکل رکھتے ہیں ...

روحانی سبق

نتیجہ خیز

کارزارِ حسن میں کامدیو کی شکست

تیرِ نگاہ سے

(۱)

اگر وینس یعنی زہرہ کو اپنے حسن و جمال پر ناز تھا۔ کوئی ظلم نہ تھا۔ سارا آسمان اور تمام آسمان والے اس بات کو مان چکے تھے کہ وینس سا حسین کوئی باخدا ہونا ہے معلوم نہیں یونان والوں کو یہ آسمانی عقیدہ کس طرح معلوم ہو گیا۔ انہوں نے بھی وینس کو حسن کی دیوی مان کر اس کی پرستش شروع کر دی تھی۔

اروٹس وینس کے ملک کی مشہور سیاحہ اور شہرت کی دیوی جو اس سے پہلے کئی بار خاکی کرہ کا سفر کر چکی تھی۔ وینس سے ملنے آئی۔ وینس نے دنیا کی نئی حسینا کے متعلق پوچھا۔ اروٹس نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔

"اے میری معزز ملکہ۔ مانا کہ کرۂ ارض کثیف ہے اور وہاں کے رہنے والے خاک سے بنے ہیں اور رذیل ہیں لیکن کیا کہا جائے اسی کرہ میں ایک جگہ یونان ہے وہاں یونان کی بیٹی سائیک جس کا نام ہے ایسی حسین ہے کہ اگر اس کے پیروں کی خاک مل جائے تو تم کو چاہیئے اس کو سرمہ بناؤ میری ملکہ میں افسوس کرتی ہوں کہ کیوں نہ انسان ہوئی۔ کہ اس کی معیت کی آرزو تو دل میں پیدا کر سکتی۔

وینس کو اس بات کا امکان بھی نہ تھا۔ کہ کوئی اس کے برابر بھی حسین ہو سکتا ہے۔ چونک پڑی اس کے غرورِ حسن کو اس بیان سے ایسا صدمہ پہنچا کہ رنگ زرد اور چہرہ فق ہو گیا۔ اور بولی :-

اروٹس ٹھہر۔ میں ابھی طلسمی آئینہ منگا کر سائیک کی تصویر دیکھتی ہوں اگر وہ ایسی نہ ہوئی جیسی تو بیان کرتی ہے۔ تو سمجھ رکھ جھوٹ اور گستاخی کی سزا موت ہو گی۔ اس نے اروٹس کو رخصت کیا اور کنیزوں کو حکم ہوا کہ طلسمی آئینہ لاؤ۔

طلسمی آئینہ سامنے رکھا گیا وینس نے تنہائی میں اس کو دیکھا آئینہ ایک ایسی تصویر پیش کر رہا تھا جو حقیقتاً وینس کے وہم و گمان سے باہر تھی مضطربانہ انداز سے بولی ایسی حسین سائیک کے حسن کا قیام میں نہیں دیکھ سکتی۔ مجھے وہ چیز تلاش کرنی چاہیئے جو اس کے حسن کو جلد زائل کر دے اس کو عشق کا سبق دینا چاہیئے اور عشق بھی ایسا شدید کہ مایوس اور ناکام

(۲)

وینس اٹھی اور اپنے باغ میں آئی۔ اس کا لختِ جگر کیوپڈ دکامدیو، شانہ پر کمان اور ترکش میں تیر لئے اپنے پردار بازوؤں کو سمیٹے ہوئے پودوں پر ٹہل رہا تھا وہ پھول توڑ توڑ کر ڈھیر لگا رہا تھا۔ کہ ان پر مشق تیر اندازی کرے اس کا عنفوانِ شباب تھا اور اسکی ناوک اندازی کی انتہا نہ تھی۔

وینس آگے بڑھی۔ بیٹے کا منہ چوما اور بولی :-

بیٹا! میں نے سنا ہے کہ تو جب تیر و کمان لے کر باہر نکلتا ہے تو ملک کی جوان لڑکیاں تیرے آگے ہاتھ جوڑتی ہیں کہ کیوپڈ جی چاہے اپنے تیروں سے ہمارے دلوں کو گھائل کر دے لیکن خدا کے لئے پیروں میں محبت کی زنجیر نہ ڈال۔

کیا واقعی تیرے تیروں کے زخم زنجیرِ محبت سے زیادہ آسان ہیں۔ کیا میں دیکھ سکتی ہوں کہ تو ان تیروں سے کیونکر وہ زنجیرِ محبت تیار کر سکتا ہے۔ کرۂ زمین میں وہ ائی یونان کی بیٹی سائیک تیرے تیروں کی قائل نہیں جا اور اس کو بتا کہ

چٹکیوں میں تیری اک نخوت شکن انداز ہے　　جا دکھا وینس کا بیٹا کیسا تیر انداز ہے

کیوپڈ یہ سن کر ہنس کر اٹھا اپنے شکار کا حال معلوم کر کے اسکی چٹکیاں بھی ہو گئیں کمان کندھے سے اتار کر ہاتھ میں آ گئی

اور تیر ترکش سے نکل کر کمان میں۔ اس کے پروں کی شکنیں کھلیں اور وہ دفعتاً نگاہ سے غائب ہو گیا۔

(۳)

سائیک کی سترھویں سالگرہ ختم ہو چکی تھی۔ شوہر کا انتخاب نہ ہو سکا۔ اس کا حسن لوگوں کے دلوں میں عجیب و غریب صورت اختیار کر
چکا تھا اس سے محبت کرنے کا مفہوم سوائے اسکے اور کچھ نہ رہ گیا تھا۔ کہ دنیا اس کی پرستش کرنے لگے۔ سائیک کا نام لیا جائے تو
لوگ سجدوں میں گر پڑیں اور جب اس کا واسطہ دیا جائے تو ظالم سے ظالم قزاق بھی اپنا ہاتھ روک لے۔
والئ یونان کو پورا یقین تھا۔ کہ اب سائیک کی شادی نہیں ہو سکتی۔ کوئی منتخب کیا جاتا تو وہ اس بات کا اہل نہ ہوتا کہ
سائیک اسکی آغوش میں سپرد کر دی جائے اور اگر کوئی ہوتا بھی تو سائیک کے حسن کی برداشت اسکے امکان سے باہر تھی۔
سالگرہ کے ٹھیک دوسرے دن شام کو سائیک اپنے باغ میں حوض پر بیٹھی ہوئی رنگین مچھلیوں کی بیقراری کا تماشہ دیکھ رہی تھی
لیکن جو حسینہ اپنے شباب کو خلوت اور مہجوری میں کاٹنے کے لئے مجبور ہو اسکے لئے یہ تفریحیں کیا معنی رکھتی ہیں وہ مغموم اور نامراد تھی
پھولوں کے ہار یونہی پڑے پڑے سوکھ گئے وہ سمجھتی تھی شاید گجروں کو کوئی اپنے لئے نہیں پہنتا۔ ہار اسلئے گردن میں نہیں ہوتے کہ
ان کی نکہت کو صرف ہوا لئے پھرے۔ ان سے یہ مقصود نہیں کہ وہ ایک افسردہ سینہ پر پڑے پڑے سوکھ جائیں بلکہ ان کا یہ مدعا
ہے کہ کوئی دوسرا بھی ان کی نکہت سے بیقرار ہونیوالا ہو۔ اور ان کی جنبش ایک دھڑکتے ہوئے دل کی جانب سے اس بیقراری کا جواب دے
ورنہ ناکام سینہ ایک مزار ہے اور مزار پر چڑھائے ہوئے پھول کیا۔
سائیک نے گانے میں بھی دلچسپی چھوڑ دی اور سازوں کی نسبت اسے گمان ہو گیا کہ ان کے تاروں میں کسی تار کی کمی ہے ان میں
کوئی بھی اسکے حسیات کا جواب دینے والا نہ تھا۔ وہ اپنی گوری گوری کلائیاں دیکھتی تھی اور چاہتی تھی۔ کہ کوئی مضبوط ہاتھ انہیں پکڑے اور نہ
چھوڑے۔ اب اس کا وہ غرور حسن باقی نہ رہا کہ خوبصورت شہزادوں کی تصویریں دیکھتی اور منہ پھیر لیتی۔

(۴)

سائیک حوض پر بیٹھی ہوئی محو تماشہ تھی کہ دوسرے کنارے پر نسرین (سینی) نے اپنا ساز چھیڑا
"اے رات بیدار ہو جا کہ آج میری نازک انگلیوں میں پھر تاروں کی سرزنش سے گدگدی پیدا ہو رہی ہے"۔
سائیک یہ گانا سُنکر شاہانہ انداز سے کھڑی ہو کر ٹہلنے لگی۔ سیاہ ریشمی چادر جو اس کے زانوؤں سے لپٹی ہوئی تھی کمر کی نزاکت کو اور بھی
نمایاں کرتی ہوئی سر تک پہنچ گئی۔ شانے کھل گئے اور سفید گردن سینہ کی سفید عریانی سے مل گئی۔ کالے کالے بال گھوم گھوم کر اور بھی پھیلے بن گئے
ابروئیں تن گئیں اور مست آنکھیں اور بھی متوالی ہو گئیں
یہی وقت اور یہی عالم تھا۔ کہ کیوپڈ اپنا تیر کمان سنبھالے کنجوں میں سے نکلا۔ اور اس ارادہ سے نکلا۔ کہ آج اپنا ترکش سائیک پر خالی کر دے
لیکن نشانہ کو پیش نظر رکھنے کے لئے کیوپڈ نے سائیک کو نگاہ بھر کر دیکھا ہی تھا کہ تیر چٹکی سے چھوٹ گیا۔ کمان ہاتھ سے گر پڑی چلہ
اتر گیا۔ اور وہ خود غش کھا کر زمین پر گر پڑا۔
آہ کاش کوئی اسوقت سائیک سے کہدیتا۔ کہ جس محبت کی اسکو جستجو ہے وہ خود اسکی متلاشی ہے جس عشق کی اسے تمنا ہے وہ
خود اسکی تمنائی ہے صیاد خود اس کا مجروح اور عشق خود اس کا دیوانہ ہے اور تیر آپ اسکی نگاہ کا زخمی۔
اے کامدیو! تو نے لاکھوں دلوں پر تیر چلائے ہوں گے نہ جانے تو نے کتنے سینے مجروح کئے ہوں گے لیکن وہ تیر جو حسن کے ترکش
میں پنہاں ہیں وہ پیکان جنہیں ایک دوشیزہ ہی کی نیم باز آنکھیں چلا سکتی ہیں تیری ناوک اندازی سے زیادہ تباہ کن ہیں۔
جا! تیرا تیر اب صرف ایک شہپر ہے بازو سے جدا۔ تیری کمان ایک خمیانہ ہے۔ بیہودہ جو کچھ ہونا تھا ہو گیا فرشتوں
[illegible] کاش نہ ہوتا۔ کہ وہ عشق کا دیوتا آج سائیک کے باغ میں بیہوش پڑا ہے۔

(۵)

وینس کو یقین تھا۔ کہ سائیک کیا ویسی ہزاروں سائیک ہوں تو بھی کیوپڈ چٹکی کی صرف ایک جنبش سے سب کے دلوں کو چھلنی کر سکتا ہے مگر فطرت کے پاس ایک تیر اور تھا جو کا مدیو کے تیروں کی طرح بدنام نہ تھا مگر تھا ان سے زیادہ کارگر ———— جس وقت سائیک اس عالم میں آئی تو وہ تیر اسکی نشیلی آنکھوں میں نگاہ بنا کر رکھدیا گیا۔

کیوپڈ کو تو زخم پہنچانے کے لئے قصد اور ارادہ کی ضرورت تھی۔ لیکن سائیک کی مست آنکھوں کو یہ ہوش کہاں۔ ایک بار پلک سے پلک جدا ہوتی اور تیروں کی بارش شروع ہو گئی۔

کیوپڈ سائیک کے باغ سے زخمی ہو کر پھرا اور ایسا زخمی کہ اسکی روح ایک جراحت کدہ بن گئی۔ وہ اپنے باغ میں بیقراری کا لطف اٹھا رہا تھا۔ کہ وینس آئی اور اس کو افسردہ خاطر دیکھ کر متحیر ہو گئی وہ ایک لمحہ کے لئے بھی نہ سمجھ سکتی تھی کہ کیوپڈ اور کسی مہم سے ناکام واپس آئے کچھ بھی او سمجھ کر ٹھٹکی اور ٹھٹک کر آگے بڑھی۔ اس نے تحکمانہ انداز سے کہا ————

اے کیوپڈ اپنا ترکش دکھا کہ میں اسکو خالی دیکھ کر خوش ہو جاؤں۔ شاید تو افسوس کرتا ہوگا۔ کہ ایسی حسین دوشیزہ کو کیوں زخمی کیا جلدی بول اور کہہ کہ سائیک دیوانہ وار دیواروں سے سر ٹکرا رہی ہے یا وادیوں میں خراب وخستہ پھر رہی ہے۔

کیوپڈ سائیک کی نسبت ایسی باتیں نہ سن سکا اور بیقرار ہو کر بولا۔ ہاں میرا ترکش خالی ہے بیں سائیک کے مجروح ہونے پر افسوس نہیں کرتا ہوں کہ وہ مجروح نہیں ہے اور اگر کہیں وادیوں میں پریشان پھر رہی ہے تو وہ تنہا نہیں ہوگی۔ کیونکہ کیوپڈ نے اپنی کمان توڑ ڈالی۔ تیروں کو پھینکدیا اور اب اس کی زندگی کا مقصد صرف یہی ہے۔ کہ وہ سائیک کے درد ومصیبت میں اپنے تئیں مٹا دے۔ اے ماں مجھے ملامت نہ کر کہ وہ فن تیراندازی میں مجھ سے زیادہ مشاق نکلی۔

اس لئے کبیر جی نے کہا ہے :۔

دوہا

چھوٹی موٹی کامنی سب ہی وِش کی بیل
وَیری مارے داؤ سے یہ مارے ہنس کھیل

پیارے دوستو! جب کامدیو بھی کامنی کے تیروں سے نہ بچ سکا۔ تو سمجھ لو کہ اس ندی کو پار کرنا کسی بیر پُرش کا کام ہے۔ جو سنسار میں آکر کامنی کے داؤ گھات سے بچا رہتا ہے وہی مہاتما اور مایہ سے رہت ہے۔ سنت کبیر فرماتے ہیں :۔

ساکھی

نینوں کاجل پاٹیکے گاڑھا باندھا کیش ہاتھوں مہندی لائے کے باگھن کھایا دیش

(۲) گائے روئے ہنس کھیل کے ہرت سبن کے پران کہے کبیر یا گھات کو سمجھے سنت سُجان

(۳) ناری سے نظر نہ جوڑیے انش کھیس ہو جائے جا کے چت ناری بسے چار انش لے جائے

(۴) دیپک جھولا پون کا۔ نر کو جھولا نار سادھو جھولا شبد کا۔ بولے نہیں وچار

(۵) ایک کنک اور کامنی وِش پھل کیا اُپائے دیکھت ہی تے بِس چڑھے چاکھت ہی مر جائے

برسات

موٹر ایک پہاڑی ڈھلوان سڑک پر دوڑ رہی تھی لال لال کیچڑ پہیوں سے لپٹی جا رہی تھی۔ بارش تھمنے کے بعد چٹانوں پر گہرے رنگ کا پانی بہہ رہا تھا سامنے نشیب میں گاؤں کے کچے جھونپڑے جن پر کدو کی بیلیں پھیلی ہوئی تھیں نظر آ رہے تھے۔ موٹر کیچڑ اچھالتی اور گدلے پانی کے چھینٹے اڑاتی گاؤں کے قریب پہنچ گئی۔ اور دو تین موٹے موٹے کتوں نے پہلے بھونک کر پھر بڑے بڑے بالوں والی دموں کو ہلا کر کمبلوں اور بوریوں میں لپٹے ہوئے مسافروں کا استقبال کیا۔ موٹر گاؤں کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ قریب ہی بکریوں کا ایک ریوڑ پتھر کی ڈھلی ہوئی چ... پر جھکائے کھڑا تھا۔ بکریوں کے بال بارش کے پانی سے بھیگے ہوئے تھے۔ وہ کان لٹکائے جگالی کر رہی تھیں بھیں بھیں اور میں کی آواز میں موسلا دھار بارش کے خلاف اجتماعی طور پر اظہار نفرت کر رہی تھیں۔ ایک خوبصورت دوشیزہ بھیگا ہوا سر کھولے بکریوں کے پاس کھڑی گویا ان کی ڈھارس بندھا رہی تھی اور غور سے لاری کے مسافروں کو دیکھ رہی تھی جو موٹر ٹھہرتے ہی برساتی کیڑوں کی طرح کلبلانے لگے تھے۔

سگریٹ۔ بیڑی۔ ماچس ——— چٹ پٹے مصالحہ دار چنے! گرم گرم کابلی چنے ہیں! ——— مونگ پھلی بابو جی بھونی ہوئی مونگ پھلی! ——— ٹین کی ایک چھوٹی سی دکان سے جو سڑک کے کنارے بنی ہوئی تھی ایک نوجوان ... بولنے لگا اور دو تین مسافر کھانستے کھنکارتے دوکان کے سامنے جا کھڑے ہوئے ڈرائیور نے سڑک پر انگڑائی لیتے ہوئے رونے کے انداز... گانا شروع کیا۔ "برسات ہے۔ برسات ہے۔ برسات"

اس کی پھٹی ہوئی آواز دو رنگ نمناک فضا میں پھیلتی چلی گئی۔ ایک کالے کتے نے منہ پھاڑ کر سر کو اونچا کر دیا اس کی بھدی آواز پہاڑی درختوں کی چوٹیوں پر پھیلے ہوئے گاڑھے بادلوں میں جا ملی دوسرا بھورے رنگ کا کتا اپنی لنگڑی ٹانگ کو دانتوں سے چبانے میں مصروف تھا سگریٹ کا دھواں سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا میری آنکھوں کے سامنے نیچے سے اوپر کی طرف جا رہا تھا دوشیزہ سفید... کے سر پر ہاتھ رکھے ڈرائیور کی طرف دیکھ رہی تھی جو بڑی تیزی کے ساتھ اپنے ڈھیلے کوٹ کی پھولی ہوئی جیب سے مونگ پھلی نکال کر کھا رہا... دوشیزہ کی نگاہوں میں نہایت گہرا اور شاعرانہ حسن طلب جس میں بھوک اور معصومیت کے ملے جذبات نمایاں تھے چھلک رہا تھا۔ ——

کھوں کھوں آخ کی متعدد آوازیں بیڑی کے دھوئیں سے لپٹی ہوئی دوکان کے سامنے بل کھا رہی تھیں۔ ایک بڈھا جس کی پسلیاں ابھری ہوئی تھیں۔ رانوں تک دھوتی چڑھائے گاڑھی کیچڑ کو کھوندتا گاؤں سے لاری کی طرف آ رہا تھا اسکی پرانی کھانسی جس میں بلغم ندی کے جھاگوں کی طرح تیر رہا تھا اپنے جھٹکوں سے روح پر اس طرح ضربیں لگا رہی تھی جیسے لاری کا انجن اپنی تھرتھراہٹ سے مسافروں کے جسم کو کبھی کبھی ہلا دیا کرتا تھا۔ کیچڑ میں سنے ہوئے پیروں سے سڑک کو روندتا ہوا وہ موٹر کے قریب آ گیا اور میلی پگڑی کے نیچے ہاتھ ڈال کر چندیا کو کھجاتے ہوئے بولا۔ "ایک بیڑی! ——— بابو جی!! چھالیہ ذرا سی ——— خانصاحب!

خانصاحب بٹوہ ہاتھ میں لئے چھالیہ پھانک رہے تھے اور پیلا پیلا رنگین تھوک منہ کے دونوں کونوں سے بہ رہا تھا انہوں نے حقارت آمیز نگاہوں سے بڈھے کو دیکھا جس کا کمر سے لگا ہوا پیٹ جلدی جلدی حرکت کر رہا تھا اور دوسری طرف مڑ کر انہوں نے پان کی ایک لمبی سی پچک تھوک دی۔ پھر دانتوں سے لونگ کاٹنے میں مصروف ہو گئے۔

خانصاحب! چھالیہ ذرا سی! بڈھے نے چندیا کھجاتے ہوئے کئی مرتبہ کہا اور ڈرائیور کے پاس جا کھڑا ہوا جو اب بھی مونگ پھلی چھیلنے اور کھانے میں مصروف تھا اس کی نگاہیں دوشیزہ کے بھیگے ہوئے بالوں پر جمی ہوئی تھیں اور کبھی کبھی برسات ہے برسات کی پھٹی ہوئی آواز اس کے منہ سے نکل جاتی تھی۔

"بس بابو جی۔ ایک پیسہ" ——— برسات ہے برسات ہے۔ برسات! ڈرائیور بہت زور سے چلایا اور بڈھا

مہاتما نے مسکراتے ہوئے فرمایا اب مجھے کسی چیز کی خواہش نہیں مالک نے مجھے سب کچھ دے رکھا ہے اسکی مہر کی نظر ہی میرے لئے سب کچھ ہے میں اس لئے اور کیا مانگوں"۔

جواب میں فرشتوں نے کہا "تمہیں ضرور بالضرور کسی نہ کسی طاقت کو حاصل کرنے کے لئے خواہشمند ہونا چاہیئے ورنہ مجبوراً تمہیں دی جائیگی"۔

"بہت اچھا" مہاتما نے کہا۔ "اگر ایسی ہی بات ہے تو پھر مجھے ایسی طاقت حاصل ہو جائے جسکے ذریعہ میں حقیقی فیاضی کا سرچشمہ بن جاؤں لیکن ساتھ ہی یہ شرط ہے کہ مجھے اس بات کا مطلق علم نہ ہو کہ کس کے ساتھ میں نے بھلا کیا ہے میرے علم میں آئے بغیر ہی مجھ سے محض بھلائی ہوتی رہے"۔

مہاتما کی ایسی پوتر اور خودی و خود غرضی سے بالا تر خواہش کو سُن کر فرشتے حیرت زدہ ہو گئے باہمی مشورہ کرنے لگے آخر کار اس نتیجہ پر پہنچے کہ مہاتما کا سایہ آئندہ ہمیشہ کیلئے اس کے پیچھے یا دائیں بائیں پڑا کرے اور اس میں یہ طاقت اور برکت ہو کہ اگر وہ کسی مریض پر پڑے تو وہ صحتیاب ہو جائے کسی غمزدہ پر پڑے تو وہ خوش و خرم ہو جائے وغیرہ لیکن ساتھ ہی یہ بات ہو کہ مہاتما کو اس امر کا مطلق علم نہ ہو کہ اس کے سایہ میں ایسی طاقت یا برکت ہے ایسا ہی ہو گیا اس کے بعد جب مہاتما چلا کرتا تھا اس کا سایہ اس کے پیچھے یا دائیں بائیں پڑا کرتا تھا۔ اگر مہاتما کا کسی خشک جگہ سے گذر ہوا تو اس کے سایہ سے وہ جگہ سبزہ زار ہو گئی مرجھائے ہوئے بوٹے تر و تازہ ہو گئے خشک جھیلیں پانی سے لبریز ہو گئیں۔ ننھے بچوں کے پژمردہ چہرے پر رونق ہو گئے یہ سارا کام مہاتما کو بغیر علم ہوئے ہوتا رہتا تھا اور اسے اس بات کی مطلق خبر نہ ہوتی تھی۔ ندی کے قدرتی بہاؤ کی مانند اس سے بھلائی ہی بھلائی ظاہر ہوتی تھی ذاتی غرض کو اس میں بالکل دخل ہی نہ تھا۔ جب مہاتما سڑک سے گذرتا تھا لوگ چپکے چپکے اس کے سایہ سے فیض اٹھایا کرتے تھے نہ مہاتما کو اس کا علم ہوا کرتا تھا اور نہ ہی لوگ اسے کچھ بتاتے تھے رفتہ رفتہ لوگ اس مہاتما کا نام بالکل بھول گئے اور وہ محض "متبرک سایہ" کے نام سے مشہور ہو گیا۔

ہندوستان کے آم

دنیا بھر کے تمام پھلوں کا سردار آم ہے اور اس کو ایشور نے ہندوستان پر نازل کیا ہے۔ گو ملک افریقہ میں بھی آم ہوتے ہیں لیکن وہ ہندوستان کے آموں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ افریقہ کے آم جنگلی ہوتے ہیں ہندوستان میں ہزاروں سالوں سے آموں میں پیوند پیوند لگا کر طرح طرح کی قسمیں پیدا کر دی ہیں اس ہنر کے مالک ہندوستانی ہی ہیں۔ آم ہندوستان کے گرم علاقہ کی پیداوار ہیں ماہ اپریل میں اس پر مور (پھول) آتا ہے۔ ہر درخت خوب پھولتا ہے اور اس کی خوشبو دور دور تک پھیل جاتی ہے ماہ جون میں آم پکنے لگتے ہیں یعنی اساڑھ اور ماہ ساون ہندوستان میں آموں کا خاص موسم ہے۔ آم دو طریقہ سے پکتے ہیں ایک تو درختوں پر پک کر گرتے رہتے ہیں اور یہ آم ٹپکے کے آم کہلاتے ہیں کیونکہ یہ درختوں سے ٹپکتے رہتے ہیں دوسری قسم پال کے آم کہلاتی ہے یعنی نیم پختہ آموں کو درختوں سے اتار کر ایک گھاس کہ جس سے کاغذ بنتا ہے اس گھاس کو پال بھی کہتے ہیں اس گھاس میں نیم پختہ آموں کو رکھکر پکاتے ہیں اسلئے پال کے آم کہلاتے ہیں لیکن کھانے میں ٹپکہ بہتر ہوتا ہے۔ برسات میں جب بارش برستی ہے۔ تب ہندوستان کے رہنے والے آم کے باغوں میں ٹپکہ آم کا لطف اٹھاتے ہیں۔ ذات کے لحاظ سے آم دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک آم کا پیوند دوسرے آم پر لگا کر نئی نئی قسم کے آم پیدا کئے جاتے ہیں ایسے آموں کو قلمی یا پیوندی آم کہا جاتا ہے ان آموں کا گودا ٹھوس ہوتا ہے اسلئے ان آموں کو چاقو یا چھری سے تراش کر کھلاتے ہیں۔ آموں کی یہ قسم قیمتی لذیذ اور مختلف ذائقہ دار اور شیریں ہوتی ہے۔ ہندوستان میں لکھنؤ۔ بنارس۔ بمبئی۔ مدراس اور سہارنپور کے آم خاص اور بہ عمدہ ہوتے ہیں (۱) بنارس کا سفیدہ آم (۲) ضلع لکھنؤ کا دسہری آم (۳) بنارس کا لنگڑا آم (۴) ملیح آباد ضلع لکھنؤ کا گلاب

جامن آم (۵) اسی علاقہ کا زرد آلو آم (۶) یوپی کا سندھوری آم (۷) موہن بھوگ آم (۸) دلپسند آم (۹) شاہ پسند آم (۱۰) کرشن بھوگ آم (۱۱) دودھیا آم (۱۲) سونفیا آم (۱۳) سیپیا آم (۱۴) فضلی آم (۱۵) زعفرانی آم (۱۶) سہارنپوری پیوندی آم (۱۷) بمبئی کا پیوندی آم آل فنز (۱۸) مدراس کا پیوندی آم - یہ سب اعلیٰ قسم کے پیوندی آم ہیں - ان کا اصل وطن یوپی - مدراس بمبئی ہے لیکن دوسرے صوبوں میں بھی اب یہ پیدا ہوتے ہیں (۱۹) پری آم (۲۰) طوطا آم یہ ہر دو ادنیٰ قسم کے پیوندی ہیں مندرجہ بالا اقسام کے علاوہ اور بھی پیوندی آموں کی اقسام ہونگی لیکن میں انہی اقسام سے واقف ہوں اور یہی اقسام زیادہ زمنہ ہیں - تخمی آم - ان کو کہا جاتا ہے - جو کہ پیوند لگانے کی بجائے آم کی گٹھلی بو کر پیدا کئے جاتے ہیں کیونکہ یہ تخم یعنی بیج سے اگائے جاتے ہیں اسلئے تخمی کہلاتے ہیں - ان تمام آموں کا رس پتلا ہوتا ہے کئی اقسام کے آموں میں صوف یعنی ریشے ہوتے ہیں کم پسند کئے جاتے ہیں آم کی کئی اقسام صوف کے بغیر ہوتی ہیں ان کو زیادہ پسند کیا جاتا ہے - تخمی آموں کی سینکڑوں اقسام ہیں - پنجاب میں ضلع مظفر گڑھ اور ضلع ملتان کے آم زیادہ اچھے ہوتے ہیں ضلع گورداسپور اور ضلع ہوشیارپور میں آم بکثرت پائے جاتے ہیں ویسے پنجاب کے ہر ضلع میں تخمی آم ملتے ہیں لیکن قلمی کم پائے جاتے ہیں - یوپی میں تخمی آم بھی بہت زیادہ پیدا ہوتے ہیں اور دور دور بھیجے جاتے ہیں آم دراصل بہشتی میوہ ہے ماہ اساڑھ اور ساون میں تمام ہندوستان میں آموں کا دسترخوان بچھ جاتا ہے ملک کا ہر امیر غریب اس دسترخوان سے اس بہشتی میوہ کو پیٹ بھر کر کھاتا ہے - آم کے کھانے سے جسم میں نیا خون پیدا ہوتا ہے جسم میں گرمی پیدا ہوتی ہے معدہ اور انتڑیاں اس کے استعمال سے صاف رہتی ہیں - دل و دماغ کو یہ قوت دیتا ہے اور چہرہ کا نکھارتا ہے بوڑھوں بچوں اور جوانوں کے لئے یکساں مرغوب غذا ہے آم کھانے کے بعد دودھ ملے پانی میں میٹھا ملا کر پینا زیادہ مفید ہے کہ جس کو پنجابی کچی لسی کہتے ہیں - یا بکریوں کا دودھ پینا چاہیئے میٹھا - برف اور روح کیوڑہ کے چند قطرے ملا - آم کے بعد جامن کھانے سے آم جلد ہضم ہو جاتے ہیں - آم سے طرح طرح کے مربے - اچار - چٹنیاں بنتی ہیں جو کہ بہت مفید اور لذیذ ہوتی ہیں موسم پر ہندوستانی تمام سال کے لئے اپنے گھروں پر تیار کر لیتے ہیں - آموں کو دنیا کے سائنسدان پریزرو یعنی محفوظ کرنے کی کوشش کر چکے ہیں تاکہ دنیا کے کونے کونے میں اس پھل کو پہنچا سکیں - لیکن ہندوستان کی یہ خوش قسمتی ہے کہ وہ اب تک کامیاب نہیں ہوئے ورنہ ہندوستان میں آموں کا بھی قحط پڑ جاتا - یورپ میں آم پیدا نہیں ہوتے جو بمشکل وہاں پہنچتے ہیں بھاری قیمت پاتے ہیں اور وہاں کے امراء ہی ان کو خرید سکتے ہیں - اس بہشتی پھل پر آج تک کسی نے تفصیلی روشنی نہیں ڈالی تھی حالانکہ اس پھل کے حالات ضبط تحریر میں لانے از بس ضروری ہیں - اس پھل کو ہندوستان سے خاص لگاؤ ہے غیر ممالک کے سیاح ہندوستان میں آکر اس ملک کے اس خاص پھل کو بڑے شوق سے کھاتے ہیں اور تعریف کرتے ہیں - پیوند لگا لگا کر ہندوستان کے مالیوں نے ان میں طرح طرح کے ذائقے پیدا کر کے اپنے کمال کا ثبوت دیا ہے کہ جس کی مثال دنیا میں نہیں مل سکتی ایک درخت سے سینکڑوں قسمیں پیدا کر دینا کوئی آسان کام نہیں - ہندوستانی دماغ سب کچھ کر سکتے ہیں بشرطیکہ ان کو سکون حاصل ہو۔

آموں کی سوغات

(۱) شریمان سیتارام سنگھ جی آنند نے لکھنؤ سے گلاب جامن آم زرد آلو آم اور دسہری آم کا ایک پارسل (۲) لالہ لاجپت رائے ماتاجی پیکنگ کیس سٹور لکھنؤ نے دسہری آموں کا ایک پارسل (۳) شریمان نیاد رسنگھ جی جین مظفر نگر (یوپی) سے خوشبودار میٹھے آموں کا ایک پارسل بھیجنے کی کرپا کی ہے کہ جنکو میں کئی دن تک کھاتا رہا ہوں میں مندرجہ بالا ہر سہ اصحاب کے تحفوں کی جو کہ دلی محبت سے بھیجے گئے ہیں بہت قدر کرتا ہوں (صوفی لچھمن پرشاد)

رخ مت بھولیں مثال کے طور پر جن پرندوں نے قدرتی حادثوں (پانی ہوا۔گرمی وغیرہ) کی تبدیلی دیکھ کر خود کو بھی تبدیل کیا
وہ زندہ رہے۔ باقی مٹ گئے مٹنے والوں میں سے آپ کیوی ۱۷۱ K پرندے کا نام لے سکتے ہیں۔ یہی قدرت کا قانون ہے
ضرورت حالات کے مطابق اپنے رسم و رواج میں تبدیلی کریں۔ ورنہ قدرت سے ٹکرلیں۔
کبھی آپے سے باہر مت ہو جیئے۔ اگر دل بے قابو ہو جائے تو زبان کو زبردست کنٹرول میں رکھئے ورنہ نتیجہ اچھا نہ ہوگا بے موقع
دخل مداخلت اچھی نہیں یہ سوسائٹی کے خلاف ہے۔ سائنس کی کوئی برانچ بھی اتنی ضروری نہیں جتنی حضرت انسان کو سمجھنے کی ہے اگر
آپ اس میں کامیاب ہوئے ہیں تو آپ بہترین رسوخ کے مالک ہوں گے۔

ہمیشہ دماغ کا استعمال کیجئے۔ اپنی دل سے اور دلیل سے مدد لیجئے۔ یہ بھی غلطی کر سکتے ہیں۔ لیکن ان کی مدد سے آپ کی زبان بہت
سی غلطیوں سے بچ جائیگی۔ بولنا اگر چاندی ہے تو خاموش رہنا سونا اور میں تو آدمی کی قابلیت اور عظمت کی جانچ ہی اس کی
بات چیت اور خاموشی سے لگایا کرتا ہوں۔

دنیا میں ترقی ان لوگوں کے لئے ہے جو صبر سے بیٹھ کر محنت کرتے ہیں اور موقعہ ملنے پر اس کا اعلیٰ فایدہ اٹھاتے ہیں خیال
ہے کہ آپ کی تھوڑی سی غلطی سے اگر ایک چانس نکل گیا ہے تو شاید پھر کبھی ایسا ہاتھ نہ آئے
سوسائٹی میں آپ ان آدمیوں کو جن کو دنیا بڑا کہتی ہے۔ عزت پر کھئے۔ ان کی خوبیاں سمجھئے جن کی وجہ سے وہ بڑے
بنے وہ خوبیاں اپنے میں پیدا کیجئے۔ یاد رکھئے۔ کہ دوسروں کی تعریف بیشک دوسروں کے سامنے کیجئے لیکن بدخوئی اکیلے ہی اچھی
ہے اور آخر میں خیال رکھئے۔ کہ ہمیشہ راستی کی فتح ہوتی ہے۔ جوش کی ضرورت نہیں ہوش طاقتور ہوتا ہے لگاتار محنت نے
غریبوں کو بادشاہ اور موچیوں کو ڈکٹیٹر بنایا۔ زندگی میں قدم قدم پر دشواریاں اور تلخیاں آپ کا مقابلہ کرنے کو بیٹھی ہیں انہیں
دماغ کے زور سے اپنے راستے سے ہٹا دیجئے۔ جناب عالی! زندگی محتاط رہنے کا نام ہے۔ سمجھے آپ!

عورتوں کا بھی کچھ فرض ہے

مردوں کا فرض ہے کہ صبح سے شام تک محنت کر کے کمائے۔ کاشتکاری۔ تجارت۔ دستکاری۔ مزدوری یا اعلیٰ سے
ادنیٰ درجہ کی ملازمت یہ ہی مردوں کا ذریعہ معاش ہے۔ مرد کے لئے لازم ہے کہ وہ کما کر اپنے بیوی بچوں کی ضرورت پوری کرے۔ اس
دن کے لئے اس کو خون پسینہ ایک کرنا پڑتا ہے روزی کی خاطر ذلیل ہوتا ہے ہر طرح کی مصیبتیں برداشت کرتا ہے۔ غم و فکر میں ڈوبا
رہتا ہے پھر کہیں جا کر اپنے بال بچوں کا پیٹ بھرتا ہے۔ بیاہ شادی۔ بیماری کی ذمہ داریاں بھی اسکی گردن پر ہوتی ہیں اس کو نہایت
دوراندیشی سے چلنا پڑتا ہے۔ پائی پائی کی کفایت کرنا۔ قانون کی خلاف ورزی میں قید و بند کی مصیبتیں اس کو جھیلنی پڑتی ہیں اس قدر
ذمہ داریوں سے اس کو گذرنا پڑتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں عورتوں کا یہ فرض ہے کہ مرد کی آمدن کے مطابق چلے۔ اڑوس پڑوس برادری
کے زیادہ آمدن والے گھروں کی تقلید نہ کرے بلکہ اپنی چادر دیکھ کر پاؤں پسارے مرد کو تو تمام دن کمانے سے فرصت نہیں عورت کا
فرض ہے کہ گھر میں بیٹھ کر بچوں کی نگہبانی کرے سینا پرونا کھانا بنانا۔ چیزوں کو قرینے سے رکھنا۔ مردوں کے لباس اور خوراک کا
خیال رکھنا۔ گھریلو خرچ کا حساب کتاب بجٹ کے مطابق رکھنا اس کا فرض ہے۔ مرد جس طرح کمانے کے لئے مشقت کرتے ہیں
ایسے عورتیں اسی سرگرمی کے ساتھ گھریلو کاموں میں دلچسپی لیتی ہیں۔ گھریلو کام کاج کے متعلق مردوں کو فکرمند نہیں ہونے دیتیں اور
پائی پائی کی کفایت کرتی ہیں ایسی شریف عورتیں گھر کے ادنیٰ سے ادنیٰ کام کو کرنے میں شرم محسوس نہیں کرتیں اور گھران کی دلچسپی
کا مرکز ہوتا ہے ایسی عورتیں اپنی دانشمندی سے گھر کو بہشت بنا دیتی ہیں ہر چیز قرینے سے رکھتی ہیں اور مرد جس کی کر آستے

ہیں خندہ پیشانی سے ان کا استقبال کرتی ہیں ایسے گھروں میں مرد آ کر اپنی تمام دن کی مشکلات کو بھول جاتے ہیں اور ان کو آرام ملتا ہے یہ ہی ہندوستانیوں کی قابل فخر پرانی تہذیب ہے۔ جدید تہذیب کا یہ حال ہے کہ عورتوں کی بلا سے اگر مرد کی آمدن کم ہے تمام دن بناؤ سنگار سے کام اڑوس پڑوس میں گھومتے رہنا۔ خاوند کو ایسی فرمائشیں کرتے رہنا جو کہ اس کی آمدن سے بہت زیادہ ہوتی ہیں گھر کے کام سے کچھ سروکار نہیں تمام کنبہ نوکروں کے رحم پر نوکروں کو گھر کی ہر چیز کا علم ہے لیکن عورت کو کچھ خبر نہیں گھر ہے یا تباہ ہوا اس کو اس میں کچھ دلچسپی نہیں کھیل تماشوں کی طرف ہر وقت مائل جب دیکھو لڑائی فساد پر آمادہ ایسی عورتیں مردوں ہی کی نہیں بلکہ تمام کنبہ کی زندگیاں برباد کر دیتی ہیں ایسی غیر ہمدرد عورت سے جس قدر جلد مخلصی ملے اتنا ہی اچھا ہے ایسی عورتوں کے مرد چاک گریباں ہمیشہ غمگین رہتے ہیں۔ عورتوں کو بھی گھر کا اتنا ہی کام کرنا چاہیئے کہ جتنا مردوں کو باہر کرنا پڑتا ہے اگر مرد نہ کمائے تو تمام کنبہ کو بھوکوں مرنا پڑتا ہے اسی طرح سے باوجود دکمائی کے عورت خانہ داری کے کاموں کو پوری ذمہ داری سے انجام نہ دے تب نوکر چاکر خوب موج کرتے ہیں اور گھر برباد اور مرد قرضدار ہو جاتا ہے وہ عورت جو گھریلو کاموں میں دلچسپی نہیں لیتی اور بیگانہ گھر سمجھ کر رہتی ہے۔ میرا تجربہ کہتا ہے آخر کار بیوہ ہو کر لوگوں کے گھروں کے برتن صاف کر کے پیٹ پالتی ہے اس لئے جو عورتیں چاہتی ہیں کہ عمر خوشی سے گذاریں ان کو چاہیئے کہ گھر کو اپنا گھر سمجھ کر ہر کام میں دلچسپی لیں اور گھر کا کام کر کے خوشی محسوس کریں اگر ایسا نہ کریں گی تو ان کا گھر اجڑ جائیگا۔ اور ذلیل زندگی بسر کرنے پر مجبور ہونگی۔ عورتوں کا بھی کچھ فرض ہے کہ جس کو انجام دینا ضروری ہے چیزوں کی قیمتیں بہت بڑھ گئی ہیں۔ مردوں کو ضروریات پوری کرنے کے لئے اب اور بھی زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے اگر اب بھی عورتوں نے اپنا فرض پورا نہ کیا تو تباہ ہو جائینگی۔ مہاتما گاندھی نے ان کو چرخہ کاتنے کو کہا۔ چرخہ تو یہ کیا کاتینگی انہوں نے تو دیگر گھریلو کاموں میں دلچسپی لینا بھی چھوڑ دیا ہے۔ پنجاب میں تو یہ حالت ہے کہ ست سنگ کیتھا بارتا۔ بائیسکوپ میلہ۔ شادی مرگ کے بہانے یہ وقت نکال کر ماری ماری پھرتی ہیں۔ لیکن خانہ داری میں من مارنے سے کوسوں دور بھاگتی ہیں۔ ان کے شاہانہ لباس پر مرد کی تمام کمائی قربان ہو جاتی ہے پرانے فیشن کی دیویاں جو رات دن خانہ داری کے کاموں میں مصروف رہتی ہیں۔ ان کا یہ مذاق اڑاتی ہیں۔ پہلے وقت کی عورتیں چرخہ کات کر گھر بھر کے لئے کپڑا مہیا کرتی تھیں۔ اب نئے فیشن کی عورتیں زرق برق پوشاک خریدنے پر مردوں کی تمام کمائی صرف کر دیتی ہیں ایسی حالت میں مردوں کی حرکتِ قلب بند ہونے سے موت واقع نہ ہو تو اور کیا ہو۔ ہارٹ فیل ہونے کا عارضہ عورتوں کی فضول خرچی اور گھر سے لاپرائی کا نتیجہ ہے۔ اس لئے عورتوں کو بھی اپنا فرض پورا کرنا چاہیئے ورنہ ان کا گھر اور ان کا سکھ وچین خطرہ میں ہے ÷

"اُمید"

اگر تمہارے خویش واقارب تمہیں چھوڑ دیں۔ تمہیں ٹھکرا دیں۔ نا امید نہ ہو

اگر تمہاری امید کا ہرا بھرا درخت سوکھ جائے اور پھل پتے گر کر برباد ہو جائیں نا امید نہ ہو

اگر راستہ میں اندھیرا چھا جائے۔ پریشان نہ ہو۔ بڑھے جاؤ۔ ہمت نہ ہارو اور نا امید نہ ہو

اگر آندھی کے تند جھونکے تمہاری مشعل بجھا دیں۔ جلانے کی کوشش کئے جاؤ۔ گھبراؤ نہیں نا امید نہ ہو

اگر تمہارے دوستوں کے کان تمہاری طرف سے بہرے ہو جائیں اور جنگل کے پنکھ پکھیرو۔ چوپائے تمہاری طرف سے کان پھیر لیں۔ نا امید نہ ہو۔ افسوس نہ کرو۔

جانداروں میں حفاظت کے طریقے

موجودہ جنگ میں دشمن سے بچنے کے لئے اور اس کو دھوکا دینے کے لئے فوجوں کو کئی چالیں کھیلنی پڑتی ہیں جن میں کیموفلاج
[...]ت دخل ہے جنگلات میں سپاہی سبز وردی زیب تن کرتے ہیں گاڑیوں کو درختوں کی ٹہنیوں کے نیچے چھپا دیا جاتا ہے ہوائی
[...]ڈوں پر سبزیاں بودی جاتی ہیں صحراؤں میں خاکی رنگ کی وردیاں بالخصوص پہنی جاتی ہیں آلات حرب پر خاکی روغن کر دیا جاتا ہے
[...] سپاہی برفانی پہاڑوں میں سفید وردی میں ملبوس ہو کر دشمن سے نبرد آزما ہونے ہیں غرض آدمی اپنی عقل کے زور سے اپنے ماحول
[...]ابق ایجادات کرتا رہتا ہے مگر ادنیٰ مخلوق جن میں آدمی کے سوا سب جاندار شامل ہیں۔ اپنی حفاظت قدرت کے مہیا کردہ
[...]وں کے ذریعہ کرتے ہیں۔

پرندوں میں دشمن سے بچنے کے لئے بیشمار طریقے ہیں جو قدرت نے ودیعت کئے ہیں مثلاً ایک پرندہ پٹرمیگن ایسے علاقہ میں
[...]ہے جہاں سردیوں میں سارا علاقہ برف سے ڈھکا رہتا ہے مگر برف پگھلنے سے گرمیوں میں زمین چٹیل میدان بن جاتی ہے
[...]نے اس پرندے کو ان حالات پر قابو پانے کے لئے عجیب و غریب طریقہ بخشا ہے یعنی گرمیوں میں اس کے پروں کا رنگ
[...]ری ہو جاتا ہے جس سے اس کی شناخت مشکل ہو جاتی ہے۔ سردیوں میں انہی پروں کا رنگ سفید ہو جاتا ہے اور وہ برف میں
[...]ی کے ساتھ پہچانا نہیں جا سکتا۔ پنجاب میں زمین پر بسیرا کرنیوالے پرندوں کا رنگ مٹیالا ہوتا ہے جن میں تیتر۔ بٹ تیتر۔ بٹیر
[م]شہور ہیں۔ شکاری کو ان کے شناخت کرنے میں بڑی دقت محسوس ہوتی ہے بسا اوقات وہ زمین کا چپہ چپہ چھان مارتا ہے
[...] وہ نظر نہیں آتے۔ جب تنگ آ کر کوشش چھوڑ کر ایک طرف چل دیتا ہے تو اچانک پاؤں کے قریب سے پھراٹ مار کر اڑ جاتے ہیں
[...]ری منہ تکتا رہ جاتا ہے اسی طرح ہریل اور طوطے کا رنگ سبزی مائل ہوتا ہے درختوں کے سبز پتوں میں ان کی پہچان
[...] سے کم نہیں ہوتی۔

جنگلی درندے اور چوپائے عموماً خاکی رنگ کے ہوتے ہیں مثلاً بھیڑیا۔ گیدڑ۔ لومڑی۔ ریچھ۔ ہرن وغیرہ خاکستری رنگ
[...]ت وچالاک عادات دشمن کی دستبرد سے بہت حد تک محفوظ رکھتے ہیں گھنے جنگلات میں شیر چیتے چتکبرے ہوتے ہیں
[...]ی کھال بالکل اس سائے سے مشابہ ہوتی ہے جو نیم گنجان درخت میں دھوپ گذرنے سے پیدا ہوتا ہے قطبی علاقوں میں جہاں
[...]ن برف سے مستور ہوتی ہے اور سفید چادر سی بچھی نظر آتی ہے قطبی ریچھ کا بھی رنگ بالکل سفید ہوتا ہے۔ شکاری کے لئے یہ
[...]م بڑا خطرناک ہوتا ہے کیونکہ بسا اوقات وہ خود شکار ہو جاتا ہے اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا کہ یہاں قریب ہی ریچھ چھپا
[...]ہے کہ دفعتہً ریچھ حملہ آور ہوتا ہے۔ غیر برفانی پہاڑوں میں بھورے رنگ کے ریچھ ہوتے ہیں جو کھوہوں میں چھپے پڑے رہتے ہیں
[...]ں شکاری یا شکار کا گذر ہوتا ہے فوراً جھپٹ پڑتے ہیں۔

مینڈکوں کا رنگ سبزی مائل ہوتا ہے تاکہ گندے جوہڑوں میں جن پر بالعموم سبز کائی جمی رہتی ہے شناخت نہ کئے جا
[...]یں۔ ایک قسم کا درختی مینڈک (TREE F.20G) درختوں کی ٹہنیوں اور پتوں میں رہتا ہے اس کی جلد کا رنگ بالکل
[...]ر ہے۔ اس طریقہ سے وہ پرندوں کی نظروں سے بالکل اوجھل رہتا ہے بعض مینڈکوں کا رنگ شوخ سنہری سیاہ اور زرد ہوتا ہے
[شو]خ رنگ والے مینڈک عموماً زہریلے ہوتے ہیں کیونکہ ان کی جلد میں زہریلے مادے پائے جاتے ہیں۔ پرندے ان رنگوں سے فوراً
[پہچ]ان جاتے ہیں کہ آیا یہ مینڈک قابل خوراک ہیں یا نہیں۔ سیلامنڈرا ایک دم دار مینڈک ہے جو ممالک یورپ میں ملتا ہے اس کا رنگ
[...] ہوتا ہے اور جلد پر سیاہ رنگ کے دھبے اور دھاریاں موجود ہیں اس کے جسم میں زہریلے مادے بکثرت ہیں پرندے دیکھتے ہی
[...]ہ جاتے ہیں کہ اس کو [...]

نیگر گیون (NIGRE GUAN) مینڈک نیلے اور سرخ رنگ سے مزین ہے اور نہایت بیباک اور نڈر ہے مینڈک کھانے والے پرندوں سے ذرا نہیں جھجکتا۔ کیونکہ اسکی جلد ہلاک ہے بعض مینڈکوں کا رنگ سورج کی روشنی کے مطابق شوخ و مدہم ہو رہتا ہے۔

جنگلی چوہا آپ نے دیکھا ہوگا۔ یہ چوہے کی قسم سے نہیں۔ کوئی ۷ انچ کے قریب لمبا ہوتا ہے پیٹھ پر کانٹے دار قدرتی زرہ اعض نرم ہیں اگر پیٹھ پر کانٹے نہ ہوتے تو بے پناہ تھا جب کوئی حملہ کرتا ہے سمٹ کر کانٹوں کا گیند بن جاتا ہے سر کو دم کے ساتھ ملا دیتا ہے ایس نظر آتا ہے جیسے انڈے کا بڑا چھل ہے۔ آگ یا پانی ڈالے بغیر نہیں کھلتا۔ ایسی حالت میں دشمن کو کیا ضرورت ہے کہ منہ میں خواہ مخواہ کانٹ کا گچھا رکھے۔ بعض اوقات بڑا مزا ہوتا ہے۔ یہ سانپ کو دم سے پکڑ کر کھانا شروع کر دیتا ہے اور خود سکڑ کر گیند بن جاتا ہے سانپ بھرا کانٹے سے پٹکتا ہے۔ سو طرح کے جتن کرتا ہے مگر یہ حضرت اسے برابر نوالا بناتے جاتے ہیں۔

مختلف رنگوں کے متنوع نقش و نگار جس قدر تیتریوں کے پروں میں پائے جاتے ہیں کسی دوسرے جاندار میں نظیر نہیں ملت یہ رنگ اس قدر جاذب نظر اور خوبصورت ہوتے ہیں کہ کپڑوں پر ویسے بیل بوٹے بنائے جاتے ہیں ان کا مسکن پھولوں کی کیاریاں ہیں۔ اک مشاہدہ کیا گیا ہے کہ جیسے پھول ہوتے ہیں اسی رنگ و ڈیزائن کے ان کے پر ہوتے ہیں۔ یہ تیتریاں پھول پر بیٹھی ہوئی نظر نہیں آتیں اسی طرح ایک انوکھی قسم کی تیتری ہے جس کا جسم خشک ٹہنی کی طرح ہے اور پر بالکل سبز پتے کی طرح جب بیٹھی ہو بالکل درخت کا پتہ معلوم ہوتی ہے پرندے دھوکا کھا کر اسے چھوتے نہیں۔ ایک اور قسم خاکستری رنگ کی پائی جاتی ہے جو سوکھے پتوں میں اپنا آپ بالکل ناقابل شناخت بنا دیتی ہے۔ کئی تیتریاں گھاس کا گچھا معلوم دیتی ہیں۔

زہریلے جانور بہت سے جانوروں میں قدرت نے زہر پیدا کیا۔ جس کی بدولت وہ ذاتی حفاظت کرتے ہیں چھوٹے چھوٹے کیڑوں سے لیکر چیونٹیوں، مکھیوں، مکڑیوں۔ بچھو، مچھر، زنبور اور سانپوں میں زہر کا ذخیرہ موجود ہوتا ہے۔ مچھلیوں کی ایک خا قسم بھی زہریلی ہوتی ہے۔ یہ زہر متواتر پیدا ہوتا رہتا ہے۔ زہریلے اثر کے لحاظ سے سانپ سب پر سبقت لے گیا ہے گرم ملکوں کے سانپ زیادہ زہریلے ہوتے ہیں۔ سب سانپوں کے منہ میں دانت نہیں ہوتے مگر زہریلے سانپ کے منہ میں تیز نکیلی دو کھوکھلی کچلیاں بھی اوپر کے جبڑے میں ہوتی ہیں یہ پیچھے کو جھکی رہتی ہیں ڈسنے کے وقت سیدھی ہو جاتی ہیں کالے سانپوں اور چند دوسری اقسا میں دو کھوکھلی کچلیاں تو ہوتی ہیں مگر ہل جل نہیں سکتیں اوپر اور کچلیوں کے پیچھے دو چھوٹی سی تھیلیاں ہیں۔ ڈسنے کے وقت تھیلی میں سے زہر بہہ کر کچلیوں میں آ جاتا ہے۔ جہاں سے گذر کر زخم میں جا پہنچتا ہے۔ سانپ ایک سست جانور ہے جتنا زہریلا ہ اتنا چالاک نہیں ہوتا۔ تو حضرت انسان کے لئے کوئی جائے پناہ نہیں تھی مگر قدرت نے ہر کام سوچ سمجھ کر کیا ہے سانپ بھاگ جا کو ڈسنے پر ترجیح دیتا ہے۔ جب بچ نکلنے کی کوئی سبیل نظر نہ آئے۔ اسی وقت کاٹ کھاتا ہے

اب ہم نئی دنیا میں داخل ہوتے ہیں جو بحری جانداروں کا مسکن ہے ان میں اکثر چھوٹی جسامت کے ہیں اتنے چھوٹے ک خوردبین کی مدد کے بغیر نظر نہیں آتے انہیں بھی قدرت نے زہر کے کیل کانٹے سے لیس کیا ہے۔ مثلاً اوبلیا۔ ہائیڈرا سی اینی جیلی سیٹما اس زمرہ کی مثالیں ہیں۔ پہلی دو مثالوں میں منہ کے قریب باریک بازوؤں کا گچھا ہوتا ہے جس میں زہریلا مادہ ہو ہے اگر یہ بازو کسی چھوٹے جانور کو چھو جائے تو وہ مردہ ہو جاتا ہے۔ اس زہریلے خلیے کا خوردبین سے معائنہ کیا جائے تو اسکی ساخت واضح طور پر معلوم ہوگی۔ یہ ایک تھیلی ہے جس کے اندر زہر بھرا گیند ہے اس گیند کے ایک طرف باریک ریشہ ہے جو اندر سے نلی کی طرح خالی ہے عام طور پر یہ ریشہ گیند کے منہ کے گرد لپٹا رہتا ہے لیکن بوقت ضرورت پیچ کھل جاتے ہیں اور تازیانہ کی طرح بیکدم باہر نکل آتا ہے یہ تار جب کسی چیز کو چھوتا ہے۔ تو زہر کھوکھلی نالی سے ہوتا ہوا شکار کے جسم کے اندر پہنچ جاتا ہے جو زہر اثر سے بیہوش ہو جاتا ہے۔

رجسٹرڈ ایل نمبر ۳۸۸۳

تمام اردو رسالوں میں سب سے زیادہ چھپنے والا سستا اور ہردلعزیز رسالہ

گاہ بگاہ ہیں بام دنیا پر تماشا دیکھنا بادشہ دنیا کے مہرے ہیں مری شطرنج کے	گاہ بگاہ ہیں دشتِ بونگی ہی لگاتا ہوں صدا دل لگی کی چال ہے سب نگس صلح و جنگ کے

دینی دنیوی روحانی اور جسمانی معلومات کا خزانہ

رسالہ

مستانہ جوگی

لاہور

ایڈیٹر صوفی لچھمن پرشاد جائنٹ ایڈیٹر سوہن لال بھٹناگر بی اے (آنرز)

جلد ۳۴	ماہ اکتوبر ۱۹۴۶ء	نمبر ۱۰

قواعد

۱- ہر ماہ کی یکم تاریخ کو رسالہ لاہور سے روانہ ہوتا ہے۔ اگر ایک ہفتہ تک نہ ملے تو ضرور دفتر میں شکایت آجانی چاہیے۔ اس کے بعد شکایت کے ساتھ آٹھ آنے کے ٹکٹ آنے چاہئیں ۲- ہر قسم کی خط و کتابت، شکایت ترسیل زر صوفی لچھمن پرشاد کے نام ہو کسی اور کے نام خط و کتابت کرنے پر دفتر ذمہ دار نہ ہوگا ۳- ہر خطہ پر اپنا پورا پتہ خوشخط لکھا کریں اور نمبر خریداری بھی ضرور درج کریں جواب کیلئے واپسی کارڈ یا ڈیڑھ آنہ کا ٹکٹ آنا چاہیے۔ ۴- خط و کتابت کے لئے اتنا پتہ کافی ہے۔ صوفی لچھمن پرشاد۔ شاہی محلہ لاہور

سالانہ چندہ پانچ روپے پیشگی۔ قیمت فی پرچہ ۸ ممالک غیر سے نو روپے

فہرست مضامین بابت ماہ اکتوبر ۱۹۴۶ء

رسالہ

مستانہ جوگی

لاہور

جلد ۱۴ ۳	ماہ اکتوبر ۱۹۴۶ء	نمبر ۱۰

جوگی

(۱)

دربار میں سناٹا چھا گیا۔ دیودت اور دوسرے ساتھی بھی ہمراہ تھے۔ سدھارتھ نے زخمی ہنس تخت کے سامنے رکھ دیا۔ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ مہاراج انصاف کریں جس کی چیز ہو اس کو دلا دیں۔ دیودت نے تیر مار کر آسمان سے نیچے گرایا۔ میں نے اس کی مرہم پٹی کی۔ زمین سے اٹھا کر پھر آسمان میں اڑنے کے قابل بنایا جس کا حق زیادہ ہو اس کے حق میں فیصلہ دیا جائے۔ راجہ حیران اور درباری تکتے۔ عجیب معاملہ ہے۔ عدالت میں ایسا مقدمہ آج تک نہ آیا تھا۔ دیوان نے کہا یہ ہنس تیر سے ہلاک ہو جاتا تو دیودت کا حق تھا۔ جاندار اور آزاد راجکمار سدھارتھ کو دلوانا چاہیئے جس نے اس کی جان بچائی جس طرح چاہے اس کے ساتھ سلوک کرے درباریوں نے اس فیصلے پر تائید کی مہر لگا دی۔ سدھارتھ نے ہنس کو ہوا میں اڑا دیا۔ معصوم جانور آن کی آن میں ہمالیہ کی چوٹی پر کالے کالے بادلوں میں اڑتا ہوا مانسرودر کی نیلی نیلی لہروں میں جا اترا۔

سدھارتھ راجکمار تھا اور چھتری۔ اس کا دل رحمدلی کے جذبے سے بھرپور تھا۔ چیونٹی سے لیکر ہاتھی تک کوئی بھی ایسا نہ تھا جس کے ساتھ اس کی ہمدردی نہ ہو۔ اس کا دل جانداروں کے دکھ سے کٹتا تھا۔

وہ دنیا سے ہتھیاروں کی حکومت کو نابود کرنے آیا تھا۔ جب ہنس کو تیر لگا اور وہ زمین پر زخمی ہو کر گر پڑا تو سدھارتھ نے تیر کے پیکان کو اپنی انگلیوں میں چبھو کر دیکھا تھا۔ کیا مجھے بھی اس تیر سے درد ہوتا ہے۔ دنیا اس کو عبرت کی جا نظر آتی تھی۔ اس کی نظروں میں یہ سب کچھ ایک ظلم کا کارخانہ تھا۔

(۲)

وہ پہلی مرتبہ ہی جنگل کی سیر کو نکلا تھا۔ پانی کی جھلملاتی ہوئی سورج کی کرنوں اور پرندوں کی چہچہاہٹ سے اس نے سمجھا تھا۔ دنیا بڑی خوبصورتیوں کا گھر ہے۔ سانپ نے مینڈک کو نگلا چیل سانپ کو لے اڑی۔ اس کو دنیا کی حقیقت معلوم ہو گئی کس طرح ایک چھوٹی چیونٹی سے لیکر آدمی تک کا دل تکلیف کے صدموں سے چور ہے۔ اس کی ظاہری آنکھیں جنگل کے پھول اور بوٹوں کی بہار دیکھ رہی تھیں۔ باطن کی آنکھیں کچھ اور ہی نظارہ کر رہی تھیں۔ اُف! کسان کی روٹی میں کس طرح مٹھاس کے ساتھ کڑواہٹ ملی ہوئی ہے سخت محنت سے بیلوں کے کندھے سوج رہے ہیں۔ پنیچی کی مار سے ان کی کھال بُری طرح زخمی ہو رہی ہے ہل کے ہل کی پھالی سے نہ جانے دنیا میں رہنے والے کتنے ہی جانداروں کی جان جاتی ہوگی۔ ان بے زبانوں کی تکلیف کا احساس کس کو ہوتا ہوگا کس کے دل میں ترس آتا ہوگا۔ نیولا سانپ کو نگل رہا ہے۔ بگلا مچھلیاں پکڑنے میں مصروف ہے۔ کمزور اور زور آور جانوروں میں کیسی خوفناک لڑائی جاری ہے۔ ان کو صلح اور امن کا سبق سکھلانے والا کوئی نہیں۔

(۳)

سدھارتھ کے خیالات سے ویراگ کی بو آنے لگی۔ راجہ شدودھن نے گوپا سے شادی کر دی۔ شادی ہی سے دنیا داری کی زنجیریں سخت ہوتی ہیں۔ ادھر شادی اور اُدھر یہ بندوبست کہ راجکمار کا دل بہت نرم ہے کوئی ایسا نظارہ اس کے سامنے نہ آئے جس سے دنیا اس کو فانی نظر آئے۔ جب کبھی سدھارتھ سیر کو نکلا ہزاروں سرکاری آدمی اس بات کے درپے کہ کوئی مکروہ بات اس کے سامنے نہ آنے پائے گوپا بڑی حسین اور عقلمند تھی۔ آتے ہی راجکمار کے دل پر قبضہ سا کر لیا۔ سدھارتھ نے گوپا کے ہاتھ کو چومتے ہوئے کہا۔ پیاری جب تک تمہارا یہ چاند سا مکھڑا نہیں دیکھا تھا۔ دنیا میرے لئے اندھیرے کے سوا کچھ نہ تھی جامن کے پیڑ کے نیچے بیٹھے ہیں اس دنیا کے عجیب کاروبار کا پہروں خیال کرتا تھا۔ ٹھنڈی اور خوشبودار ہوائیں۔ کلیوں کا چٹکنا۔ پھولوں کا مہکنا۔ موروں کا ناچ۔ ہرنوں کی کلیلیں۔ ماہ کامل کا تبسم۔ بجلی کی چمک۔ بادل کی گرج۔ کوئی بھی میرے دل کی بیکلی نہ کھو سکا۔ تم کو دل دیتے ہی کایا پلٹ گئی۔ تمہاری خوبصورتی کے کنول رس پیتے ہی آنکھوں کے بھونرے [illegible]

ل کے سنگھاسن پر بٹھایا ہے اور تم کو اپنا مالک بنایا ہے۔ دنیا میرے لئے سورگ بنی ہوگئی ہے جس طرح
ے دن نکلنے پر چکوا چکوے سے مل کر خوش ہوتا ہے۔ تمہارے درشن سے میرے دل کی کلی کھل جاتی ہے۔

(۴)

سدھارتھ نے آج زندگی میں پہلی بار بوڑھا آدمی دیکھا تھا۔ اس نے سارتھی سے پوچھا یہ کیسا عجیب
ریب آدمی ہے۔ سوکھی کھال پیڑ کی چھال کی طرح سکڑی ہوئی۔ کمر جھک کر گھٹنوں سے جڑی ہوئی بدن
نپتا ہے۔ دو قدم چلتا اور چار گھڑی ہانپتا ہے سارتھی نے کہا۔ یہ بھی کبھی ہمارے جیسا آدمی تھا ہماری طرح
یا میں کام کئے۔ اب بڑھاپے نے آن دبوچا۔ نہ ہاتھوں میں سکت نہ پاؤں میں طاقت کوئی ایک بھی ایسا نہیں
ت کا چابک سب نوجوانوں کو پیٹ پیٹ کر اسی طرح بیکار کر دیگا۔ تو کیا میں میری پیاری گوپا اور اس
سین لونڈیاں سب کی سب ایک دن ایسی ہو جائیں گی۔ یہ خیال سدھارتھ کے دل کو چوٹ سا لگا ابھی
ا بیس قدم آگے چلے ہونگے کہ ایک بیمار درد سے چلاتا ہوا دکھائی دیا۔ سپاہی لاکھ راستہ سے ہٹاتے ہوئے
ت ہے۔ راجکمار نے دیکھ لیا۔ کہا ادھر لاؤ۔ سارتھی سے پوچھا۔ یہ کون ہے؟ کیا یہ بھی بوڑھا ہے۔ سارتھی
نہیں بیمار ہے انسان کا جسم مشین سا ہے کسی پرزے میں فتور آیا اور دکھ نے آن دبایا۔ ایک یہ
ہر کسی کو کبھی نہ کبھی ایسا دکھ دیکھنا ہی پڑتا ہے۔ راجکمار نے ایک سرد آہ بھری۔ او ہو بادے آدمی تو
بات کا بھنورا ہے انقلاب اس کے پیچھے پڑا ہے جس گوپا کو دیکھکر میں خوش ہوتا ہوں۔ وہ بھی کسی نہ
دن رات کی سوئی نہ جانے اسی حالت میں اٹھے۔ اس کے درد کا مجھے کتنا درد ہوگا۔

آگے جا کر ایک ارتھی کو دیکھا۔ مردہ جلانے کے لئے جا رہے تھے۔ کچھ دیر پہلے یہ ہنستا تھا۔ بولتا تھا
رتا تھا۔ اب کچھ بھی نہیں کسی غائبانہ ہوا کے جھونکے نے پیڑ سا گرا دیا۔ پنچھی اڑ گیا۔ خالی پنجر اخالی
یہی انسان کی اوقات ہے سدھارتھ نے سوچا۔ دنیا کچھ نہیں جس کو رتن سمجھتے ہیں۔ وہ مٹی ہے
دھوکے کی ٹٹی ہے۔ آدمی دکھ کے تلے اور موت کے پھندے سے بندھا ہوا جال میں پھنسا ہے
رسے پرارتھنا کرنا اور دیوتاؤں کی منتیں مانتا ہے۔ دکھ سے رہائی نہیں ملتی۔

(۵)

سدھارتھ نے باپ سے کہا۔ اجازت دو تو میں گھر سے نکل کر گیان کی کھوج کروں۔ صداقت کا
وں۔ دنیا کیوں دکھ کی آگ سے جلی جا رہی ہے۔ یہ گھر بار مجھے زہر سا لگتا ہے۔ وہ نسخہ بتاؤ جس سے
کی بہار میں بوڑھاپے کی خزاں نہ آئے۔ تندرستی کا پھول بیماری کی لو سے نہ مرجھائے۔ زندگی کے
موت کی بجلی نہ گرے [illegible] تو پھر یہ راج تلک یہ دنیا داری کے دکھ

سب ہیچ کسی میں میری راحت کا سامان نہیں۔ تم میرا علاج نہیں کر سکتے۔ تو موقع دو۔ وہ جڑی پیدا کر دوں۔ ساری دنیا کا دُکھ دور ہو جائے۔

راجہ کا ایک ہی بیٹا۔ وہی آنکھوں کا نور۔ وہی کلیجہ کی ٹھنڈک۔ وہی جگر کا ٹکڑا کس طرح نظر سے دور کر دے۔ اس نے کہا۔ بیٹا میرے بڑھاپے پر رحم کرو۔ میری زندگی تمہارے سوا اور کس کا سہارا ہے۔ تم گئے تو بوڑھے کی لاٹھی ٹوٹ گئی۔ سدھارتھ بولا۔ مہاراج یہ دنیا کا کارخانہ ہے۔ فانی انسان سدا رہتا ہے نہ جوانی۔ آخر ایک دن موت سب کچھ دھروا لے گی۔ تو پھر خود ہی خوشی سے سب کچھ نہ چھوڑ دیں۔ کل ضرور ہی ٹوٹ جائیگا۔ تو اپنوں اور بیگانوں سے آج ہی کیوں ناطہ توڑ دیں۔ یہ نہ سمجھنا میرا دل پتھر کا ہے۔ تم لوگ الگ رہے ہیں کسی کا بھی دُکھ نہیں دیکھ سکتا۔ جو دُکھ تم کو مجھے جدا کرنے سے ہو رہا ہے۔ اسی کی دوا تلاش کرنے کا خیال ہے جھوٹی محبت کا وہم دل سے دور کرو میری راہ میں موہ کے کانٹے نہ بچھاؤ۔ جب موت پر تم کو اختیار نہیں تو مجھے روکنے کا کیا حق۔ آج ہی میری جان نکل جائے تو کل ہی راج لاوارث ہو جائیگا۔ پھر میرا یہاں رہنا نہ رہنا یکساں۔ راجہ یہ سن کر رو دیا۔ دربار پر اداسی چھا گئی۔

(۶)

آدھی رات کا وقت محل میں ہر طرف خاموشی کا پہرہ تھا سدھارتھ اُٹھا اس وقت گوپا اور معصوم راہل گہری نیند میں تھے۔ رات بھر جاگتے رہنے کی سخت ہدایت تھی۔ تو بھی وقت کی بات داسیاں سب کی سب سو گئیں سدھارتھ کے سامنے دو راہیں کھلی تھیں۔ ایک میں دنیاوی عیش و آرام۔ دوسری میں شانتی اور گیان۔ دل نے کہا۔ دنیا میں رہکر چکرورتی راج کرو۔ یا فقیر بن کر جانداروں کی مصیبت کا خاتمہ کرو ضمیر نے آواز دی کیا یہ اچھا ہے کہ تیز تلوار کی دھار سے انسانوں کا خون بہاؤ خزانے بھرنے کے لئے غریبوں کا لہو چوسو۔ ایسا راج کس کام کا جس میں ابتدا سے انتہا تک خونریزی ہی خونریزی ہے عمر بھر جنگ و جدل سدھارتھ نے کہا۔ ایسے راج کو دور سے سلام۔ دنیا کے دکھوں سے گھبرا کر انسان چلا رہے ہیں۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھکر کہا۔ اے مجھے بلانے والے دنیا کے لوگو! میں تمہاری خاطر اس پر موہ کا من محل کے سکھوں کو چھوڑتا ہوں جن کا چھوڑنا سب سے زیادہ مشکل ہے۔ جو دنیاداری کا چکدار موتی اس پیاری گوپا کو چھوڑتا ہوں۔ جو ہماری محبت کی کلی ہے۔ نہ ابھی پھولی نہ پھلی ہے۔ اس معصوم راہل کو چھوڑتا ہوں محبت کے ان دو پھولوں کو خوشبو سے محروم کر کے میں ظلم کر دوں گا۔ ان دو معصوم جانوں پر ظلم ساری دنیا کو ظلم سے چھڑائیگا۔

(۷)

سدھارتھ گوپا کے قریب آیا۔ وہ ابھی تک سوتے ہی میں کو یا معلوم ... کی خوشیوں

دنیا میں قیامت آنیوالی تھی۔ دیکھکر اس کا دل پسیج اٹھا۔ ہائے میرے بغیر یہ کیسے جئے گی۔ کیا ہی گہری نیند ہے ایسی ہی نیندیں دنیا نے سب کچھ کھو دیا اور نہ جانے کیا کیا کھو دیگی۔ پھر اس نے دل کو سمجھایا۔ نادان تو میرے ارادوں کو قید کی کڑیوں میں الجھا رہا ہے۔ کبھی پیاری کا خیال کبھی بچے کا پیار۔ یہ کمزوری ہے اس کو چھوڑ دے۔ پتھر کی مانند سخت ہو جا۔ یہ جاگ اٹھی تو بھاگنے کی تمام راہیں بند ہو جائیں گی۔ پھر یہ گھڑی ہاتھ نہ آئے گی۔ سدھارتھ نے آخری بار بیوی اور بیٹے کو دیکھا۔ آہستہ سے دروازہ کھولا اور چپکے سے باہر نکل گیا

تیاگ کا چور دولت کو لوٹ کر لے گیا۔ گوپا کی آنکھ کھلی۔ اب کیا دھرا تھا۔ خالی سیج جدائی کے کانٹوں سے بھرپور۔ ہزاروں شمعیں روشن۔ پھر بھی اندھیرا۔ اس کے دل کی روشنی بجھ گئی تھی۔ وہ گھبرائی۔ اس نے داسیوں کو ادھر ادھر دوڑایا۔ لونڈیوں نے کہا ہنسی سے کہیں چھپ رہے ہوں گے۔ کئی دنوں سے برے خواب دیکھ رہی تھی۔ گوپا کو یقین نہ آیا۔ پاگل سی ہو گئی۔ کہا داسیو! میرے پران ناتھ کو بلا دو نہیں تو اس محل کو آگ لگا دو۔ پربھو ہنسی کی ہو تو نکل آؤ۔ ظاہر ہو جاؤ۔ میرا دل ٹوٹ رہا ہے اور نہ رلاؤ لیکن پیارا کہاں؟ وہ پیارا جوگی بن کر بہت دور نکل گیا تھا۔

(۹)

سدھارتھ پیپل کے پیڑ کے نیچے سمادھی لگائے بیٹھا ہے۔ سہانا موسم۔ قدرت کے سنگیت کا میٹھا راگ کانوں میں امرت ٹپکا رہا تھا۔ ہوا پانی آگ سب ہی خوشی سے ناچ رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس زمین پر گیان کا آفتاب روشنی پھیلانے والا ہے۔ اس کے جسم میں ہڈیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ یکبارگی ہی پیشانی چمک اٹھی۔ رفتہ رفتہ شعاعیں اس آفتاب علم سے نکل کر چاروں طرف پھیلنے لگیں۔ سارا گوشہ بن بقعۂ نور بن گیا۔ سدھارتھ پربدھ ہوا۔ وہ آج سدھارتھ نہ تھا بدھ تھا۔ جو دنیا کل تک دکھ کا گھر نظر آتی تھی آج سکھوں کا بھنڈار بن گئی۔ ایک غائبانہ کڑک کے ساتھ ہزاروں اور لاکھوں آفتاب طلوع ہو گئے۔ یہی گیان تھا اور یہی نروان۔ پیارا جوگی اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا اور دنیا دکھوں سے چھوٹ گئی۔

راہل نے گوپا سے پوچھا ماں۔ یہ راج دربار میں بھکشوؤں کے ساتھ بیٹھے کون اپدیش کر رہے ہیں؟۔ گوپا نے کہا۔ یہی تمہارے باپ ہیں۔ "میرے لئے کچھ لائے ہونگے"

"ہاں بڑا ہی قیمتی تحفہ شانتی۔ دنیا میں اس سے قیمتی اور شئے اور کیا ہو گی؟

آغوش میں [illegible] پیاری [illegible] پریم [illegible] چلو میں تم کو

ایک بڑی محبت کی سلطنت میں لے چلتا ہوں۔ پیارے جوگی نے جوگن کو بھی پیار کے رنگ میں رنگ دیا۔ اور [illegible]

مَیں اب سمجھا کہ بہکایا گیا ہوں

میں کسی نوبت کو پہنچایا گیا ہوں ہمیشہ غمزدہ پایا گیا ہوں
زمیں پر خلد سے لایا گیا ہوں میں اب سمجھا کہ بہکایا گیا ہوں
وہ عقدہ ہوں کہ جب پایا گیا ہوں نہ اُلجھایا نہ سلجھایا گیا ہوں
کبھی کانٹوں میں کھچوایا گیا ہوں کبھی پھولوں میں تلوایا گیا ہوں
کبھی بخشی گئی مجھ کو خدائی کبھی میں خود سے شرمایا گیا ہوں
کسے الزام دوں اے ساتھ والو کہیں دانستہ لٹوایا گیا ہوں
مجھے شکوہ نہ ہو کیوں رہنما کا کہیں رستے سے بھٹکایا گیا ہوں
وہاں کا حال ہے معلوم مجھ کو کسی کی بزم میں آیا گیا ہوں
مری تردامنی کام آئی آخر کسی کے روبرو لایا گیا ہوں
تبسم اشک میں بھیگا ہوا ہے بڑی کوشش سے ہنسوایا گیا ہوں
فسانے کی طرح بزم جہاں میں میں صدہا بار دُہرایا گیا ہوں
چلو یونہی سہی اے بے مروّت نہ تڑپا ہوں نہ تڑپایا گیا ہوں
کسی بے درد کی محفل سے اکثر تسلّی دے کے اُٹھوایا گیا ہوں
مجھے ڈھونڈا گیا جس وقت انور
کسی کی یاد میں پایا گیا ہوں

فطرتِ انسانی کی پہچان

یدھشٹر جی نے پوچھا۔ تعظیم کے قابل پتامہ بہت سے سختی کا برتاؤ رکھنے والے ظاہراً نرم طبیعت اور سنجیدہ بنے رہتے ہیں اور نیکی کرنے بھلائی چاہنے والے لوگ سخت دکھائی دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی پہچان کیونکر ہو؟
بھیشم جی نے فرمایا۔ یدھشٹر! اس بارے میں ایک قدیم کہانی جو کہ شیر اور گیدڑ کی گفتگو ہے تمہیں سناتا ہوں۔

سنو! بہت دیر گزری "پرریکا" نام کی ایک ریاست تھی جو کہ زر و مال اور اناج سے بھرپور تھی۔ اس میں "پورک" نامی ایک راجہ حکومت کرتا تھا اور وہ نہایت ہی سنگدل اور ظالم تھا۔ ہمیشہ دوسروں کو ایذا اور نقصان پہنچانا ہی اس کا کام تھا۔ آہستہ آہستہ زندگی کے دن پورے ہوئے۔ موت واقع ہو جانے کے بعد اسے گیدڑ کا قالب ملا۔ مگر گزشتہ جنم کی یاد مکمل بنی رہی۔ اس لئے گزشتہ واقعات کی یاد آنے سے ایسے نیچ قوم میں پیدا ہونے پر نہایت ہی ندامت دامنگیر ہوئی اور دل میں تارک الدنیا ہونے کا خیال پیدا ہوا۔ اب اس نے دوسروں پر جبر کرنا اور ستانا چھوڑ دیا۔ سچ کو اپنایا اور اپنے قائم کئے ہوئے اصول کی پابندی کو پورے طور پر سر انجام دینے لگا۔ چوبیس گھنٹوں میں ایک وقت کھانا کھاتا اور وہ بھی درخت سے خود گرے ہوئے پھلوں کا۔ اس نے شمشان میں رہنا بہترین خیال کیا۔ کیونکہ وہیں اس کی پیدائش ہوئی تھی۔ پیدائشی مقام ہونے کی وجہ سے اسے کسی دوسری جگہ رہنا کسی طرح گوارا نہ تھا۔ گیدڑ کا اس طرح نیک چال چلن سے رہنا اس کے قومی بھائیوں کو اچھا نہ لگا۔ ان سے برداشت نہ ہو سکا کہ ہمارا ایک بھائی ریاضت کرتا ہوا زندگی ختم کر دے۔ اس لئے وہ چاپلوسی اور خوشامدی باتوں سے اس کی عقل میں فتور ڈالنے کی ناکام کوشش کرنے لگے۔ ایک دن سب مل کر اس کے پاس گئے اور بولے بھائی گیدڑ! تو گوشت خور چوپایہ جانور ہے اور شمشان میں رہتا ہے پھر بھی نیک نیتی سے رہنا پسند کرتا ہے۔ یہ تیری الٹی سمجھ کا نتیجہ ہے۔ بھائی! ہماری ہی طرح ہو کر رہو۔ تمہارے لئے کھانا ہم لا دیا کریں گے۔ تو صرف اچھے برے کا خیال چھوڑ کر کھا لیا کر۔ کیونکہ تیری ذات برادری کا جو ہمیشہ سے کھانا رہا ہے۔ وہ ہی تیرا بھی ہو۔
ان کی ان چاپلوسی اور بے سمجھی کی باتیں سنکر گیدڑ اور بھی چوکنا و ہوشیار ہو گیا میٹھے لیکن گھمبیر الفاظ میں انہیں سمجھاتا ہوا بولا۔
بھائیو! بد چال چلن والوں کی ہی وجہ سے ہی ہماری قوم کا کوئی اعتبار نہیں

کرتا۔ اچھے اعمال اور نیک نامی سے ہی خاندان کا نام روشن ہوتا ہے۔ اس لئے میں بھی یہ کام کرنا چاہتا ہوں۔ جس سے اپنے خاندان کا نام روشن ہو۔ اگر میری رہائش شمشان میں ہے تو اس سے کیا۔ میری بات کو غور سے سنئے۔ کُٹی (جھونپڑی) بنا کر رہنا ہی دھرم میں داخل ہے۔ ایسی بات نہیں ہے۔ کوئی بھی نیک عمل آتما کے اکسانے سے ہی ہوتا ہے۔ جھونپڑی میں رہ کر اگر کوئی گئوہتیا کرے۔ کیا وہ گناہ گناہ نہیں گنا جائیگا۔ اس کے علاوہ جھونپڑی سے الگ ہونے پر شمشانوں وغیرہ مقاموں میں اگر کوئی گئودان کرے تو کیا وہ رائیگاں چلا جائیگا۔ اس سے ثواب نہیں ہوگا۔ تم لوگوں کی زندگی صبر شکر سے دور، حقارت آمیز اور سچائی کا گلا گھونٹنے کی وجہ سے قابل نفرت اور یہاں وہاں دونوں ہی جگہ بُرا ثمر دینے والی ہے اس لئے میں اسے پسند نہیں کرتا۔

گیدڑ کی سماں نیک سیرتی اور نیک نیتی کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ اس کی بھنک ایک دن شیر کے کانوں میں بھی پڑی۔ اس شیر نے خود آکر اس کی خوب خاطر و مدارات کی اور اسے نیک سچائی پسند اور دانشمند سمجھ کر اپنا وزیر بننا منظور کر لینے کی درخواست کی۔

شیر بولا۔ برخوردار! میں تمہاری حقیقت سے بخوبی واقف ہوں۔ تم میرے ساتھ چل کر رہو اور من مانی موج اڑاؤ۔ ایک بات سے تمہیں خبردار کئے دیتا ہوں۔ ہماری قوم کا برتاؤ ہمیشہ سخت ہوتا ہے یہ دنیا جانتی ہے اگر تم نرمی کو اپناتے ہوئے میری بھلائی میں لگے رہوگے تو تمہارا بھلا ہوگا۔

گیدڑ نے کہا جنگل کے بادشاہ! آپ نے میرے لئے جو بات کہی ہے وہ ہمیشہ آپ ہی کے قابل ہے اور آپ جو نیک دل اور سب کی بھلائی چاہنے والے آدمی ڈھونڈ رہے ہیں۔ یہ بھی ٹھیک ہی ہے مہاراج! اس لئے آپ کو چاہیے کہ جو آپ کے لئے جان نثار اور جنہیں نیتی کی واقفیت ہو جو ملاپ کرانے میں ہوشیار۔ فتح کے خواہاں۔ لالچ سے دور، عقلمند سب کی بھلائی چاہنے والے دلیرانہ دل رکھتے ہوں۔ ایسے لوگوں کو اپنا مددگار بنا کر باپ و اُستاد کے برابر ان کی عزت و تعظیم کریں۔ آپ میرے لئے جو آرام کے سامان دے رہے ہیں۔ ان کی مجھے خواہش نہیں ہے۔ میں عیش و آرام مباشرت اور زر و مال کو نہیں چاہتا آپ کے پرانے نوکروں کے ساتھ میرا سبھاؤ نہیں ملیگا۔ وہ ظالمانہ فطرت کے لوگ ہیں۔ آپ کو میرے خلاف بھڑکایا کریں گے۔ ان کی طاقت بڑھی ہوئی ہے اس لئے ان کو میرے حکم بردار ہو کر رہنا اچھا نہیں معلوم ہوگا۔ ادھر میری فطرت بھی عجیب و غریب ہے۔ میں گنہگاروں سے بھی سختی سے پیش نہیں آتا۔ دور تک کی بات سوچتا ہوں۔ میرا حوصلہ کبھی کم نہیں ہوتا۔ مجھ میں طاقت کا زور ... مجھے بہت کم واقفیت

بے آزادی سے جنگل میں گھومتا رہتا ہوں۔ میرے جیسے جنگل کے رہنے والے کی زندگی لگاؤ سے خالی اور بے خوف ہوتی ہے۔ ایک جگہ کا بے کھٹکے پانی پیتا ہوا ان دونوں کو بغور سوچ کر دیکھتا ہوں تو مجھے یہی وہاں ہی آرام ملتا دکھائی دیتا ہے۔ جہاں کوئی خدشہ نہیں ہے۔ راجہ کے پاس رہنے میں ہمیشہ خطرہ ہی خطرہ ہے۔ شاہی خدمتگاروں میں سے جتنے لوگ دوسروں کے لگائے ہوئے جھوٹے الزام کی وجہ سے راجہ کے ہاتھ سے مارے گئے ہیں اتنے سچے قصوروں کی وجہ سے نہیں۔ جنگل کے بادشاہ اگر مجھ سے وزیر کا کام لینا ہی ہو تو میں آپ سے ایک شرط کرانا چاہتا ہوں۔ اسی کے مطابق آپ کو میرے ساتھ سلوک روا رکھنا ہوگا۔ میرے عزیزوں کی آپ آؤ بھگت کیا کریں۔ ان کی نصیحت خیز باتوں کو سن کر انہیں عمل میں لائیں۔ میں آپ کے دوسرے وزیروں سے صلاح مشورہ اور بول چال بھی نہ رکھوں گا۔ تنہائی میں آپ کے ساتھ اکیلا ہی ملوں گا اور آپ کی بھلائی کی باتیں بتایا کروں گا۔ آپ بھی اپنے قومی بھائیوں کے کاموں میں مجھ سے اچھی بری صلاح نہ پوچھیں گا مجھ سے مشورہ کرنے کے بعد اگر آپ کے پہلے کے وزیروں کی بھول بھی ثابت ہو تو انہیں پھانسی کی سزا نہ دیجئے گا اور کبھی غصہ میں آ کر میرے عزیزوں پر بھی وار نہ کیجئے گا۔

شیر نے "ایسا ہی ہوگا" کہہ کر گیدڑ کی بڑی خاطر مدارات کی۔ گیدڑ نے بھی اس کا وزیر ہونا منظور کر لیا پھر تو اس کی بڑی آؤ بھگت ہونے لگی۔ ہر کام میں اس کی بڑائی اور عزت ہونے لگی یہ سب دیکھ سن کر پہلے کے نوکر چاکر اور امیر وزیر جل بھن کر کوئلہ ہو گئے۔ ہر ایک اس سے حسد کرنے لگا۔ ان کے دل میں عداوت کی آگ جل رہی تھی اس لئے وہ بار بار جھنڈ باندھ کر گیدڑ کے پاس آتے اور اپنی دوستی و ہمدردی جتلاتے ہوئے اس کو سمجھا بجھا کر اپنے ہی جیسا گنہگار بنانے کی تدابیر کیا کرتے تھے۔ گیدڑ کے آنے سے پہلے ان کا رہن سہن کچھ اور تھا۔ دوسروں کی چیز چھین کر آپ اسے ہڑپ کر لیا کرتے تھے۔ مگر اب ان کی دال نہیں گلتی تھی۔ وہ کسی کے مال پر ہاتھ صاف نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ گیدڑ نے ان پر بڑی پابندی لگا رکھی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ گیدڑ بھی گر جائے اس لئے طرح طرح کی باتوں میں لے سے پھسلاتے اور بہت سا زر و مال بھی دینے کا لالچ دکھاتے تھے۔

مگر گیدڑ بڑا دانشمند اور ہوشیار تھا وہ ان کے چکمہ میں نہیں آیا۔ اس نے حوصلہ نہیں ہارا تب ان سب نے مل کر اسے مار ڈالنے کا تہیہ کر لیا اور سب مل کر اسے عملی صورت میں لانے کی تدابیر کرنے لگے۔ عمل شروع ہو گیا۔ ایک دن انہوں نے شیر کے کھانے کے لئے جو گوشت تیار کر کے رکھا گیا تھا اسے اس کی جگہ سے چرا لیا اور گیدڑ کی جائے رہائش میں رکھ دیا۔ گیدڑ نے وزیر بننے سے پہلے ہی طے کر لیا تھا کہ مہاراج اگر مجھ سے دوستی

چاہتے ہو تو کسی بہکاوے میں آکر مجھے موت کا سزاوار نہ ٹھہرانا۔

اُدھر شیر کو جب بھوک لگی اور وہ کھانے کے لئے اُٹھا تو اس کے کھانے کے لئے رکھا ہوا گوشت دکھائی نہیں پڑا۔ شیر نے چور کا پتہ لگانے کے لئے نوکروں کو حکم دیا۔ تب جن کی یہ کرتوت تھی انہیں لوگوں نے شیر سے اس گوشت کے بارے میں بتلایا۔ مہاراج! اپنے کو بڑا عقلمند اور پنڈت ماننے والے گیدڑ صاحب نے ہی آپ کے گوشت کو چرا لیا ہے۔ گیدڑ کی یہ شرارت سنکر شیر مارے غصہ کے آپے سے باہر ہو گیا اور اسے قتل کرنے کا پروگرام بنانے لگا۔ اس وقت گیدڑوں کے دشمنوں کی بن آئی اور موقعہ پاکر پہلے کے وزیر لوگ شیر کہنے لگے۔ اے جہاں پناہ! وہ تو باتوں سے ہی دھرماتما بنا ہوا ہے۔ برتاؤ کا نہایت ہی سخت ہے۔ اندر کا تو کا ہے مگر اوپر سے دھرم کا ڈھونگ بنائے ہوئے ہے۔ اس کا تمام چال چلن دکھانے کے لئے ہے۔ یہ کہہ کر وہ بھر میں ہی اس گوشت کو گیدڑ کے غار سے اُٹھا لائے۔ شیر نے ان کی باتیں سُنیں اور جب یقین ہو گیا کہ گیدڑ گوشت لیگیا تھا تو اس نے گیدڑ کو قتل کرنے کا حکم صادر فرمایا۔

اُدھر شیر کی ماں نے جب شیر کے حکم سنائے جانے کا حال معلوم ہوا تو وہ نہایت میٹھے الفاظ میں اسے سمجھا کے لئے آئی اور کہنے لگی بیٹا! اس میں کچھ کینہ و حسد سے ملا ہوا چال بنایا جان پڑتا ہے تمہیں اس پر یقین کرنا چاہئے۔ جن کے دل میں کسی کی بڑھتی چڑھتی دیکھکر عداوت ہو جاتی ہے وہ بیگناہ کو ہی قصور وار ٹھہر ہیں کیسی کو اپنے سے اونچی پدوی پر دیکھکر اکثر لوگوں کو حسد ہو جاتا ہے۔ وہ اس کی ترقی نہیں دیکھ سکتے۔ کوئی کتنا ہی صاف دل کیوں نہ ہو اس پر بھی الزام تھوپ ہی دیتے ہیں۔ لالچی لوگ صفا دل لوگوں پر اور کاہل لوگ تپسیوں سے دشمنی کرتے ہیں۔ اسی طرح ناسمجھ لوگ عالموں سے کینہ اور حاسد لوگ مالدار سے گنہگار نیک دل لوگوں سے اور بد شکل خوبصورت لوگوں سے عداوت رکھتے ہیں۔ عالموں میں بھی کئی ہی ایسے بے سمجھ لالچی اور غدار ہوتے ہیں جو بہتیرے جیسے نیک دل عقلمندوں میں بھی نکتہ چینیاں نکا کرتے ہیں۔ ایک طرف تو جب گھر میں سنسان تھی اس وقت تمہارے گوشت کی چوری ہوئی ہے دو طرف ایک ایسا شخص ہے جو دینے پر بھی گوشت لینا نہیں چاہتا۔ ان دونوں باتوں پر اچھی طرح غو آسمان اُلٹی کڑاہی کی طرح اور جگنوں آگ کی طرح دکھائی دیتا ہے لیکن دراصل نہ تو آسمان میں کڑاہی ہے اور نہ جگنو میں آگ ہی ہے اس لئے سامنے دکھائی دیتی ہوئی چیز کا بھی امتحان کر لینا چاہئے۔

جو تحقیقات کے بعد کسی بات میں اپنا خیال ظاہر کرتا ہے اسے پیچھے تاسف نہیں ہوتا۔ راجہ کسی کو مروا ڈالنا مشکل کام نہیں ہے مگر اس سے اس کی عزت نہیں ہوتی۔ بہادر انسان میں اگر معا

سینے کا جذبہ ہو تو اس کی عزت کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔ اس لئے اس کی شہرت بھی بڑھتی ہے۔
سوچو تو سہی۔ تم نے خود ہی گیدڑ کو وزیر کی پدوی پر بٹھایا ہے اور تمہارے ہمعصروں میں بھی اس
کی منزلت بڑھ گئی ہے۔ ایسے لائق وزیر نہایت مشکل سے ملا کرتے ہیں۔ یہ تمہارا بہت خیر خواہ ہے
لئے تمہیں اس کی حفاظت کرنی چاہیئے۔ جو دوسروں کے جھوٹے الزام لگانے پر بھی بے گناہ کو
وار ٹھہرا کر سزا دیتا ہے۔ وہ راجہ ظالم اور تنگدل وزیروں کے ساتھ رہنے سے ملک الموت کے
پاس چلا جاتا ہے۔ شیر کی ماں جب اس طرح نصیحت کر رہی تھی تو اس چنڈال چوکڑی میں سے ایک خود
غرض شخص اٹھکر شیر کے نزدیک آیا وہ گیدڑ کا جاسوس تھا۔ اس نے جیسے یہ کھچڑی پکائی گئی تھی اس
کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ اس سے شیر کو گیدڑ کی سچائی کا قائل ہونا پڑا۔ اس نے وزیر کو عزت سے اس پر لگائے
الزامات سے بری کر دیا اور بار بار اسے گلے لگایا۔

آخری منزل

سورج اپنی سنہری شعاعوں کا خزانہ لئے غروب ہو چکا تھا۔ ہر طرف تاریکی نے اپنی چادر ڈال
دی تھی۔ ملاحوں کی کشتیوں پر پانی کو چھوتے ہوئے برگد پر، دریا کی لہروں پر۔ موت کی تاریکی
چھا گئی۔ سناٹے کا عالم طاری ہو گیا ــــ میں پانی میں پاؤں لٹکائے اس منظر کو دیکھ رہا تھا
عالم عبرت سے اور مجھ پر ایک عجیب کیفیت طاری تھی۔
دریا بہہ رہا تھا۔ لیکن صبح وہ ایک شوخ بچہ تھا۔ نہایت معصوم۔ شفق کی سرخی میں کھیلتا
میٹھے سریلے گیت گاتا اور وجد کا عالم طاری کرتا ہوا۔
دن چڑھ آنے پر وہ جوان ہو گیا اس کی معصومیت کی جگہ۔ جوانی کا جوش تھا۔ اس کی
چال میں فرق آ چکا تھا۔ نہایت مستی کے عالم میں کناروں سے ٹکرا رہا تھا۔ اس کے کناروں پر شور
تھا اور زندگی کا پورا پورا جوش تھا۔
جب دن ڈھلنے لگا تو اس پر ادھیڑ پن کا عالم طاری تھا۔ وہ جوانی کی چھلوں اور شور سے اکتا
گیا تھا۔ اس کی بیقراری پر خاموشی غالب آتی جا رہی تھی۔ لیکن اب ــــ رات تھی۔ اندھیری

افسردہ، مایوس، خاموش اور خوفناک پیری بچپن کی معصومیت، اور جوانی کے جوش کو بڑھاپے کی افسردگی نے ڈھانپ لیا تھا ۔۔۔ میں بے قرار ہو اٹھا اور چلایا "انسانی روح کی آخری منزل نروان ہے"! دریا کی لہریں مل کر کنارے کے قریب آ گئیں اور ان سے ایک صدا بلند ہوئی "نروان، نروان"! پھر کامل سکوت چھا گیا۔

کوئی دور سے چلایا: "لیکن انسانی جسم کی آخری منزل کونسی ہے"؟

"شمشان!" میں نے اپنی لرزتی ہوئی انگلی دوسرے کنارے پر جلتی ہوئی لاشوں کی طرف کر کے کہا پھر لہریں پاس ہو گئیں اور صدا بلند ہوئی "نروان شمشان، نروان شمشان"

میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

بھونرے سے

جب میں ننھی نادان کلی تھی۔ تو تو مجھ پر دیوانہ وار شیدا تھا۔

لیکن میں نے مدت تک کچھ التفات نہ کیا۔

ایک روز تو نے میرے کانوں میں نہ جانے کیا کہدیا ۔۔۔ میں ہنس پڑی۔ اب میں ایک نوشگفتہ پھول تھی۔ رنگ، وبو کا دلکش ونظر نواز مرقع میٹھا میٹھا رس ۔۔۔ میرے رنگ وروپ کی جلوہ سا، ئی عالم بالا تک پہنچی۔ ستارے بھی مسکرا اُٹھے۔

حسین ورنگین تیتریاں رقص میں مشغول ہو گئیں۔ ۔۔۔ سرسراتی ہوئی ہوا سے مل کر پتیوں نے نغمے الاپنے شروع کئے ۔۔۔ ایسے نشاط آگیں وقت میں۔ میں اور تو وفور کیف میں ہم آغوش ہو گئے۔ تو میرا پرستار میں تیری جان بن گئی لیکن آہ! یہ نشاط آگیں اور پُر کیف لمحات جلد گزر گئے۔

میرا حسن زوال پذیر تھا۔ تیرا جذبہ پرستاری جلد اتر جانے والا نشہ ۔۔۔

میرا حسن گھٹتا گیا ۔۔۔ تیری بے التفاتی بڑھتی گئی۔ میری رنگین پنکھڑیاں ایک ایک کر کے زمین پر گرنے لگیں اور مادر گیتی نے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا۔

میں آخری بار مسکرائی اور ابدی نیند سو گئی۔ ہر برگ وبر مصروف نوحہ ہو گیا۔

لیکن تو چپکے سے کہاں چلا گیا ۔۔۔ تو نے مڑ کر بھی میری طرف نہ دیکھا ۔۔۔

آہ ۔۔۔! میں ہوس کو عشق سمجھ بیٹھی تھی ۔۔۔

مژدۂ شوق

میں تیرے پاس بہت جلد چلا آؤں گا

تیری جانب کوئی شے کھینچ رہی ہے مجھکو
چشمِ مخمور کی مے کھینچ رہی ہے مجھکو
ربطِ حسن کی لے کھینچ رہی ہے مجھکو

میں تیرے پاس بہت جلد چلا آؤں گا

ہوتا جاتا ہے دعاؤں میں اثر سا پیدا
چہرۂ شام سے ہے نورِ سحر سا پیدا
دل کے اندر ہے کوئی مدّو جزر سا پیدا

میں تیرے پاس بہت جلد چلا آؤں گا

اب کوئی تازہ سبب روک سکیگا نہ مجھے
جذبۂ ترک وطلب روک سکیگا نہ مجھے
کوئی طوفان بھی اب روک سکیگا نہ مجھے

میں تیرے پاس بہت جلد چلا آؤں گا

قلب پُر درد کی پروا نہ کروں گا کوئی
چہرۂ زرد کی پروا نہ کروں گا کوئی
نالۂ سرد کی پروا نہ کروں گا کوئی

میں تیرے پاس بہت جلد چلا آؤں گا

تیری اُلفت سے ترے پیار سے کھیلوں کبتک
زیست کی منزلِ دشوار سے کھیلوں کبتک
اپنے ہر جذبۂ خود دار سے کھیلوں کبتک

میں تیرے پاس بہت جلد چلا آؤں گا

ہر فریب غم وراحت سے گریزاں ہوکر

ہر ستم کار حقیقت سے گریزاں ہو کر
ہر غم و کیفِ محبت سے گریزاں ہو کر
میں ترے پاس بہت جلد چلا آؤں گا

سخت درپے ہے مرے گردشِ دوراں اب بھی
میں غمِ زیست سے ہوں دست و گریباں اب بھی
یوں تو ہوں تیری قسم بے سر و ساماں اب بھی
لیکن اب جلد بہت جلد چلا آؤں گا

(رحمت الاکرام رضوی مرزاپوری)

ناموں کی کہانی

اس حیرت انگیز دنیا میں ہر شخص دوسرے شخص سے مختلف ہے۔ کوئی گورا ہے تو کوئی کالا کسی کی رنگت گندمی ہے تو کوئی زردی مائل۔ اسی طرح کوئی عقلمند ہے تو کوئی سادہ لوح، کوئی گانے بجانے میں طاق ہے تو کوئی پڑھنے لکھنے میں ہوشیار اسی طرح مزاجوں میں بھی زمین آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ کوئی جوشیلا ہے تو کوئی ٹھنڈے دل و دماغ والا۔ کوئی محنت مشقت کا عادی ہے تو کوئی فطرتاً کاہل اور آرام پسند ہے۔ غرض یہ کہ اگر انسانوں کا نفسیاتی مطالعہ کیا جائے تو ہر شخص دوسرے انسان سے کسی نہ کسی وجہ سے مختلف نظر آتا ہے لیکن ایک چیز جو ہر شخص کے پاس ہے وہ ہے اس کا نام کیا غریب اور کیا امیر جسے دیکھو اس مفت پائی ہوئی دولت سے مالا مال ہے۔ آپ نے سینکڑوں میں بلیوں کسی ڈپٹی مل، جج کمار بلکہ راجہ رام اور نتھو شاہ دیکھے ہونگے۔ کم از کم غریبوں پر نام رکھنے کے بارے میں تو کوئی پابندی کسی ملک اور کسی قوم میں عائد نہیں مجھے بارہا یہ دیکھکر بہت رنج ہوا کہ لوگ نام رکھنے کے بارے میں بھی بہت قدامت پسند اور پسماندہ واقع ہوئے ہیں۔ ایک قوم کے ناموں سے اس کی اخلاقی سماجی اور سیاسی ترقی جھلکتی ہے۔ آج بیسویں صدی میں کیا آپ کو چھجو مل نتھو رام۔ گوجر مل وغیرہ جیسے بے معنی اور بھونڈے نام سن کر ہنسی نہیں آتی۔ در اصل مدتوں کی غلامی نے ہمارے تمام قومی اداروں کو مردہ بنا دیا ہے، نہ ہمارا کوئی قومی لباس ہے نہ کوئی قومی زبان۔ یہی حالت کم و بیش دوسرے معاملات میں نظر آتی ہے۔ ہندوستان کی پرانی تاریخ کا مطالعہ ثابت کر دیگا کہ آج سے ہزاروں سال پہلے بھی ہمارے بزرگ ناموں کا انتخاب کرنے میں اپنی فراست اور تہذیب کا مظاہرہ

کرتے تھے۔ ان کے ناموں سے بہادری، عقلمندی، حب الوطنی اور دانشمندی کی بو آتی ہے۔ آج بھونڈے، بے معنی اور بعض اوقات مضحکہ خیز نام محض بدمذاقی اور پستی کی دلیل ہیں اور خاص طور پر سوسائٹی کے نچلے طبقوں میں ان کا بہت رواج ہے۔ یہ کمزوری یا بدمذاقی کسی خاص مذہب یا پیشہ کے لوگوں تک ہی محدود نہیں بلکہ تمام ملک میں پائی جاتی ہے اور مجھے افسوس ہے کہ قومی اور سماجی رہنما ان چھوٹی چھوٹی لیکن بہت اہم باتوں کی طرف بالکل دھیان نہیں دیتے۔ ہمارے نام کسی خاص بنیاد پر نہیں رکھے جاتے۔ دریاؤں، پہاڑوں، پھولوں، شہروں اور نہ جانے کن کن چیزوں پر رکھ دیئے جاتے ہیں۔ دریاؤں پر گنگا رام، جمنا داس، سرتی دیوی، کرشنا کماری، پہاڑوں پر کیلاش چندر، شہروں پر متھراداس، ہردواری لال، لاہوری مل، پشاوری مل، دیا بتی رام وغیرہ وغیرہ بہت عام ہیں۔ پھولوں کو بھی کسی نے نہیں چھوڑا۔ چنبیلی۔ گلاب۔ موتیا وغیرہ۔ ان لوگوں کی نظر میں ہمیشہ بہت موزوں نام مہیا کرتے رہے ہیں۔ ان سب سے بڑھکر وہ بے معنی اور بھدے نام ہیں جو ہماری پستی اور بدمذاقی کی زندہ دلیل ہیں۔ مثلاً کلو، چھجو، لوٹن، گھسیو، بدھو۔ غرض کوئی کہاں تک لکھے جائے۔ اگر کوئی حضرت نانی کے ہاں پیدا ہوئے تو ننھو کہلائے۔ اگر بدقسمتی یا خوش قسمتی سے بدھ کے روز دنیا میں تشریف لائے تو بدھو کا نام پایا۔ اگر کسی کی ماں نے کالی مائی کی پوجا کر کے بیٹا پایا تو وہ کالو رام یا کالیداس کے نام سے موسوم ہوئے۔ میرا مقصد محض یہ ہے کہ ناموں کے رکھنے میں ہم لوگوں کو بہت احتیاط رکھنی چاہئے اور نام ایسے ہوں جن سے تہذیب، خوش مذاقی، شجاعت اور دوسری اچھی عادات کا اظہار ہو۔ ایسے لوگوں کی کوئی کمی نہیں جو تمام عمر ماں باپ کی غلطی کا خمیازہ بھگتتے ہیں کیونکہ انہیں اپنا نام بتلاتے شرم محسوس ہوتی ہے۔ بزرگوں، پیغمبروں یا بڑے بڑے لیڈروں کے ناموں کی تقلید کرنا، نیکی، شجاعت، حب الوطنی، پارسائی، شرافت یا ایسے عمدہ جذبات اور اعمال کی بنا پر نام رکھنا بہت موزوں ہوگا۔ عام لوگ بھی اس بات کو سمجھنے لگے ہیں۔ سڑکوں اور محلوں، بچوں اور شہروں کے نام اب پہلے کی نسبت زیادہ ستھرے اور پسندیدہ چنے جاتے ہیں۔ جواہر نگر، گاندھی محلہ۔ کملا نگر، کرشنا گلی، رنجیت سنگھ روڈ، لودھی روڈ وغیرہ وغیرہ اس گہرے جذبہ کے آثار ہیں جو ہندوستانی قوم کے دل میں بیدار ہو رہے ہیں۔ والدین کا فرض ہے کہ وہ ناموں کے انتخاب میں اپنی دانشمندی اور خوش مذاقی کا ثبوت دیں۔ زیادہ مضحکہ خیز، بھونڈے، بے معنی لمبے اور مشکل ناموں کو رکھنے سے پرہیز کریں۔ سوسائٹی کی ترقی اپنی چھوٹی چھوٹی اصلاحوں سے ہی ہو سکتی ہے۔

شاعر!

کوہ کے نیم سرد سیالوں میں
شام چپ چاپ پھیل جاتی ہے
سنگ در سنگ، تیز تنہائی
جگنوؤں کے دیئے جلاتی ہے
دفعتہً سامنے چٹانوں میں
پھر آواز چاپ آتی ہے

دور بستی میں ایک دیوانہ
ان چٹانوں پہ روز آتا ہے
کسی اُلجھی ہوئی گپھا کے پاس
مست خاموش بیٹھ جاتا ہے

ذہن کی بیکراں حرارت میں
جسم ڈھل کر لطیف ہوتا ہے
وقت اور فاصلہ، طلسم خیال
چوٹ کے ساتھ ٹوٹ جاتا ہے
تجربہ خوابناک عالم میں
اجنبی وادیاں دکھاتا ہے

رنگ در رنگ استعاروں میں
سوچتا ہے وہ اس دیوانہ
کس قدر غیر شاعرانہ ہے
زندگی کا طویل افسانہ
حُسن کی عادتیں جفا بنظر
عشق کی خصلتیں بہیمانہ

عقل کی ظلمتیں شرر آمیز
دین کی نعمتیں گدایانہ
کئی مجذوب اہل گل کیلئے
خون کا دے چکے ہیں نذرانہ
لیکن اب بھی نصیب ہو نہ سکا
پھول کا ہفت رنگ پیمانہ

آدمی بے خبر رہا، ورنہ
مہر کی چشمکیں شکار کرے
ماہ کو چھین کر ستاروں سے
اپنی محفل میں نور بار کرے

رات کے ہولناک سایوں میں
آشتی کا چراغ لے آؤ
اور یونہی بڑھے چلو قدم بقدم
گیت گاؤ، ایاغ چھلکاؤ
کوہ کی اوٹ میں طلائی کرن
جھانکتی ہے گلاب زاروں پر
روشنی کے انار چھٹتے ہیں
دُور پھیلے ہوئے اناروں میں
یک بیک سحر ٹوٹ جاتا ہے
مرمریں۔ احمریں خیابوں میں